مولانا ظفر علی خانؒ

اور

فتنۂ قادیانیت

تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر مولانا ظفر علی خانؒ کے معرکہ آرا مضامین، مقالات، توضیحات، اداریے، خطبات، مکاتیب اور شاعری کا دلکش مرقع



ترتیب و تحقیق

محمد متین خالد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا ظفر علی خانؒ
اور
فتنۂ قادیانیت

''بیسویں صدی کے اوائل میں عام مسلمان قادیانی عقائد وعزائم اوراس کے دجل و فریب سے نا آشنا تھے۔مولانا نے اس فتنہ کے خلاف اپنے روزنامہ میں مستقل بنیادوں پر بڑے زبردست اور انقلابی مضامین تحریر کیے جس سے نا صرف قادیانی ملمع سازی کی قلعی کھل گئی بلکہ عام مسلمانوں کو بھی ایک ولولہ تازہ اور جرأت اظہار عطا ہوئی۔زمیندار وقتاً فوقتاً 'قادیان نمبر' شائع کرنے کا بھی اہتمام کرتا رہا۔اس کے علاوہ مولانا نے بڑے گھن گرج کے ساتھ فتنہ قادیانیت کے تار و پود کو اپنی رجزیہ شاعری میں بے نقاب کیا جس سے لوگوں کو نہ صرف اس فتنہ سے آگاہی ہوئی بلکہ لغت میں ایسے الفاظ واصطلاحات کا بھی اضافہ ہوا جن میں ایک جہان معنی پوشیدہ ہے۔علاوہ ازیں انہوں نے برصغیر میں جلسے جلوسوں میں اپنی شعلہ بار خطابت سے مسلمانوں کے جذبات ومحسوسات کی ترجمانی کی۔'زمیندار' خرمن قادیان پر برق باری کے باعث متعدد بار قادیانیوں اور قادیانیت نواز حکومتوں کے زیر عتاب رہا۔ اس پر بھاری جرمانوں، اخبار کی ضبطیوں اور ڈیکلریشن کی تنسیخ کے پے درپے وار کیے گئے۔پریس ضبط ہوا، آئے دن کی ڈگریاں، گرفتاریاں، نظربندیاں اور جبر واستبداد اس کا مقدر بنے رہے۔مولانا نے یہ سب مصائب خندہ پیشانی سے برداشت کیے۔ان کے لیے ان مراحل سے گزرنا اور ابتلا و آزمائش کی اس کسوٹی پر کسا جانا ضروری تھا کہ شاید قدرت کو ان کے خلوص وصداقت کا امتحان لینا مقصود تھا''۔

مولانا ظفر علی خانؒ
اور
فتنۂ قادیانیت

تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر مولانا ظفر علی خانؒ کے معرکہ آرا مضامین،
مقالات، توضیحات، اداریے، خطبات، مکاتیب اور شاعری کا دلکش مرقع

محمد متین خالد

عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت
حضوری باغ روڈ، ملتان۔ 061-4783486

نام کتاب	مولانا ظفر علی خانؒ اور فتنۂ قادیانیت
مصنف	محمد متین خالد
ناشر	عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت حضوری باغ روڈ، ملتان۔
مطبع	آر۔آر پرنٹرز، لاہور
قانونی مشیر	محمد نوید شاہین ایڈووکیٹ ہائی کورٹ
سرورق	محمد طیب محبوب
کمپوزنگ	طاہر علی، ظفر اقبال
سنِ اشاعت	2023ء

عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت

حضوری باغ روڈ، ملتان۔ 061-4783486

حسن انتخاب

مضامین، مقالات

اداریے، شذرات، توضیحات

فکاہات

مکاتیب

خطبات

شاعری

مشاہیر، مولانا ظفر علی خاں اور قادیانیت

جمع کی ہے کرن کرن ہم نے

رسالتِ محمدیہ ﷺ کا تصور عقیدۂ ختم نبوت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ختم نبوت پر ایمان نہ ہوتو پورے اسلام کی نفی ہو جاتی ہے۔ جو شخص ختم نبوت پر ایمان نہیں رکھتا، وہ حضور نبی کریم ﷺ کی نبوت و رسالت سے بغاوت کا مرتکب ہو کر دنیا کے بدترین کافروں کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ برادرم محمد متین خالد کی پوری زندگی محبتِ رسول ﷺ میں عقیدۂ ختم نبوت کے باغی گروہ قادیانیت کے خلاف قلمی، علمی اور عملی جہاد میں بسر ہوئی ہے۔علامہ محمد اقبالؒ سے لے کر مولانا ظفر علی خانؒ تک جس جس نے بھی عشق رسول ﷺ سے سرشار ہو کر فتنۂ قادیانیت کے خلاف قلمی جہاد میں حصہ لیا، وہ محمد متین خالد کے ممدوح قرار پائے۔محبت رسول ﷺ کی نسبت خاص کے سبب انہیں علامہ محمد اقبالؒ اور مولانا ظفر علی خانؒ کی ان تحریروں سے بھی والہانہ محبت ہوگئی جو مختلف اوقات میں ردقادیانیت کے موضوع پر لکھی گئیں۔ان تحریروں کی تاریخی اہمیت سے انکار بھی ممکن نہیں۔علامہ محمد اقبالؒ اور مولانا ظفر علی خانؒ نے اپنے زور قلم اور استدلال کی قوت سے قادیانیت کے دجل وفریب کا بھرکس نکال دیا۔فتنۂ قادیانیت کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کرنے کے لیے جو کچھ بھی علامہ اقبالؒ نے تحریر کیا، ان تحریروں کو تحقیق و ترتیب کے بعد محمد متین خالد 2005ء میں ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شائع کر چکے ہیں۔اب اسی تحقیقی کام کے سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے ''مولانا ظفر علی خانؒ اور فتنہ قادیانیت'' کے عنوان سے کتاب ترتیب دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کام علامہ اقبالؒ کی تحریروں کی ترتیب و تدوین سے کہیں زیادہ مشکل تھا۔قادیانیت کے تعاقب میں مولانا ظفر علی خانؒ نے جو کچھ شاعری کی صورت میں لکھا، وہ تو کتاب کی شکل میں محفوظ تھا۔لیکن اس حوالے سے مولانا ظفر علی خانؒ کے قلم سے نکلے ہوئے مضامین، اداریے، مقالات اور تقاریر کو تلاش کرنا مشکل ہی نہیں، ایک ناممکن کام تھا۔اس ناممکن کو ممکن بنانے میں محمد متین خالد کی کئی سالوں کی محنت شامل ہے۔میں ان مشکل ترین اور صبر آزما مراحل کا کسی حد تک شاہد ہوں جن سے انہیں ''مولانا ظفر علی خانؒ اور فتنۂ قادیانیت'' کی تکمیل کے لیے گزرنا پڑا۔

جمع کی ہے کرن کرن ہم نے یونہی سورج نہیں بنی یہ زمیں

جو کام اداروں کے کرنے کا تھا، وہ اکیلے محمد متین خالد نے سرانجام دیا ہے۔اس لیے اس کی

جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔مگر واقفانِ حال اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ وہ صلہ وستائش سے ایک بے نیاز شخص ہے۔محبتِ رسول ﷺ میں کیے ہوئے کام کا صلہ اگر خوشنودئ رسول ﷺ کی صورت میں مل جائے تو اس سے بڑا اتمغاءِ فضیلت اور کیا ہوسکتا ہے۔انہوں نے ہمیشہ مشکل تحقیقی کاموں میں ہاتھ ڈالا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ہی انہیں اِن کاموں میں کامیاب وکامران اور سرخرو کیا ہے۔ان کی تمام تحقیقی کاوشوں کا مرکز ومحور حضرت محمد ﷺ کی ذات مقدس ہے۔میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ قادیانیت کے خلاف محمد متین خالد کے مسلسل جہاد کا عمل حضور خاتم المرسلین ﷺ کی نظر میں رہتا ہے۔ محبتِ رسول ﷺ سے پھوٹنے والی ایمان کی حرارت ہی انہیں قادیانیت کے خلاف ہمہ دم متحرک رکھتی ہے اور وہ دیوانہ وار آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔مولانا ظفر علی خانؒ نے کہا تھا کہ:

پیمبر ﷺ کی شفاعت پر مری اس عرض کا حق ہے
کہ آقاؐ تیری خاطر میں نے چکی جیل میں پیسی

محمد متین خالد کو بھی ''مولانا ظفر علی خانؒ اور فتنہ قادیانیت'' کو مکمل کرنے کے لیے چکی ایسی مشقت سے گزرنا پڑا ہے۔میرا یہ یقین ہے کہ آقا ﷺ کی محبت میں مشقِ سخن ہو یا چکی کی مشقت دونوں کو شرف قبولیت ضرور ملتا ہے۔مولانا ظفر علی خانؒ ایک سچے عاشق رسول ﷺ تھے۔انہوں نے کہا تھا۔

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب ﷺ کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

مولانا ظفر علی خانؒ کی تحریروں کو مرتب کرنے کے لیے بھی اللہ کریم نے ایک سچے عاشق رسول محمد متین خالد کو منتخب کیا جو اس میں سرخرو ہوا ہے اور اس کٹھن کام میں محبت رسول ﷺ ہی وہ چراغ راہ تھی جس نے انہیں منزل مراد تک پہنچایا۔محمد متین خالد کا یہ کام جمہور مسلمانوں کے لیے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔مجھے اُن کے بے پناہ جذبے مستقبل کے اپنے جیسے دیوانوں کو دعوتِ عمل دیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

اس اہم کاوش پر میں انہیں دل کی عمیق گہرائیوں سے ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

محمد آصف بھلی

یکم فروری 2023ء

ایک نادرُ الوُجُود کاوش

ایک خورشید خطابت دوسرا شیر ژیاں
کانپتی ہے نام سے جن کے زمین قادیاں

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ شعر 1974ء میں بطل حریت، تاج دار اقلیم الفاظ و معانی، شیر بیشہ تحریک ختم نبوت حضرت شورش کاشمیریؒ نے معروف ہفت روزہ چٹان کے سرورق پر ایک نایاب تصویر کے نیچے تحریر کیا تھا جس میں اقلیمِ خطابت کے تاجور سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور سیاح دجلہ فصاحت اور قادر الکلام شاعر مولانا ظفر علی خاں مغفور کسی تقریب میں ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں۔ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ فی الواقع ایک شخصیت نے فن خطابت سے اور دوسری ہستی نے رعنائی تحریر کے ساتھ انگریزی کی معنوی اولاد ''مرزائیت'' پر برصغیر کی زمین تنگ کر دی تھی اور وہ بقائے حیات کے لیے پاک و ہند کے گلی کوچوں کے کونے کھدروں میں منہ چھپائے پھرتی تھی۔ فن تحریر و تقریر، دونوں کی اہمیت اپنی جگہ بجاء کوئی خورشید خطابت کے طور پر افقِ دہر پر ضیا پاشیاں کرتا ہے اور کوئی قرطاس و قلم کو اوڑھنا بچھونا سمجھتے ہوئے قلوب و اذہانِ آدمیت میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ کوئی عروض پر یدطولیٰ رکھتے ہوئے بحور و قوافی سے کھیلتا جواہر آبدار بکھیرتا ہے۔ مگر یہ تینوں رفیع الشان اور لا مثال اوصاف و محاسن کسی خوش مقدر کو قسام ازل بیک وقت عطا فرماتا ہے۔ ایسی صاحب کمال ہستیاں معدودے چند ہی تاریخ ادب و فن میں ملتی ہیں۔ گلستانِ ادب کا ایک ادنیٰ خوشہ چین ہونے کی نسبت سے فقط دو ہی ایسی عدیم النظیر ہستیوں سے واقف ہوں جنہیں قدرت کاملہ نے تینوں اوصاف (یعنی تحریر، تقریر اور شاعری) سے نہایت فیاضی سے بہرہ اندوز کیا تھا۔ ان میں ایک نازشِ میدانِ صحافت حضرت مولانا ظفر علی خاں اور دوسرے مجاہد ختم نبوت حضرت شورش کاشمیری ہیں۔ دونوں ہستیوں کو اگر میں پاسبان حرمت قرطاس و قلم کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ دونوں عشاق رسول اللہ ﷺ، فرنگیوں اور قادیانیوں کے خلاف شمشیر ہائے بے نیام، دونوں سلاطین وقت کی ہتھکڑیوں کو پھولوں کے گجرے سمجھنے والے اور جیل کی سلاخوں کو زلف یار کی طرح پیار کرنے والے تھے۔ یہاں شورش کاشمیریؒ مغفور کا تذکرہ ضمناً آ گیا۔ موضوع بحث کشتہ شمع رسالت اور جاں سپار تحفظ ختم نبوت مولانا ظفر علی خاں ہیں۔ ظفر علی خاں کو ذوق ادب نوازی و ادب شناسی اپنے والد

مکرم سراج الدین احمد خاں (بانی و مدیر روزنامہ زمیندار) کی طرف سے ارزانی ہوا۔ آپ بیک وقت اردو اور انگریزی کے صاحب طرز ادیب اور جادو بیان مقرر تھے۔ اردو زبان تو خیر ان کی میراث پدر تھی مگر انگریزی پر بھی انہیں جو مہارت تامہ اور ید طولیٰ حاصل تھا، ان کی داد و اظہار میرے امکان میں نہیں۔ اس کے علاوہ فارسی اور عربی پر بھی حیرت انگیز دسترس حاصل تھی۔ ایسی نادر اور جامع الصفات ہستیاں تاریخ میں شاذ ہی نظر آتی ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں نے ہوش سنبھالا تو ان کی جولانیٔ تحریر و تقریر کسی استعجاب انگیز معرکہ آرائی کے لیے بے تاب رہنے لگی۔ زمیندار کی ادارت سنبھالتے ہی انہیں ہنگامہ آفرین موضوعات پے در پے ملتے چلے گئے۔ کبھی مسجد شہید گنج تو کبھی عمائدین احرار سے رزم آرائیاں مگر ان ہنگامہ خیز نشیب و فراز سے قطع نظر اس لسان والعصر کی زبان اور کلک گہر بار کو دو موضوعات ایسے میسر آئے جہاں ان کے فن تحریر و تقریر کو ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی، نیا طنطنہ اور نیا ہمہمہ عطا ہوتا رہا۔ ان میں ایک عشق رسول بشمول تعاقب مرزائیت اور دوسرا اہل فرنگ کے خلاف جہادِ عشق رسول کو وہ برملا اپنا اثاثہ فوز و فلاح دنیوی اور نجات اخروی تصور کرتے تھے اور اس کا اظہار انہوں نے کس غایت عقیدت سے کیا ہے۔

ہوتا ہے جن میں نام رسول خدا بلند
ان محفلوں کا مجھ کو نمائندہ کر دیا
سرکار ﷺ دوجہاں کا بنا کر مجھے غلام
میرا بھی نام تا بہ ابد زندہ کر دیا

مولانا ظفر علی خاں نے بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں کچھ اس انداز سے گلہائے عقیدت پیش کیے کہ ہر خطیب کے زور بیاں کے جزو لازم قرار پائے۔ اپنی نعتیہ شاعری کو عزت مآب ظفر علی خاں اپنے زور تخیل کی معراج قرار دیتے ہیں۔

جب نبی کی نعت میں مصروف ہوتا ہے قلم
کیسے کیسے خوش نما موتی پروتا ہے قلم

آپ کی نعتیہ شاعری (جس کا ایک ایک لفظ عشق رسالت مآب ﷺ سے لبریز ہے) پر اظہار خیال کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔

سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

میدان تحقیق و تدقیق میں علمی و ادبی معرکے سر کرنے والوں نے ظفر علی خاں کے اسلوب تحریر اور شاعری پر گراں قدر کاوشیں کی ہیں اور بڑے بڑے ضخیم مقالہ جات تحریر کیے ہیں۔ معرکۃ الآراء اخبار

زمیندار کی انگریزوں اوران کے حاشیہ برداروں اور صبح ومسا ان کی چوکھٹ پر دریوزہ گری کرنے والوں کے خلاف وجد آفریں جدوجہد پر بہت کچھ تحریر کیا گیا۔ اس ضمن میں ان کی جرات و استقامت اور عزیمت واستقلال کو بہت نمایاں کیا گیا اور وہ فی الواقع اس بات کے مستحق بھی تھے کہ ان کی اس جنگ کو زیادہ سے زیادہ ہدیہ تبریک پیش کیا جائے۔ مگر ان کی زندگی کا ایک ایمان افروز پہلو جوان کے اثاثہ زبان وقلم کا نمایاں ترین وصف ہے جسے بجا طور پر شفاعت حبیب کبریا کا حق دار تصور کیا جا سکتا ہے۔ وہ آغوش فرنگیت میں پروان چڑھنے والے مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف معرکۃ الآراء اور الوالعزمانہ جدوجہد ہے۔ ظفر علی خاں مغفور کی آب زر سے لکھنے والی ان حیات آفرین کاوشوں پر بہت کم تحریر کیا گیا ہے۔ حالانکہ حضرت ظفر علی خاں کے باطل شکن قلم نے قصر قادیانیت پر وہ کاری ضرب لگائی جس سے ابھی تک وہ لرزہ براندام نظر آتا ہے۔ البتہ قادیانیت شکن شورش کاشمیری جب تک زندہ رہے، وہ کسی نہ کسی صورت اس حوالے سے بارگاہ ظفر علی خاں میں خراج عقیدت پیش کرتے رہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی شاعری ہنگامہ ہائے روزگار اور شور وشغب میں اچانک پروان چڑھتی اور اس زور بیاں میں وہ چنگاریاں پھنکارتے ناک کی طرح سلگتی رہتیں جو خرمن قادیانیت کو جلا کر خاکستر کر دیتیں۔ اپنے تخیل کو شعر کا پیکر عطا کرنے پر انہیں اس قدر دسترس تھی کہ چشم زدن میں نوک قلم شعر موتیوں کی طرح اگلنے لگتی۔ مثلاً قادیانیت کے حوالے سے انہوں نے یہ اشعار بالبداہت کہے تھے۔

پکڑ فولاد سے بھی ہے میری سخت
میرا سینہ ہے چکلا اور چوڑا
غلام احمد مرا لوہا گیا مان
اٹھایا میں نے جب دیں کا ہتھوڑا
ہر اک میداں سے بھاگے قادیانی
کہ ان کا پیشوا بھی تھا بھگوڑا

مولانا ظفر علی خاں کے نزدیک فرنگیت اور قادیانیت ایک ہی چہرے کے دو روپ تھے۔ ان میں ایک خالق اور ایک مخلوق تھی۔ مولانا نے دونوں کو عین عبادت تصور کرتے ہوئے زبان وقلم کے نشانے پر رکھا ہوا تھا اور اس پیکر غلاظت کی ردائے کذب میں نشانہ بازی سے اتنے چھید کر دیے تھے کہ وہ ابھی تک رفوگری سے عاجز نظر آتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

یہی اس کی نبوت کی ہے پہچان
کہ مر کر بھی نہ منہ لندن سے موڑا

بطل حریت حضرت مولانا ظفر علی خاں مغفور کی استعماری پودے قادیانیت کے خلاف بے مثال معرکہ آرائی کو تشویش ناک حد تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ مجھے گزشتہ دنوں مولانا ظفر علی خاں پوسٹ گریجوایٹ کالج وزیر آباد کے ایک علمی و ادبی مجلّے چناب کا ظفر علی خاں نمبر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔(یہ خصوصی نمبر پرنسپل صاحب نے مجھے عنایت کیا تھا) اس میں اہل علم نے بھرپور انداز میں آپؒ کی جدوجہد آزادی، آپ کی جامع شخصیت اور فنی محاسن کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا تھا۔مگر اس میں مرزائیت کے خلاف آپؒ کی لامثال کاوشوں پر ایک مضمون بھی نظر نہیں آیا۔حالانکہ مرزائیت کی بیخ کنی ہی تو ان کا مقصد وحید رہا ہے۔اس احساس محرومی کو لیے میں ابھی عالم تذبذب میں کروٹیں بدل ہی رہا تھا کہ میرے دیرینہ مشفق اور موجودہ دور میں قادیانیت کے خلاف برہان قاطع اور تیغ براں، فاضل نبیل، برادر معظم محمد متین خالد دامت برکاتہم العالیہ کا فون آ گیا کہ میں مرزائیت کے خلاف شمشیر بے نیام حضرت مولانا ظفر علی خاں کے غلام احمد قادیانی کے خلاف علمی و ادبی معرکوں پر مشتمل باقاعدہ ایک کتاب مدون کر رہا ہوں۔ میں تحریک ختم نبوت کے اس بے لوث، بے ریا انسان کی پرخلوص کاوشوں کا پہلے سے ہی دل کی گہرائیوں سے معترف ہوں۔ بلکہ اس ضمن میں برادرم محمد متین خالد کی خدمت میں بساط بھر تحریری طور پر ہدیہ عقیدت پیش کر چکا ہوں مگر حق نہیں ادا کر سکا۔میں نے اپنی تازہ کتاب ''روح کائنات'' میں ایک پورا باب تحریک ختم نبوت کے حوالے سے جناب محمد متین خالد صاحب کی ترغیب و تحریک پر ہی تحریر کیا تھا۔اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جناب متین صاحب اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس ناپسندیدہ و نازیبا ٹولے کو فنا کے گھاٹ اتار دینے کے لیے وقف کر چکے ہیں۔آپ کے دلائل و براہین میں وہ ثقاہت وہ جلالت اور سطوت ہوتی ہے جس سے قصر قادیانیت کانپ کانپ جاتا ہے۔مرزائیوں کے دجل و فریب اور ان کے بچھائے ہوئے دام تزویر کا پردہ چاک کرنے کے لیے جناب متین خالد نے تقریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم دستاویز تیار کی ہے۔اس کے علاوہ مختلف نجی ٹیلیویژن چینلز مناظروں کی صورت میں بھی آپ کی زبان گوہر فشاں نے فرنگیوں کے پروردہ دیوث گماشتوں کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

جاں سپار مصطفیٰ جناب محمد متین خالد کی تازہ کاوش مولانا ظفر علی خاں اور قادیانیت، ایک ایسی منفرد دل پذیر تالیف ہے جس کی کمی مجھ عاجز سمیت ملک کے علمی و ادبی حلقے ایک طویل عرصے سے محسوس کر رہے تھے۔عقیدہ ختم نبوت جیسے ناگزیر اور حساس مسئلے کے ساتھ برادرم متین خالد کی جذباتی اور والہانہ عقیدت و محبت کا عالم یہ ہے کہ سٹیٹ بینک آف پاکستان میں بطور آفیسر خدمات انجام دیتے ہوئے ایک گھٹن اور تنگی محسوس کر رہے تھے۔ان کا خیال یہ تھا بقول حضرت ڈاکٹر عابد نظامی۔

اک عشق مصطفیٰ ہے اگر ہو سکے نصیب
ورنہ دھرا ہی کیا ہے جہان خراب میں

چنانچہ آپ نے ایک باوقار اور فرحت آفرین ذریعہ آمدن کو ایک ارفع و اعلیٰ مقصد کے لیے چھوڑ دیا اور اپنی باقی زندگی کا ہر لحظہ عقیدہ تحفظ ختم نبوت اور ناموس رسالت ﷺ کی پاسبانی کے لیے وقف کر دیا۔ بقول شاعر

وقف ہو جائے یہ تیرے سنگ در کے واسطے
اس سے بڑھ کر نیک بختی کیا ہے سر کے واسطے
موج کوثر کے ترنم کی زباں درکار ہے
اعتراف عظمت خیر البشر ﷺ کے واسطے

ردفتنہ قادیانیت کے حوالے سے آپ نے ایک ایسے منفرد موضوع کا انتخاب کیا ہے جس پر تحقیق و جستجو کوئی آسان کام نہیں تھا۔ حضرت مولانا ظفر علی خاں کی مرزائیت کے خلاف معرکہ آرائیوں کو ایک کتابی صورت میں مدون کرنا نہایت صبر آزما مشقت کا طالب تھا۔ محمد متین خالد صاحب خود فرماتے ہیں کہ ناموس رسالت ﷺ اور ختم نبوت کے حوالے سے جو کام مجھے آغاز میں بھاری محسوس ہوتا ہے جب اللہ کی بے پایاں رحمت اور آقا ﷺ کی چشمِ عنائیت شامل حال ہوتی ہے۔ تو وہی کام آسانیوں میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ پھر قدم قدم پر حوصلوں کو نیا ولولہ اور عزائم کو تسخیر کے نئے افق عطا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ آنکھوں کو مخزن بصارت، دماغ کو معدن بصیرت اور تخیل کو وہ اڑان عطا ہوتی ہے جو احاطہ تصور میں نہیں آسکتی اور فطرت خود بخود لالے کی حنابندی کرتی چلی جاتی ہے۔ ختم نبوت کے حوالے سے تو کلک متین خالد یوں جنبش میں آتی ہے جیسے صحن چمنستان بطحا میں باد صبا تمناؤں کو زندہ کرتی ہوئی گھوم رہی ہو جیسے فرش گل و لالہ سے کواکب کے جہاں تک عندلیبان رسالت زمزمہ ریز ہوں۔ جیسے کوئی غریق بحر عشق رسالت طغیان آرزو سے دانستہ گریز پائی کرتے ہوئے رحمت کی وادیوں میں اتر جانے کی کوششوں میں مصروف ہو۔ جیسے حجابات رنگ و بو، حسن مدینہ کے جلوؤں میں ڈوب جانے کے لیے بے قرار رہتے ہوں۔ انہی ہمہموں اور طنطنوں کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے جناب متین خالد نے کمر ہمت باندھ لی۔ پنجاب کی بڑی بڑی لائبریریاں گھنگال ڈالیں، جہاں سے بھی آپ کو خفیف سی بھنک پڑ گئی کہ وہاں سے ظفر علی خاںؒ کے رشحات قلم (نثر یا نظم کی صورت میں) مل سکتے ہیں، وہاں آپ نے بلا تاخیر رابطہ فرمایا۔ یہ حسن ظن بھی آپ کے شامل حال رہا کہ کاش ظفر الملت والدین حضرت ظفر علی خاں کا کوئی

ہم عصر مل جائے، اس مقصد کے لیے بھی آپ کا راہوار شوق طلب سرپٹ دوڑتا رہا مگر

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

اس ضمن میں آپ نے حصولِ مواد کے لیے مولانا مرحوم کے مرز بوم میں بھی کچھ ارباب فکر دانش سے رابطہ کیا۔ اس ضمن میں آپ کو کئی مرتبہ مایوسی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ مگر آپ کی جنون انگیز فطرت نے یاس وقنوطیت و پژمردگی کو قریب نہیں بھٹکنے دیا اور خلعت رجائیت کو زیب تن کرلیا۔ تا آنکہ آپ نے وہ حیات بخش گوہر مقصود پالیا جس کے لیے انہوں نے راحت روز وشب کو پر کاہ جتنی حیثیت بھی نہیں دی ہوئی تھی۔ میں اس حوالے سے برادر مکرم جناب متین خالد کا دل کی عمیق ترین گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ آپ مجھ جیسے نافہم اور ناآشنائے حریم الفاظ ومعانی کو ایک طویل عرصے سے اپنے تخلیقی کام میں رفیق کار رکھے ہوئے ہیں اور اپنی ہر کاوش گراں مایہ میں میرا بھی تحریری حصہ ڈال لیتے ہیں۔ میرا یہ ایمان و ایقان ہے کہ تمازت آفتاب محشر میں جب خدائے بزرگ و برتر کا سحاب کرم اور حضور ختمی مرتبت ﷺ کی زلفِ عنبریں حضرت متین خالد پر سایہ فگن ہوگی تو مجھ جیسا خاطی و عاصی بھی اللہ کی رحمت بے کنار اور حضور ﷺ کی شفاعت وشفقت کا حق دار ٹھہرے گا۔ ہر زاویہ ہائے تقدیس وتحریم حبیب کبیر یا ناموس رسالت ﷺ کی پاسبانی یقیناً ایک بہت بڑا محتشم فریضہ ہے اور اس کے اجر وثواب کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ لیکن موجودہ دور میں قادیانیت (جو پھنکارتے ناگ کی طرح عقیدہ تحفظ ختم نبوت کو ڈس رہی ہے) کے خلاف اپنے اثاثہ حیات کو نچھاور کر دینا ایک نعمت وسعادت عظمیٰ سے کم نہیں اور یہ متبرک و مقدس فریضہ برادر مکرم محمد متین خالد صاحب بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدائے عز وجل اس جاں سپار حبیب کبریا کو تا دیر سلامت رکھے اور میں اس نایاب کاوش پر متین صاحب کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ آخر میں مولانا ظفر علی خاں کے اس شعر کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔

محمد ﷺ کی غلامی کا شرف جس کو ہوا حاصل
سکندر کا وہ ہمتا ہے سلیماں کا وہ ثانی ہے

نیاز آگیں
تفاخر محمود گوندل
سیرت نگار، کالم نگار جنگ ایکسپریس

اوراق پارینہ

یہ کتاب فتنۂ قادیانیت کے موضوع پر ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ ہماری نئی پود مولانا ظفرعلی خاں صاحب کی نابغۂ روزگار شخصیت کے صرف ایک پہلو سے واقف ہے کہ انہوں نے ''وہ شمع اجالا جس نے کیا'' اور ''دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھیں تو ہو'' جیسی دلآویز اور خوبصورت نعتیں لکھی ہیں۔ فتنۂ قادیانیت کے محاذ پر مولانا نے جو قربانیاں دیں، صعوبتیں برداشت کیں، قید و بند کے جن مراحل سے گزرے اور جو استقامت دکھائی، وہ فقید المثال ہے لیکن جدید نسل ان سب سے بے خبر ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس دور پرفتن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور قاری ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ وہ کیسی عظیم شخصیت تھی کہ انگریز کی حکومت میں اُس کے خود کاشتہ پودے پر وار کر رہے ہیں لیکن نہ پابند سلاسل ہونے پر فکرمند ہیں، نہ ماہوار وظیفہ بند ہونے پر مشن سے پیچھے ہٹتے ہیں، نہ اخبار کی ضمانت ضبط ہونے کی پروا کرتے ہیں نہ پریس ضبط ہونے پر پسپائی اختیار کرتے ہیں بلکہ ہر قسم کے نتائج و عواقب سے بے نیاز ہوکر اپنے مذہبی فریضہ کو سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ گویا زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں۔

اگر گیتی سراسر باد گیرد
چراغِ مقبلاں ہرگز نہ میرد

جب مجسٹریٹ کہتا ہے: ''میں قانون کا پابند ہوں۔ یہ ضمانت عارضی ہے، عدالت کو حق حاصل ہے کہ اسے منسوخ کر دے''۔ تو فرماتے ہیں: ''آپ انگریزی قانون کے پابند ہیں، میں محمدی قانون کا پابند۔ ایسی ضمانت پر جو تحریر و تقریر پر پابندی عائد کرے، جیل کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ اصول کا سوال ہے''۔ مزید فرمایا: ''مرزا قادیانی کو دجال کہنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں۔ جیل کے در و دیوار یہی صدا سنیں گے کہ مرزا دجال تھا، دجال تھا، دجال تھا''۔ جابر و ظالم حکومت کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے؟

محترم جناب محمد متین خالد ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں کہ انھوں نے کمال جستجو اور عرق ریزی سے ایک طرف تو مولانا ظفر علی خاں صاحب کے اخبارات ''زمیندار'' اور ''ستارۂ صبح'' کی فائلوں سے مواد ڈھونڈا، مرتب کیا اور ہدیہ قارئین کر دیا۔ اس عمل میں کن کن لائبریریوں کے چکر لگائے اور کہاں کہاں کی خاک چھانی اور یہ گوہر تابدار ڈھونڈ نکالے۔ اس میں مولانا کے تاریخی مضامین بھی ہیں، اداریے اور شذرات بھی ہیں، توضیحات و فکاہات بھی ہیں، خطبات اور مکتوبات بھی ہیں اور اخباری بیانات بھی۔ تو دوسری طرف مولانا کے شعری مجموعوں نگارستان، بہارستان، چمنستان، حبسیات اور ارمغانِ قادیاں کی ورق گردانی کر کے نظموں، نعتوں اور اشعار کا ایسا انتخاب کیا ہے کہ قاری پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے اپنی نثر کی طرح شاعری سے بھی تحفظ ختم نبوت کا بھرپور کام لیا ہے اور اپنی نظم و نثر سے قادیانیت کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ اسی پر بس نہیں، محمد متین خالد صاحب نے وہ اہم مضامین بھی یکجا کر دیئے ہیں جو نامور شخصیات نے مولانا ظفر علی خاں صاحب کی قادیانیت کے خلاف جدوجہد کے بارے میں سپرد قلم فرمائے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک مستند تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے اس قادیانی پراپیگنڈہ کی قلعی بھی کھل جاتی ہے جو وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ بھی قادیانیت سے متاثر تھے اور اس کے حق میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور اسے اسلام کے دیگر مذہبی فرقوں کی طرح ایک فرقہ سمجھتے تھے۔ کتاب میں پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب کے مضمون میں اس پر مدلل گفتگو کی گئی ہے اور پروفیسر صاحب نے "Thoughts & Reflections of Iqbal" کے مستند حوالے سے واضح کیا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے 1935ء میں قادیانی جماعت کی اساس کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے سیاسی پہلو پر خاص زور دیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''احمدیت کا مقصد انگریز کے ہندوستان پر غلبہ کو مستحکم کرنے کے لیے مذہبی اور وحی کی بنیاد فراہم کرنا ہے''۔ گویا مرزا قادیانی کا جہاد کو حرام قرار دینا اسی مقصد کی ایک کڑی تھی۔ پروفیسر صاحب نے اسی کتاب کے ایک دوسرے حوالہ سے یہ بھی تحریر فرمایا کہ 1936ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کے خط کا جواب دیتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے

دوٹوک الفاظ میں لکھا: ’’میرے ذہن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ قادیانی، اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں‘‘۔

حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی نے اپنے مضمون میں تحریر فرمایا کہ ’’1935ء میں ’’زمیندار‘‘ کا قادیانی نمبر شائع ہوا جس میں علامہ اقبالؒ نے اس فرقۂ ضالہ کے دلائل کی قلعی کھول دی جس پر مولانا ظفر علی خاں صاحب نے علامہ کی تحسین وستائش میں ایک زوردار مقالہ سپردِ قلم فرمایا‘‘۔ ان حقائق کا جدید نسل کے علم میں لانا بہت ضروری تھا۔ جناب محمد متین خالد صاحب نے یہ فرض کفایہ ادا کرنے کے لیے لائبریریاں کھنگالیں اور مضامین پارینہ تلاش کرنے کا بیڑا اٹھایا اور الحمدللہ! اس میں کامیاب بھی رہے۔ علمی، تحقیقی اور تاریخی مضامین ہونے کے باوجود دورانِ مطالعہ قاری اُوبتا نہیں بلکہ دلچسپ ادبی اندازِ بیاں سے حظ اٹھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

عبدالرؤف

اسلام آباد

دل کی بات

ظفر الملت حضرت مولانا ظفر علی خاں ایک تاریخ ساز اور عہد طراز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اس دور کے متبحر عالم، صاحب بصیرت مدیر، منفرد ترجمہ نگار، نعت گو شاعر، بابائے صحافت، قادر الکلام خطیب، حاضر طبع شاعر اور بلند پایہ ادیب تھے۔ وہ نظم نثر پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ دینی و سیاسی علوم میں یکہ تاز تھے۔ بلند پایہ علمی و ادبی ذوق انہیں ورثے میں ملا تھا۔ انہیں دین اسلام بالخصوص حضور خاتم النبیین ﷺ سے والہانہ محبت اور بے پناہ عقیدت و احترام تھا۔ آپ اُردو کے قدیم اور ممتاز اخبار ’زمیندار‘ کے مدیر اعلیٰ اور مالک تھے۔ اس اخبار نے تحفظ ناموس رسالت ﷺ کے ساتھ ساتھ فتنہ قادیانیت کے تعاقب اور محاکمہ کے سلسلہ میں جو لاثانی کردار ادا کیا، اسے صدیوں یاد رکھا جائے گا۔

آتی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

بیسویں صدی کے اوائل میں عام مسلمان قادیانی عقائد و عزائم اور اس کے دجل و فریب سے نا آشنا تھے۔ مولانا نے اس فتنہ کے خلاف اپنے روزنامہ میں مستقل بنیادوں پر بڑے زبردست اور انقلابی مضامین تحریر کیے جس سے نا صرف قادیانی ملمع سازی کی قلعی کھل گئی بلکہ عام مسلمانوں کو بھی ایک ولولہ تازہ اور جرأت اظہار عطا ہوئی۔ زمیندار وقتاً فوقتاً ’قادیان نمبر‘ شائع کرنے کا بھی اہتمام کرتا رہا۔ اس کے علاوہ مولانا نے بڑے گھن گرج کے ساتھ فتنہ قادیانیت کے تار و پود کو اپنی رجزیہ شاعری میں بے نقاب کیا جس سے لوگوں کو نہ صرف اس فتنہ سے آگاہی ہوئی بلکہ لغت میں ایسے الفاظ و اصطلاحات کا بھی اضافہ ہوا جن میں ایک جہان معنی پوشیدہ ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے برصغیر میں جلسے جلوسوں میں اپنی شعلہ بار خطابت سے مسلمانوں کے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کی۔ ’زمیندار‘ خرمن قادیان پر برق باری کے باعث متعدد بار

قادیانیوں اور قادیانیت نواز حکومتوں کے زیر عتاب رہا۔ اس پر بھاری جرمانوں، اخبار کی ضبطیوں اور ڈیکلریشن کی تنسیخ کے پے در پے وار کیے گئے۔ پریس ضبط ہوا، آئے دن کی ڈگریاں، گرفتاریاں، نظر بندیاں اور جبر و استبداد اس کا مقدر بنے رہے۔ مولانا نے یہ سب مصائب خندہ پیشانی سے برداشت کیے۔ ان کے لیے ان مراحل سے گزرنا اور ابتلا و آزمائش کی اس کسوٹی پر کسا جانا ضروری تھا کہ شاید قدرت کو ان کے خلوص و صداقت کا امتحان لینا مقصود تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد تحریکِ ختم نبوت (1953ء) میں 'زمیندار' کا ڈیکلریشن منسوخ ہوا اور حکومت نے پرنٹنگ پریس اپنی تحویل میں لے لیا۔ ان دنوں مولانا ظفر علی خاں کے بیٹے اختر علی خاں اخبار کے مدیر تھے۔ ان کو مارشل لاء کے تحت چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی، یوں تقریباً نصف صدی کی ہنگامہ خیز جدوجہد کے بعد 1954ء میں اخبار مستقلاً بند ہو گیا۔

مجھ کو دہراؤ گے محفل میں مثالوں کی طرح

ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سامراج اور مغربی طاقتوں پر بے پناہ جارحانہ اور جرات مندانہ تنقید نے جہاں 'زمیندار' کو عوام میں مقبول بنایا، وہاں حاکم اِس سے ناراض ہوئے اور اسے خاموش کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا مگر 'زمیندار' کے مالک و مدیران ان تمام حوادث کے سامنے پہاڑ کی طرح ڈٹے رہے اور اخبار کا اثر و رسوخ اور وقار جاں جوکھم میں ڈال کر بدستور قائم رکھا، اس طرح زمیندار گویا پوری نصف صدی کی داستانِ عزیمت ہے۔ بقول شخصے: ''زمیندار اگرچہ حکومت کے ہتھوڑوں کی بے پناہ ضربات سے چور ہو رہا ہے، درجنوں کارکنوں کو قید کرا چکا، ہزاروں روپیہ سرکاری خزانے میں داخل کرا چکا، آج آسمان ہند کے نیچے کوئی بھی اخبار اس کی مظلومی و بے کسی کا مقابلہ نہیں کر سکتا، لیکن جرأت، حوصلے اور شجاعت و بسالت کا اب بھی یہ عالم ہے کہ آج بھی اس کی صدائے بے پناہ سے ایوان حکومت میں تزلزل آ جاتا ہے، بڑے بڑے جباروں اور متکبروں کو پگڑیاں سنبھالتے ہی بنتی ہے، گویا:

ملی تعزیر جس قدر بھی، بڑھا ہے ذوق گناہ اس سے

اس کتاب کے لیے مواد کی تلاش میں مجھے یہ جان کر از حد حیرانی ہوئی کہ تحفظ ختم نبوت یا قادیانیت کی تردید میں حضرت مولانا ظفر علی خاںؒ کا کوئی مطبوعہ مضمون دستیاب نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف لائبریریوں میں بیسیوں قدیم و جدید اخبارات و رسائل کی فائلوں کو دیکھا مگر گو ہر

مقصود تک رسائی نہ ہو سکی۔ صاحبان علم و تحقیق نے بھی اس پر حیرت کا اظہار کیا۔ ناسازی طبع کے باوجود ارادہ کیا کہ اس موضوع پر مولانا کے اہم مضامین کی کھوج کی جائے۔ چنانچہ اس تلاش و جستجو میں تحقیقی سفر کا آغاز کیا۔ احباب کے مشورے سے طے پایا کہ حضرت مولانا کے زیر ادارت شائع ہونے والے اخبار 'زمیندار' اور 'ستارہ صبح' کی فائلوں کو بالاستیعاب کھنگالا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مختلف لائبریریوں میں جانا ہوا۔ یہ جان کر بھی مایوسی ہوئی کہ ان اخبارات کی فائلوں کا مکمل ریکارڈ کہیں بھی دستیاب نہیں۔ اگر انٹرنیٹ کی کسی سائٹ یا کسی ادارہ نے انہیں ڈیجیٹل طور پر محفوظ کیا ہے تو کوالٹی اس قدر ناقص ہے کہ اسے واضح طور پر پڑھا نہیں جا سکتا۔ کسی لائبریری میں سرے سے اس کا ایک بھی شمارہ نہیں ہے۔ چند لائبریریوں میں محض تبرک کے طور پر دو چار شمارے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں ٹرسٹ لاہور کا ذکر کرنا عبث و بے کار ہے۔ یہاں تحقیق کے لیے جانے والوں کے ساتھ جو معاندانہ اور مخاصمانہ رویہ برتا جاتا ہے، وہ ناقابل بیان ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر مصلحت آڑے آ رہی ہے، بھینس کے آگے بین بجانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میری ایماندارانہ رائے میں اس 'سفید ہاتھی' کو فی الفور بند کر دینا چاہیے۔

ہائے ہم کیا سمجھتے تھے، وہ کیا نکلے

صرف تین ادارے ایسے ہیں جہاں زمیندار کی مکمل نہیں تو کم از کم اتنی فائلیں ضرور موجود ہیں جن سے آپ کسی حد تک استفادہ کر سکتے ہیں۔ ان میں ریسرچ سوسائٹی قائداعظم کیمپس پنجاب یونیورسٹی لاہور، لاہور میوزیم لائبریری اور دفتر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان شامل ہیں۔ اس کتاب کے **80** فیصد سے زائد مضامین کا انتخاب انہی اداروں کی لائبریریوں میں موجود 'زمیندار' اور 'ستارہ صبح' کی فائلوں سے کیا گیا ہے۔ یہ ایک جانگسل اور اعصاب شکن مرحلہ تھا جو بہ توفیق الٰہی بڑے احسن طریقے سے عبور ہوا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ تقریباً سو سال پرانے مضامین کی فائلیں خستہ ہو چکی تھیں۔ ان فائلوں سے بڑی احتیاط کے ساتھ مضامین کی تصاویر لی گئیں۔ پھر انہیں کمپیوٹر پر منتقل کر کے اس کے پرنٹ لیے گئے۔ عربی اور فارسی کی تراکیب اور الفاظ اس قدر مبہم اور گنجلک تھے کہ اس کے لیے مختلف زبانوں کی لغات سے مدد لینی پڑی۔ پروف ریڈنگ کا مرحلہ بے حد مشکل تھا، اسے بھی ایک معرکہ سمجھ کر عبور کر لیا۔ میرے ناتواں کندھے اتنا ہی بوجھ برداشت کر سکتے تھے، اس سے زیادہ کی سکت نہیں تھی۔ میں نے جب ان

مضامین کی تدوین کرلی تو اندازہ ہوا کہ'ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا' یعنی اس طرح کی درجنوں جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔ بہرحال یہ اداروں کے کرنے کا کام ہے۔ انہیں اس جانب اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیے۔

گل پھینکے ہیں عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

مجھے امید ہے کہ میری یہ کاوش نہ صرف اس اہم موضوع پر پہلی کڑی ثابت ہوگی بلکہ محققین کے لیے بھی مہمیز ہوگا۔ اہل علم سے درخواست ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اپنی بیش قیمت آراسے ضرور مطلع فرمائیں تا کہ آئندہ ایڈیشن خوب سے خوب تر کا آئینہ دار ہو۔

طالب شفاعت محمدی ﷺ بروز محشر
محمد متین خالد
mateenkh@gmail.com

چند ضروری گزارشات

- یہ کتاب 'مولانا ظفر علی خاں اور فتنۂ قادیانیت' کے متعلق گوناگوں، علمی، تحقیقی اور چشم کشا مضامین کا مجموعہ ہے۔ اپنے تئیں پوری کوشش کی ہے کہ صرف وہی مضامین اس کتاب میں شامل کیے جائیں جن کے لکھنے والوں کی متانت وثقاہت مسلم ہے۔ پھر بھی اسے مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔
- اس کتاب کو تیار کرتے وقت بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ کسی غلطی کا امکان نہ رہے۔ اس لیے اس کی پروف ریڈنگ کو بہتر بنایا گیا ہے، اس کے باوجود غلطی کا امکان ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین کرام کسی قسم کی کوتاہی کو بنظر عفو واغماض دیکھیں گے۔ اگر کسی جگہ کسی قاری کو غلطی نظر آئے تو براہِ کرم مصنف کو ضرور مطلع کرے۔ ان شاء اللہ آئندہ کے ایڈیشن میں اس کا ازالہ کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی حوالہ کے نقل واخذ میں سہو ہو گیا ہو تو قارئین کرام ناصحانہ اور ہمدردانہ طور پر نشان دہی فرما دیں تا کہ اس کی تصحیح کر دی جائے۔ شکریہ!
- یہ کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ ہر مضمون اپنی جگہ پر خاص اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ ممکن ہے کتاب کے بعض مقامات پر حوالہ جات اور تشریحات کی تکرار پڑھنے کو ملے۔ قارئین کرام اسے متعلقہ مضمون کا ضروری حصہ سمجھ کر مطالعہ کر لیں کیونکہ اس کے بغیر خدشہ تھا کہ مضمون ادھورا رہ جاتا۔

محمد متین خالد

مولانا ظفر علی خانؒ
اور
فتنۂ قادیانیت

مضامین، مقالات

ہمارا مذہب

دُنیا میں ایک شخص آیا تھا جس کا نام ''محمد ﷺ'' **(بابی انت و اُمی یا رسول اللّٰہ)** تھا۔ خدا اور انسان کے جو تعلقات روز الست سے چلے آئے ہیں، وہ درہم برہم ہو چکے تھے۔ حضور سرور کائنات ﷺ نے اُن کی کامل طور پر تجدید فرمائی اور آپ ﷺ کی عدیم النظیر یزداں شناسی نے جو معرفت باری کے آسمان کا نقطہ نصف النہار تھی، اہل عالم کو ایک کامل و مکمل ضابطہ کے ذریعہ سے بتا دیا کہ رہتی دنیا تک اسے کس طریقہ پر چلنا چاہیے۔ آفریندہ کون و مکاں کے ساتھ اس کا کیا رشتہ ہونا چاہیے اور اپنے بنی نوع کے ساتھ اس کے معاملات کی کیا شان ہونی چاہیے۔

یہ ضابطہ قرآن مجید و فرقان حمید تھا جو سوا تیرہ سو سال سے ایک لفظ ایک حرف اور ایک نقطے کی تحریف کے بغیر جوں کا توں چلا آیا ہے اور یوم نشور تک چلا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ تو دنیا سے پردہ فرما گئے لیکن اپنا قائم مقام اس ضابطہ آسمانی کو چھوڑتے گئے جس کے نور سے تمام عالم روشن ہے اور جس کی ضیا اس وقت بھی اس تیرہ خاکداں کو منور کرتی رہے گی، جب نہ یہ آفتاب ہوگا نہ یہ ماہتاب، نہ نجوم لامعہ ہوں گے نہ ان کے بروج مشیدہ۔

قرآن مجید کے نزول کے بعد رشد و ہدایت کا وہ سلسلہ جسے اصطلاح مذہب میں شریعت کہتے ہیں، قطعاً ٹوٹ گیا۔ رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین تھے جن پر نبوت ختم ہوگئی۔ اسی طرح وہ صحیفۂ آسمانی جو بوساطت جبریل امیں حضور انور ﷺ کے قلبِ مطہر پر نازل ہوا، خاتم الصحائف ہے جس کے بعد کوئی کتاب انسان کے ایمان بالغیب پر کسی قسم کا حق نہیں رکھ سکتی۔ اس کتاب کے جو جو معانی اور مطالب تھے، رسول اللہ ﷺ نے کھول کھول کر اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو سمجھا دیے اور اُن بزرگوں نے جن سے بڑھ کر شریعت کا رازداں اور کوئی نہیں ہوسکتا، ان حقائق عالیہ کو آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا اور یہ سلسلہ ہم تک قائم ہے۔

رسول اللہ ﷺ نور کا ایک اُبلتا ہوا چشمہ ہیں جو شعاع رشد و ہدایت پر تنویر چشمے سے

نکلے۔وہ غیر مختسم اور غیر منقطع ہونے کے ساتھ ایسے نہیں کہ چشم بصیرت اس سے چندھیا جائے اوراس خیر گی کے رفع کرنے کے لیے کسی دوسرے نور کی ضرورت ہو۔قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں جو سمجھ میں نہ آ سکے۔کوئی توڑ موڑ نہیں،کوئی اینچ پینچ نہیں،کھلی کھلی باتیں ہیں جنہیں عامی اور جاہل،فلسفی اور حکیم،ادنیٰ اور اعلیٰ سب سمجھ سکتے ہیں۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِهِ الۡكِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجاً. (الکہف:1)

ترجمہ: سزاوار ستائش ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر قرآن اُتارا اور اس قرآن میں کسی قسم کی کجی نہ رکھی۔

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں آنجہانی مرزا قادیانی نے جو ایک عیار و طباع شخص تھا اور حکیم ناصر خسرو علوی کی طرح قرآن مجید کی من مانی تاویل کرنے کا عیارانہ فن خوب جانتا تھا اور اُسی کے ساتھ روایات اسلام کے رطب و یابس سے بھی فائدہ اٹھانے کے ڈھب سے اچھی طرح واقف تھا،مہدویت و مسیحیت کا دعویٰ کر دیا اور اسی پر بس نہ کی بلکہ حلول اور رجعت اور تناسخ کے آریائی تصور کو اپنی دنیوی اغراض کے سانچہ میں ڈھال کر کمال بے باکی کی راہ سے حضور سرور کائنات ﷺ کا بروز بن بیٹھا اور صاف کہہ دیا کہ میں وہی احمد عربی ہوں جو مدینہ میں مبعوث ہوا تھا۔اس کی روح میرے جسم کے اندر ہے اور اب میں اس ایمان کو جو زمین پر نہیں ہے بلکہ دنیا سے رخصت ہو کر ثریا پر چلا گیا ہے،اتار کر لایا ہوں تاکہ دنیا نئے سرے سے پھر مسلمان ہو۔

مرزا قادیانی کی اس فتنہ گری کا اولین احساس ہمیں اس وقت ہوا جب ہم حیدر آباد دکن میں تھے اور ہم نے ''نقاش'' کا علمی نام اختیار کر کے پے در پے متعدد مضامین سپرد قلم کیے جن میں مرزا قادیانی کی رسن سازی کا تار و پود بکھیرا گیا تھا۔

دولت آصفیہ کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جب ہم لاہور آئے تو مرزا قادیانی رخت رحلت باندھ کر احکم الحاکمین کی بارگاہ میں اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے جا چکا تھا اور حکیم نور الدین جس نے مرزا قادیانی کی پیمبری کی تصنیف میں وہی حصہ لیا تھا جو فردوسی سیسان کے ایک معمولی پہلوان کو ''رستم داستان'' بنانے میں لے چکا تھا،اس خانہ ساز نبوت کی مسند خلافت پر جلوہ افروز تھا۔

حکیم صاحب بھی ایک خاص دل و دماغ کے شخص تھے۔شقاق و افتراق کی وہ قوتیں جو

تاریخ اسلام میں ہر غیر شرعی تحریک کی خانہ براندازی کا باعث بن کر اسلام کی سرمدی صداقت پر مہر لگاتی رہی ہیں، مرزا قادیانی کی آنکھیں بند ہوتے ہی بروئے کار آچکی تھیں اور قادیانیت کے دو ''اندلسی'' اور ''دمشقی'' یعنی کمالی اور محمودی ٹکڑے انقراض وانقطاع کا سرمایہ بن رہے تھے۔ لیکن حکیم صاحب کی زبردست شخصیت ایک قلیل مدت کے لیے منفصل کو متصل بنانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔

تین سال کی خلوت گزینی نے جہاں ہمیں اور بیسیوں درس عبرت دیے، وہاں اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا کہ قادیانی جماعت اس پنجابی ظرف ''ٹنڈ'' کی طرح جس کے پیندے کا شکوہ سنج ہر کسان ہوا کرتا ہے یا اُس گردگان کی طرح جس کی شکایت سعدی شیرازی کی زبانی گنبد کر سکتا ہے، ایک عجیب زمانہ ساز گروہ ہے جس کو اپنے مطلب سے مطلب ہے، اسلام اور اس کی خدمت سب ڈھکوسلے ہیں۔ اخوت اسلامی محض ایک دلفریب فقرہ ہے جو چندہ وصول کرنے کے لیے کام میں لایا جاسکتا ہے۔

موسیو بشیر الدین محمود سے تو شکوہ عبث ہے جو اپنے اور اپنے اکملوں اور کرم دادوں کے علاوہ باقی تمام مسلمانوں کو سرے سے کافر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم قرن اول کی روایات کے تازہ کرنے والے ہیں۔ امت محمدیہ میں اشرف و افضل ہیں۔ ابوبکر صدیقؓ اور فاروق اعظمؓ ہمارے امام کی خاک پا کی برابری بھی نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اس تین سال میں جو سلوک تمام مسلمانوں کے ساتھ کیا، وہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ قادیانیت ایک زہریلا درخت ہے جو گلشن اسلام میں ایک منٹ ایک سیکنڈ کے لیے بھی کھڑا ہونے کا حق نہیں رکھتا۔

(ستارہ صبح لاہور 26 ستمبر 1917ء)

اسلام کی برکتیں

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللهِ الْاِسْلَام

حکیم سنائی جو لشکر تصوف کے علم بردار اور شبستانِ معرفت کی شمع ہیں اور جن کی جلالت قدر کا اعتراف مولانائے روم جیسے عارف باللہ نے یہ کہہ کر کیا ہے کہ

عطار روح بود و سنائی دو چشم او
ما از پے سنائی و عطار آمدیم

اپنی ایک لطیف اور نکتہ آموز نظم میں ارشاد فرماتے ہیں:

ہر خسے از رنگ و رفتارے بدیں رہ کے رسد
درد باید صبر سوزد مرد باید گام زن
روز ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب و گل
شاہدے را حلّہ گردد یا شہیدے را کفن
ہفتہ ہا باید کہ تا یک مشتِ پشم از پشتِ میش
صوفئے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن
سالہا باید کہ تا یک سنگِ اصلی ز آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن
قرنہا باید کہ تا یک کود کے از لطف طبع
عالمے گویا شود یا فاضلے صاحب سخن
دور ہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود
بو سعید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

شاعر نے ان دلآویز اشعار میں جو فلسفیانہ نکتہ بیان کیا ہے، اس کی دو شرحیں ہو سکتی

ہیں۔ پہلی شرح تو یہ ہے کہ نظامِ موجودات میں ہماری نظر جن چیزوں پر پڑتی ہیں، وہ دفعتہً اور بغتۃً ایک کامل و مکمل شکل میں نمودار نہیں ہو جاتیں بلکہ بتدریج نشو و نما پا کر بلوغ و کمال کو پہنچتی ہیں۔ ایک سبز درخت کو دیکھو۔ پہلے اس کی شکل ایک بیج کی تھی جس میں مبداء فیاض نے حیات کا وہ جوہر اولیں ودیعت کر رکھا تھا جو قوت سے فعل میں آنے کے لیے تیار تھا۔ یہ بیج زمین میں ڈالا گیا، آفتاب کی حرارت اور پانی کی رطوبت نے اجزائے ارضی کے ساتھ مل کر بیج کی قوت نامیہ کو اُبھارا اور وہ زمین میں سے پھوٹ نکلا۔ پہلے اس کی ایک ننھی سی کونپل نکلی جو آنکھ کو بمشکل نظر آتی تھی۔ رفتہ رفتہ غذا کے ملنے سے یہ کونپل بڑی ہوتی گئی۔ ایک شاخ میں سے کئی شاخیں پیدا ہو گئیں اور ایک لہلہاتا ہوا پودا صنعت ایزدی کی گواہی دینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ آفتاب کی شعاعوں اور ہوا کے جھونکوں نے اس کی پرورش کی، بادل کے چھینٹوں اور کسان کے پسینے نے اسے سیراب کیا۔ یہاں تک کہ یہ پودا دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتا ہوا ایک ایسے شاندار اور تناور درخت کی شکل میں بدل گیا جس کے سایہ میں بیسیوں انسان اور حیوان پناہ لینے کے قابل ہو گئے اور جس کا ایک ایک پتہ زبان حال سے **فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ** کا کلمہ پڑھنے لگا۔

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

انسان کی حقیقت پر غور کرو۔ ایک بڑے حکیم کے قول کے مطابق نو مہینے تک جب کہ وہ ماں کے پیٹ میں تھا، اس کی زندگی کی نوعیت آبی تھی اور اس زمانہ میں اس نے درجہ بدرجہ بہت سی متمائز مگر متناسب شکلیں بدلیں۔ جب وہ پیدا ہوا تو اس کی زندگی آبی سے ہوائی ہو گئی۔ وہ ہوا میں سانس لینے لگا، اسے نئی قسم کی غذا دی جانے لگی، اس کی پرورش کا طریقہ بدل گیا لیکن ابھی وہ نہ کچھ دیکھ سکتا تھا، نہ پہچان سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے ہوش و حواس کی نعمت عطا ہوئی، اسے معلوم ہونے لگا کہ ایک بیرونی و خارجی دنیا بھی موجود ہے۔ وقت مقررہ پر اس کے اعضا تبدیل غذا کے خوگر ہو چلے، دانت نکل آئے اور خوراک بدل گئی۔ شیر خوارگی کے زمانہ کے بعد طفولیت کا دور آیا اور عہد طفولیت مبدّل بہ عالمِ شباب ہو گیا۔ اس کا جسم نشو و نما پاتا گیا اور ساتھ ساتھ قوائے عقلی بھی ترقی کرتے گئے۔ جب اس کی عمر پندرہ سال کے قریب پہنچی تو بوجہ اس ترقی کے جو اس کے جسم کے خاص خاص اعضا نے کی تھی، اس کی اخلاقی سیرت میں تغیر پیدا ہو گیا۔ نئے جذبے،

نئے خیالات اورنئی اُمنگیں اُس پر اپنا اثر ڈالنے لگیں۔ آخر کار ریعان بلوغ کی حد آ پہنچی اور انسان جسمانی، اخلاقی اور عقلی قوتوں کا ایک دلآویز مجموعہ بن گیا جس کی باجبروت ہستی کا غلغلہ زمینوں اور آسمانوں میں پڑ گیا۔

خاک کے پتلے نے دیکھ کیا ہی مچایا ہے شور
فرش سے لے عرش تک کر رہا ہے اپنا زور

غرض زندہ مظاہر عالم کی کل اصناف اس قانون کی تابع ہیں کہ کرۂ زمین پر زندگی کے نمودار ہونے کے وقت سے لے کر اس وقت تک اشکال ذوی الاعضا کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہے جس کے اجزا نے مدارجِ نشو ونما منزل بمنزل طے کیے ہیں اور سنائی کے حکمت آفرین اشعار اسی قانون کی شرح ہیں۔ لیکن ایک اس سے بھی زیادہ دقیق وباریک نکتہ ان اشعار میں مضمر ہے اور وہ یہ کہ کسی ایک نوع کے عام افراد کی نشو ونما کے لیے قدرت جو زمانہ مقرر کر دیتی ہے وہ تو خیر طویل ہوتا ہی ہے لیکن ان افراد میں سے کسی ایک کو کل نوع کا ایک نمونہ کامل بنانے کے لیے قدرت کو بہت زیادہ طویل و مدید زمانہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے اس فردِ اکمل کے پیدا کرنے میں بہت بڑی جد و جہد اور تگ و دو کرنی پڑتی ہے اور کامل و بے عیب نمونہ اس وقت تک تیار نہیں ہوتا جب تک کہ وہ پہلے امتحاناً بہت سے نمونے تیار نہیں کر چکتی جن میں سے کسی میں کمال کا کوئی پہلو رہ جاتا ہے اور کسی میں کوئی۔ کئی طالیس اور سقراط اور زنوفن پیدا ہوئے تب کہیں جا کر ایک ارسطو پیدا ہوا۔ بہت سے رودکی اور دقیقی اور عنصری گزر چکے تب کہیں جا کر ایک فردوسی ظاہر ہوا۔ بیسیوں سلیمان اور سکندر اور نوشیروان پیوند زمین ہو چکے تب کہیں جا کر ایک عمر فاروقؓ کی شکل دکھائی دی۔ صدہا زردشت اور بدھ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اپنے اپنے نقش مٹا چکے تب کہیں جا کر حضرت محمد ﷺ کی تصویر اپنی شانِ رحمۃ للعالمینی کے ساتھ نظر آئی۔

سنائی کے حکیمانہ اشعار کی جو شرح ہم نے کی ہے، اس کی دوسری شق پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ حیات کے عقلی و روحانی مظاہر کی نشو ونما بھی نہایت آہستگی و مواظبت کے ساتھ بتدریج ہوتی ہے اور انسانی خیال عام اس سے کہ اس کا موضوع معاش ہو یا معاد، صدیوں کے مرور کے بعد منتہائے بلوغ کو پہنچتا ہے اور ان میں سے جو خیال جس قدر زیادہ مہتم بالشان ہوتا ہے، اسی قدر اس کی نشو ونما میں زیادہ مدت صرف ہوتی ہے۔

انسان کی اندرونی زندگی کی سب سے زیادہ مہتمم بالشان حقیقت وہ کیفیت ہے جسے مذہب سے تعبیر کیا جاتا ہے اور متشککین کا قلیل التعداد گروہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہے لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ جس طرح ہم میں بھوک پیاس کی خواہشیں اور رنج و راحت کے احساس کی قابلیت رکھی گئی ہے، جس کے حقیقی واصلی ہونے سے مطلق انکار نہیں ہوسکتا، اسی طرح علّۃ العلل یعنی حیات کے مبدءِ اصلی کی ٹوہ لگانے اور ہمیشہ زندہ رہنے کی آرزو کرنے کی خواہشیں بھی ہماری فطرت کا ایک جزو لاینفک ہیں اور یہی خواہشیں مذہب کا سنگ بنیاد ہیں۔ڈاکٹر ڈریپر اپنی کتاب "Conflict Between Religion and Science" میں جس کا ترجمہ ہم نے ''معرکۂ مذہب وسائنس'' کے نام سے کیا ہے، اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہ مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے، لکھتے ہیں:

''قدرت نے انسان کی جسمانی ساخت کا ڈھنگ ہی کچھ ایسا ڈالا کہ بقائے روح اور حیات اُخروی کے تصورات بے اختیار اس کے دماغ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔غیر مہذب وحشی کو بھی جس کی روح پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی ہے، عالمِ رویا میں وہ سہانے جنگل اور دلفریب مرغزار نظر آتے ہیں جو اس کی رویا کا سب سے زیادہ خوشگوار حصہ ہیں۔ان غیر حقیقی اور موہوم تصاویر سے وہ بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکال سکتا ہے کہ وہ سایہ ہیں اس دل کشا حقیقت کا جو اسے ایک آنے والی زندگی میں نظر آئے گی۔کبھی کبھی خواب میں اسے ان گزرے ہوئے لوگوں کی صورتیں بھی نظر آجاتی ہیں جن میں سے زندگی کی حالت میں کوئی اس کا دوست رہ چکا ہے اور کوئی دشمن۔ظاہر ہے کہ عالم خواب کے ان مظاہر کو وہ روح کے وجود و بقا کی حجتِ قاطع سمجھتا ہے۔خود ہم بھی جن کی تہذیب وتمدن کا آفتاب نصف النہار پر ہے، اس قسم کے واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور جو نتائج ہمارے غیر مہذب آباؤ اجداد نے ان سے اخذ کیے تھے، وہی ہم بھی نکالتے ہیں۔ہماری اعلیٰ درجہ کی تہذیب وشائستگی جس طرح ہمیں کمزوریوں اور بیماریوں سے نہیں بچاسکتی، اسی طرح مقتضیاتِ فطرت کی قید سے بھی نہیں آزاد کرسکتی۔ان اعتبارات سے روئے زمین کے کل انسان مساوی الحیثیت ہیں۔ہم خواہ وحشی ہوں یا خواہ تہذیب یافتہ لیکن اس سے ہم کو کسی طرح مفر نہیں کہ ہماری فطرت فنا اور بقا کی ان حقیقتوں کو جن سے زیادہ مہتمم بالشان اور قلب کو مرعوب کرنے والی حقیقت اور کوئی نہیں ہوسکتی، ایک نہ ایک وقت ہمارے سامنے پیش کر کے

رہتی ہے اور یہ موقع اس وقت آتا ہے جب ہم انفراغ یا بیماری کی حالت میں ہوتے ہیں۔اس موقع پر ہماری فطرت اپنا پورا عمل کرتی ہے اور ہم بھی اس وقت اس کی حقائق آموزیوں سے متنبہ ہونے کے لیے پوری طرح تیار ہوتے ہیں۔اس فطرت کا عمل سب پر یکساں ہوتا ہے۔اس کے نزدیک غریب، امیر، جاہل، عالم سب برابر ہیں۔مغرور سے مغرور اور متکبر سے متکبر شخص اس کی سرزنش اور نصیحت سے نہیں بچ سکتا اور مسکین سے مسکین اور عاجز سے عاجز شخص کو بھی حقیقت عقبیٰ کی معرفت کی تسکین سے یہ محروم نہیں رکھتی۔اس پر کسی کی سازش یا خود غرضی کا جادو نہیں چلتا۔ انسانی کوشش کی خارجی تائید کی اس کے نہ ٹلنے والے اثر کو پروا نہیں۔ ہر انسان کے ساتھ خواہ وہ کہیں بھی کیوں نہ جائے، یہ برابر سایہ کی طرح لگی رہتی ہے۔گزشتہ تصورات کے آثار و باقیات سے حیرت انگیز صفائی کے ساتھ عالم عقبیٰ کی آنے والی حقیقتوں کی ناممکن التردید شہادتوں کا استخراج اس کا کام ہے۔ یہ اس سرچشمہ سے سیراب ہوتی ہے جو ظاہر بین نگاہوں کو خشک نظر آتا ہے اور ان وہمی و خیالی شبیہوں سے جو ظاہر ہوتے ہی غائب ہو جاتی ہیں، ہمارے صورت کدۂ ایقان کے لیے ان لعبتوں کو تیار کرتی ہے جو فنا و زوال کی رہن منت نہیں ہیں۔''

انسان کی اس روحانی خواہش نے جو معرفت کی پہلی سیڑھی ہے، اوّل اوّل جبکہ انسان پر ابھی تمدن کا سایہ نہ پڑا تھا اور وہ وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا اور ارواح پرستی، جماد پرستی، بت پرستی اور فطرت پرستی کی شکل اختیار کی۔ جب انسان نے ہوش سنبھالا اور فہم و شعور نے اس کی بصیرت کا دریچہ آہستہ آہستہ کھولنا شروع کیا تو ہوا، آگ، پانی، درخت، پتھر، چاند، سورج کے بجائے جن میں اسے پہلے شانِ خدا نظر آتی تھی، اب ایک اَن دیکھی اور اَن بوجھی قوت کا تصور پیدا ہونے لگا جس کے جلال و جبروت کے مقابلہ میں یہ تمام دنیا ایک جزو لایتجزی ہے۔ یہ تصور جن انسانوں کے دل میں پیدا ہوا، ان کا شمار ان خاص خاص برگزیدہ لوگوں میں تھا جنہیں قدرت افرادِ انسانی کے لیے اپنے اپنے عہد کی روحانیت کا نمونہ بناتی چلی آئی ہے۔ یہ لوگ اپنے اپنے زمانہ کے اخلاق و روحانیت کا نچوڑ تھے اور ان حقیقتوں کے ترجمان تھے جو انہیں گزشتہ نسلوں سے ترکہ کے طور پر ملی تھیں۔تاریخ کی روشنی میں ہمیں ایسے بے تعداد ہادیانِ مامور من اللہ کی صورتیں نظر آتی ہیں، زردشت، کنفیوشیس، بدھ، ابراہیم،، موسیٰ، عیسیٰ اور اسی حیثیت کے دوسرے ملہم من اللہ بزرگ قوموں کی نجات اور منشاء فطرت کی تکمیل کا ذریعہ ہوتے رہے ہیں۔ان بزرگوں نے اپنے

اپنے زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے روحانیت کے سلسلہ ارتقا کو جاری رکھا اور اپنی اپنی امتوں کو یزداں شناسی کی طرف مائل کیا۔لیکن جس طرح تمام موجودات ذہنی و خارجی ایک حالت سافل سے ترقی کرتی ہوئی بتدریج مقامات عالیہ کی طرف صعود کرتی ہے اورنشو ونما کے مختلف مدارج طے کرنے کے بعد اس منتہائے بلوغ پر پہنچ جاتی ہے جس کے بعد مزید ترقی کی گنجائش نہیں رہتی۔چنانچہ انسان ہی کو دیکھو جو حجری، شجری اور حیوانی مقامات میں سے گزر کر انسانی درجہ میں جا پہنچا ہے اور اب اپنے جوارح واعضا اور ظاہری صورت کے لحاظ سے مزید ارتقا کی ضرورت سے مستغنی ہو گیا ہے۔اسی طرح مذہب کی ترقی بھی خاص حدود سے حسب منشاء فطرت متجاوز نہ ہوسکتی تھی۔آدم کا دین حنیف جو علم الاسما کی ابجد خوانی کرتا ہوا بنی آدم میں شائع ہوا، قرنہا قرن تک کبھی بدھ کی نروان کی بھٹی میں پوتر ہوتا اور کبھی طور سینا کی چوٹی کے ربّانی نور کی موجوں میں غوطہ کھاتا ہوا بالآخر مسیح ابن مریم کو ترکہ میں ملا جس نے اخلاق، روحانیت اور معرفت کا یہ صدیوں کا چھتّا ہوا عصارہ انجیل کے آسمانی گلاس میں ڈال کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔لیکن پانسو ستر سال تک پیالہ قلتین بنے رہنے سے ان میں طرح طرح کی کدورتیں شامل ہوگئیں اور نفاست پسند طبیعتوں کو اس لائے درد آمیز کا پینا گراں گزرنے لگا۔آخر مکّہ کے ایک ساقی نے اسے خالص وحدانیت کی صافی میں چھان کر **اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ** کے قرابے میں بھرا اور اب یہ جام تا قیام عالم گردش میں رہے گا۔

(پنجاب ریویو (کرم آباد) اگست 1910ء)

احمد کون ہے؟

حضور سرورِ کون ومکاں ﷺ یا مرزائے قادیاں

قادیاں اور لاہور کے گروہوں میں جنہیں عرفِ عام اندلسی اور دمشقی یعنی کمالی اور محمودی کا لقبِ امتیازی دے چکا ہے، بڑی وجہ افتراق ظاہر ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی شانِ مامور من اللّٰہی کی نوعیت کی تعیین ہے۔ مرزا بشیرالدین محمود اپنے والدِ کو نبی برحق مانتے ہیں اور دوسروں سے بھی منوانا چاہتے ہیں کہ اس نبی پر ایمان نہ لانا منکر کو مستوجبِ خسراں و خذلان قرار دے گا اور اس بدنصیب کی نجات کبھی نہ ہوسکے گی۔ بخلاف اس کے خواجہ کمال الدین اور اُن کے ہم عقیدہ مرزا غلام احمد قادیانی کو ایک ظلّی اور بروزی نبی مانتے ہیں اور اگرچہ حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت فاروقِ اعظمؓ، حضرت عثمان ذی النورینؓ اور حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ کو موصوف سے کمتر درجہ عنایت کرتے ہیں لیکن پھر بھی غالباً اُن کا یہ خیال نہیں ہے کہ جو شخص صرف محمد مصطفٰی ﷺ کی نبوت پر ایمان لائے اور مرزا قادیانی کا معتقد نہ ہو، اُس کے لیے دارالبوار کے سوا اور کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔

مرزا قادیانی کی نبوت کی تشریعیت یا بروزیت کی یہ بحث قادیاں اور لاہور کے ان بڑے مقتدر گروہوں ہی کو مبارک ہو۔ ہم پرانے عقیدہ کے دقیانوسی مسلمان تو یہی سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ خاتم النبین ہیں۔ دینِ اسلام کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کامل و مکمل کرتے گئے اور خدائے قدوس کے حی و قیوم کلام (قرآن مجید و فرقان حمید) کو اپنی نبوّت بالغہ و کاملہ کی ابدی نشانی اپنے پیچھے چھوڑ کر دل اور دماغ اور آنکھ رکھنے والے مسلمان کو کسی (نئے) نبی کی طرف سے مستغنی کرتے گئے۔ اس لیے کہ جیتا جاگتا اور زندہ و توانا مجدد ہم میں خود کلام اللہ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جن کا درجہ مقامِ الوہیت سے صرف دوسرے درجہ پر ہے، ہم کسی انسان کے مقابلے میں ظلاً یا بروزاً لاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔

با خدا دیوانہ باش و با محمد ﷺ ہوشیار

تشریعیت اور بروزیت کی بحث نے اپنے منطقی اثرات کے لزومِ قاطع کے لحاظ سے اب ایک نئی شکل اختیار کی ہے یعنی مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے والد کے ملفوظات کے حوالہ سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ سورۃ الصّف میں ''**مبشراً برسولِ یاتی من بعدی اسمہٗ احمد**'' (الصّف:6) کی بشارت کے مصداق حضور سرورِ کائنات ﷺ نہیں ہیں بلکہ خود آپ کے والد ہیں۔ اس دعویٰ کی توضیح آپ نے یہ کہہ کر فرمائی ہے کہ بلحاظ نام کے تو یہ پیشگوئی مرزا غلام احمد قادیانی پر چسپاں ہوتی ہے اور باعتبارِ صفت بھی اس کے موضوع وہی ہیں گو صفتِ احمدیت کے اولیں مظہر حضور سرورِ کائنات ﷺ ہی کیوں نہ ہوں۔

اس دعوے کو مولوی محمد علی لاہوری نے جو مرزا محمود کی جماعتِ مخالف کے ایک سربرآوردہ رکن ہیں، ''احمد مجتبیٰ ﷺ کا انکار'' خیال کیا ہے اور اس کی تردید میں ایک مضمون بھی لکھا ہے جس کی نسبت فریق ثانی کو الفاظ کی تلخی اور لہجہ کی درشتی کی شکایت ہے۔ اس تُو تُو مَیں مَیں کا نتیجہ اس وقت تک صرف اس قدر مترتب ہوا ہے کہ مرزا محمود نے اعلان فرمایا ہے کہ اگر مولوی محمد علی لاہوری قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت کر دیں کہ

(الف) ''احمد، رسول کریم ﷺ کا نام تھا نہ کہ صفت

(ب) جو نشانات قرآنِ کریم میں احمدِ موعود کے آئے ہیں، وہ رسول کریم ﷺ پر چسپاں ہوتے ہیں۔''

تو آپ پانچ سو روپیہ بطورِ تاوان اُنہیں دینے کے لیے تیار ہیں۔

چونکہ مرزا بشیر الدین محمود کے دعویٰ کی تحدّی صرف مولوی محمد علی لاہوری ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ ہم مسلمانوں کی طرف بھی اس باب میں آپ کا روئے سخن ہے، اس لیے مختصراً چند جملے میں بھی عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ پوری آیت زیر بحث کے الفاظ حسبِ ذیل ہیں:

❑ **و اذ قال عیسیٰ ابن مریم یٰبنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقا لما بین یدی من التوراۃ و مبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد فلما جاء ھم بالبینٰت قالوا ھذا سحر مبینo** (الصّف:6)

ترجمہ: اور یاد کرو جب فرمایا عیسیٰ ابن مریم نے اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں۔ میں تصدیق کرنے والا ہوں تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہے اور

خوشخبری دینے والا ہوں ایک رسول کی جو تشریف لائے گا میرے بعد، اُس کا نام (نامی) احمد ہوگا۔ پس جب وہ (احمد) آیا اُن کے پاس روشن نشانیاں لے کر تو انہوں نے کہا یہ تو کھلا جادو ہے۔

مرزا محمود اگر غور فرمائیں تو اُن کا جواب خود اس آیت کریمہ کے الفاظ میں موجود ہے۔

(الف) آپ کہتے ہیں کہ ''احمد'' حضور سرورِ کائنات ﷺ کا نام نہ تھا صفت تھی لیکن قرآن کہتا ہے کہ ''**اسمهٔ احمد**'' (اُس کا ذاتی نام احمد ہے) یہ نہیں کہتا کہ اس کی صفت احمد ہے۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ عربی ادب یا عربی صرف ونحو سے مجھے قائل فرما سکیں کہ ''اسمِ ذات'' کے معنی ''صفت'' بھی ہوا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے والد کا نام ''غلام احمد'' تھا ''احمد'' نہ تھا۔ اگر قرآن کی بشارت مرزا غلام احمد سے متعلق ہوتی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اللہ میاں کو ''**یاتی من بعدی اسمهٔ غلام احمد**'' لکھ دینے میں کیا تکلف تھا؟

(ب) قرآن مجید میں لفظ ''احمد'' صرف ایک جگہ اسی آیت میں آیا ہے۔ ایسی حالت میں، میں نے اگر قرآن کریم کے اُن نشانات کو بالتفصیل درج کیا جو رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرتے ہیں یعنی دوسرے لفظوں میں قرآن مجید کا ایک نیا ایڈیشن لاہور کے کسی مطبع سے چھپوا کر آپ کی خدمت میں بھیج دیا تو آپ فرمائیں گے کہ یہ نشانات تو محمد ﷺ پر منطبق ہوتے ہیں، احمد سے ان کا واسطہ نہیں۔ اس لیے میں اول تو اسی آیت کے الفاظ ''**فلما جاء هم بالبينٰت قالوا هذا سحر مبين**'' کی طرف آپ کو توجہ دلاتا ہوں جن میں ارشاد ہوا ہے کہ جب احمد روشن نشانیوں کے ساتھ آیا تو منکروں نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے اور اس کے بعد آیت ''**هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دين الحق ليظهرهٔ علی الدين كله و لو كره المشركون**'' کی طرف آپ کو متوجہ کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جو پہلی آیت کے شارح ہونے کے لحاظ سے احمد کے نشانات کا اظہار اس طرح کرتی ہے کہ خدا نے اپنے اس رسول (احمد ﷺ) کو راہِ ہدایت دکھانے اور دینِ حق کے پھیلانے کے لیے بھیجا تا کہ وہ تمام ادیان پر غالب آجائے خواہ مشرکوں کو بُرا ہی کیوں نہ لگے۔

اب ارشاد ہو کہ یہ علامتیں رسول اللہ ﷺ کی ہیں یا مرزا غلام احمد قادیانی کی؟

رسول اللہ ﷺ اسلام کے علمبردار بن کر تشریف لائے اور دیکھتے دیکھتے یہ جھنڈا عرب، ایران، شام، مصر میں لہرانے لگا اور اس کے بعد دنیائے معلومہ کے بڑے حصہ میں

باوجود ادیانِ مخالف کی مزاحمت کے، اسلام پھیل گیا۔ پھر کیا اس احمدیت کے مصداق حضرت محمد ﷺ ہیں یا غلام احمد؟

رسول اللہ ﷺ نے جب اشاعتِ اسلام فرمائی تو جہاں آپ پر کفار کی طرف سے دوسرے آوازے کسے گئے، وہاں آپ کو جادوگر بھی کہا گیا۔ (نعوذ باللہ) یہ خطاب ''احمدیت'' کی دوسری علامت تھا۔ جیسا کہ آیتِ قرآنی بتا رہی ہے۔ کیا مرزا غلام احمد کو بھی کبھی جادوگر کہا گیا؟ میں نے مولوی ثناء اللہ صاحب کی تحریرات بھی دیکھیں جن کی زندگی کا بڑا حصہ اس کام کے لیے وقف ہے۔ سید جماعت علی شاہ صاحب کے خیالات سے بھی واقف ہوں۔ قادیان کے عقائد سے بیزاری کا اظہار کرنے والے اور بھی بہت سے علما سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن کسی کی زبانی میں نے نہ سنا کہ مرزا غلام احمد کو ''سحر مبین'' میں بھی دخل تھا۔ پس اگر قرآن ہی اس بحث میں حکم بن سکتا ہے تو ''**اسمهٔ احمد**'' والی بشارت کے مصداق صرف حضور سرورِ کائنات ﷺ ہیں۔

(2) جو کچھ اوپر لکھا جا چکا ہے، اس سے از روئے قرآن ثابت ہے کہ ''اسمہٗ احمد'' والی پیشگوئی کے مصداق حضور سرورِ کائنات اور صرف حضور سرورِ کائنات ﷺ ہیں۔ مرزا محمود کی تحدی کے دو اجزاء کی تنقید کرتے ہوئے میں ثابت کر چکا ہوں کہ

(الف) احمد، رسول کریم ﷺ کا نام تھا نہ کہ صفت

(ب) جو نشانات قرآن کریم میں احمدِ موعود کے آئے ہیں، وہ رسولِ کریم ﷺ پر چسپاں ہوتے ہیں لیکن روزنامہ ''الفضل'' کی اشاعت 2 اور 5 دسمبر 1916ء کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ آپ اپنے حریف مولوی محمد علی لاہوری کو اُس وقت تک پانچ سو روپیہ مرحمت فرمانے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک کہ وہ آپ کی تحدی کے جزوِ ثالث سے بھی بحسن الوجہ عہدہ برآ نہ ہو سکیں۔

تحدی کا جزو ثالث یہ ہے کہ اس بات کو احادیثِ صحیحہ سے ثابت کر دیا جائے کہ

(ج) رسول اللہ ﷺ نے یہ پیشگوئی اپنے اوپر چسپاں فرمائی ہے۔

اگرچہ ایسی حالت میں کہ خود قرآن مجید نہایت صاف اور روشن الفاظ میں بتا رہا ہو کہ احمد سے مراد صرف حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہی ہیں۔ اس بشارت مبینہ کی تصدیق کے لیے کسی حدیث سے ثبوت طلب کرنا صرف مرزا بشیر الدین محمود ہی کا حصہ ہو سکتا ہے جو کلام اللہ میں سے ایک آیت (کی آیت) نکال کر اُسے اپنے والد کے سر پر چسپ کیے دیتے ہیں لیکن اس خیال سے

کہ مبادا وہ یہ سمجھیں کہ فریق ثانی صرف قرآن ہی سے استدلال کرسکتا ہے، حدیث میں درخور نہیں رکھتا یا کوئی صحیح حدیث ہی اس بارے میں موجود نہیں ہے۔ یہ چند سطور مجھے پھر قلمبند کرنی پڑیں۔

حضرت امام مالکؒ کے اسم گرامی سے ہمارے مرزا محمود ناواقف نہ ہوں گے اور امام صاحب کے محدثانہ فضائل کا بھی آپ کو علم ہوگا۔ امام صاحب کی معرکۃ الآرا تالیف موطا بھی قادیاں کے کتب خانہ میں موجود ہوگی اور بیٹے کو ترکہ میں ضرور موطا کا وہ نسخہ بھی پہنچا ہوگا جو بروایت یحییٰ بن یحییٰ تمیمی مرتب ہوکر دنیائے اسلام میں نظرافروز علمائے فن حدیث ہوا ہے۔ مرزا محمود اس نسخہ کا آخری باب ملاحظہ فرمائیں۔ جس کا موضوع اسماء حضورِ سرورِ کائنات ﷺ ہے۔ اس میں یہ حدیث آپ کی نظر سے گزرے گی:

مالک عن شهاب عن محمد بن جبير بن مطعم ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لى خمسة اسماء انا محمد و احمد و انا الماحى الذى يمحو الله بى الكفر و انا الحاشر الذى يحشر الناس على قدمى و انا العاقب، والعاقب الذى ليس بعده شىء (متفق علیہ)

(یعنی مالکؒ شہاب سے اور شہابؒ محمد بن جبیر بن مطعمؒ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور رسول مقبول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے پانچ نام ہیں۔ میں محمد اور احمد ہوں۔ میں الماحی (مٹانے والا) ہوں کہ میرے ذریعے سے اللہ کفر کو مٹائے گا۔ میں الحاشر (جمع کرنے والا) ہوں کہ (روز قیامت) تمام لوگ میرے قدموں میں جمع ہوں گے اور میں العاقب (آخری نبی) ہوں اور عاقب اُسے کہتے ہیں جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔

اس حدیث نے تو بحث کا خاتمہ ہی کردیا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ مرزا محمود اپنے کسی خانہ ساز اصولِ تنقید سے اس کی تضعیف فرمادیں۔ اس وقت کے لیے میں چشم براہ ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ مرزا محمود اس میں کیا مین میکھ نکالتے ہیں۔

(3) اس وقت ''الفضل'' کا سینتالیسواں صحیفہ جو قادیاں کے آسمان سے **16** دسمبر **1916**ء کو نازل ہوا، میرے سامنے ہے۔ اس خیال سے کہ ''اسمہٗ احمد'' والی بشارت کے متعلق کلام مجید اور موطائے امام مالکؒ سے جو معقولی اور منقولی دلائل میں پیش کرچکا ہوں، اُن کی یا تو کوئی معقول تردید کی گئی ہوگی یا اگر انصاف کوئی چیز ہے تو اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کردیا گیا ہوگا۔ میں نے مرزا

بشیر الدین محمود کے ''مقدس صحیفہ'' پر بار بار نگاہ تفحص ڈالی لیکن ''انوارِ خلافت'' کے تحدی آمیز اشتہار کے سوا اور کچھ دیکھنے میں نہ آیا جس میں ممدوح کے انوکھے دعویٰ کا اعادہ اس طرح کیا گیا ہے:

''حضرت خلیفۃ المسیح ثانی نے گزشتہ سالانہ جلسہ پر اسمہٗ احمد کے متعلق جو تقریر فرمائی تھی، وہ حضور کی دوسری تقریروں کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئی ہے۔ اس تقریر میں تمام دنیا کے عالموں اور فاضلوں کو چیلنج دیا گیا ہے۔ اس میں حضرت مسیح موعودؑ کا نام احمد ہونے کے متعلق بڑے زبردست دلائل دیے گئے ہیں جن کا توڑنا ناممکن ہے۔''

یہ تو بعید از قیاس ہے کہ جو کچھ میں نے اس موضوع پر لکھا ہے، وہ مرزا صاحب کے ملاحظہ سے نہ گزرا ہو، اس لیے کہ ''ستارۂ صبح'' ہر ہفتے آپ کی خدمت میں بلاناغہ حاضر ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ میرے پیش نمودہ دلائل پر اعتنا کرنے سے آپ کو اس خیال نے باز رکھا ہو کہ اگر دلائل مذکورہ کی تردید نہ ہوسکی تو کہیں پانچ سو روپیہ گرہ سے نہ جائیں۔ اس لیے مجھے خیال ہوتا ہے کہ مرزا محمود غالباً قادیاں کے منارۂ شریف سے روح القدس کے نزول کے منتظر ہیں تاکہ لاہوتی تجلیات سے ضیاء اندوز ہونے کے بعد کوئی روشن حُجّت میری تشفی کے لیے پیش فرما سکیں۔ چونکہ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے دلائل کی تنقید کب ہوگی۔ اس لیے یاددہانی کے طور پر میں ایک اور حدیث نبوی ﷺ جو مسلم میں حضرت ابوموسیٰؓ سے مروی ہے۔ مرزا محمود کے تدبّر کے لیے نقل کیے دیتا ہوں:

- **انا محمد و احمد و المقفی و الحاشر و نبی التوبة و نبی المرحمة**

یعنی حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں محمد ہوں اور احمد ہوں اور مقفی ہوں اور حاشر ہوں اور نبی التوبہ ہوں اور نبی المرحمۃ ہوں۔

اس حدیث شریف میں حضور سرور کائنات ﷺ نے اپنے جو اسمائے مبارک گنائے ہیں، اُن میں سے مقفی کے معنی خاتم الانبیا کے ہیں یعنی سب پیغمبروں کے آخر میں آنے والا۔ حاشر سے مراد ہے کہ سب کا حشر آپ کے قدم پر ہوگا۔ نبی التوبہ سے عبارت ہے وہ نبی جس کے ہاتھ پر بے شمار لوگوں نے توبہ کی اور جس کی امت کی توبہ مقبول ہے۔ نبی المرحمۃ سے مراد وہ پیغمبر رحمۃ للعالمین ہے جس کی شرع کے احکام میں کسی قسم کی سختی نہیں اور محمد کے معنی تو ظاہر ہی ہیں کہ ''بہت زیادہ تعریف کیا گیا'' کے ہیں۔

لیکن مرزا محمود اور آپ کے ہم عقیدہ لوگوں کے لیے سب سے زیادہ غور کے قابل لفظ احمد کے معنی ہیں۔ فارقلیط اور اس کے معانی کی بحث میں، میں سر دست نہیں پڑتا۔ مرزا محمود سے صرف اسی قدر پوچھا جاتا ہے کہ کیا احمد کے معنی ''سب مخلوقات سے زیادہ تعریف کے لائق'' نہیں ہیں؟ اگر یہی معنی ہیں تو اس کے مصداق احمد ﷺ مدنی ہو سکتے ہیں یا اُن کے والد غلام احمد قادیانی؟ فافہم وتدبّر!

(4) میں نے ''ستارہ صبح'' میں مرزا بشیر الدین محمود کی صلائے عام کے لحاظ سے ''اسمہٗ احمد'' کی بشارت کا مصداق حضور سرور کائنات ﷺ کو ثابت کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے کیا استدلال کیا، بہت سے غیر متعلق مباحث کا دروازہ بھی کھول دیا کہ قادیاں شریف کی منطق کا قصر رفیع و منیع ایسے بہت سے فراخ پھاٹکوں سے آراستہ ہے۔ اس بحث میں میرا روئے سخن خاص مرزا محمود کی جانب تھا۔ میں نے آپ سے بہ کمال ادب و متانت یہ عرض کیا تھا کہ قرآن شریف میں جو نص صریح وارد ہے، اُس کے الفاظ و معانی سے کسی طرح یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ اس آیت کا موضوع جناب کے والد ہیں۔ پھر یہ گزارش کی تھی کہ اگر قرآن شریف کے الفاظ میں تاویل کی کوئی گنجائش بھی باقی رہ گئی ہو تو خود حضور سرورِ کائنات ﷺ کا یہ ارشادِ اقدس کہ احمد آپ ہی کا اسم مبارک ہے، اس بحث کو صاف کیے دیتا ہے۔ اس ضمن میں، میں نے موطا اور مسلم سے دو صحیح احادیث بھی اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کی تھیں اور مجھے انتظار تھا کہ مرزا محمود میری گزارشات کے جواب میں اس بات کو ثابت کر دیں گے کہ

(الف) ''اسمہٗ احمد'' میں ''اسم'' کے معنی ''صفت'' کے ہیں۔

(ب) جو احادیث قولی میں نے پیش کی ہیں، وہ اسناداً مشتبہ الروایت یا وصفی ہیں۔

اور یا اپنے دعوے سے دست بردار ہو کر اس امر کا ثبوت دیں گے کہ انصاف قادیاں شریف سے بالکل ہی اُٹھ نہیں گیا ہے۔

میں قادیاں سے جواب کا انتظار کر رہا تھا کہ لاہور سے ''پیغام صلح'' کا پرچہ مورخہ 17 دسمبر 1916ء میرے نام آیا۔ شاید صلح کا پیغام ایسا ہی ہوتا ہو، میرے حق میں تو یہ اچھا خاصا پیغام جنگ تھا۔ میں حیران تھا کہ مخاطب تو میں مرزا بشیر الدین محمود سے ہوں اور جواب مجھے مل رہا جناب خواجہ کمال الدین کی جماعت کی طرف سے کہ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو میں نے بھی

''**اسمۂ احمد**'' کی تفسیر میں وہی پہلو اختیار کیا ہے جو آج کل اس جماعت کا مطمع نظر ہے۔ پھر ان دو لمبے لمبے کالموں کی شانِ نزول کیا ہوسکتی ہے جن میں ''**لاتنا بزوا بالالقاب**'' اور ''**لاتقف مالیس لک به علم**'' کی دو گونہ نہی کلام اللہ سے میرے حق میں مستعار لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ میں خاصان خدا پر سوقیانہ آوازے کستا ہوں اور کسی بات کی تحقیق کیے بغیر اناپ شناپ جو جی میں آتا ہے، لکھ مارتا ہوں لیکن اس نگارخانہ حیرت میں جس کو دنیائے قادیاں کہتے ہیں، عام اس سے کہ اس دنیا کے باشندے اپنی اصطلاحات مقدسہ کے اعتبار سے دارالخلافہ دمشق (قادیاں) کے رہنے والے ہوں یا دارالسلطنت اندلس (لاہور) کے ساکن ہوں، بہت سے عجائبات ایسے ہیں جنہیں بقول شیکسپیئر ہمارا فلسفہ خواب میں بھی نہیں دیکھ سکا۔

غیر متعلق بحثوں میں پڑ کر میں اپنا اور اپنے ناظرین کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا اور جناب ایڈیٹر صاحب ''پیغام صلح'' نے جو کچھ اپنے صحیفۂ گرامی میں ارشاد فرمایا ہے، اُس پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر مفت کا جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا صرف ایک دفعہ اور شاید آخری دفعہ بنجیالِ تفنن طبع اُس منطق کی ایک جھلک ناظرین کو دکھاتا ہوں جو ''پیغام صلح'' نے استعمال کی ہے۔

''پیغام صلح'' کو شکوہ ہے کہ اُس اختلاف عظیم کا ذکر کرتے ہوئے جس نے مرزا قادیانی کی امت کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے، عرفِ عام کے تتبع میں، میں نے اُس گروہ کو کمالی کیوں کہا جس کا نمائندہ ''پیغام صلح'' ہے۔ لیکن اگر ''کمالی'' کا لقبِ امتیازی کوئی گالی ہے تو

ایں گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند

''پیغام صلح'' کی اشاعت زیرِ نظر کے تیسرے صفحہ کے پہلے کالم کے نیچے آپ نے مرزا غلام احمد قادیانی کی امت کی اُس بڑی شاخ کو جو مرزا محمود کی خلافت کی قائل ہے اور اپنے آپ کو ''احمدی'' کہتی ہے ''محمودی'' کے نام سے یاد کیا ہے جو عرفِ عام کا کھلا ہوا تتبع ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ ''دمشق والے بھی احمدی ہوں اور ''اندلس'' والے بھی احمدی ہی کے لقب کو اپنے لیے تجویز کرتے ہوں تو عرف عام کے لیے علامت امتیاز بجز اس کے اور کیا باقی رہ جاتی ہے کہ اس بٹی ہوئی خلافت کو اُس کے مدعیوں کے نام ہی سے نسبت دے کر خلطِ مبحث سے محفوظ رہے۔ باقی رہا یہ امر کہ آپ کا گروہ طائفۂ حقّہ ہے اور اس کو ''کمالی'' کہتے ہی قائل پر ''**لاتنابزوا بالالقاب**'' کا آسمانی تازیانہ برس جاتا ہے۔ سو بہتر یہ ہوگا کہ آپ اول مرزا محمود سے اس بحث کا

تصفیہ کرلیں کہ آپ کا طائفہ ''حقّہ'' ہے یا اُن کا۔

اسی اشاعت میں ''پیغام صلح'' نے اپنے عرفِ عام کے تتبع میں ہم مسلمانوں سے ہمارا سیزدہ صد سالہ پُرغرور لقب ''مسلم'' چھین کر ہمیں ''غیر احمدی'' لکھا ہے حالانکہ کسی زمانہ میں بھی کسی مسلمان نے اپنے لیے یہ نام تجویز نہیں کیا۔ کیا میں خواجہ کمال الدین کی جماعت سے اس عنایت کی توقع رکھ سکتا ہوں کہ وہ آئندہ ہمیں مسلمان کے نام سے یاد کیا کرے، ''غیر احمدی'' نہ لکھا کرے۔ احمد سے مراد اگر حضور سرورِ کائنات ﷺ ہیں اور ی نسبت کی ہے تو پھر ہم کو ''غیر احمدی'' قرار دینا یعنی چہ؟ اس لیے آپ ''احمدی'' ہی کہلانا پسند کرتے ہیں تو براہ کرم ہمیں تو ''غیر احمدی'' نہ لکھا کیجیے۔

''پیغام صلح'' باوجودیکہ میرا روئے سخن اُس کی طرف نہ تھا، مجھ پر ''سبزہ خودرو'' کی پھبتی اُڑاتے ہوئے چیں بہ جبیں ہے کہ کیوں میں نے عامی و جاہل ہو کر دو ایک آیات کی تفسیر کی جرأت کی۔ اس گرہ کی کشایش کے لیے تو ''طائفہ حقّہ'' ہی کے نکتہ اندوز ناخن مخصوص ہو چکے ہیں۔ لفظ ''کمالی'' کے استعمال پر **لاتنابزوا بالالقاب** کی آسمانی ڈانٹ بتا کر معاصرِ ممدوح نے نہی عن المنکر کی خدمت میرے حق میں انجام دینا بھی اُس قدرت کا کرشمہ خاص تصور کیا ہے جو اُسے ''طائفہ حقّہ'' کے دوسرے مقدس مطوفین کی طرح تدبر فی القرآن میں حاصل ہے۔ اگرچہ معاصر موصوف یہ بھول گیا کہ اس قسم کی زجر و توبیخ کرنے والے دوسروں پر ''سبزہ خودرو'' کا آوازہ کس کر اُن سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ ان ادب ناآشنا کمالیوں کے لیے ''قادیاں کے بند پانی کی کائی'' کا خطاب تجویز کرنے میں کوئی قباحت سمجھیں گے۔ بہرحال **لم تقولون مالا تفعلون** کا حوالہ دے کر **تخلقوا باخلاق اللّٰہ** کے ان سبق آموزوں سے میں یہ دریافت کرنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ چند ہی سطر کے بعد آپ نے جو بیچارے مفتی صادق قادیانی کی فراست کے لیے محض اختلاف رائے کی پاداش میں ''شیطان داد'' کی ابلیسی صفت تجویز کی ہے اور اس غریب پر تین حرف بھی بھیجے ہیں، یہ کون سا خدائی اور کہاں کا مصطفائی اخلاق ہے۔

یہ قادیان و لاہور کی خاص منطق ہے اور اس کے محیر العقول ضغطہ میں پڑ کر انسان پر وہ عجیب و غریب حالت طاری ہو جاتی ہے جس میں وہ نہیں جانتا کہ ہنسے یا جھنجلائے۔ اگر اردو زبان عبرانی یا لاطینی نہیں ہے، اگر الفاظ معانی سے بالکل عاری نہیں ہو گئے ہیں تو میں تو قادیاں اور

لاہور کا بڑا فرق آج تک صرف یہی سمجھتا رہا ہوں اور مجھ پر کیا موقوف ہے ہر ایک شخص نے مرزا قادیانی کے معتقدین کی ان دونوں جماعتوں میں بڑی وجہِ افتراق یہی سمجھی ہے کہ قادیاں والے اپنے پیشوا کو مستقل اور حقیقی نبی سمجھتے ہیں اور لاہوری گروہ اُن کی نبوت کو بتفاوت الفاظ مجازی یا ظلّی یا بروزی خیال کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ میں نے اور عام مسلمانوں نے ایسا سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ لیکن یہ غلطی ایسی ہے جس میں لاہور کی احمدیہ انجمن اشاعت اسلام بھی برابر کی شریک ہے کہ بحوائے ''**صاحب البیت ادری بما فیه**'' اُس سے بڑھ کر قادیانی عقائد کے اسرار وخفایا کی حقیقت اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس انجمن کے گزشتہ اجلاس مورخہ **26** دسمبر **1916**ء میں مولوی احسن امروہی نے جو مرزا قادیانی کے ایک فرشتے بتائے جاتے ہیں اور ''دمشق'' سے ہجرت کر کے ''اندلس'' تشریف لے آئے ہیں یعنی مرزا محمود احمد صاحب سے گسیختہ ہو کر خواجہ کمال الدین کی جماعت میں پیوست ہو گئے ہیں، اپنے عقائد کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

''قادیاں کی احمدی جماعت کا یہ دعویٰ کہ حضرت مسیح موعود حقیقی اور اصلی نبی ہیں صحیح نہیں۔''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ میں نے قادیاں سے وہی عقائد منسوب کیے ہیں جو خود لاہوری جماعت اُس سے منسوب کرتی ہے۔ رہے لاہوری جماعت کے عقائد۔ سو اُس کا فیصلہ خود مرزا قادیانی کا یہ قول کیے دیتا ہے کہ ''**سمیت نبیا من اللّٰہ علی طریق المجاز لاعلیٰ وجه الحقیقة**''یعنی اللہ تعالیٰ نے میرا نام مجازی نبی رکھا ہے حقیقی نبی نہیں رکھا۔

(ضمیمہ حقیقۃ الوحی الاستفتاء ص **65** مندرجہ روحانی خزائن جلد **22**،ص **689** از مرزا قادیانی)

اس تشریح کے بعد میں حیران ہوں کہ معاصر ''پیغام صلح'' کی تحریر کے اضداد و نواقض پر کن الفاظ میں نقد و جرح کروں۔ معلوم ہوتا ہے کہ **لاتقف مالیس لک به علم** کے اقتباس کرنے والے بھی اپنے اور اپنے حریفوں کے صحیح عقائد کا علم نہیں رکھتے۔ فاضل امروہی کہتے ہیں کہ اہل قادیاں مرزا قادیانی کو حقیقی نبی سمجھتے ہیں۔ فاضل مدیر ''پیغام صلح'' کا ارشاد ہے کہ بجز مرزا بشیر الدین محمود کے مبایعین کے مرزا قادیانی کو اُن کی جماعت کا کوئی فرد ظلی و بروزی نبی نہیں سمجھتا۔ مرزا قادیانی کا دعویٰ ہے کہ میں مجازی نبی ہوں یعنی ظلّی و بروزی۔ ان میں سے کوئی کس کو سچا سمجھے اور کس کو جھوٹا؟ اور لطف یہ ہے کہ فاضل مدیر ''پیغام صلح'' ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ لاہوری جماعت مرزا قادیانی کو حضور سرورِ کائنات ﷺ کے مقابلہ میں ظلاً و بروزاً نہیں لاتی لیکن

ساتھ ہی اجتماعِ نقیضین کی شان یوں دکھاتا ہے کہ مرزا قادیانی ''ظلّی و بروزی طور پر آپ کے رنگ میں رنگین'' ہیں۔ یہ ویسی بات ہے جیسے کوئی گڑ کی نفی یہ کہہ کر کرے کہ میٹھا تو نہیں لیکن اس میں مٹھاس ضرور ہے۔ شاخِ نباتِ نبوت کی حلاوت کے ان باریک مدارج کو میں اپنے شکر خام معاصر کی خاطر سے تسلیم تو کرلوں اور اس بات کا معترف ہو جاؤں کہ مرزا قادیانی نبی نہیں ہیں بلکہ محض مجدّد ہیں لیکن اس میں مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ خود جنابِ ممدوح کا یہ صریح دعویٰ موجود ہے کہ آپ مجازی نبی تھے۔

محترم معاصر ''پیغام صلح'' کے خواہ مخواہ مجھ سے دست و گریباں ہونے کی صرف ایک وجہ میری سمجھ میں آئی ہے۔ میری جو شامت آئے ایک فقرہ میرے قلم سے یہ بھی نکل گیا کہ خواجہ کمال الدین اور اُن کے ہم عقیدہ لوگ مرزا قادیانی کو حضرت ابوبکرؓ، حضرت فاروق اعظمؓ، حضرت عثمان ذی النورین اور حضرت علی مرتضیٰ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تمام برگزیدگان امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الف الف تحیات سے افضل سمجھتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت نفس الامری ہے، اس میں بگڑنے کی کوئی بات نہ تھی۔ بجائے اس کے کہ یا تو اُسی وضع کی اخلاقی جرأت سے کام لے کر جو مرزا محمود کے حصہ میں آئی ہے، صاف صاف الفاظ میں اعتراف کرلیا جاتا کہ ہاں مرزا قادیانی یقیناً تمام اہل بیت تمام صحابہ، تابعین اور تمام تبع تابعین کے سرتاج ہیں اور یا اُسی اعتزال کے تدریجی لہجہ میں جس نے مرزا قادیانی کی نبوت کو رفتہ رفتہ مجددیت کے معمولی اعزاز میں منتقل کرا دیا، تھوڑی سی مزید تاویل سے یہ بھی کہہ دیا جاتا کہ مرزا قادیانی کا درجہ کسی صورت میں خلافت راشدہ کے برگزیدہ اراکین سے زیادہ نہیں ہے۔ آپ اس اصولی حقیقت کو تو گومگو میں رکھتے ہیں اور پینترا بدل کر مجھ سے میرے عقائد کا احتساب کرنے لگتے ہیں۔

''پیغام صلح'' نے اس قدر زیادہ جگہ لے لی کہ میں مرزا محمود کے لیے جو اس بحث میں میرے مخاطب صحیح تھے، کوئی گنجائش نہیں نکال سکتا۔

''انوارِ خلافت'' کے نسخہ کا بھی مجھے انتظار تھا جس کے متعلق مدیر جریدہ ''الفضل'' کا ایک عطوفت نامہ میرے پاس بدیں مضمون موصول ہوا ہے کہ جو براہین و دلائل ''اسمہٗ احمد'' کی بشارت کے بارے میں مرزا محمود نے مخالفین کے لیے فراہم کیے ہیں اور جن کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا، وہ سب کی سب اس میں درج ہیں۔ کیا اچھا ہوتا اگر ''انوار خلافت'' بھیجنے کے بجائے جو

ہنوز غیر موصول ہے، مجھے دولفظوں میں صرف اتنا جواب دے کر یہ جھگڑا چکا دیا جاتا کہ حضور رسالت مآب ﷺ کے جن ارشادات اقدس سے میں نے استناد کیا ہے، ان کی صحت کا جنابِ ممدوح کو اعتراف ہے یا نہیں۔ اسی ضمن میں اس امر کا اظہار خالی از لطف نہ ہوگا کہ قادیاں کے اخبار ''فاروق'' کے پرچہ سے جو ابھی موصول ہوا، معلوم ہوتا ہے کہ مرزا محمود اور اُن کی جماعت مرزا قادیانی کو ظلّی و بروزی نبی مانتی ہے، حقیقی نبی تسلیم نہیں کرتی، جیسا کہ امروہی اور لاہوری جماعت نے بیان کیا ہے۔ یہ عجب گتھی ہے جو سلجھنے ہی میں نہیں آتی ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز قادیاں کم جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

(ستارہ صبح جلد نمبر 1، شمارہ نمبر 3، 8 دسمبر 1916ء، ستارہ صبح جلد نمبر 1، شمارہ نمبر 4، 16 دسمبر 1916ء)

متنبّی قادیاں کی ناک

مرزا غلام احمد قادیانی جہاں اور بہت سے رنگارنگ ''کمالات'' کے جامع تھے، وہاں شاعر بھی تھے۔ آپ کا ایک شعر ہے:

ابنِ مریم کے ذکر کو چھوڑو
اُس سے بہتر غلام احمد ہے

اس پر جب یہ اعتراض ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام تو ایک اولوالعزم صاحب شریعت نبی ہیں جن کی بزرگی وعظمت کی گواہی قرآن مجید کی آیات دے رہی ہیں۔ ان سے مرزا غلام احمد کا مرتبہ کیونکر بڑا ہوسکتا ہے تو مرزا قادیانی کے مریدان باصفا نے جو فن تاویل میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، جواب دیا کہ مرزا قادیانی نے ''غلام احمد'' میں صفتِ ایہام ملحوظ رکھی ہے۔ شعر کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ایسی اونچی شان ہے کہ اُن کا ایک غلام بھی مسیح ابن مریم پر فوقیت لے جاتا ہے۔ شرع کی نظروں میں اگرچہ یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ اس لیے کہ امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الف الف تحیاۃ کا کوئی فرد کسی حالت میں بھی خدا کے کسی پیغمبر سے درجہ میں بڑھ نہیں سکتا۔ لیکن چونکہ اس جواب سے اسلام کی بڑائی کا ایک شاعرانہ پہلو نکلتا تھا، اس لیے کچھ دیر کے لیے مسلمان خاموش ہوگئے۔ لیکن مرزا صاحب انہیں کب خاموش بیٹھنے دیتے تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام جو تھے آسمان پر تھے، مرزا صاحب انہیں وہاں بھی نیچا دکھا کر ہی رہے۔ یعنی ایہام سے گریز کر کے تعلّی کے پانچویں آسمان پر پہنچے اور وہاں سے پکارے کہ

عیسیٰ کجا ست تا بہ نہد پا بمنبرم

مسلمانوں میں پھر ایک کھلبلی سی پڑ گئی کہ اُن کے ایک ذی شان نبی کی یوں علانیہ توہین کی جارہی ہے لیکن یہ منصور و سرمد کا زمانہ نہیں تھا بلکہ اُس کامل آزادی کا دور تھا جس میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ اگر چاہے تو نبوت کیا خدائی کا بھی مدعی ہوجائے۔

پادری آتھم کا غصہ حضرت مسیح علیہ السلام پر نکال کر اور خدا کے اُس برگزیدہ رسول کو جامع و مانع گالیاں دے کر مسیحیت کی بدشگونی کے لیے اپنی رہی سہی ناک جس طرح مرزا قادیانی نے کٹوائی ہے، وہ اُنہی کا حصہ ہے۔

(ارمغانِ قادیان (قادیانیت کے بارے میں مولانا ظفر علی خاں کی منتخب نظموں اور نثری مضامین کا مجموعہ) مطبوعہ مکتبہ کارواں لاہور)

ملنگ بہ اشتیاق ''گولے کے''

عرب کے سب سے بڑے ادیب سہل بن ہارون نے کذب و ناراستی و بطالت کی تحسین و تمجید میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ جاحظ نے سیاہ رنگ سوڈانی حبشیوں کے فضائل میں ایک تالیف شائع کی تھی کہ جمال صورت و معنی انہیں میں ہے۔ مبارک بن خضر ناگوری نے ایک فتویٰ مرتب کرایا تھا کہ اکبر شاہ کو منصب اجتہاد حاصل ہے اور مصالح مقتضیہ کی بنا پر وہ شریعت کے احکام غیر منصوصہ میں ترمیم و تغیر بھی کر سکتا ہے۔ عربوں نے ''محاسن واضداد'' کا ایک فن اختراع کیا تھا کہ جس بات کو چاہتے ایک پہلو سے تو اس کے شرایف و محامد دکھاتے اور دوسرے رُخ سے اُسی کے قبائح و رذائل ظاہر کرتے۔ طوفان تاتار جب متموج ہوا ہے، ان دنوں بخارا کے سوفسطائی اس نقض و ابرام میں سرگرم تھے کہ انسان کو اشتراکِ جنسی کے باعث ''لاحیوان'' نہیں کہہ سکتے اور اس لاحیوانیت کے ایجابِ جنسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسی قیاس پر ''لاحمار'' بھی نہیں مان سکتے۔ لہٰذا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ جو انسان ''لاحمار'' نہیں ہے، یعنی حماریت کی نفی اس سے نہیں ہو سکتی بلکہ حماریت کا اطلاق ایجابی اس پر ہو سکتا ہے، وہ ''حمار'' ہے۔ اہل بخارا میں یہ بحث بڑے جوش و خروش سے چھڑی ہوئی تھی اور اس پر متعدد رسائل بھی تالیف ہو رہے تھے کہ سیلاب آیا اور بحث و مباحث کو بہا لے گیا۔ **فما بکت علیھم السماء** (اور آسمان تک اُن پر نہ رویا)

تاریخ نے اپنی تکمیلِ سنت کے لیے ہندوستان حاضر میں اپنا اعادہ کیا ہے کہ وہ ملک جس میں اسلام کے بالمقابل (بعہد سلطنت فرخ سیر) ایک نیا فربودی مذہب ایجاد ہوا تھا اور بادشاہ تک اُس کے پیشوا کی زیارت کو گیا تھا، وہی سلسلہ فربودیت اب مکمل ہو کر سیل فنا کا جاذب ہو کر فربود بھی نیست و نابود ہو جائیں اور قوم مظلوم بھی ان کے شوم سے محفوظ نہ رہ سکے۔ **و اذا اردنا ان نھلک قریۃ امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا فحق علیھا القول فدمرنھا تدمیرا۔** (بنی اسرائیل: 16، 17)

قادیاں سے ایک ماہانہ رسالہ شائع ہوتا ہے جس کا نام نامی ''تشحیذ الاذہان'' ہے اور ''قاضی ظہور الدین اکمل آف گولے کے'' اس کے ایڈیٹر ہیں۔ اس رسالہ کے نومبر 1917ء کے پرچے میں سب سے پہلا مضمون یہ ہے کہ ''استہزا، رسولوں کے صدق کا نشان ہے۔'' جناب مضمون نگار اس میں تحریر کرتے ہیں:

''ہمارا ایمان ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی خدا کے برگزیدہ رسول ہیں اور اس پر ہم علیٰ وجہ البصیرت قائم ہیں جب تک اس دُنیا سے گزر جائیں۔ یہ عقیدہ کسی الحاد یا تقلید کی بنا پر نہیں بلکہ خدا کے فضل سے ہم اس کے لیے اتنے دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ رکھتے ہیں کہ کسی میدان میں شرمندہ نہیں ہو سکتے کیونکہ میرے مولیٰ میرے ہادی کے ہاتھ پر اس قدر نشانات صداقت ظاہر ہوئے کہ اگر وہ ایک ہزار نبی پر بھی تقسیم کیے جائیں تو ان کی نبوت بھی ان سے ثابت ہو سکتی ہے۔ منجملہ ان نشانات کے ایک یہ بھی ہے جو اس آیت قرآنی سے مستفاد ہے۔ **مایاتیھم من رسول الا کانوا بہ یستھزون**۔ بے شک دنیا میں کئی ایسے لوگ ہیں جنہیں حقیر سمجھا جاتا ہے اور اُن سے تمسخر و استہزا ہوتا ہے مگر اس حرکت کے مرتکب علی العموم ادنیٰ طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ پس خدا کے رسولوں کا یہ نشان ہے کہ اُن کے مقابلہ پر متین سے متین اور سنجیدہ سے سنجیدہ شخص بھی استہزا سے کام لیتا ہے۔ دیکھیے سر سید کیسی زبردست شخصیت کے بھاری بھرکم آدمی تھے، وہ بھی ہمارے رسول کے دعوے کی طرف متوجہ ہی نہ ہوئے اور جب ہوئے تو آپ نے ایک تمسخر آمیز پیغام بھیجا جو اُن کی شان سے بالکل بعید تھا۔ مگر کیا کرتے رسولوں کے مقابل میں متانت اور سنجیدگی اسی طرح جواب دے جایا کرتی ہے۔ ایسا ہی بعض ہیں جو انگریزی یا عربی کی سند فضیلت رکھتے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ مشہور انشا پرداز ہیں۔ یہ بھی دعویٰ ہے کہ کتاب وسنت سے واقف ہیں بلکہ اس پر عامل۔ مگر سلسلۂ احمدیہ پر جب کچھ لکھیں گے تو متانت اور سنجیدگی کو یکدم جواب دے کر بالکل ایک ٹھٹھول آدمی بن جائیں گے۔ ظرافت ایک اور چیز ہے۔ استہزا و تمسخر اور چیز۔ مجھے نہ تو ان کی مخالفت کا شکوہ ہے کیونکہ جب کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی یا وہ اُسے خلاف کتاب وسنت سمجھتے ہیں تو ان کا حق ہے کہ وہ اس کی مخالفت کریں اور نہ اُن کی انشا پردازی کا خوف۔ مگر یہ کیا شرافت ہے کہ علم کی بات تو کچھ بھی نہ ہو محض سفیہانہ مکاءً وتصدیہ۔''

میں اس مضمون کا جواب نہیں دینا چاہتا۔ البتہ قاضی ظہور الدین اکمل آف گولے کے سے استفتا کرتا ہوں کہ:

(1) آثار ماثورہ میں کیا یہ بھی وارد ہے کہ **سیکون فی امتی کذابون ثلاثون کلھم یزعم انه نبی اللّٰہ و انا خاتم النبیین. لا نبی بعدی ولا تزال طائفة من امتی علی الحق ظاھرین لا یضرھم من خالفھم حتیٰ یاتی امر اللّٰہ** (یعنی عنقریب میری امت میں تیس کذاب ودجال ہوں گے جن میں سے ہر ایک اپنی نسبت یہی زعم رکھے گا کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے۔ حالانکہ میں خاتم الانبیا ہوں۔ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں۔ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر رہے گا۔ غالب رہے گا۔ اس گروہ کی جو مخالفت کرے گا، وہ اسے کچھ ضرر نہ پہنچا سکے گا تا آنکہ خدا کا حکم آئے۔

کیا جن لوگوں کو حدیث میں کذاب ودجال کہا گیا ہو، اُن کو یا ان کے متبعوں کو اس شکایت پر بگڑنے کا حق ہوگا کہ حدیث کے ساتھ استہزا کریں اور پھر اسی استہزا کو اپنے ''صدق رسالت'' کے ثبوت میں پیش کریں گے؟

(2) اس نظم کا کیا مطلب ہے:

سخن چیں را توا نم چارۂ کرد
کہ تا من خود نگویم اوچہ چنید
ولے از مفتری نتواں برآمد
کہ او از خود سخن می آفرینید

(ارمغانِ قادیان (قادیانیت کے بارے میں مولانا ظفر علی خاں کی منتخب نظموں اور نثری مضامین کا مجموعہ) مطبوعہ مکتبہ کارواں لاہور)

مشائخ قادیان کی علت اورالولد سرٌ لابیہ

موسیو بشیر الدین محمود کا سرکاری گزٹ ''الفضل'' مورخہ 22 ستمبر 1917ء اپنے وقت پر مسئلہ ارتقا کے ایک نئے انکشاف کا کاشف ہوا۔ کیا کہیں اب تو موسیو موصوف نے نئے نئے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کر دیے۔ دوسرے ہی صفحہ پر آپ نے ببانگ دہل منادی کی ہے کہ جو شخص آپ کا منکر ہے، وہ تمام انبیا کا منکر ہے۔ فرماتے ہیں:

''جس طرح مسیح موعود کا انکار تمام انبیا کا انکار ہے، اُسی طرح میرا انکار انبیائے بنی اسرائیل کا انکار ہے جنہوں نے میری خبر دی۔ میرا انکار رسول اللہ کا انکار ہے جنہوں نے میری خبر دی۔ میرا انکار شاہ نعمت اللہ ولی کا انکار ہے جنہوں نے میری خبر دی۔''

سچ ہے ''اَلْوَلَدُ سِرٌّ لابیہ'' باپ صاحب پہلے ایک معمولی مُلّا تھے جو دفعۃً قلم دوات ہاتھ میں لے کر مجتہد بن بیٹھے۔ مجتہد سے یک بیک مسیحا ہو گئے۔ مسیحیت ادنیٰ درجہ کی چیز تھی۔ یکا یک مہدویت کا دعویٰ کیا۔ مہدویت بھی ایک معمولی سی بات تھی۔ مصطفائی کے مدعی بن بیٹھے۔ خدائی رہ گئی تھی، اُس کا بھی لگاّ لگا ہی دیا اور اپنے اختراع کے قرع انبیق میں ایک انوکھے الہام کا ہفتاد آتشہ زلال ٹپکا کر خدا کا قول اپنے حق میں دہرایا کہ:

''انت منی بمنزلة اولادی، انت منی بمنزلة ولدی.''

''(اے مرزا) تو میرے نزدیک میری اولاد کی طرح ہے۔ (اے مرزا) تو مجھ سے بمنزلہ میرے بیٹے کے ہے۔''

(تذکرہ مجموعہ وحی والہامات طبع چہارم صفحہ 345، 442 از مرزا قادیانی)

منصور صاحب دار پر اس لیے لٹکائے گئے تھے کہ آپ نے نعرہ انا الحق لگایا تھا۔ اُن کے ایک روحانی بھائی کو جہانگیر اس علت میں سولی پر لٹکاتے لٹکاتے رہ گیا تھا کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ کی توہین یہ کہہ کر کی تھی کہ:

پنجہ در پنجۂ خدا دارم
من چہ پر وائے مصطفےٰ ﷺ دارم

لیکن کسی مدعی اسلام نے آج تک خدا کا بیٹا بننا تو ایک طرف رہا، خدا کے باپ بننے کا دعویٰ نہ کیا تھا۔ یہ شرف موسیو بشیر الدین محمود کے والد کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ **انت منی و انا منک** فرما کر آپ نے کس اخلاص سے سورہ قل ھواللہ احد کے اس ٹکڑے کی تفسیر کی ہے جس میں جناب باری نے اپنی شان **لم یلد و لم یولد و لم یکن لہٗ کفواً احد** بتائی ہے۔

بیٹے صاحب کل تک صرف باوا جان کی نبوت منوانے پر زور دیتے تھے اور خود محض اُن کے خلیفہ تھے۔ آج اُچک کر خلافت کی صندلی سے نبوت کی مسند پر جا بیٹھے اور اگر کوئی بدنصیب آپ کا منکر ہو تو وہ نہ صرف حضرت آدم نہ صرف حضرت نوح نہ صرف حضرت ابراہیم نہ صرف حضرت عیسیٰ علیہم السلام کا منکر ہوگا بلکہ خود حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ سے بھی انکار کرے گا۔ اب دنیا کے کان کو ایک بالکل نئے رنگ میں قادیاں کے دعوے کی شنوائی کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ موسیو بشیر الدین محمود جو شملہ کی چوٹیوں سے ہوتے ہوئے ساتویں آسمان تک پہنچ ہی چکے ہیں، ایک جست میں عرش اعظم پر نظر آئیں گے اور خدا کو............ اُس کے اریکہ جلال سے نیچے اُتار رہے ہوں گے۔ **نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیاٰت اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہٗ و من یضلل فلا ھادی لہ۔**

قادیاں کے کاتب وحی ''الفضل'' نے اپنے نبی کی اس شملوی تحریر کو درج کرتے ہوئے جس میں نبی صاحب نے اس شدّ ومد کے ساتھ نقارہ **انا و لا غیری** بجایا ہے، داد کاسہ لیسی یوں دی ہے۔

''اس وقت خدا کے کیے ہوئے محمود کو کوئی اور طاقت بلا رہی تھی۔ تقریر میں زور اور بجلی کی سی طاقت تھی۔ آواز مسیح موعود کی آواز تھی۔ لہجہ حضرت جری اللہ فی حلل الانبیا کا لہجہ تھا''۔

حضرت جری اللہ فی حلل الانبیا سے قادیاں کی اصطلاح میں مرزا غلام احمد قادیانی مراد ہے۔ میرے مددگار مولوی عبدالحی صاحب جن کو میں یہ عبارت لکھائے جاتا ہوں، آتش غیرت سے جل رہے ہیں۔ ان کی حالت بری ہو رہی ہے۔ غصہ میں آ کر دانت پیستے ہیں۔ ہونٹوں کو اتنا چباتے ہیں کہ دل و جگر کے لہو کی بوندیں ان پر آ کر جمع ہو جاتی ہیں۔ میز پر زور زور سے ہاتھ

مارتے ہیں۔ پھر اس ہنسی کا زہر جس میں حقارت اُبل رہی ہے، بے اختیار ٹپکا دیتے ہیں کہ
یہ کیا ہو رہا ہے، یہ کیوں ہو رہا ہے

پھر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ حضرت اس ''خدا کے کیے ہوئے'' کی انوکھی ترکیب کا مطلب تو لِلّٰہ سمجھا دیجیے کہ کیا ہے؟ میں جواب دیتا ہوں کہ مولانا اس سوال کا جواب موسیو بشیر الدین محمود ہی سے پوچھئے یا اُن کے کاتب وحی سے کہ خدا نے انہیں کس طرح کیا تھا۔

اس تمام خرافات کی ابتدا یوں ہوئی کہ بتاریخ **16** ستمبر **1917**ء شملہ کی چوٹیوں کو بھی دارالامان قادیاں کا مینارہ سمجھ کر موسیو محمود نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس کا موضوع ''رسول اللہ کی دوسری بعثت'' تھا۔ اس خطبہ میں فاطمیین مصر کے دعاۃ کی باطنی شان کی تاویل قرمط اور بابک کے رنگ میں غوطہ کھا کر جھلکتی نظر آتی ہے۔ قرآن مجید کی آیتوں کو توڑ مروڑ کر اپنے ڈھب کے معنی زنادقہ نے ہمیشہ نکالے ہیں لیکن موسیو محمود اور انہیں پر کیا موقوف ہے، تمام قادیاں والے آیات قرآنی کے مفہوم کو اپنی اغراض مشئومہ کے لیے جس بُری طرح سے مسخ کر رہے ہیں، اُس کو دیکھ دیکھ کر خدا یاد آ جاتا ہے اور دوبارہ کہنا پڑتا ہے کہ الٰہی یہ کیا ہو رہا ہے، یہ کیوں ہو رہا ہے۔

موسیو بشیر الدین محمود جنہوں نے رجعت اور حلول اور صیر ورت اور ظل اور بروز اور تناسخ کے مشرکانہ تصورات کا مبتدیانہ سبق ایران اور ہندوستان بلکہ یوں کہیے اپنے والد سے پڑھا ہے، ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ تو عرب میں مبعوث ہوئے تھے لیکن اب دوسری مرتبہ حضور اقدس نے مرزا غلام احمد کا جنم قادیاں میں لیا ہے۔ **نعوذ بالله من تلک الهفوات و الخرافات۔**

عن ابن عباس قأل قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم من قال فى القراٰن (برأيه وفي رواية: من غير علم) فليتبوأ مقعده فى النار

(ترمذی، حدیث نمبر 2950، 2951)

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنی رائے سے یا بغیر علم کے قرآن کی تفسیر کرے، اسے اپنی مقعد یعنی جائے وقوع جہنم میں قرار دینی چاہیے۔

اس دعوے کے ثبوت میں آپ نے اپنے باوا جان کا منطقی رنگ اختیار کر کے پہلے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی:

ھوالذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتہٖ و یزکیھم و یعلمھم الکتب و الحکمۃ و ان کانوا من قبل لفی ضلال مبین o و اخرین منھم لما یلحقوا بھم و ھو العزیز الحکیم. (الجمعہ:2تا3)

ترجمہ: وہی (اللہ) جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں، ایک رسول انہی میں سے جو پڑھ کر سناتا ہے انہیں اُس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے ان (کے دلوں) کو اور سکھاتا ہے انہیں کتاب اور حکمت اگرچہ وہ اِس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے اور دوسرے لوگوں کا بھی ان میں سے (تزکیہ کرتا ہے تعلیم دیتا ہے) جو ابھی ان میں سے آکر نہیں ملے اور وہی سب پر غالب حکمت والا ہے۔

''الفضل'' کو اتنی تو توفیق دی نہ گئی تھی کہ پوری آیت لکھ دیتا۔ رسولاً اور آخرین کے درمیان جتنی عبارت تھی، اُس کی جگہ نقطے دے کر موسیو محمود کے کاتب وحی نے ثابت کر دیا ہے کہ دوسروں کو گالیاں دینے کے لیے تو یہ فرقہ اپنے آسمانی گزٹ کے کالم کے کالم سیاہ کرتا چلا جاتا ہے لیکن قرآن مجید کی آیات کے اندراج میں اس قدر بخیل ہے کہ ایک سطر کی گنجائش نہیں نکال سکتا۔ لیکن یہ ایک جداگانہ بحث ہے۔ میرے پیش نظر اہل قادیاں کی وہ لغو و مہمل تاویل ہے جس سے موسیو بشیر الدین محمود اینڈ کو نے الفاظ **آخرین منھم لما یلحقوا بھم** کا مصداق مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کی امت قلیل الانفار کو بتایا ہے۔

ہلاکو خاں کے مقربین میں خواجہ نصیر الدین محقق طوسی بھی تھے جن سے بادشاہ نے ثبوت طلب کیا تھا کہ قرآن اگر منزل من اللہ ہے تو بتاؤ اس میں میرا تذکرہ کہاں ہے؟ محقق طوسی کو اگر متنبّی قادیان کی طرح فن تاویل و تحریف میں ید طولیٰ حاصل ہوتا تو وہ لفظ ''ہلاک'' کے مشتقات سے ایسا کر سکتے تھے اور ہلاکو خاں کو جو عربیت سے نابلد تھا ''**ھلک عنی سلطانیه**'' کے یہ معنی بتا کر قرآن کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت دے سکتے تھے کہ اس آیت میں حضور ہی کو سلطان ہلاکو کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مگر کجا محقق طوسیؒ اور کجا محقق راجے کی قادیانی۔ قدرت کاملہ نے کلام اللہ کے ساتھ یہ عدوان و استبداد ''راجے کی'' ہٹ کے ساتھ مخصوص کر رکھا تھا کہ مرزا قادیانی کو بظاہر تو قرآن سے رسول و نبی و مبعوث من اللہ ثابت کرنے کا دعویٰ کریں لیکن باطن میں سب سے بڑا داؤں یہ کھیلیں کہ معانی قرآنی ایسے مسخ کر دیے جائیں کہ قلب سلیم اس کو منزل من اللہ تسلیم کر بھی نہ سکے۔ **وما یخدعون الا انفسھم** فریب تو دیتے ہیں مگر اپنے نفس کا فر کو فریب دیتے ہیں۔

ذرا آپ کی شان تلبیس دیکھیے :

"لما یلحقوا کے **لما** نے جس مدت انتظار کا فائدہ دیا۔ وہ آنحضرتؐ کی بعثت اول کے انتہا تک کا زمانہ ہے یعنی تیرھویں صدی تک کا جس میں امت محمدیہ کے لوگ حقیقت اسلام و نور ایمان سے بے خبر و بے بہرہ ہونے کی وجہ سے خدا کی کتاب میں **وان کانوا من قبل لفی ضَلٰلٍ مبین** کے معنوں میں "**امیین**" کا نام پانے کے مستحق ہو چکے تھے اور زمانہ بزبان حال پکار پکار کر خدائے تعالیٰ سے اس مصلح کو طلب کر رہا تھا جو ایمان کو ثریا سے واپس لانے والا تھا"۔

آیات قرآنی کی یہ انوکھی قادیانی تفسیر ثابت کر رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد سے تیرھویں صدی ہجری تک جتنے مسلمان گزرے ہیں، وہ سب کے سب گمراہ تھے۔ انھیں مسلمانوں میں ائمہ طاہرین بھی تھے۔ فقہائے مجتہدین بھی تھے۔ عرفائے دین بھی تھے۔ قدمائے متکلمین بھی تھے۔ سب ہی تھے اور سب کے سب قادیانی تفسیر کے مطابق ضلال مبین یعنی کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔ امام جعفر صادق، امام موسیٰ کاظم، امام علی الرضا، امام مالک بن انس، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام غزالی، امام رازی، شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس اللہ اسرارہم، جن کو تمام دنیائے اسلام آج تک بہترین نمونہ توحید و تقویٰ مانتی چلی آئی ہے۔ یہ سارے کے سارے گمراہ تھے اور باوجود انتہائی علم و فضل کے "امیین یعنی ان پڑھ کا نام پانے کے مستحق ہو چکے تھے"۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ "حقیقت اسلام اور نور ایمان سے بے خبر اور بے بہرہ" بھی تھے اور یہ سب کس لیے؟ محض اس لیے کہ مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان نہ لائے تھے جو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ **نعوذ باللّٰہ ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ**۔

اتنا بڑا دعویٰ تو کچھ قادیاں والوں ہی کو زیب دیتا ہے۔...... قادیان کی اس خصوصیت سے مجال انکار کس کو ہے جو عہد "بعثت ثانی" سے ہمیشہ تحدی کرتا رہا کہ "قرآن صرف قادیانیوں کو آتا ہے، غیر احمدیوں کو قرآن نہیں آتا"۔ کون بد بخت ہے جو اس شان اعجاز پر ایمان نہ لائے جب کہ ثبوت میں قرآن کے ہر روز نئے نئے مطلب تصنیف ہوتے ہیں اور حدیث کے نئے نئے معنے گڑھے جاتے ہیں۔

پہلے تو آپ فرماتے ہیں کہ ایمان دنیا سے اُٹھ گیا تھا۔ اس کا نام بھی باقی نہ رہا تھا۔

شریعت زمین سے رخصت ہو چکی تھی اور ثریا پر چلی گئی تھی۔ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ (معاذ اللہ) مرزا غلام احمد قادیانی کا روپ دھار کر آئے اور ثریا سے ایمان کو پھر نیچے اُتار لائے اور اب اس ایمان کا چشمہ قادیاں میں اُبل رہا ہے اور جو اس چشمہ کا پانی نہیں پیتے، وہ مسلمان ہی نہیں۔

اس کا جواب میں سوائے اس کے کیا دے سکتا ہوں کہ آپ کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔ اسلام کو جھٹلانے والا ہے۔ اس کی حقیقتوں کی تردید کرنے والا ہے اور اس لیے میں آپ کے دماغ شریف کی کوئی اصلاح نہیں کر سکتا کہ **من یضلل فلاھادی لہ**۔ ہاں اگر میں امیر عبدالرحمٰن خاں خلد آشیاں کی جگہ ہوتا تو آپ سے صرف اتنا کہتا کہ ''ایں جا بیا۔'' معلوم ہوتا ہے کہ چوہے کو کہیں سے ہلدی کی کوئی گرہ ہاتھ آ گئی ہے اور اب وہ پنساری بننا چاہتا ہے۔ قاضی اکمل آف گولے کے نے موسیو بشیر الدین آف قادیاں کے سامنے سالہا سال کی کنج کاوی کے بعد ضرور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت جو بخاری و مسلم کے علاوہ ترمذی اور نسائی میں بھی درج ہے، انٹ کا سنٹ ترجمہ کر کے رکھ دی ہوگی۔ اصل روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال کنا جلوساً عند النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذنزلت سورۃ الجمعۃ فتلاھا فلما بلغ و اخرین منھم لما یلحقوا بھم قال رجل یا رسول اللّٰہ من ھولاء الذین لم یلحقوا بنا فلم یکلمہ حتی سَئَلَہٗ ثلاثا قال و سلمان الفارسی فینا فوضع رسول اللّٰہ ﷺ یدہ علی سلمان و قال والذی نفسی بیدہ لو کان الایمان بالثریا یتناولہ رجال من ھولاء.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے دربار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سورہ جمعہ کا نزول ہوا۔ آپ ﷺ نے اس کی تلاوت فرمائی۔ جب آپ ﷺ الفاظ **لما یلحقوا بھم** پر پہنچے تو ایک شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ! یہ لوگ جو ہم سے ملحق نہیں ہوئے ہیں، کون ہیں؟ لیکن آپ نے اس کے جواب میں سکوت فرمایا۔ اُس نے پھر سوال کیا، آپ پھر بھی خاموش ہی رہے۔ تیسری مرتبہ بھی آپ نے مہر خموشی نہ توڑی۔ اس وقت سلمان فارسی ہمارے مجمع میں تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے یک بیک اپنا ہاتھ اٹھا کر اُن کے سر پر رکھ دیا اور فرمایا: مجھے اسی کی قسم ہے جس کی مٹھی میں میری جان ہے، اگر ایمان ثریا پر ہوتا تو انہی لوگوں میں سے کسی کا ہاتھ اس تک پہنچ جاتا۔

قربان ہو جایئے رسول اللہ ﷺ کے ذوق سلیم کے کہ آپ ﷺ نے صاف فرما دیا کہ عرب و عجم یعنی دنیا کے مسلمانوں میں سے وہی لوگ کتاب وسنت کے لطائف کو سمجھ سکتے ہیں جنہیں مذاق سخن فہمی دیا گیا ہو۔ **آخرین منھم لما یلحقوا بھم** کے معنی صاف یہی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی غایت تمام دنیا کے نفس کا تزکیہ اور کتاب و حکمت کو تمام روئے زمین کے انسانوں تک پہنچانا ہے۔ بالفاظ دیگر آپ ﷺ کے درس وحدت کا روئے سخن نہ صرف اُن آدمیوں کی طرف ہے جن میں آپ بجسد عنصری مبعوث ہوئے بلکہ وہ تمام لوگ بھی جو تا قیام قیامت نسلاً بعد نسل اور بطناً بعد بطن آپ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ سلک اسلام میں منسلک ہونے کے باعث ملحق ہوتے رہیں گے۔ یعنی تمام تابعین تمام تبع تابعین وھلم جراً آپ کی بعثت کی منشا میں داخل ہیں اور ان ہی کا نام آخرین منھم ہے۔

لیکن ذوق سلیم قادیاں کہاں سے لائے اور اس کے علاوہ اسے تو اپنا اُلّو سیدھا کرنا ہے۔ آیت **ھو الذی بعث** کے معنی قادیاں نے یہ کیے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی دو بعثتیں ہیں:

(الف) بعثت مدنی (ب) بعثت قادیانی

پہلی مرتبہ آپ عرب میں محمد (ﷺ) بن کر ظاہر ہوئے، دوسری مرتبہ سوا تیرہ سو سال بعد ''غلام احمد'' کا روپ دھار کر قادیاں میں تشریف لائے اور اس نئے مجسمہ نے ہاتھ بڑھا کر ایمان سے خوشہ انگور کو جو ثریا پر لٹک رہا تھا، نیچے اُتار لیا۔

اس ناپاک خرافات سے خدائے ذوالجلال کی پناہ!

حدیث شریف میں سلمان فارسی کا نام آیا تھا اور ثریا کا ذکر بھی آ گیا تھا۔ اگرچہ ''لو کان'' کی امکانی شرط سے مشروط تھا۔ موسیو بشیر الدین کو ابلیس ایسا موقع دیں۔ دونوں لفظوں کو لے اڑے اور دیر تک کی سوچ بچار کے بعد ایک دُور کی کوڑی لائے۔ یعنی ثابت تو آپ کو یہ کرنا تھا کہ آپ کے والد نے معاذ اللہ رسول اللہ ﷺ کا روپ قادیاں میں دھارا اور آیت قرآنی میں آخرین کا لفظ تھا جس کے معنی آپ صرف ''عجم'' ہی لے سکتے تھے۔ اس لیے ضرور ہوا کہ آپ کے ابا جان کا تعلق ایران سے ہو۔ اگر اتنا ہی کہہ دیتے کہ مرزا غلام احمد سلمان فارسی کی نسل سے ہیں تو تُک سے تُک خیر مل بھی سکتی تھی لیکن قادیاں میں اُلٹی گنگا ہمیشہ سے بہتی چلی آئی ہے۔ موسیو بشیر

الدین حال کا استعمال استقبال میں کرتے ہوئے کس مزے سے مؤخر کو مقدم اور مقدم کو مؤخر فرماتے ہیں کہ ’’سارا ایران آپ کے باوا جان کی اولاد ہے۔‘‘

ان روشن بیانات کے بعد فاضل راجے قادیانی کی نئی منطق ملاحظہ ہو۔

’’صحیح تفسیر آیت جو تفسیر نبوی کے عین منشا کے مطابق ہے، یہ ہے کہ رجل من فارس سے مراد مسیح موعود احمد نبی اللہ قادیانی ہے۔ کیونکہ آنحضرت نے دوسری جگہ فرمایا ہے کہ **کیف تھلک امة انا فی اولھا والمسیح بن مریم فی آخرھا** یعنی وہ امت کیونکر ہلاک ہو سکتی ہے جس کا سر آغاز میں ہوں اور مسیح ابن مریم اس کے آخر میں ہوں گے‘‘۔

کتنی بڑی بے باکی ہے کس قدر شوخ چشمانہ جسارت ہے............

مجھ سے تو موسیو بشیر الدین اور ان کے یاران سرپل اس لیے بگڑتے ہیں کہ میں بر سبیل تمسخر ان کے دعاوی کا استخفاف کرتا ہوں۔ لیکن کیا فرمائیں گے وہ اپنے والد کے ’’اندلسی‘‘ یعنی لاہوری مریدوں کے باب میں جنھوں نے آپ کے اس نئے دعوے کو کہ آپ کا انکار تمام انبیائے بنی اسرائیل کا انکار ہے، کفر سے تعبیر کیا ہے اور 26 ستمبر 1917ء کے ’’پیغام صلح‘‘ میں ’’شملہ کی گھاٹیوں پر سے اشاعت کفر‘‘ کی سرخی قائم کر کے ایک ایسا کرارا مضمون آپ کے خلاف لکھا ہے کہ آپ مدتوں اس کے مزے لیتے رہیں گے۔

(روزنامہ زمیندار 30 ستمبر 1917ء، روزنامہ زمیندار (قادیان نمبر) 19 مارچ 1933ء)

متنبّی قادیان اور اُس کا لاہوری طنبورہ!

سید عطا اللہ شاہ بخاری کے مقدمہ میں جہاں قادیانی مرزائیوں کی شہادتیں ہوئیں وہاں اس طائفہ ضالہ کی لاہوری شاخ کے نمائندہ پادری محمد علی لاہوری نے بھی عدالت میں بحیثیت گواہ ایک بیان دیا جس کا ایک ٹکڑا ''زمیندار'' کی اشاعت مؤرخہ 8 اپریل 1935ء میں بایں الفاظ درج کر دیا گیا کہ

جو لوگ مرزا صاحب کو مسیح موعود نہیں سمجھتے، میں اُن کو مسلمان نہیں سمجھتا۔

مرزائیت کی کھلی ہوئی تعلیم اور پادری محمد علی کے عالم آشکار عقیدہ کے لحاظ سے یہ قول بالکل صحیح تھا اور روزنامہ ''زمیندار'' کے نامہ نگار نے اس میں خفیف سے خفیف معنوی تحریف بھی نہ کی تھی۔ لیکن ازبسکہ پادری صاحب سادہ لوح مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کا ایک خاص سوفسطائی سلیقہ رکھتے ہیں اور انہیں ڈر ہے کہ مسلمانوں کو متنبّی قادیاں کے انکار کی بنا پر کھلم کھلا کافر کہہ دینے سے کہیں اس چندہ میں کمی واقع نہ ہو جائے جو وہ اسلام کے نام پر فرزندان توحید سے بٹور رہے ہیں۔ لہٰذا ''زمیندار'' کے خلاف ان کے منافقانہ غیظ و غضب کا پارہ معاً کھولاؤ کے درجہ تک پہنچ گیا اور انہوں نے اپنی ساری جماعت سمیت چیخنا شروع کر دیا کہ ''زمیندار'' مفتری ہے اور کذاب ہے جس نے ایک ایسی بات ''امیر جماعت احمدیہ لاہور'' سے منسوب کر دی جو حضرت کے مقدس منہ سے ہرگز نہ نکلی تھی۔ ''حضرت'' نے تو صرف اسی قدر فرمایا تھا کہ:

جو لوگ مسلمان مرزا غلام احمد صاحب کو مجدد نہیں مانتے ہیں، میں ان کو غلطی پر سمجھتا ہوں۔

اس پر پادری صاحب کی خدمت میں گزارش کی گئی کہ آپ کی منافقانہ مصلحتیں گو مرزا غلام احمد آں جہانی کو مجدد قرار دیں لیکن دل سے آپ کو بھی مرزا بشیر الدین محمود کی طرح اقرار ہے کہ یہ آں جہانی بزرگوار مجدد نہیں بلکہ اچھے خاصے نبی تھے جن کی نبوت کا انکار ''غلطی'' ہی نہیں بلکہ کفر ہے اور وہ بھی کفر بواح جو اگر آپ بھولے نہ ہوں تو آپ ہی کے الفاظ میں

''عنداللہ قابل مواخذہ ہے۔''

مرزائیوں کا عام اس سے کہ وہ دمشقی (قادیانی) ہوں یا اندلسی (لاہوری) قاعدہ ہے کہ کیسی ہی دندان شکن منطق سے ان کے دعاوی کو ملیامیٹ کیوں نہ کردیا جائے، وہ برابر اپنی ہی رٹ لگائے جاتے ہیں اور اُن کی خرافات کا پرنالہ وہیں رہتا ہے جہاں اُن کے آں جہانی پیشوا کے دست باطل نے اسے نصب کیا تھا۔ ''زمیندار'' کا سارا استدلال وہ روایتی بوند ثابت ہوا جو چکنے گھڑے پر پڑتے ہی پھسل جاتی ہے۔ 4 جون 1935ء کے ''پیغام صلح'' میں ''زمیندار'' کی غلط بیانی اور ''بہتان عظیم'' کی جلی سرخی کے ساتھ ایک طویل و عریض دشنام نامہ شائع ہوا ہے جس میں ''زمیندار'' کو کذاب اور غلط نگار اور شیوۂ شرافت سے عاری قرار دے کر استفسار کیا گیا ہے کہ کیا ''زمیندار'' اخلاقی جرأت سے کام لے کر اپنی غلط بیانی کو واپس لے گا؟''

اس استفسار کی ضرورت دجل و تلبیس کے اس واحد لاہوری اجارہ دار کو اس لیے پیش آئی ہے کہ آج کل اپنے چندہ کی پوٹ کی فربہی کو مائل بہ لاغری دیکھ کر پادری محمد علی کی طرف سے باہتمام بلیغ اعلان کیا جارہا ہے کہ ہم لوگ رسول اللہؐ کو خاتم النبیین مانتے ہیں۔ حضور کے بعد نبوت کے ہر مدعی کو کافر جانتے ہیں۔ ہر کلمہ گو ہمارے نزدیک مسلمان ہے اور ہم اُس کے جنازہ میں شریک ہونے کو بھی تیار ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس اعلان کے سرسری مطالعہ کے بعد بھولے بھالے مسلمان پادری صاحب کے جھانسے میں آسکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ جس شخص یا جماعت کے یہ عقائد ہوں، وہ بھلا کس طرح دائرہ اسلام سے خارج ہوسکتی ہے لیکن جنہیں دیدہ بینا دیا گیا ہے اور جو لاہوری مرزائیوں کی منافقانہ گھاتوں سے واقف ہیں، ان کے اس سوال کا کوئی جواب پادری محمد علی اور ان کے حواریوں سے بن نہیں پڑتا کہ جب آپ رسول اللہ ﷺ کی ختم المرسلینی کے قائل ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد ہر مدعی نبوت کو کافر خیال کرتے ہیں اور ہر کلمہ گو آپ کے نزدیک مسلمان ہے تو پھر دنیا کے ساٹھ کروڑ کلمہ گوؤں کا مرزا غلام احمد قادیانی کے دعاوی سے مجرد انکار ''غلطی'' کیوں ہے اور یہ غلطی خدا کے کس قول اور رسول اللہ ﷺ کے کس ارشاد کی رو سے ''قابل مواخذہ'' ہے؟

''زمیندار'' نے براہین قاطعہ اور حقائق ثابتہ سے واضح کردیا کہ ''غلطی'' سے آپ کی

مراد ''کفر بواح'' ہے۔ آپ کو اس سے انکار ہے تو ہوا کرے۔ ہم آپ کو مرزا غلام احمد قادیانی سے بڑا مرتبہ دینے کے لیے تیار نہیں اور شاید آپ بھی اس مرتبہ کے مدعی ہونے میں ذرا تامل کریں۔ اپنے اس گورو گھنٹال ہی سے ''غلطی'' کا مفہوم دریافت کر لیجیے۔ سنئے وہ کیا کہتے ہیں:

کفر دو قسم پر ہے۔ (اوّل) ایک یہ کفر کہ ایک شخص اسلام سے ہی انکار کرتا ہے اور آنحضرت ﷺ کو خدا کا رسول نہیں مانتا (دوم) دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا اور اس کو باوجود اتمام حجت کے جھوٹا جانتا ہے جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسول نے تاکید کی ہے اور پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی تاکید پائی جاتی ہے۔ پس اس لیے کہ وہ خدا اور رسول کے فرمان کا منکر ہے، کافر ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہے۔ (حقیقۃ الوحی ص 179 مندرجہ روحانی خزائن جلد 22، صفحہ 185 از مرزا قادیانی)

یہ متنبّی قادیاں کا قول فصیل ہے اور اس کی رو سے دنیا جہان کے مسلمان جو اس شخص کو مسیح موعود نہیں مانتے، کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ پادری محمد علی لاہوری اگر منافق نہیں بلکہ ایک سچے مرزائی ہیں تو اُن کے لیے اپنے پیشوا کی تحریر کا لفظ لفظ آیتٌ من آیات اللہ ہونا چاہیے۔ پھر وہ اُن کلمہ گوؤں کی نسبت جو مرزا غلام احمد قادیانی کی مسیحیت کے منکر ہیں، کس منہ سے یہ بات کہنے کے مجاز ہیں کہ ہم انہیں مسلمان سمجھتے ہیں اور جب خود مرزا قادیانی نے اپنے منکر کے انکار کو ''غلطی'' نہیں کہا بلکہ لگی لپٹی رکھے بغیر ''کفر'' سے تعبیر کیا ہے تو آپ کون ہیں جو اپنے پیشوائے اعظم کے الفاظ میں ردو بدل کریں اور آپ کو کیا حق ہے کہ اگر ''زمیندار'' آپ کی ''غلطی'' کی تصحیح خود آپ ہی کے ''مسیح موعود'' کی تصریحات کی روشنی میں کرے تو آپ لکھنؤ کی بھٹیارنوں کی طرح اس پر رنگا رنگ گالیوں کا جھاڑ باندھ دیں۔ آپ کی اس منطق نے مرزا غلام احمد قادیانی کو دارالبوار میں جہاں وہ آج کل تشریف فرما ہیں، ضرور پریشان کر دیا ہوگا اور وہ جھنجھلا کر کہہ رہے ہوں گے کہ

من چہ می سرائم و طنبورہ من چہ می سراید

(ارمغانِ قادیان (قادیانیت کے بارے میں مولانا ظفر علی خاں کی منتخب نظموں اور نثری مضامین کا مجموعہ) مطبوعہ مکتبہ کارواں لاہور)

دارالفساد قادیان

ایشیا میں غلامی کی سب سے بڑی تربیت گاہ

نے کعبے نے دیر کے قابل
ہے مذہب ان کا سیر کے قابل

خدائے بزرگ و برتر نے انسان کو باوجودیکہ اس کا خمیر خاک جیسے مایۂ حقیر سے اٹھایا گیا تھا، احسن تقویم کے سانچہ میں ڈھال کر تمام موجودات ذوی العقول پر فضیلت عطا کی۔ فرشتے سراپا نور تھے لیکن ان کی گردن مٹی کے اس پتلے کے آگے جھکا دی۔ شیاطین واجنہ سرتاپا نار تھے لیکن ان کا سر اس کی چوکھٹ پر رکھ دیا۔ اپنے جلال و جمال کا درخشاں تاج اپنے ہاتھ سے اس کے سر پر رکھ کر آفرینندۂ کون ومکان نے کائنات کی تمام مادی طاقتوں کو انسان کے زیر نگیں کر دیا۔ آفتاب کو اس کی آئینہ داری کی خدمت تفویض ہوئی۔ ماہتاب کو اس کی ساغر گیری کا منصب سپرد کیا گیا۔ ستاروں کو اس حویلی کے آنگن کی جاروب کشی کا شرف بخشا گیا۔ بحر و بر، برق و باد، شجر و حجر، وحوش وطیور سب اس کے غلامانِ غلام بنائے گئے۔

ظاہر ہے کہ آدم کا یہ شریف ونجیب بیٹا جسے بارگاہِ رب العالمین سے خلیفۃ اللہ فی الارض کا پرغرور لقب مرحمت ہوا ہے، فطرتاً حر ہے اور اپنے ابنائے جنس میں سے کسی کا عبد نہیں ہوسکتا۔ اس کی پیشانی اگر کسی کے آستانہ کی گرد سے آلود ہوسکتی ہے تو صرف اپنے پروردگار کی دہلیز کبریائی کی خاک سے۔ غلامی سے اس کی فطرتِ آزاد کو ازلی وابدی نفرت ہے اور ان قیود کے سوا جو رب السموات والارض کی مصلحتوں نے اس کے لیے تجویز کی ہیں، دنیا جہان کی کوئی ماسوااللٰھی اس پر جداً عائد نہیں ہوسکتی۔ اس سبق کو ساعتِ الست سے جب اوّل اوّل اس نے اپنے آقائے اعظم کے ساتھ پیمانِ وفا استوار کیا تھا، وہ بارہا بھول چکا ہے مگر جب کبھی خود فراموشی کی یہ کیفیت اس پر طاری ہوئی ہے، خدا کی رحمتِ نہائی نے جوش میں آ کر کسی خاص بندے کی معرفت اس کا حافظہ تازہ کر دیا ہے اور اسے اپنا بھولا سبق یاد آ گیا ہے۔ دنیا میں جس قدر انبیاء مرسلین مبعوث ہوئے،

سب کی بعثت کا منتہا یہی تھا کہ انسان کی غلامی کی بیڑیاں بڑھائیں اور اسے حریت کامل کا درس دے کر حکمرانی کا اہل بنائیں۔

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے تیشہ کی ایک ہی ضرب سے مٹی کے بتوں کی گردن اڑا کر خدائے واحد کی کبریائی کا علم نافِ عالم میں بلند کیا، وہاں اپنے زمانہ کے غلام............ خلاف اپنی جبروتی آواز بلند کر کے بنی آدم کو آزادی کی دعوت دی۔ ابتغائے مرضات اللہ کے صلہ میں ان کے لیے ''امام الناس'' کا منصب رفیع تجویز ہوا اور انہیں یہ آسمانی بشارت ملی کہ ان کی نسل دنیا میں پھلے پھولے گی، اسے نبوت کے خلعت سے سرفراز کیا جائے گا اور اس کے سر پر تاج سلطنت رکھا جائے گا۔ چنانچہ اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام کے حق میں وعدۂ ایزدی کا اعلان ان الفاظ میں ہوا کہ ہم اس پر اپنی برکتیں نازل فرماتے ہیں، ہم اس کی نسل میں بے حساب افزائش کریں گے، اس کے صلب سے بارہ تاجدار پیدا ہوں گے اور اس کی اولاد کو ایک عظیم الشان قوم کا درجہ عطا کیا جائے گا۔ (پیدائش باب 17، آیت 20، 21)

اسرائیلیوں نے نمارده کی غلامی سے آزاد ہو کر جب قرنہا قرن کے بعد اپنی فطرتِ منور کا روشن چہرہ خود مسخ کر لیا اور فراعنہ کا ملعون طوقِ عبودیت اپنی گردن میں ڈال لیا تو موسیٰ عمران کو بھیجا گیا کہ اس قیدِ گراں سے انہیں چھڑائیں۔ مصر سے ان کی یادگارِ زمانہ ہجرت، فرعون اور اس کے طاغوتی کو کبہ کی ان کے تعاقب میں مجنونانہ تگ و دو، خیل باطل کی موج دریا میں غرقابی، پرستارانِ حق کا چالیس سال تک وادیِ سینا کی آزاد ہواؤں کے آغوش میں پرورش پا کر از سر نو جہانبانی کا سلیقہ پیدا کرنا یہ سب واقعات بتا رہے ہیں کہ وہ جو حامل تورات تھا، صرف غلامی کے خلاف جہاد کرنے، زیردستوں کو زبردست بنانے اور کائنات انسانی کو آزادی کے گر سکھانے آیا تھا۔

کئی صدیاں اور گزر گئیں پرانے نمردوں اور فرعونوں کی جگہ نئے نئے قیصروں نے لے لی جنہوں نے کروڑوں آزاد انسانوں کے کانوں میں حلقہ غلامی ڈال دیا۔ اب عیسیٰؑ ابن مریم آئے اور جو فرض ان کے جلیل المرتبت پیشرو نے فراعنہ کی سرکوبی سے انجام دیا تھا، وہی فرض انہوں نے قیاصرہ کی رگِ گردن میں استرخا پیدا کر کے اپنے عہد کے مظلوم انسانوں کو دعوتِ حریت دینے سے پورا کرنا چاہا۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے اس زمانہ کی مفلوک الحال اور جفا زدہ انسانیت کے سر

کے لیے آسمانی سلطنت کا تاج تجویز فرمایا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس وقت کے بڑے بڑے جغادری یہودی ٹوڈیوں نے روما کے بھرے دربار میں ان پر یہ الزام لگایا کہ وہ عامۃ الناس کو رومۃ الکبریٰ کے خلاف بغاوت پر ابھار رہے ہیں اور آسمانی سلطنت کا نہیں بلکہ دنیوی سلطنت کا ڈول ڈال رہے ہیں۔ جس سلطنت کی خواہش ان کی طرف سے ظاہر ہوئی، دنیوی ہو یا دینی، آسمانی ہو یا زمینی، لیکن بہرحال وہ سلطنت ضرور تھی، اغیار کی محکومی وغلامی نہ تھی۔

زمانہ کے پل کے نیچے دریائے حوادث کی چھ سو گونا گوں موجیں آزادیٔ انسانی کو خس و خاشاک کی طرح بہاتی ہوئی دور نکل گئیں اور وقت آ گیا کہ حریتِ کاملہ کے ادبستان کا وہ آخری معلم جس کے ظہور نے خلیل اللہ کی دعاؤں کی گود میں پرورش پا کر روح اللہ کی نویدوں کے گہوارہ میں تربیت حاصل کی تھی، افق بطحا پر آفتاب عالم تاب بن کر چمکے جس کی ایک ہی نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی تجلی غلامی کی ظلمتوں کے بادل کو چیر کر ربع مسکوں کو مطلع الانوار بنا دے۔

رونق بزمِ دودۂ آدم صلی اللہ علیہ وسلم
خواجہ گیہان سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم
جادہ شناسِ منزلِ وحدت جلوہ نمائے نورِ حقیقت
ہادی اکبر مصلحِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم
خیرِ ممثل فصلِ مجسم صورتِ احساں پیکرِ رحمت
آیۂ لطفِ ربک الاکرم صلی اللہ علیہ وسلم
ہوگئی اس پر ختم رسالت دیتے گئے ہیں جس کی شہادت
موسیٰؑ، عمرانؑ، عیسیٰؑ، مریمؑ، صلی اللہ علیہ وسلم
خیل ملک تھا اس کے جلو میں یعنی قضا کا رخش تھا رو میں
تا کہ جہاں ہو درہم برہم، صلی اللہ علیہ وسلم
کہتے ہیں جس کو سطوتِ کبریٰ وہ اک اس کی مشق سراپا
گردنِ ہرقل جس سے ہوئی خم، صلی اللہ علیہ وسلم
جیت گئے اسلام کے غازی ہر گئی آخر کفر کی بازی
جھک نہ سکا توحید کا پرچم، صلی اللہ علیہ وسلم

اس کی غلامی نے ہمیں بخشا تاجِ سکندر فرّ دارا
کوکبۂ کے مرتبۂ جم، صلی اللہ علیہ وسلم
سب سے اونچا پایہ ہے اس کا اور ترے سر پہ سایہ ہے اس کا
ملتِ بیضا پھر تجھے کیا غم، صلی اللہ علیہ وسلم

رحمتِ عالمیان صفوت آدمیان تتمہ دور زمان محمد مصطفیٰ واحمد مجتبیٰ ﷺ **(بابی انت و أمی یا رسول اللّٰه)** مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کے مظلوم انسانوں کے پاؤں سے ابد الاباد تک کے لیے غلامی کی بوجھل زنجیریں کاٹ ڈالنے کے لیے تشریف لائے اور تیئیس سال کی قلیل مدت میں جو تاریخ عالم کے بالمقابل ایک لمحہ کا حکم رکھتی ہے، کائنات انسانی میں وہ محیر العقول انقلاب برپا کر گئے جو آج تک کسی ابن آدم کے حصہ میں نہیں آیا اور نہ تا قیامِ قیامت آئے گا۔ حضور ﷺ کے سحر جلال کے ایک کرشمہ نے پست کو بلند اور بلند کو پست کر کے بنی آدم کے لیے مساوات کا وہ بوریائے بے ریا بچھا دیا جس پر شتربانان جہاں بانوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھے نظر آئے۔ کالی کملی والے فقیر زرین قبا کج کلاہوں کے ہم نشیں دکھائی دیتے۔ آقا و غلام کی تمیز یکسر اُٹھ گئی بلکہ غلامی اور بادشاہی دو مترادف الفاظ بن گئے۔ آج وہ آسمانی جادو جس کے ڈورے آپ ﷺ نے انسان کے دل پر آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے ڈالے تھے، اب بھی بدستور کرشمہ سنج ہے اور قرآن حکیم ان کو جنہیں اس زمانہ کے اکاسرہ وقیاصرہ نے اپنے استعباد کی فولادی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے، مخلصی کی بشارت ان نورانی الفاظ میں دے رہا ہے:

- **وعد اللّٰه الذين امنوا منكم وعملوا الصلحت ليستخلفنهم فى الارض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذى ارتضى لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم امنا۔** (النور:55)

خدائے پاک کا تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو صاحب ایمان ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں، یہ وعدہ ہے کہ وہ انہیں دنیا میں اسی طرح صاحب تاج ونگین بنائے گا جس طرح اور پہلی قوموں کو یہ انعام دے چکا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اس مسلک قدیم کی بنیاد کو جو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے، مضبوطی سے استوار کرے گا اور ان کے دلوں کے خوف کو تسکین خاص سے بدل دے گا۔

حکومت اور سلطنت کا یہ آسمانی وعدہ غیر سماوی الاصل وعدوں کی طرح نسل یا رنگ یا زبان یا وطنیت یا مزدوری یا سرمایہ داری کی قیود سے مقید نہیں بلکہ ابرِ نور بہار کی طرح جس کے حیات افزا چھینٹے کوہ وصحرا، باغ وراغ، مرغزار وریگزار پر یکساں برستے ہیں۔ اس کا احسان بھی اسود واحمر، ابیض واصفر، ایشیائی وارو پائی، مفلس وغنی، اموالی واعالی کے لیے عام ہے، شرط صرف ایمان اور عمل صالح کی ہے۔ اس کے بعد ہر شخص میثاق ایزدی کی رو سے کاملاً آزاد اور علی قدرِ مراتب حکومت کا حصہ دار ہے۔ بنی آدم کے لیے بارگاہ راہب العطایا سے یہ گنج شایگاں صرف حضرت محمدِ عربی ﷺ ہی لا سکتے تھے۔

آزادی اور سلطنت جیسی بیش بہا نعمتوں کا میسر ہونا جب ایمان اور عمل صالح پر موقوف ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ ایمان کا نفس کی کس انفعالی کیفیت اور عمل صالح کا اعضا و جوارح کے کس فاعلی ملکہ پر انحصار ہے۔ اس دلکشا نکتہ کی شرح کے لیے تو کئی دفتر بھی کم ہیں لیکن اگر دجلہ کو کوزہ میں بند کرنا ہو تو صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہوگا کہ ایمان ماسوا سے کٹ کر معبودِ حقیقی سے جڑ جانے کا نام ہے اور عمل صالح خدا کے رستے میں کٹ مرنے کی استعداد کو کہتے ہیں جس کے لیے شریعت غرائے مصطفویٰ علی صاحبا الصلوٰۃ نے جہاد کی عالم آشوب اصطلاح وضع کی ہے۔ وہ جو اپنے پروردگار کی راہ میں موت سے جی چراتا ہو اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر خاک وخون میں تڑپنے کے لیے تیار نہ ہو، کوئی حق نہیں رکھتا کہ آزادی کا نام بھی زبان پر لائے اور سلطنت کی تمنا کو دل میں جگہ دینے کا تصور بھی کرے۔ خود خواجہ کونین علیہ الف الف تحیاۃ کی ساری زندگی اس حقیقتِ کبریٰ کی جیتی جاگتی شرح ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میری دلی آرزو ہے کہ میرا سر میدان جہاد میں تن سے جدا ہو جائے اور پھر جڑ جائے اور پھر جدا ہو جائے اور پھر جڑ جائے اور پھر جدا ہو جائے۔ سارا قرآن ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ارشادِ اقدس کے مطابق حضور سرورِ کون ومکانؐ کی حیاتِ طیبہ کی بولتی چالتی تصویر ہے، فرضیت جہاد سے بھرا پڑا ہے۔ مروارید کے اس درخشاں گنجینہ سے چند موتی رولتے جایئے۔

- ❑ **یایھا النبی جاھد الکفار والمنفقین واغلظ علیھم وماوھم جھنم وبئس المصیر۔(التحریم:9)**

اے پیغمبر (ﷺ) حق کے منکروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کرو اور ان پر اس قدر سختی

کر کہ ان کا قافیہ تنگ ہو جائے۔

آگے چل کر اسی سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

❑ **فرح المخلفون بمقعدھم خلف رسول اللّٰہ وکرھوا ان یجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللّٰہ وقالوا لاتنفروا فی الحر قل نار جھنم اشد حرا لو کانوا یفقھون۔**(التوبہ:81)

جو لوگ غزا کے لیے رسول اللہ کے ہمراہ نہیں گئے بلکہ عورتوں کی طرح گھروں میں بیٹھ رہے ہیں اور اپنے مال و جان اللہ کے رستے میں قربان کرنے سے جی چراتے ہیں، وہ جی ہی جی میں خوش ہو رہے ہیں کہ اس مصیبت سے سستے چھوٹے اور دوسروں کو بھی یہ کہہ کر گمراہ کر رہے ہیں کہ اس بلا کی گرمی میں کیوں میدانِ جہاد کا رخ کرتے ہو۔ اے پیغمبر (ﷺ)! ان سے کہہ دو کہ تم دھوپ ہی کی تیزی سے گھبراتے ہو۔ کاش تمہیں یہ معلوم ہوتا کہ فریضۂ جہاد سے پہلو تہی کرنے کا نتیجہ جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہے جس کے التہاب کے آگے سورج کی حرارت کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ باتیں اگر تم لوگوں کو معلوم ہوں تو یوں کھلکھلا کر نہ ہنسو بلکہ دھاڑیں مار کر اپنے نصیبوں کو روؤ۔

ایک اور مقام پر نہایت جامعیت کے ساتھ اس حقیقت کی شرح کی گئی ہے کہ عقبٰی میں فوزِ عظیم اور دنیا میں حکومت کا انعام اسی جماعت کو مرحمت ہو سکتا ہے جو اپنا مال اور جان خدا کی راہ میں قربان کرنے کی توفیق رکھتی ہو۔ سنئے۔

❑ **یایھا الذین امنوا ھل ادلکم علی تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم تؤمنون باللّٰہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللّٰہ باموالکم وانفسکم ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون O یغفرلکم ذنوبکم ویدخلکم جنت تجری من تحتھا الانھر ومسکن طیبۃ فی جنت عدن ذلک الفوز العظیم۔**(الصّف:11،12)

اے اربابِ ایمان! کیا تم کو بازارِ ہستی میں اس جنس کی خرید و فروخت کا راز بتایا جائے جو تمہارے سر سے غیر اللہ کی غلامی کا دردناک عذاب ٹال سکتی ہے۔ وہ راز یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو اگر تم کو فہم و فراست سے کچھ بھی حصہ ملا ہے۔ تو یہی شیوۂ ایثار تمہارے حق میں موجب فلاح ہے۔ اس مجاہدانہ تگ و دو کا یہ نتیجہ ہوگا کہ تمہارے گناہوں پر یک قلم خطِ عفو کھینچ دیا جائے گا، تم کو جنت الفردوس میں جگہ ملے

گی جہاں تمہاری تفریح کے لیے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور تمہارے رہنے کو دلکشا قصر وایوان ہوں گے کہ یہی فوزِ عظیم ہے۔ لیکن یہ تو دوسری دنیا کی باتیں ہیں تم چاہتے ہو گے کہ اس دنیا ہی میں تمہاری قربانی کا صلہ تم کو کسی ایسی شکل میں مل جائے جو تمہیں نہایت ہی پیاری ہے۔ سو ہمارے ہاں اس کی بھی کمی نہیں۔ گھروں سے ہماری راہ میں زر بکف اور سر بکف ہو کر نکلو پھر تم دیکھ لو گے کہ خدا کی نصرت تمہارے سروں پر سایہ افگن ہے اور فتح و کامرانی تمہارے قدم لینے کے لیے بڑھ رہی ہے۔ اس سے زیادہ خوشخبری تمہارے لیے اور کیا ہو سکتی ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کے اسوۂ حسنہ پر جو مختصر سا تبصرہ میں نے کیا ہے، اس سے اربابِ بصیرت نے بیک نظر دیکھ لیا ہوگا کہ یہ نفوسِ قدسی انسان کے لیے صرف ایک پیغام لائے اور وہ پیغام یہ تھا کہ ابن آدم کو ماسوا کی محبت اور خوف سے تعلق توڑ کر نیا رشتہ الفت وخشیت صرف اپنے پروردگار سے جوڑنا چاہیے کہ آزادی اور نیابت الٰہی یعنی سلطنت جو انسان کی دلی آرزوؤں کا منتہا ہے، اسی تعلق کو برقرار رہنے سے حاصل ہو سکتی ہے اور یہ تعلق اسی صورت میں برقرار رہ سکتا ہے جب انسان خدا کی راہ میں اپنا مال و دولت لٹا دینے اور اپنی جان پر کھیل جانے کے لیے ہر وقت تیار رہے، اسی کو جہاد کہتے ہیں اور اگر جہاد کی تعلیم دنیا سے مٹ جائے تو آزادی اور حکومت کے امکانات بھی صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح محو ہو جائیں۔

رسول اللہ ﷺ پر نبوت ختم ہوگئی، حجت حق کے دروازے بند ہو گئے، عرش سے رب العالمین پکارا **الیوم اکملت لکم دینکم**، فرش سے نبی اکرم نے اس اکملت پر مہر تصدیق و توثیق ثبت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ **لانبی بعدی**۔ چالیس کروڑ انسانوں کی گردنیں ان سماوی وارضی ارشادات کے آگے جھک گئیں اور رہتی دنیا تک جھکی رہیں گی۔ لیکن صنم کدۂ ہند کے ایک غیر معروف گوشہ سے نخوت و پندار کے ایک بت نے یکا یک سر اٹھایا اور خدا کے فیصلہ سے روگرداں ہو کر رسول اللہ ﷺ کے فرمودہ کو پائے استحقار سے ٹھکرا کر ملت بیضا کے سیزدہ صد سالہ عقیدہ کا مضحکہ اڑا کر طول وعرض مشرق میں اعلان کر دیا کہ نبوت ہرگز پیغمبر عرب پر ختم نہیں ہوئی۔ الہام کا جبرائیلی دریچہ چودھویں صدی میں رب کعبہ نے میرے لیے ازسرنو کھول دیا ہے۔ میں اس عہد کا نبی ہوں۔ جو باتیں تمام انبیاء وصلحا میں تھیں، وہ سب مجھ میں جمع ہیں بلکہ میں ان سے بعض باتوں میں افضل ہوں۔ عیسیٰ کہاں ہے جو میرے منبر پر پاؤں رکھنے کا شرف حاصل کرے،

حسین ابن علیؓ کی حقیقت ہی کیا ہے، ایسے سینکڑوں حسینؓ میرے گریبان کے ایک گوشتہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ سامی الاصل انبیا تو ایک طرف رہے، آریائی النسل پیغمبروں کا نام بھی میری وجہ سے اچھلا ہے۔ میں جہاں محمدؐ عربی کا بروز ہوں، وہاں کرشن گوکلی کا بھی اوتار ہوں۔ مجھ پر جو شخص ایمان نہ لائے گا، وہ مردودِ ازلی ہے، مخذولِ سرمدی ہے، کافر ہے، ملحد ہے، شقی ہے، ملعون ہے۔ آؤ اور میری شریعت کی شمع سے لو لگاؤ تا کہ چودہ طبق روشن ہو جائیں۔ کعبہ جا کر کیا لوگے، قادیان میں آؤ تا کہ دوا ملے، شفا ملے اور امان ملے۔ محمدؐ عربی کی شریعت جس کی جان مسئلہ جہاد تھا، تقویم پارینہ ہو چکی جو آج کام نہیں آسکتی۔ آج دولت بہیہ برطانیہ ربع مسکوں کے بڑے حصہ پر سایہ افگن ہے اور اس کی موجودگی میں کسی اسلامی سلطنت کے قائم رہنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ یہ وحشی اور سفاک سلطنتیں جہاد جیسے خونی اور جاہلانہ عقیدہ کو دنیا میں پھیلا کر امن عالم کو درہم برہم کرتی رہتی ہیں۔ میں آیا ہی اسی لیے ہوں کہ اس ناپاک عقیدہ کو دنیا سے مٹا دوں اور سارے مسلمانوں اور ہو سکے تو ساری نامسلمان دنیا کی گردنیں آقائے برطانیہ کے آستانۂ جلال و جبروت پر جھکا دوں۔ میری ساری عمر ان جاہلوں کو جو جہاد جہاد پکارتے ہیں، انگریزوں کی وفاداری کی تعلیم دینے میں گزری ہے اور مجھے اس پر ناز ہے۔

حاصلِ عمر نثارِ رہَ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

(ٹوڈی جون)

(زمیندار 14 جون 1929ء)

علامہ اقبالؒ اور قادیانیت

اس سرمدی حقیقت کا تکرار مسلمان کے ایمان کو ہر بار ایک نئی تازگی بخشتا ہے کہ حضور خیر البشر ﷺ (**بابی انت و اُمی یا رسول اللّٰہ**) کے وصال مبارک کے ساتھ بنی آدم پر حق کی حجت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ فطرت انسانی کو ذہنی، اخلاقی اور روحانی عروج کے انتہائی نقطہ پر پہنچانے کے لیے خدائے بزرگ و برتر کی ارحم الراحمینی نے جو آسمانی ضابطہ مرتب کیا تھا، کامل و مکمل ہوگیا۔ جو نعمتیں انسان کو اپنے پروردگار کی طرف سے ملنے والی تھیں، اُن میں کسی مزید اضافہ کی گنجائش باقی نہ رہی یعنی اس کی دینی و دنیوی فلاح کا وہ دستور العمل جس کا جامع نام اسلام ہے، اپنی آخری شکل میں اس کے سامنے آ گیا۔ رب العالمین کے اسی احسان عمیم، اسی انعام عظیم کا نام ختم نبوت ہے جو ملت بیضا کے اوراق کی شیرازہ بند اور اس کی حیات جاودانی کی سرمدیت کی ضامن ہے۔ جس زادۂ توحید کو مبدء فیاض سے سوچنے اور سمجھنے کی کچھ بھی توفیق ارزانی ہوئی ہے، اس کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے بعد نبوت کا سلسلہ بدستور جاری رہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا کا آخری پیغام جسے حضور ﷺ نے اس کے بندوں تک پہنچایا، ہنوز تشنہ تکمیل تھا، ابھی انسان کو اپنی دنیوی فلاح اور اخروی نجات کے لیے کسی نئی ہدایت، کسی جدید راہنمائی کی ضرورت تھی اور اس شریعت پر جس کے آخریں علم بردار حضور خواجہ دو جہاں ﷺ تھے، کسی نئی شریعت کا اضافہ ہونے والا تھا۔ ظاہر ہے کہ نبوت کے ارتقاء جاری کا یہ امکان اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر مسلمانوں کی قومی وحدت اور ان کے نظام اجتماعی کا پارہ پارہ ہو جانا چند دن کی بات ہے۔ اسی خطرہ کو حضور سرور کون و مکان ﷺ کی چشم جہاں بیں نے جس کے لیے علام الغیوب کے فیضان نہائی نے سرا پردۂ غیب کا ایک گوشہ سرکا دیا تھا، پہلے سے دیکھ کر اپنی امت کو متنبہ کر دیا کہ **انه سیکون فی امتی کذابون ثلثون کلهم یزعم انه نبی و انا خاتم النبیین لا نبی بعدی.** (مسلم)

یہ شرف پنجاب کی قسمت میں لکھا تھا کہ اس کی الحاد پرور خاک سے ایک شخص جس کا

نام مرزا غلام احمد قادیانی ہے، اٹھے اور از راہ غایت شوخ چشمی یہ دعوے کر دے کہ نبوت محمد مصطفےٰ ﷺ پر ختم نہیں ہوئی بلکہ بدستور جاری ہے اور میں اس زمانہ کا نبی ہوں جس پر وحی آتی ہے اور جس کا کلام قرآن مجید کی طرح خطا سے پاک اور لغزشوں سے منزہ ہے اور جو مجھ پر ایمان نہ لائے، وہ صحیح معنوں میں مسلمان نہیں ہوسکتا۔ اسی کے ساتھ اس شخص نے کلام اللہ کی آیات کو من مانی تاویلوں اور سوچی سمجھی ہوئی تحریفوں سے کچھ کا کچھ کر دیا۔ رسول اللہ کی شریعت غرا کے احکام کو اپنی خرافات واہیہ کا بازیچہ بنا دیا اور امت محمدیہ علیٰ صاحبا الصلوٰۃ میں ایک ایسا خوفناک فتنہ پیدا کر دیا کہ دنیائے اسلام کے طول وعرض میں شور قیامت بپا ہوگیا۔ اس شخص نے دنیا کے ستر کروڑ مسلمانوں کو جو اس کے مزخرفات لایعنی کے منکر تھے، بیک کشش قلم دائرہ اسلام سے خارج کر دیا اور اپنی مٹھی بھر جماعت کو جس کی تعداد اس کے انوکھے دعوے کے بعد سے لے کر اس وقت تک کلھم چھپن ہزار تک پہنچی ہے، اسلام کا واحد اجارہ دار قرار دیا۔

ہندوستان میں اگر حکومت اسلامی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ملت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس قسم کا خطرناک ملحد جو نہ خدا کا قایل ہو، نہ قرآن کا اور جو حطام دنیوی کی خاطر اسلام کی سیزدہ صد سالہ روشن حقیقتوں کو جھٹلانے اور مسلمانوں کی مجاہدانہ فطرت کو غلامانہ دنائت کے زہریلے جراثیم سے آلودہ کرنے میں ذرا باک نہ کرتا ہو، یوں کھلے بندوں چھوڑ دیا جاتا، لیکن مسلمانوں کی شومئی قسمت اور اس کی خوبی تقدیر سے حکومت اغیار کی تھی جسے مسلمانوں کی تہذیب اور مسلمانوں کی نفسیات سے طبعًا کچھ بہت زیادہ ہمدردی نہ ہوسکتی تھی۔ مرزا قادیانی کی عیاری نے حکومت کو باور کرا دیا کہ صرف مرزائی ہی اس کے وفادار ہوسکتے ہیں جن کا مذہب اس وفاداری کو جزو ایمان قرار دیتا ہے۔ باقی تمام وہ لوگ جو مسلمان کہلاتے ہیں، اگر بالفعل باغی نہ ہوں تو بالقوۃ ضرور باغی ہیں اور ان کی بغاوت کے استقبالی خطرہ سے بچنے کی یہی سبیل ہوسکتی ہے کہ تمام مسلمانوں کو مرزائیت کا حلقہ بگوش بنا دیا جائے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، قادیانیت کا یہ خطرہ میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا اور میری ساری عمر اس ہولناک فتنہ کا مقابلہ کرنے میں گزری ہے۔ مسلمانوں نے اول اول قادیانی خطرہ کو کچھ بہت زیادہ اہمیت نہ دی۔ علمائے امت نے اتنا ضرور کیا کہ جس طرح مرزا غلام احمد قادیانی نے ان کو اور باقی تمام مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا، اسی طرح

انہوں نے بھی اس پر اور اس کی امت قلیل الانفار پر کفر کا فتویٰ لگا دیا یا اس کے مایہ ناز مسئلہ ممات مسیح پر اس کے ساتھ اور اس کے اتباع و اعوان کے ساتھ ہنگامہ خیز مناظرے کر لیے۔ لیکن زہر کا یہ تریاق کچھ بہت زیادہ سودمند ثابت نہ ہوا اور مرزائیوں کا پروپیگنڈا اس مذہبی رواداری کے سایہ میں جس کا حکومت وقت کو ادعا ہے، پروان چڑھتا رہا۔

آخر میرے شور وغل اور میرے رفقا کی ہائے وہو نے عام مسلمانوں کی آنکھیں کھولیں اور جب حکومت نے مرزائیت کی پیٹھ پر علی الاعلان تھپکیاں دینی شروع کیں تو ان کو صاف نظر آنے لگا کہ جس فتنہ سے انہیں پالا پڑا ہے، وہ کس قدر ہولناک ہے۔ میں پہلے دن سے پکار رہا ہوں کہ فرقہ ضالہ مرزائیہ جو اسلام کے نام پر مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے میں شب و روز مصروف ہے، ہرگز یہ حق نہیں رکھتا کہ اس کا شمار مسلمانوں میں ہو بلکہ سکھوں، پارسیوں، عیسائیوں اور دوسری اقلیتوں کی طرح اس فرقہ کا شمار بھی سرکاری کاغذوں میں ایک جداگانہ اقلیت کے طور پر ہونا چاہیے۔ جب حکومت کی امپیریل مصلحتوں نے چودھری ظفر اللہ خاں قادیانی کو جس کے عقیدہ میں تمام مسلمان مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی نہ ماننے کی بنا پر دائرہ اسلام سے خارج ہیں، وائسرائے کی کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا تو ''زمیندار'' نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ قادیانی فتنہ اب خطرناک تر ہونے والا ہے۔ چنانچہ طول وعرض ہند میں اس کے خلاف احتجاج ہوا مگر حکومت کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور چودھری ظفر اللہ خاں کا تقرر عمل میں آ ہی گیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک مسلمان برابر پکار رہے ہیں کہ قادیانیوں کا اسلام سے ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ انہیں ایک جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے، حکومت ان کے ساتھ ایک غیر مسلم اقلیت کی حیثیت سے جو مراعات چاہے کرے لیکن انہیں اسلام کا نمائندہ سمجھ کر نہ کرے اس لیے کہ مسلمانوں سے ان کا کسی قسم کا کوئی واسطہ نہیں۔

مسلمانان ہند کا یہ سارا شور حکومت کے بہرے کانوں پر پڑا۔ اس اہم مسئلہ پر جس نے مسلمانوں کو ایک عرصہ سے بے چین کر رکھا ہے، اگر اس نے کبھی لب کشائی کی ضرورت بھی محسوس کی تو مسلمانوں کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ سارا شور غیر ذمہ دار اور متعصب لوگوں کا بپا کیا ہوا ہے۔ مسلمانوں کا ذمہ دار اور فہیم طبقہ مرزائیوں کو پکا مسلمان سمجھتا ہے۔

آخر وہ وقت بھی آیا کہ حکومت کی نگاہ میں جو لوگ ذمہ دار اور فہیم اور غیر متعصب تھے، انہوں نے عامہ مسلمین کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے لگی لپٹی رکھے بغیر حکومت

کو جتا دیا کہ قادیانیت ایک بالکل جداگانہ مذہب ہے جسے اسلام سے کوئی واسطہ نہیں اور اگر حکومت نے قادیانیوں کو ایک علیحدہ اقلیت قرار دینے میں کوتاہی کی تو مسلمانوں کا یہ شبہ یقین کے درجہ کو پہنچ جائے گا کہ حکومت مسلمانوں کی وحدت ملی کو پارہ پارہ ہوتا ہوا دیکھنے کی خود متمنی ہے۔

خدا بھلا کرے علامہ اقبال کا جن کے حکیمانہ بیان نے ان ساری حقیقتوں کو بکمال شرح وبسط الم نشرح کر کے مسلمانانِ ہند کی ایک ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی جس کا صلہ انہیں حضور سرورکون ومکان ﷺ کی ختم المرسلینی ہی کی بارگاہ سے مل سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کا یہ دعویٰ کہ ختم نبوت کا عقیدہ جو دین حجازی کے آغوش میں پرورش پا کر ملت بیضا کی وحدت و اکتناز کا حصارِ عافیت بن گیا، بنی آدم کی ثقافت کی تاریخ میں اپنے اچھوتے پن کے لحاظ سے اپنا جواب آپ ہے۔ایک روشن وتابناک حقیقت ہے جسے تاریخ آج تک نہیں جھٹلا سکی۔توحید اور رسالت کا صحیح تصور دنیا کے سامنے پیش کرنے کی توفیق صرف سامی تہذیب کو میسر ہوئی ہے۔ یہ تہذیب جس کا دور ابوالانبیا حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت سے شروع ہوتا ہے، کوئی پانچ ہزار سال پرانی ہے اور اس کی ورق گردانی سے مذہب کے طالب علم کو یہ پتہ تو چلتا ہے کہ ہر نبی نے جو خدائے بزرگ و برتر کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے کے لیے من جانب اللہ مامور ہوا، اس پیغام کی تکمیل کے لیے اپنے کسی جانشین کے آنے کی پیشین گوئی کی اور اس کی امت اپنے قوائے ذہنی واخلاقی وروحانی کو درجہ کمال تک پہنچانے کی امید میں کسی آنے والے نبی کی آمد کی منتظر رہی۔لیکن ہزار جستجو کے بعد بھی اس واقعہ کا سراغ ابداً نہیں ملتا کہ کسی رسول یا نبی نے یہ دعوے کیا ہو کہ دین کامل ومکمل ہو گیا، حق کی حجت تمام ہو گئی اور میرے بعد ابدآلاباد تک کے لیے نبوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ یہ دعویٰ انسان نے آج سے کوئی ساڑھے تیرہ سو سال پہلے اول اول وادی بطحا میں سنا، جب کائنات کا ذرہ ذرہ اس آسمانی حقیقت کی شہادت دیتا ہوا پایا گیا کہ **ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول الله و خاتم النبیین.**

ابراہیم آذر آئے اور دنیا والوں کو یہ خوشخبری دیتے گئے کہ:

❑ ''اور اسمٰعیل کے حق میں بھی میں نے تیری دُعا سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے بارآور کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔'' (تورات کتاب پیدائش باب 17 فقرہ 20، 21)

موسیٰ عمران آئے اور دین قیم کے نور کے اتمام کا مژدہ اہل عالم کو یہ کہہ کر سناتے گئے کہ:

- ’’خداوند جو تیرا خدا ہے، تیرے بھائیوں میں سے تیرے لیے ایک نبی میری مانند پیدا کرے گا۔ تم اس کی سنیو اور خدا نے مجھ سے کہا کہ میں تیرے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی پیدا کروں گا۔ میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ جو کچھ میں حکم دوں گا، وہ میرے نام سے ان کو سنائے گا۔ اور ایسا ہو گا کہ جو کوئی میرا کلام جو وہ نبی کہے گا، نہ سنے گا، میں اس سے مواخذہ کروں گا۔ مگر جو نبی ایسی دلیری کرے گا کہ میری طرف وہ احکام منسوب کرے گا جس کی نسبت میں نے حکم نہیں دیا یا میرے سوا کسی اور معبود کی نسبت گفتگو کرے گا، وہ نبی ہلاک کیا جائے گا‘‘۔

(استثناء باب 18 فقرات 15، 18، 19 تا 20)

عیسیٰ مریم آئے اور جب گئے تو اپنی امت کو یہ بشارت دیتے گئے کہ:

- ’’میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے ضرور ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو فارقلیط نہیں آئے گا مگر اگر میں جاؤں تو میں اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا‘‘۔

(انجیل یوحنا باب 16 فقرہ 7)

اسی قسم کی اور بیسیوں منقولی شہادتوں سے جن پر معقولی دلائل کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت آفتاب عالمتاب کی طرح روشن ہے کہ امم عالم کی کم از کم چار ہزار سال کی تاریخ میں ختم نبوت کے عقیدہ سے کسی قوم کا دماغ آشنا نہیں ہوا۔ اس عقیدہ کے عالم وجود میں آنے کا ایک وقت مقرر تھا۔ وہ ساعت موقوت حضور خواجہ کون ومکان ﷺ کے مسند رسالت پر فائز ہونے کے ساتھ آئی جو حق کے نقطۂ اوج اور باطل کے نقطہ حضیض پہ پہنچنے کی ساعت تھی۔

ختم نبوت کے اس عقیدہ کو جھٹلانے کی جرأت اس ساڑھے تیرہ سو سال کے عرصہ میں اگرچہ متعدد پرستاران طاغوت کو ہوئی ہے لیکن اس جرأت کا سب سے زیادہ بے باکانہ مظاہرہ آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی قلیل الانفار ذریت کی طرف سے ہوا اور میرا پختہ یقین ہے کہ اسی تکذیب کی پاداش میں طائفہ قادیانیہ جس کے نیم جان بدن میں حکومت وقت کے سیاسی مصالح نے تھوڑی بہت حرکت پیدا کر رکھی ہے، اپنے وقت پر اسی طرح گرد روزگار میں دب کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گا جس طرح اس سے پہلے دوسرے جھوٹے مدعیان نبوت اور ان کی امتیں نیست ونابود ہو چکی ہیں۔ (زمیندار 5 مئی 1935ء)

علامہ محمد اقبالؒ کی قادیانیت شناسی

(1)

’’یاد رہے کہ یہ حوا کا گناہ تھا کہ براہِ راست شیطان کی بات کو مانا اور خدا کے حکم کو توڑا اور سچ تو یہ ہے کہ حوا کا نہ صرف یہ ایک گناہ بلکہ چار گناہ تھے۔ایک یہ کہ خدا کے حکم کی بے عزتی کی اور اس کو جھوٹا سمجھا۔دوسرا یہ کہ خدا کے دشمن ابدی لعنت کے مستحق اور جھوٹ کے پتلے شیطان کو سچا سمجھ لیا۔تیسرا یہ کہ اس نافرمانی کو صرف عقیدہ تک محدود نہ رکھا بلکہ خدا کے حکم کو توڑ کر عملی طور پر ارتکابِ معصیت کیا۔چوتھا یہ کہ حوا نے نہ صرف آپ ہی خدا کا حکم توڑا بلکہ شیطان کا قائم مقام بن کر آدم کو بھی دھوکا دیا۔تب آدم نے محض حوا کی دھوکا دہی سے وہ پھل کھایا جس کی ممانعت تھی۔ اسی وجہ سے حوا خدا کے نزدیک سخت گناہگار ٹھہری مگر آدم معذور سمجھا گیا۔‘‘

(تحفہ گولڑویہ،ص 187 مندرجہ روحانی خزائن جلد 17 صفحہ 273 حاشیہ در حاشیہ از مرزا قادیانی)

مولانا عبدالحنان نائب ناظم جمعیۃ العلما پنجاب کی نظر سے جب وہ مرصع قصیدہ گزرا جو مرزا قادیانی آنجہانی نے ابوالبشر حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی رفیقۂ حیات کی شان میں بہ صفتِ غیر منقوط تصنیف فرمایا ہے تو بے اختیار پکار اٹھے کہ الٰہی تیری غیرت کو کیا ہوا۔لوگ تجھ پر بہتان باندھتے ہیں۔جو تو نے نہیں کہا، وہ تجھ سے منسوب کرتے ہیں اور تو ہے کہ ان کو اور ان کے لگے بندھوں کو اپنی بخششِ شدید کی آتشیں زنجیروں میں نہیں جکڑتا۔آدم وحوا علیہما السلام کا قصہ اپنی کلک قدرت سے سپردلوحِ محفوظ کرتے وقت تو یہ لکھتا ہے کہ **فازلھما الشیطن عنھا فاخرجھما مما کانا فیہ۔**(البقرۃ:36)

(پس شیطان نے ان دونوں کو پھسلا کر جنت سے نکال دیا)

مگر مرزائے قادیان تجھے یہ کہہ کر جھٹلاتا ہے کہ آدم کو تیری جنت سے نکالنے والا ابلیس لعین نہ تھا بلکہ اس مردودِ ازلی کی قائم مقام حوا تھی۔پھر اے رب کعبہ تو ہی بتا کہ ہم تیرے کلام کو سچ

سمجھیں یا غلام احمد قادیانی کے فرمودہ کو۔ مرزائے قادیانی کی امت بڑے فخر سے کہا کرتی ہے کہ ہمارے نبی نے قرآن کی جو تفسیر کی ہے، وہ طبری اور رازی کے فرشتوں کو بھی نہ سوجھی ہو گی لیکن جناب کی وسعت نظر ملاحظہ ہو کہ حضرت حوا علیہا السلام کو اپنی عادت کے مطابق گالیاں دیتے وقت کلام مجید کی اس آیت کو آپ نے نظر انداز فرما دیا کہ:

- **فتلقی اٰدم من ربه کلمٰت فتاب علیه انه هو التواب الرحیم.**

(البقرۃ:37)

(پس آدم نے اپنے پروردگار سے ایک دعا سیکھی جو مقبول ہوئی اس لیے کہ پروردگارِ عالم توبہ کا قبول کرنے والا اور اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے۔)

وہ دعا بھی ملاحظہ ہو:

- **ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخسرین.**

(الاعراف:23)

(ہمارے پروردگار۔ ہم نے (یعنی آدم و حوا دونوں نے) اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ پس اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم ٹوٹے میں رہیں گے۔)

یہ دعا جب قبول ہو چکی، جیسا کہ خود خداوند عالم و عالمیاں ارشاد فرماتا ہے، تو ظاہر ہے کہ آدم و حوا کی لغزشوں پر بارگاہ خداوندی سے قلم عفو کھینچ دیا گیا اور دونوں کا شمار اس کے بعد سے اور اپنے آئندہ صالحانہ طرز عمل کے لحاظ سے، صلحا و اتقیا میں ہو گیا۔ ایسی حالت میں حضرت حوا کو شیطان کا قائم مقام قرار دینا اور دنیا جہان کے گناہوں کی گٹھڑی ان کے سر اقدس پر لاد دینا مرزا قادیانی جیسے منہ پھٹ شخص ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ خدا کلام کرتا ہے اور جبرئیل کو ہمارے پاس بھیجتا ہے اور ہم اس مقام پر جا پہنچے ہیں کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ **نعوذ باللّٰہ من تلک الھفوات و الخرافات۔**

علامہ اقبال کے سامنے جب اگلے دن حضرت حوا علیہا السلام کے باب میں قادیانیوں کے قبلہ و کعبہ کا یہ عقیدہ پیش کیا گیا تو علامہ ممدوح نے چمک کر کہا کہ یہ وہی حوا ہے جس کی ایک نواسی محمدی بیگم کی خاطر آپ نے کئی ایک شکم زاد الہام سپرد کاغذ کیے۔ جب الہام پورے نہ ہوئے تو ان کی بیسیوں خندہ آفریں تاویلیں کیں اور بالآخر خسر الدنیا والآخرہ ہو کر راہ گرائے دار البوار ہو

گئے اور پھر یہ وہی حوا ہے جس کی بیٹیوں نے آپ کے خلف الصدق مرزا بشیر الدین محمود سے فلسفہ مشی فی النوم کے اسرار و خفایا پر ان گنت رنگیلی شرحیں لکھوائیں۔ شیطان کی قائم مقامی کا فرض تو انجام دیں مرزائی اور الزام اس شیطنت کا چپکا دیں تمام انسانوں کی ماں کے سر۔ معلوم نہیں قادیانی کس قسم کے انسان ہیں اور کس حوا کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں؟

(2)

حضرت حوا اور متنبّی قادیان

ابوالبشر آدم صفی اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی رفیقہ حیات حضرت حوا علیہا السلام کے باب میں مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی کا گھناؤنا عقیدہ زمیندار کی کسی گزشتہ اشاعت میں قارئین کرام کی طبیعت کے لیے تنغض کا سامان بہم پہنچا چکا ہے۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ علامہ اقبال نے اس ناپاک عقیدہ سے اپنی بیزاری کا اظہار سختی سے کیا تھا جسے راقم الحروف نے اپنے الفاظ میں درج کر دیا۔ جن صاحب کی روایت کی بنا پر یہ سارا واقعہ سپرد قلم کیا گیا، انھیں راقم کے قلم سے شکوہ ہے کہ وہ شاید موضوع کی رنگینی کی سفارش پر کسی قدر شوخ ہو گیا۔ ان کی خواہش ہے کہ علامہ اقبال کے اصل الفاظ کو علامہ ممدوح ہی کی خشک حکیمانہ متانت کے لباس میں دنیا والوں کے کانوں تک پہنچا دیا جائے۔ مجھے امتثال امر میں کوئی عذر نہیں۔

راوی کا بیان ہے کہ جب علامہ اقبال کو ''تحفہ گولڑویہ'' مصنفہ متنبّی قادیان کی وہ عبارت پڑھ کر سنائی گئی جس میں اس مفتری علی اللہ نے قرآن کریم کی آیات کو جھٹلاتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حوا نے شیطان کی قائم مقام بن کر آدم کو جنت سے نکال دیا اور علامہ ممدوح سے استفسار کیا گیا کہ ایسا عقیدہ رکھنے والے شخص کے حق میں آپ کی کیا رائے ہے تو انھوں نے فرمایا:

''یہ عقیدہ مسلمانوں کا تو نہیں البتہ عیسائی ضرور ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ رہے مرزا غلام احمد قادیانی، سو تعجب ہے کہ عورت ذات کے ساتھ ان کے تعلقات کی عمر بھر کی نوعیت نے کس طرح گوارا کیا کہ حضرت حوا کو ایسے نازیبا الفاظ سے یاد کیا جائے۔ اور یوں بھی کسی شریف النفس انسان کا جذبۂ مروت و فتوت صنف نازک پر ایسے رکیک حملہ کی تاب نہیں لاسکتا۔''

اسی انداز میں چند باتیں علامہ اقبال کی زبان سے مرزا قادیانی آنجہانی کے بیٹے کی نسبت بھی صادر ہوئیں جو اس وقت ذہن سے اتر گئی ہیں۔ بہرحال یہ بات تو متحقق ہو گئی کہ متنبّی

قادیان کے عقائد کو مسلمانوں کے عقائد سے دور کا انتساب بھی نہیں۔ نصرانیت کی ترجمانی کا ڈھنگ البتہ انھیں خوب آتا ہے۔

ہمارے علمانے قادیانیوں کو ان کے باطل عقائد کی بناپر دائرہ اسلام سے خارج کرنے میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا لیکن بوالعجبی ملاحظہ ہو کہ کسی سر برآوردہ قادیانی کا ذکر آتا ہے تو وہ بلا تکلف اسے ''مولوی'' یا ''مولانا'' کے لقب سے ملقب فرما دیتے ہیں مثلاً اگر وہ اندلسی قادیانیوں کے امام مسٹر محمد علی کا نام لیں گے، جو مسلمانوں کو ''ذریۃ البغایا'' قرار دینے میں اور علمائے امت پر گالیوں کا جھاڑ باندھنے میں اپنے کسی بڑے سے بڑے دمشقی خواجہ تاش سے کم نہیں، تو انھیں ''مولانا محمد علیؒ'' کہہ کر یاد کریں گے۔ جب ان لوگوں کے عقائد بقول علامہ اقبال عیسائیوں کے سے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ علمائے کرام اور عامۃ المسلمین ان کو مولوی کہہ کر پکاریں جو صرف ذی علم مسلمانوں کا امتیازی وصف ہے۔ یہ تو ویسا ہی ہے جیسا کوئی کہہ دے کہ حضرت مولانا لائڈ جارج نے یوں فرمایا اور حضرت مولوی سیموئل ہور کا یہ ارشاد ہے۔ بہتر ہوگا کہ آئندہ سے ہر قابل ذکر قادیانی کو عام اس سے کہ وہ اندلسی ہو یا دمشقی، مسٹر کہہ کر مخاطب کیا جائے اور جو ان کے امام ہوں، انھیں پادری کے معزز لقب سے یاد کیا جائے اور موسیو کا لقب تو موسیو مرزا بشیر الدین محمود کے لیے وقف ہو ہی چکا ہے۔ (زمیندار 6 جولائی 1932ء)

نوٹ: مولانا ظفر علی خاں نے قادیانیوں کے دو معروف فرقوں کے لیے دمشقی اور اندلسی قادیانی کی بدیع اصطلاحات وضع فرمائی تھیں۔ دمشقی قادیانیوں سے مراد وہ قادیانی ہیں جو مرزا غلام احمد کو مستقل نبی مانتے ہیں۔ اس فرقے کے امام مرزا بشیر الدین محمود تھے۔ اندلسی قادیانیوں سے مراد وہ قادیانی ہیں جو متنبّی قادیان کو مجدد کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس طائفہ کے امام مسٹر محمد علی لاہوری تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے لکھا ہے کہ دونوں فرقوں کا یہ فرق صرف لفظی ہیر پھیر ہے، حقیقت میں دمشقی اور اندلسی قادیانی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

(اقبال اور ظفر علی خاں از جعفر بلوچ)

قادیان اور سیّد امیر علی مرحوم

یادش بخیر مرزا غلام احمد قادیانی کے مریدان باصفا میں جنہوں نے لندن میں ''اسلام'' کی تبلیغ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے، کوئی نہ کوئی بزرگ ''بی۔ ٹی'' (ب۔ت) ضرور ہوتے ہیں۔ ''اندلس'' (لاہور) کے قادیانی حضرات کی طرف سے ایک ''ب۔ت'' اپنی خدمات انجام دے کر اپنے مقر اصلی کو لوٹ آئے۔اب دارالخلافہ دمشق (قادیاں) کے ایک ''ب۔ت'' انگلستان میں کلمۃ القادیاں کا اعلا فرمانے میں مصروف ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی کی اصطلاح میں ''بی'' (ب) بیچلر کا مخفف ہے اور ''ٹی'' (ت) سے مراد ''ٹریننگ'' ہے۔لیکن عالم روحانیات میں یہ حروفِ مقطعات معنویت کی ایک جداگانہ شان لیے ہوئے ہیں۔ ''ب'' سے مراد بیچم ہے اور ''ت'' تابع کی الہامی علامت ہے جس طرح بیچم صاحب کی عدیم النظیر کامیابی کا راز اشتہارات میں چھپا ہوا تھا کہ ایک پنس کی پونجی کو اقصائے کالم میں پہنچانے کے لیے مدت العمر گرہ سے ایک شلنگ لگانے کے خوگر رہے اور جب رہگرائے عالم باقی ہوئے تو لاکھوں پاؤنڈ کا ترکہ اپنے جانشینوں کے لیے چھوڑتے گئے، اسی طرح قادیاں کے تابعانِ بیچم اپنے زندہ اشتہارات کے تھیلے ڈاک کے جہازوں میں لاد کر ولایت بھیج دیتے ہیں تا کہ یہ مرزائی گولی ہاتھوں ہاتھ بک سکے کہ

''پھر بہار آئی خدا کی بات پھر پوری ہوئی''

24 مارچ 1917ء کے ''الفضل'' میں دمشقی ''ب۔ت'' قاضی عبداللہ کی ایک چٹھی چھپی ہے جس میں جنابِ ممدوح نے رائٹ آنریبل مسٹر سید امیر علی سے اپنی ملاقات کی پُر لطف کیفیت قلمبند کی ہے۔ میں مرزا بشیر الدین محمود کی اخلاقی جرأت کا ابتدا ہی سے قائل ہوں جو مداہنت کی آلائش سے بالکل پاک ہے۔وہ اپنے والد کی تعلیم کا منطقی نتیجہ ہیں اور رسول اللہ ﷺ کو خاتم النبین نہ ماننے پر گو اُن کو دنیائے اسلام کی مخالفت ہی مول لینی پڑی ہو لیکن کسی سنہری

یاروپہلی مصلحت سے اس دُھن کے پکے نے اپنا عقیدہ نہیں بدلا اور اگر اپنے عقائد پر غیر متزلزل عزم کے ساتھ ثابت قدم رہنا سزاوار تحسین ہو تو میں اُنہیں سراہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُن کے ہاتھ پر جن لوگوں نے بیعت کی ہے، وہ بھی لگی لپٹی نہیں رکھتے اور لومۃ لائم کی مطلق پروا نہیں کرتے۔ اپنے مرشد کی طرح وہ نہ صرف ''دارالامان'' قادیاں کے مینارہ پر کھڑے ہو کر مرزا غلام احمد کو نبی برحق پکارنے کے لیے تیار ہیں بلکہ خواجہ اینڈ کمپنی کی ہر مصلحت کے سر پر خاک ڈالتے ہوئے خاص نلسن کے چوک میں کھڑے ہو کر تمام لندن کے سامنے مرزا قادیانی کی نبوت کا وعظ کرنے کے لیے آمادہ ہیں اور کر ہی رہے ہیں۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے قاضی بہادر کو خیال آیا کہ چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو اگر جال میں پھنسا لیا تو کیا بڑا کمال کیا۔ کسی بڑے شہباز کو دامِ قادیاں میں پھانسنا چاہیے۔ خواجہ کمال الدین کی نظر لارڈ ہیڈلے پر پڑی تھی۔ قاضی صاحب زیادہ اولوالعزم تھے۔ اُنہوں نے رائٹ آنریبل امیر علی کو تاکا کہ ایک ذی بصیرت وصاحب حشمت سید اگر اپنے نانا کی عبائے رسالت میں اپنے ہاتھوں قادیاں کا پیوند ٹانک دے تو اس سے بڑھ کر کامیابی نہیں ہو سکتی۔

غرض گھر میں ہنٹلے پامر کے بسکٹوں کا ٹین چھوڑ کر ایشیا کے خیالی پلاؤ کی خوشی میں قاضی صاحب مسٹر امیر علی کے کلب میں جا پہنچے اور ''اسپرٹ آف اسلام'' کے مصنف سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے آستینیں چڑھا لیں۔ سید صاحب نے باتوں باتوں میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ مسلمانوں میں بہت سے فرقے ہو گئے ہیں جو شخص اٹھتا ہے نیا فرقہ بنا لیتا ہے۔ دنیا میں ایک شخص آیا جس نے پیغام حق پہنچایا۔ مگر اب لوگ اس کو بھول گئے ہیں یا چھوڑ بیٹھے ہیں۔ قاضی صاحب سفسطہ کے بہت سے ڈھیلے قادیاں شریف کے کلوخستان سے اپنے تبلیغی ابنان میں ڈال کر لیتے گئے تھے۔ ایک ڈھیلا تاک کر سید صاحب پر مارا اور کہا۔

ہاں سچ ہے بہت فرقے ہو گئے جب حق کی گرفت چھوٹ جاتی ہے تو ہر شخص دین میں دخل در معقولات دینے لگتا ہے اور لوگ سیدھی راہ سے دُور جا پڑتے ہیں۔ اسی لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک مرسل (علیہ ما علیہ۔ راقم) اس زمانہ میں آیا تاکہ لوگوں کو پھر حق پر قائم کرے اور تفرقوں کو دور کر کے ایک جماعت بنا دے اور ان کے سامنے وہی اسلام پیش کرے

جو محمد ﷺ لائے تھے۔

قاضی صاحب نے قانون جذب ودفع کا فلسفہ اچھی طرح نہیں پڑھا تھا جو ڈھیلا آپ نے اپنے حریف کے سر پر کھینچ مارا تھا، وہ ایجاز کی جامعیت میں لپٹا ہوا پچگنے زور کے ساتھ پلٹا اور آپ کے فرقِ مبارک میں اس طرح پیوست ہوا:

’’آپ جانتے ہیں، میں مسلمان ہوں میں اُسی پر فدا ہوں جو خاتم النبیین ہے۔ روحی فداک یارسول اللہ۔‘‘

لیکن قاضی صاحب بھلا کہاں مانتے تھے۔ آپ نے ایک اور لمبا چوڑا قصیدہ اس زمانہ کے ’’نبی‘‘ کی شان میں فی البدیہہ تصنیف کر کے فر فر پڑھنا شروع کر دیا۔ لندن کے بسنے والوں کے اخلاق اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں اور سید امیر علی کی ایک عمر وہیں بسر ہو چکی ہے۔ اُنہوں نے جب دیکھا کہ قاضی صاحب ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں اور نئی نبوت کی گولی زبردستی اُن کے حلق میں ٹھونسنا چاہتے ہیں تو بیچارے نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑانا چاہا کہ جناب والا مجھے یہ سب باتیں معلوم ہیں کسی اور مسئلہ پر گفتگو فرمایئے۔ لیکن ’’قاضی صاحب کچی گولیاں نہ کھیلے تھے اور گھر سے لنگر لنگوٹ کس کر یوں ہی نہیں آئے تھے۔ اس سے بہتر موقع پریوی کونسل کے ایک رکن رکین کو قائل کرنے اور مبائعین دمشق کے مقدس حلقہ کی طرف کھینچنے کا اور کون سا ہو سکتا تھا۔ سید امیر علی ہزار کہتے ہیں کہ حضرت تانت باجی راگ بوجھا، اب کوئی اور دُھن چھیڑیئے۔ لیکن قاضی صاحب سنی ان سنی ایک کر کے اپنا طویل وبسیط قصیدہ ’’بہاریہ‘‘ برابر سنائے جاتے ہیں اور تاکید وتاسیس کے لیے ہر مصرع مکرر پڑھتے ہیں۔ جب مطلع حسن مطلع تشبیب گریز اور بالآخر مقطع رسالت مرزا پڑھا جا چکا اور قصیدہ نگار کی پھولی ہوئی سانس اپنا آخری فرض مرزا قادیانی کی مسیحیت ومہدویت و کرشنیت کی توثیق وتقدیس کے متعلق ایک آدھ تازہ رباعی کے اضافہ سے پورا کر چکی تو سید امیر علی نے چپکے سے یہ شگوفہ چھوڑ دیا کہ جناب قاضی صاحب منطق تو آپ کی لاجواب ہے اور آپ بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں لیکن میرے ایک سوال کا جواب مرحمت فرمایئے، کیا میں بھی آپ لوگوں کی طرح ایک نیا فرقہ بنالوں؟

قاضی صاحب دل میں تو بہت جھنجلائے کہ عجب چکنے گھڑے سے سابقہ پڑا ہے جس پر

ایک بوند بھی نہیں ٹھہرتی۔لیکن اُس حجت کے اتمام کے خیال سے جو آپ کی پیٹھ پر تھپکی دینے کے لیے مفتی صادق کو سات سمندر پار سے لندن لا رہی تھی، آپ پھر سنبھلے اور ایک لمبی چوڑی تقریر سے سید امیر علی کے کان میں مرزا بشیر الدین محمود کی مبایعت کا حلقہ از سر نو ڈالنا چاہا۔اس لطیف ونظیف ارشاد کے جستہ جستہ نکتے یوں دہرائے جاسکتے ہیں۔

''اول تو ہمارا فرقہ کوئی نیا فرقہ نہیں بلکہ اسلام اگر اصلی وحقیقی شکل میں موجود ہے تو فقط اسی میں ہے۔ دوسرے اگر ہر شخص ایسا ہی فرقہ بنالے تو پھر سچ اور جھوٹ میں تمیز کہاں رہ سکتی ہے۔ جو شخص نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے، وہ ذلّت سے ہلاک ہوتا ہے لیکن حضرت صاحب کی کامیابی روزِ روشن کی طرح آشکار ہے جو 38 سال تک خدا سے ہمکلام رہے اور اُن کی تائید ہزارہا آسمانی نشانات سے ہوتی رہی۔ کیا ایسی کامیابی کسی جھوٹے نبی کو حاصل ہوسکتی ہے۔ حضرت نے لاکھوں 1 کی جماعت بنادی۔ وہ بھی کوئی معمولی جماعت نہیں بلکہ اُن میں حقیقی اسلام کی روح پھونک دی۔''

پتھر کا دل بھی ہوتا تو اس جامع ومانع، اس فصیح وبلیغ، اس مؤثر دل نشین خطبہ سے پسیج جاتا۔لیکن سید امیر علی نے اس انداز سے کہ گویا پوری تقریر کے دوران میں آپ ''نائینٹینتھ سینچری'' کے لیے کوئی آرٹیکل سپرد قلم فرمانے میں مصروف تھے۔خاتمۂ تقریر پر سر اُٹھایا اور خلیفہ قادیاں کے نائب منیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ آپ نے میری کتاب ''اسپرٹ آف اسلام'' بھی پڑھی ہے۔بہتر ہو کہ آپ اُسی کا درس اہل انگلستان کو دیجیے اور اس کے مطالب ومعانی سے لوگوں کو آگاہ کیجیے۔

اب تو قاضی عبداللہ صاحب کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا کہ غلام تو آبِ جُو لانے کے لیے آیا ہے اور آبِ جُو غلام ہی کو بہالے جانے کی فکر میں ہے۔ دبی زبان سے دو ایک جلے کٹے جملے تو قاضی صاحب نے سید امیر علی کو اُسی وقت سُنا دیے تھے، جب انہوں نے پوچھا تھا کہ ہم بھی ایک نیا فرقہ بنالیں؟ اور مرسل من اللہی کے کاذب مدعیوں کے عبرتناک انجام کا حوالہ دیتے ہوئے گویا اُن کو یہ دھمکی دی تھی کہ اگر آپ مرزا غلام احمد کو نبی نہ مانیں گے تو آپ کا حشر اچھا نہ ہوگا۔لیکن یہ دیکھ کر کہ اس شخص کا ''راہِ راست'' پر آنا محال ہے، قاضی صاحب نے اُس گدائے مبرم کی طرح جو

جواب صاف ملنے پر گالیوں پر اُتر آیا کرتا ہے، سید امیر علی کو کھلم کھلا ٹیڑھیاں سنانی شروع کیں۔ پینترا بدل کر کہنے لگے کہ جناب سید صاحب آپ نے اسلام کا فلسفہ بھی بیان کیا اور اُس کے حقائق و معارف پر بھی لسانی وعذب البیانی کے دریا بہائے لیکن یہ تو فرمائیے اس سے فائدہ کیا ہوا کہ آپ کی کتاب پڑھ کر کسی میں روحانیت آ گئی یا کوئی سیدھے رستہ پر آ گیا؟ آپ کی باتوں سے کسی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ یہ اثر صرف ہمارے حضرت مسیح موعود کی ذات تک محدود ہے جن میں حقیقی ایمان و عرفان تھا اور جنہیں خدا کے ساتھ براہ راست تعلق تھا۔ آپ اس وادی کے مردِ میدان نہیں۔

سید امیر علی کے پاس اس منطق کا حقیقت میں کوئی جواب نہ تھا۔ انہوں نے قاضی عبداللہ سے صرف اتنا کہہ کر اپنا پیچھا چھڑایا کہ آپ کو کیا معلوم کہ میرا خدائے تعالیٰ سے کتنا تعلق ہے اور قاضی صاحب کلب سے ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کو رخصت ہوئے۔

سید صاحب کی قاضی صاحب سے باتیں تو بہت سی ہوئیں لیکن ایک سوال یا تو انہوں نے قاضی صاحب سے کیا ہی نہیں اور یا اگر کیا بھی ہوگا تو قاضی صاحب اپنی رپورٹ میں اُسے قلم انداز فرما گئے۔ وہ سوال یہ ہے کہ حضرت آپ جو اپنے پیشوا کے مرسلِ یزدانی و مامورِ ربانی ہونے کا راگ ہر جگہ الاپتے پھرتے ہیں اور ہم سے خواہ مخواہ اس بات کا اقرار کرنے کے درپے ہیں کہ ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کا اسلام صرف مرزا غلام احمد قادیانی کی وجہ سے زندہ ہوا ہے۔ آخر اس زندگی کی علامات کیا ہیں اور اس وقت تک کہ مرزا قادیانی کو پیوند خاک ہوئے نو سال کی مدت مقتضی ہو چکی ہے، آپ کی تحریک نے دنیا کی ذہنی و روحانی معلومات میں وہ کون سا محیر العقول اضافہ کیا ہے جس پر آپ کو مبارکباد دی جا سکے؟ ہم تو اُن ہزار ہا آسمانی نشانات کی جن پر آپ کو اس قدر ناز ہے، بجز اس کے اور کوئی علامت نہیں دیکھتے کہ دنیا کے پچاس کروڑ مسلمانوں کے مقابلہ میں آپ کی مٹھی بھر بے حقیقت جماعت آپس ہی کی خانہ جنگیوں میں مبتلا ہے اور افتراق و انشقاق کے طبعی اثرات سے متاثر ہو کر قصر خمول میں گر رہی ہے۔ آپ دوسروں کو کیا مسلمان کریں گے۔ پہلے آپ خود مسلمان بنیے اور اپنے گھر کی خبر لیجیے جس میں سر پھٹول ہو رہی ہے۔ ایک طرف کمال الدین ہیں دوسری طرف بشیر الدین محمود جن کی آویزش آپ کی خانہ ساز رسالت کی دھجیاں بکھیر رہی ہے۔ آپ اپنی اندرونی اصلاح تو کر نہیں سکتے، دوسروں

کی اصلاح آپ سے کیا خاک ہوگی۔

تو درونِ در چہ کردی کہ برون خانہ آئی

....

1۔ یہ تحریر 1917ء کی ہے جس کو اٹھارہ سال ہوگئے۔اس وقت قادیانیوں کی تعداد گزشتہ مردم شماری پنجاب کے سرکاری اعداد وشمار کے لحاظ سے کل پچپن ہزار نفوس ہے۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ 1917ء میں قادیانی کتنے ہوں گے۔(ظفرعلی خاں)

(ستارہ صبح 18اپریل 1917ء جلد 1،شمارہ 19 ص 4 تا 7)

القادیان مَاالُقَادیان. وَمَا اَدُرَاکَ مَاالُقَادیان؟

آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی جب اُس ایمان کو جو دنیائے اسلام میں گم ہوگیا تھا، ثریا سے اتار کر اپنے فرشتہ خاص مولوی احسن کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے جامع دمشق کے منارۃ المسیح یعنی قادیان کے مینار پر نازل ہوئے تو آپ کے اس خرق عادت نزول کی محرک ایک خاص آسمانی وجہ ہوئی تھی جو خود مرزا قادیانی اوران کے حوارین باتمکین کے الفاظ میں اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ دنیا کفروشرک اور بدعات وخرافات کی نجاستوں سے گمراہ ہوچکی تھی۔ منکرات کا دل بادل انسانیت کے سر پر چھایا ہوا تھا، اس لیے ضروری ہوا کہ کوئی ایسا شخص آئے جس کے فیضان نامتناہی کی گھٹا پھر اُٹھے، جھوم جھوم کر برسے، دنیا کو جل تھل کر دے اوراس کا ایک ہی ریلا دنیا جہان کے طاغوتیوں کو بہالے جائے۔ اسلام اپنی اولین شان کے ساتھ ازسرنو نمودار ہو۔ قرن اول کی پرشکوہ روایات زندہ ہو جائیں۔ دین مبین کا غرور آفریں پرچم ربع مسکوں پر ہزارانِ رفعت وصولت لہراتا ہوا نظر آئے اور ایک عالم کی خباثتیں آنکھوں آنکھوں میں سعادتوں سے بدل جائیں، حضرت باری عزّ اسمہ کی طرف سے یہ آخری حجت، مرزا غلام احمد قادیانی ہے جن کے لیے کسر صلیب کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق مقدر ہو چکا ہے............

دنیا میں اگر کوئی ایسا شخص ہو جس نے صرف مرزا قادیانی کے دعاوی ہی سنے ہوں اور اس کے بعد وہ اس عالم کون وفساد سے یکا یک غائب ہوکر آج پھر دنیا میں ظاہر ہو جائے تو وہ اس امید میں حق بجانب ہوگا کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک بالکل ہی نئی دنیا ہوگی۔ وحدانیت کا ڈنکا قصائے کائنات میں بج رہا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا غلغلہ ہر طرف بلند ہوگا۔ اوامر ونواہی شرعیہ کی تعظیم وتکریم ہر شرقی وغربی کا شعار ہوگی۔ بدیاں مفقود ہوں گی، نیکیاں موجود ہوں گی اور خدا کی خدائی اُس حالت پر آچکی ہوگی جس کی بشارت آخری زمانہ کی اصلاح کی خبر کے سلسلہ میں دی گئی ہے۔ لیکن یہ شخص اگر آج آجائے تو ہم زیادہ کا تو ذمہ نہیں لیتے، البتہ قادیانی

اخبار ''پیغام صلح'' لاہور مورخہ 3 فروری 1918ء کے صفحہ 2 کے دوسرے کالم کا حسب ذیل اقتباس اُس کی آنکھوں کے لیے صاعقہ حیرت بنا سکتے ہیں۔

''دنیا ابھی تک کفر وضلالت اور فسق وفجور سے اُسی طرح بھری پڑی ہے جیسے کہ مسیح موعود (مرزا قادیانی) کے وقت میں اور آپ سے پہلے تھی......اس سے یہ سمجھنا تو حماقت ہوگی کہ وہ مامور من اللہ نعوذ باللہ نا کامیاب گیا،نہیں۔ یہ ہمارا اپنا قصور ہے۔ مامور تو ہمیشہ بیج ڈالنے آیا کرتے ہیں،اس بیج کو سینچنا اور اسے ایک عالی شان درخت بنا دینا اس کے بعد اُس کا ساتھ دینے والوں کا کام ہے۔ حضرت مسیح موعود نے تو ہمارے ہاتھ میں ایسے ایسے نادر اور اعلیٰ اصول دے دیے ہیں،وہ زبردست حربے،باطل کا سر کچلنے اور حق کی کامیابی کے لیے اس بندے نے ہمیں دیے ہیں جن کے مقابلہ کی کوئی اشد سے اشد مخالف بھی تاب نہیں لاسکتا۔ مگر آہ ہم سو رہے ہیں۔''

یہ اعتراف ایک ایسی جماعت کی طرف سے جو اپنے آپ کو ایمان کا واحد اجارہ دار سمجھتی ہے، جو اپنی مٹھی بھر جمعیت کے علاوہ دنیا کے باقی کروڑوں مسلمانوں کو یا تو خارج از اسلام اور یا فاسد العقیدہ خیال کرتی ہے۔ ایک ایسا اعتراف ہے جس پر بے ساختہ مُنہ سے نکل جاتا ہے کہ **ان هذا لشی عجائب** ....

تو پھر مرزا غلام احمد قادیانی پیدا ہی کیوں ہوئے اور اس دنیائے دون میں آپ کے قدم رنجہ فرمانے کا مقصد ہی کیا تھا؟ کیا صرف اس لیے کہ انبیا کی توہین کرنے اور خدا پر بہتان باندھنے کے بعد اسلام کے زار ونزار جسم میں دشنۂ تشتت کا ایک اور چرکا لگاتے جائیں۔ اپنا ایک ڈیڑھ اینٹ کا کنیسہ قادیان میں کھڑا کرتے جائیں کہ اس کی اینٹیں بھی آپس میں اندلسی ودمشقی جھنکار کے ساتھ بج رہی ہیں۔ کیا آپ کے ظہور کی غایۃ الغایات یہی تو نہ تھی کہ علمائے امت کے حق میں وہ جامع ومانع گالیاں تصنیف کر کے چھوڑتے جائیں جو فیلن نے اپنی ڈکشنری مرتب کرتے وقت عرب سرائے چھوڑ کر گومتی کے کنارے بھی نہ سنی ہوں گی۔

معاصر ''پیغام صلح'' ہم کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ مرزا قادیانی باطل کا سر کچلنے کے بڑے بڑے زبردست حربے اپنے پاس رکھتے تھے جن کے مقابلہ کی تاب اُن کا شدید سے شدید مخالف

بھی نہیں لاسکتا تھا۔ معلوم نہیں یہ حربے کیا ہیں اور کس نوعیت کے ہیں اور کہاں ہیں۔ شاید بہشتی مقبرے کے کسی کونے میں دبے پڑے ہوں۔ اس دنیا میں تو ان کا ایک وار بھی کارگر ہوتا ہوا ہم نہیں دیکھتے۔ اس لیے کہ بقول ''پیغام صلح'' دنیا ابھی تک کفر و ضلالت و فسق و فجور سے اسی طرح بھری پڑی ہے جیسے کہ مسیح موعود اور آپ سے پہلے تھی۔ آپ کی جارحانہ قابلیت کا ایک پہلو البتہ ایسا ہے جس سے ہم بھی آشنا ہیں۔ جس بدنصیب کو عقائد میں آپ سے اختلاف ہوتا تھا اور آپ کے انوکھے دعاوی کی تصدیق کی توتوفیق اُسے نہ ملتی تھی، اُس کے حق میں علی سبیل الانذار ایک نہ ایک ڈراؤنی پیشگوئی کر دینا جو آج تک پوری نہ ہوئی کہ ''الہام تو روز الغارون تصنیف ہوتے تھے کہ اُن کی بے فروغی کی تاویل بھی قاضی ظہورالدین اکمل آف گولے کے اپنے رسالہ تشحیذ الاذہان بابت ماہ جنوری و فروری 1918ء میں فاضل راجے کے قلم سے اس طرح کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیات متشابہات کی طرح یہ بھی متشابہ ہیں جو محکم کے تابع ہوسکتے ہیں۔ اگر کوئی پوچھے کہ مرزا قادیانی کے الہامات محکمات کس پایہ کے ہوتے تھے تو اُس کا کھلا ہوا جواب ہمارے عزیز ہم قلم مولوی ثناء اللہ صاحب مدیر ''اہل حدیث'' امرتسر کے پاس موجود ہے جنہوں نے چند ہی دن ہوئے ہوشیار پور میں ایک پرلطف تقریر کے دوران میں اس مشہور و معروف سیفی کا قصہ سنا کر مرزا قادیانی کی الہامی زندگی کی شرح کی تھی جو الٹی مرزا قادیانی پر چل گئی اور اُن کی حبل الورید ہی میں پیوست ہوکر رہی۔ کون نہیں جانتا کہ مرزا قادیانی سے مولانا ثناءاللہ کی لاگ ڈانٹ مدت سے چلی آتی تھی۔ یہ کاوش کچھ ذاتی نہ تھی بلکہ للہی تھی۔ مرزا قادیانی کی روش کو خلاف اسلام سمجھ لینے کے بعد ایک عالم دین ہونے کی حیثیت سے مولانا کا فرض تھا کہ جہاں تک بن پڑے، مرزا قادیانی کی خانہ ساز نبوت کا راز طشت از بام کریں۔ اس فرض کو جس خوش اسلوبی سے مولانا نے ادا کیا، وہ انہی کا حصہ ہے اور واقعات گواہ ہیں کہ قادیانیت کے مقابلہ میں جو جدوجہد انہوں نے فرمائی، اس میں وہ ہمیشہ موید بہ روح القدس رہے۔ مرزا قادیانی نے جب دیکھا کہ مولانا ثناء اللہ لنگر لنگوٹ کس کر ان پر پلے پڑتے ہیں اور کسی طرح اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتے تو گھبرا کر بشکل مباہلہ ایک تحدّی مرتب کی جس میں بغایت خشوع وتضرع جناب باری تعالیٰ سے التجا کی گئی تھی کہ اے میرے مالک جس کا نام سچا اور جس کا حکم غالب ہے، یہ نابکار ثناء اللہ مجھے ذلیل و رسوا کرنا

چاہتا ہے اور جی میں ٹھان چکا ہے کہ میری ''دال گلنے'' نہ دے اور میرے مریدوں کی جماعت میں کھنڈت ڈالے اور میری مسیحیت کا نام اچھلنے نہ دے۔ پس اے میرے آقا! میں تجھی سے اس شریر دشمن کے خلاف پناہ مانگتا ہوں۔ اگر میں سچا ہوں اور یقیناً سچا ہوں تو اپنی عنایت سے مجھ کو زندہ رکھ اور ثناء اللہ کو عذاب کے ساتھ ہلاک کر، لیکن اگر ثناء اللہ سچا ہے اور یقیناً سچا نہیں تو پھر اسے زندہ رہنے دے اور مجھے ذلت و رسوائی کی موت نصیب کر۔ **و من ینکر به فلیبا رز للمباهلة ولعنة الله علی من کذب الحق او افتری علی حضرة العزة۔**

خدائے پاک کی قدیم سے یہ سنت چلی آتی ہے کہ جو شخص عالم اضطرار میں ماسوی سے یکسو ہو کر اس کے پاس کوئی التجا لے جاتا ہو، بلالحاظ اس کے کہ یہ شخص صدیق و صالح ہے یا فاسق و فاجر۔ مسیح موعود ہو یا ایک عاصی مطرود، ضرور اُس کی دعا قبول فرماتا ہو۔ ورنہ اس کو کیا معنی ہوں گے کہ **امن یجیب المضطر اذا دعاہ** ہے۔ جس میں مسلمان و نامسلمان کسی کی تخصیص نہیں۔ مرزا قادیانی کی دعا کا تیر بھی ترازو ہوئے بغیر نہ رہا۔ مسیحیت و مہدویت کا سارا حوصلہ تل گیا۔ میزان عدل نے جنس ثواب وعتاب تولنے میں کسی کی رعایت ملحوظ نہ رکھی۔ قضا کے ناطق فیصلہ نے رشتہ نیستی و ہستی کی گرہ کھول دی۔ مرزا قادیانی تو نیست ہو کر رہ گئے لیکن مولانا ثناء اللہ سلمہ اللہ تعالیٰ ہوشیار پور کے جلسہ عام میں جو مولوی الٰہی بخش صاحب کے دولت کدہ پر منعقد ہوا تھا، اپنے پرانے مباہلہ باز دوست کی دائمی مفارقت کا مرثیہ ان الفاظ میں گنگناتے ہوئے سنے گئے تھے۔

دیتا ہے مکتب غم مرزا سبق ہنوز
لیکن یہی کہ ہست ہوں میں اور وہ بود تھا

تمام وہ حسرتیں اور ناکامیاں جو قادیانیت کے حصہ میں اس وقت تک آ چکیں، اب آ رہی ہیں اور آئندہ آئیں گی، لسان الغیب کے الفاظ میں جمع ہوگئی ہیں۔ شاید انہوں نے حافظ کے مطلع 'چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما' ہی کو پڑھ لیا اور اس کے بعد دیوان حافظ کو جزودان میں بند کر کے رکھ دیا۔ ورنہ اگر حافظ کی پوری غزل انہوں نے بالاستیعاب ملاحظہ فرمائی ہوتی تو انہیں اپنے خسران وخذلان کا جواب بھی دو ہی سطروں کے بعد ان الہامی مطالب میں مل گیا ہوتا:

ما مریدان روی سوی کعبه چون آریم چون
روی سوی خانه خمار دارد پیر ما

جب مرزا غلام احمد قادیانی آپ کی خاطر عین قرآن مجید کے بیچوں بیچ **سبحان الذی اسری** کے قرب وجوار میں آیت **انا انزلنا قریباً من القادیان** بلا وساطت جبریل امین وبدوں توسط ملائکہ مقربین داخل کر دی گئی ہو، اپنی زندگی میں بھی کفرستان عالم کو فسوق و ضلال کی آلائشوں سے پاک نہ کر سکے ہوں اور ان کی زندگی کے بعد خود اُن کے مریدان کی یہ حالت ہو کہ جمود وغفلت کی پٹی آنکھوں پر کسی ہوئی ہو تو پھر سوائے اس کے ہم بھولے بھالے سیدھے سادے مسلمان جو واقعات عالم کو ظاہر شرع ہی کے آئینہ میں عکس پذیر دیکھنے کے خوگر ہیں اور کس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ مرزا قادیانی کے دعاوی سب خانہ ساز ڈھکونسلے تھے اور اُن کے پیروان طریقت کی روش النیچر کی تخیل سے زیادہ نہیں۔

نے کعبہ نے دیر کے قابل   ہے مذہب ان کا سیر کے قابل

معاصر ''پیغام صلح'' نے اس بات کا تو اعتراف کر لیا کہ دنیا گمراہی کے اس مرکز سے جس پر وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی بعثت کے وقت قائم تھی، بقدر ویمقراطیس کے ایک جزو لایتجزی کے ہزارویں حصہ کے بھی نہیں ہٹنے پائی اور اس حسرت ناک حقیقت کو بھی تسلیم کر لیا کہ اعلائے کلمۃ اللہ کا فرض خود امت قادیان نے بھی جس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اول سے موضوع ہی اسی مقصد کے لیے ہوئی ہے، مطلق انجام نہیں دیا لیکن اُس نے کبھی یہ بھی سوچا کہ جس جماعت کے ماضی وحال کا یہ نقشہ ہو، اُس کے استقبال کا تاریخ عالم پر کیا حق ہو سکتا ہے۔ جو وہ یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ ہم:

مشرق کا سرا اُٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے

پہلے وہ اپنی اصلاح تو کر لیں، گھر کے تفرقے تو مٹا لیں۔ دمشق واندلس کا جھگڑا تو چکا لیں۔ حقیقی و بروزی نبوت کا امتیاز تو دور کر کے دکھا دیں پھر گھر سے باہر نکلیں اور دنیا جہان کے آریوں، مسیحیوں، یہودیوں اور بودھوں کو حلقہ بگوش اسلام بنانے کی فکر کریں۔ لیکن اگر ایسا نہ کر سکیں اور خدا ہی ہے جو کر سکیں تو پھر ہمیں ان سے شاعر کے الفاظ میں یہ سوال کرنے کا حق حاصل ہو گا کہ:

تو درون درچہ کر دی کہ برون خانہ آئی؟

آج تک ''ستارہ صبح'' میں اُن حضرات کے خلاف جن کے عقائد کا تخطیہ کرنے پر ہمیں ہمارا اسلام مجبور کرتا ہے، ایک سطر، ایک لفظ، ایک حرف بھی ایسا نہیں نکلا جو پایۂ تہذیب سے گرا ہوا ہو۔ سچی سچی باتیں البتہ ہم نے ضرور لکھیں جن کا جواب تو کیا ہو سکتا تھا۔ معترضین البتہ کڑوائے

ضرور کہ **الحق مرٌّ۔**

''آپ کون ہیں؟'' کے عنوان سے 2 فروری 1918ء کے ''ستارہ صبح'' میں جب ہم نے فلسفہ مذہب کے بعض ماثور معیار درج کیے تھے اور یہ سوال کیا تھا کہ اس کسوٹی پر مرزا صاحب پورے اُترتے ہیں یا نہیں؟ اس سوال کا جواب دینے کے بجائے حکیم محمد حسین قریشی نے وہ اشتہار چھپوایا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور گورنمنٹ سے درخواست کی ہے کہ ''ستارہ صبح'' کو جو نہ مرزا صاحب کو کامل سمجھتا ہے نہ حکیم، نہ خلیفہ، نہ موید بروح القدس، نہ ہادی، نہ مزکی، نہ امام، نہ نبی، تادیب کی جائے۔ اشتہار کے شروع میں حکیم صاحب نے مرزا صاحب کی ایک نظم درج فرمائی ہے جس کے چند اشعار قابل ملاحظہ ہیں:

از سرِ تقویٰ ہمی باید جدال
تا کجا دشنام ہا اے بدخصال
دل شود از بد زبانی ہا سیاہ
بد زباناں را در آنجا نیست راہ
روز و شب بدگفتنم کارِ تو شد
لعنت و تحقیر کردارِ تو شد
گر سفیہے لعنتے بر ما کند
او نہ بر ما خویش را رسوا کند
از سر حمق است جوش و جنگ شاں
و از پئے اطفاء حق آہنگ شاں
ایں چنیں برمن کر مہا کردہ است
منکرم برخود ستمہا کردہ است

(تحفہ غزنویہ ص 1 تا 3 مندرجہ روحانی خزائن جلد 15 صفحہ 531 تا 534 از مرزا قادیانی)

حکیم صاحب نے ان اشعار کو اپنے اشتہار کی سرخی قرار دے کر گویا یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ مرزا قادیانی کی روح نے عالمِ بالا سے ذیل کا تحفہ خاص ''ستارہ صبح'' کے لیے روانہ فرمایا ہے:

1۔ بدخصال 2۔ بدزبان 3۔ دل سیاہ 4۔ بدگو

5۔سفیہہ 6۔لعان 7۔تحقیر کردار 8۔رسوا

9۔احمق 10۔اطفاءحق 11۔منکر 12۔ستمگار

شاید ہم اس سے بھی زیادہ غلیظ سب وشتم کے مستحق ہوں، مگر کم از کم ''ستارہ صبح'' کے گزشتہ نمبروں کو دیکھنے سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اُس نے اس قسم کے الفاظ مرزا صاحب یا اُن کے جانشینوں کی نسبت استعمال کیے ہوں۔ حالانکہ وہ اگر اس سے بھی سخت الفاظ مرزا صاحب کی نسبت لکھتا تو فرقۂ مرزائیہ کو بگڑنے کا کوئی حق نہ تھا کہ وہ تو مامورین خدا میں سے ہیں۔ اُن کے اخلاق ہم دنیاداروں کے اخلاق سے بہت اچھے ہونے چاہئیں۔ہم سے زیادہ اُن میں عفوومصابرت، محبت واخلاص کا جوہر موجود ہونا چاہیے۔ پھر یہ کیا ماجرا ہے کہ وہ اپنی آنکھ کے شہتیر کو تو دارالامان کی چھت کے لیے محفوظ رکھتے ہیں اور ہماری آنکھ کا تنکا چن کر گورنمنٹ پنجاب و گورنمنٹ ہند کی دہلیز پر جا رکھتے ہیں۔ خیر، ان کی روش اُن ہی کو مبارک رہے، ہم ان کا اتباع نہ کریں گے اور گورنمنٹ کی خدمت میں ہرگز اس مضمون کا میموریل نہ بھیجیں گے کہ مرزا غلام احمد قادیانی باوجود ادعائے مسیحیت و مہدویت اور باایں ہمہ دعوائے تہذیب اخلاق اپنے نکتہ چینوں اور خصوصاً علمائے اسلام کی نسبت حسب ذیل ضبط شدنی موتی بکھیر گئے ہیں۔

جراحات السنان لها التئام

ولا یلتام ما جرح اللسان

مرزا قادیانی نے اپنی کتابوں میں مختلف لوگوں کو جو گالیاں دی ہیں، ان کی تعداد ہزاروں میں بنتی ہے۔ صفحات کی کمی کے پیش نظر صرف چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

- اے مردار خور مولویو (انجام آتھم ضمیمہ صفحہ 21 / حاشیہ، مندرجہ روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 305 از مرزا قادیانی)
- اندھیرے کے کیڑو (انجام آتھم ضمیمہ صفحہ 21، حاشیہ، روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 305 از مرزا قادیانی)
- اے بدذات (انجام آتھم ضمیمہ صفحہ 45، روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 329 از مرزا قادیانی)
- اے خبیث (انجام آتھم ضمیمہ صفحہ 45، روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 329 از مرزا قادیانی)
- اے پلید دجال (انجام آتھم ضمیمہ صفحہ 46، روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 330 از مرزا قادیانی)
- اسلام کے عار مولویو (انجام آتھم ضمیمہ صفحہ 48، روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 332 از مرزا قادیانی)
- اے نابکار (بدکردار) (انجام آتھم ضمیمہ صفحہ 50، روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 334 از مرزا قادیانی)

- ❑ اے بدذات فرقہ مولویاں (انجام آتھم ضمیمہ صفحہ 21/حاشیہ،روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 305 ازمرزا قادیانی)
- ❑ اُلو (ضمیمہ براہین احمدیہ پنجم صفحہ 165،روحانی خزائن جلد 21 صفحہ 332 ازمرزا قادیانی)
- ❑ امام الفتن (اتمام الحجۃ صفحہ 24،روحانی خزائن جلد 8 صفحہ 303 ازمرزا قادیانی)
- ❑ انسانوں سے بدتر اور پلید تر (ایام الصلح صفحہ 166،روحانی خزائن جلد 14 صفحہ 413 ازمرزا قادیانی)
- ❑ اے بدبخت مفتریو (انجام آتھم ضمیمہ صفحہ 58،روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 342 ازمرزا قادیانی)
- ❑ ایہاالمکذ بون الغالون (انجام آتھم صفحہ 224،روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 224،ازمرزا قادیانی)
- ❑ اے شیخ احمقان (انجام آتھم صفحہ 241،روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 241 ازمرزا قادیانی)
- ❑ ایہاالشیخ الضال (انجام آتھم صفحہ 251،روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 251 ازمرزا قادیانی)
- ❑ اول درجہ کے کاذب (آئینہ کمالات اسلام صفحہ 601، روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 601 ازمرزا قادیانی)
- ❑ ننگ اسلام مولویو (آئینہ کمالات اسلام صفحہ(د)،روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 608 ازمرزا قادیانی)
- ❑ اے کوتاہ نظر مولوی (آئینہ کمالات اسلام صفحہ(د)،روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 608 ازمرزا قادیانی)
- ❑ اے نفسانی مولویو (ازالہ اوہام صفحہ 105،روحانی خزائن جلد 3 صفحہ 105 ازمرزا قادیانی)
- ❑ اے غبی (کم عقل) (مواہب الرحمٰن صفحہ 131،روحانی خزائن صفحہ 352 ج 19 ازمرزا قادیانی)
- ❑ انسانیت کے پیرایہ(لباس) سے بے بہرہ اور برہنہ (نورالحق حصہ 1،روحانی خزائن جلد 8 ص 4،5 ازمرزا قادیانی)
- ❑ اے بے ایمانو (مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ 69 ازمرزا قادیانی)
- ❑ بدبخت پلید طبع مولوی (ایام الصلح صفحہ 165،روحانی خزائن جلد 14 ص 413 ازمرزا قادیانی)
- ❑ بے ایمان اور اندھے (انجام آتھم ضمیمہ ص 22/حاشیہ،روحانی خزائن جلد 11 ص 306 ازمرزا قادیانی)
- ❑ بدذات (انجام آتھم ضمیمہ ص 45،روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 329 ازمرزا قادیانی)
- ❑ بندروں (انجام آتھم ضمیمہ ص 53،روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 337 ازمرزا قادیانی)
- ❑ باطل پرست بطالوی (انجام آتھم ص 59،روحانی خزائن جلد 11 صفحہ 59 ازمرزا قادیانی)
- ❑ بدکار آدمی (شہادت القرآن ص 84،روحانی خزائن جلد 6 صفحہ 380 ازمرزا قادیانی)
- ❑ برہنہ (نورالحق صفحہ 3 حصہ اوّل،روحانی خزائن جلد 8 ص 5 ازمرزا قادیانی)
- ❑ بھیڑیے (اعجاز احمدی صفحہ 39،روحانی خزائن جلد 19 ص 150 ازمرزا قادیانی)
- ❑ بچھو (اعجاز احمدی صفحہ 75،روحانی خزائن جلد 19 ص 188 ازمرزا قادیانی)

- ❑ بے حیاء (تذکرۃ الشہادتین ص38، روحانی خزائن جلد20 ص40 ازمرزا قادیانی)
- ❑ بڑا خبیث (حقیقۃ الوحی تتمہ ص107، روحانی خزائن ج22 ص543 ازمرزا قادیانی)
- ❑ پلید ملاؤں (ایام الصلح ص165، روحانی خزائن جلد14 ص413 ازمرزا قادیانی)
- ❑ پلید جاہلوں (ایام الصلح ص166، روحانی خزائن جلد14 ص414 ازمرزا قادیانی)
- ❑ پلید تر (ایام الصلح ص166، روحانی خزائن جلد14 ص413 ازمرزا قادیانی)
- ❑ پلید دل (انجام آتھم ضمیمہ ص4، روحانی خزائن جلد11 ص288 ازمرزا قادیانی)
- ❑ پلید دجال (انجام آتھم ضمیمہ ص46، روحانی خزائن جلد11 ص330 ازمرزا قادیانی)
- ❑ ثناءاللہ کو علم اور ہدایت سے ذرہ مس نہیں (اعجاز احمدی ص43، روحانی خزائن جلد19 ص155 ازمرزا قادیانی)
- ❑ ثناءاللہ تجھے جھوٹ کا دودھ پلایا گیا (اعجاز احمدی ص51، روحانی خزائن جلد19 ص163 ازمرزا قادیانی)
- ❑ جاہل سجادہ نشین (انجام آتھم ضمیمہ ص18 / حاشیہ، روحانی خزائن جلد11 ص302 ازمرزا قادیانی)
- ❑ جنگل کے وحشی (انجام آتھم ضمیمہ ص49، روحانی خزائن جلد11 ص333 ازمرزا قادیانی)
- ❑ جانور (نزول المسیح ص8، روحانی خزائن جلد18 ص386 ازمرزا قادیانی)
- ❑ جنگلوں کے غول (اعجاز احمدی ص81، روحانی خزائن جلد19 ص193 ازمرزا قادیانی)
- ❑ جھوٹ کا گوہ کھایا (انجام آتھم ضمیمہ ص50، روحانی خزائن جلد11 ص334 ازمرزا قادیانی)
- ❑ جھوٹ بولنے کا سرغنہ (نزول المسیح ص9، روحانی خزائن جلد18 ص387 ازمرزا قادیانی)
- ❑ چارپائے ہیں نہ آدمی (انجام آتھم ضمیمہ ص10، روحانی خزائن جلد11 ص294 ازمرزا قادیانی)
- ❑ حرامی (شہادۃ القرآن ص3 ج، روحانی خزائن جلد6 ص380 ازمرزا قادیانی)
- ❑ حرام زادہ (انوار اسلام ص30، روحانی خزائن جلد9 ص32 ازمرزا قادیانی)
- ❑ حرص کے جنگل کے شیطان (نور الحق ص89 حصہ 1، روحانی خزائن جلد8 ص120 ازمرزا قادیانی)
- ❑ حلال زادہ نہیں (انوار اسلام ص30، روحانی خزائن جلد9 ص31 ازمرزا قادیانی)
- ❑ حاطب اللیل (آئینہ کمالات اسلام ص600، روحانی خزائن جلد5 ص600 ازمرزا قادیانی)
- ❑ خبیث طبع (انجام آتھم ضمیمہ صفحہ 21 / حاشیہ، روحانی خزائن جلد11 ص305 ازمرزا قادیانی)
- ❑ خنزیر سے زیادہ پلید (انجام آتھم ضمیمہ صفحہ 21 / حاشیہ، روحانی خزائن جلد11 ص305 ازمرزا قادیانی)
- ❑ خالی گدھے (انجام آتھم ضمیمہ صفحہ 47، روحانی خزائن جلد11 ص331 ازمرزا قادیانی)

- ❑ خبیث نفس (شہادۃ القرآن ص 5 ھ، روحانی خزائن جلد 8 ص 382 از مرزا قادیانی)
- ❑ خبیث طینت (انجام آتھم ضمیمہ صفحہ 8، روحانی خزائن جلد 11 ص 292 از مرزا قادیانی)
- ❑ خبیث فرقہ (انجام آتھم ضمیمہ صفحہ 9 / حاشیہ، روحانی خزائن جلد 11 ص 293 از مرزا قادیانی)
- ❑ خناسوں (انجام آتھم صفحہ 17 / حاشیہ، روحانی خزائن جلد 11 ص 17 از مرزا قادیانی)
- ❑ خسیس ابن خسیس (نور الحق ص 64 حصہ 1، روحانی خزائن جلد 8 ص 87 از مرزا قادیانی)
- ❑ خراب عورتوں اور دجال کی نسل (نور الحق ص 123 حصہ 1، روحانی خزائن جلد 8 ص 163 از مرزا قادیانی)
- ❑ خبیث النفس (ضیاء الحق ص 9، روحانی خزائن جلد 9 ص 259 از مرزا قادیانی)
- ❑ خبیث القلب (انوار اسلام ص 21، روحانی خزائن جلد 9 ص 23 از مرزا قادیانی)
- ❑ خشک دماغ (ست بچن ص 9، روحانی خزائن جلد 10 ص 121 از مرزا قادیانی)
- ❑ دل کے مجذوم (انجام آتھم ضمیمہ ص 21 / ح، روحانی خزائن جلد 11 ص 305 از مرزا قادیانی)
- ❑ دجال (انجام آتھم ضمیمہ ص 46، روحانی خزائن جلد 11 ص 330 از مرزا قادیانی)
- ❑ دنیا کے کیڑے (براہین پنجم ص 143، روحانی خزائن جلد 21 ص 311 از مرزا قادیانی)
- ❑ دابۃ الارض (ازالہ اوہام ص 510، روحانی خزائن جلد 3 ص 373 از مرزا قادیانی)
- ❑ دنیا کے کتے (استفتاء ص 20، روحانی خزائن جلد 12 ص 128 از مرزا قادیانی)
- ❑ دجال اکبر (انجام آتھم ص 47، روحانی خزائن جلد 11 ص 47 از مرزا قادیانی)
- ❑ دیوثوں (مجموعہ اشتہارات جلد اول ص 125 از مرزا قادیانی)
- ❑ دیوانے درندوں (ضیاء الحق ص 35، روحانی خزائن جلد 9 ص 296 از مرزا قادیانی)
- ❑ دجال فربہ (انجام آتھم ص 204، روحانی خزائن جلد 11 ص 204 از مرزا قادیانی)
- ❑ دجال کمینہ (انجام آتھم ص 206، روحانی خزائن جلد 11 ص 206 از مرزا قادیانی)
- ❑ دجال کے ہمراہیو (مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ 69 از مرزا قادیانی)
- ❑ ذلیل (ایام الصلح ص 166، روحانی خزائن جلد 14 صفحہ 413 از مرزا قادیانی)
- ❑ ذلت کے سیاہ داغ (انجام آتھم ضمیمہ ص 53، روحانی خزائن جلد 11 ص 337 از مرزا قادیانی)
- ❑ ذریت شیطان (انجام آتھم ضمیمہ ص 24 / ح، روحانی خزائن جلد 11 ص 308 از مرزا قادیانی)
- ❑ ذلت کے روسیاہی کے اندر غرق (انجام آتھم ضمیمہ ص 59، روحانی خزائن جلد 11 ص 343 از مرزا قادیانی)

- رئیس الدجالین (انجام آتھم ضمیمہ ص46، روحانی خزائن جلد 11 ص330 از مرزا قادیانی)
- رئیس المعتدین (انجام آتھم ص241، روحانی خزائن جلد 11 ص241 از مرزا قادیانی)
- راس الغاوین (انجام آتھم ص241، روحانی خزائن جلد 11 ص241 از مرزا قادیانی)
- رئیس المتصلفین (انجام آتھم ص251، روحانی خزائن جلد 11 ص251 از مرزا قادیانی)
- رنڈیوں کی اولاد (آئینہ کمالات اسلام ص548، روحانی خزائن جلد 5 ص548 از مرزا قادیانی)
- رئیس المتکبرین (آئینہ کمالات اسلام ص599، روحانی خزائن جلد 5 ص599 از مرزا قادیانی)
- سوروں (انجام آتھم ضمیمہ ص53، روحانی خزائن جلد 11 ص337 از مرزا قادیانی)
- سیاہ داغ (انجام آتھم ضمیمہ ص53، روحانی خزائن جلد 11 ص337 از مرزا قادیانی)
- سگان قبیلہ (انجام آتھم ضمیمہ ص229، روحانی خزائن جلد 11 ص229 از مرزا قادیانی)
- سلطان المتکبرین (انجام آتھم ضمیمہ ص251، روحانی خزائن جلد 11 ص251 از مرزا قادیانی)
- سفہاء (انجام آتھم ضمیمہ ص253، روحانی خزائن جلد 11 ص253 از مرزا قادیانی)
- سفیہوں کا نطفہ (تتمہ حقیقۃ الوحی ص14، روحانی خزائن جلد 22 ص445 از مرزا قادیانی)
- سانپوں (نور الحق ص23 حصہ 1، روحانی خزائن جلد 8 ص32 از مرزا قادیانی)
- سڑے گلے مردہ (انجام آتھم ضمیمہ ص62، روحانی خزائن جلد 11 ص346 از مرزا قادیانی)
- شیطان (انجام آتھم ضمیمہ ص4، روحانی خزائن جلد 11 ص288 از مرزا قادیانی)
- شیاطین الانس (انجام آتھم ضمیمہ ص18 / حاشیہ، روحانی خزائن جلد 11 ص302 از مرزا قادیانی)
- شیخ نجدی (انجام آتھم ضمیمہ ص198، روحانی خزائن جلد 11 ص198 از مرزا قادیانی)
- شیخ احمقان (انجام آتھم ضمیمہ ص241، روحانی خزائن جلد 11 ص241 از مرزا قادیانی)
- شیخ الضال (انجام آتھم ضمیمہ ص251، روحانی خزائن جلد 11 ص251 از مرزا قادیانی)
- شقی (انجام آتھم ضمیمہ ص252، روحانی خزائن جلد 11 ص252 از مرزا قادیانی)
- شغال (آئینہ کمالات اسلام ص604، روحانی خزائن جلد 5 ص295 از مرزا قادیانی)
- شیطنت کی بدبو (آئینہ کمالات اسلام ص301، روحانی خزائن جلد 5 ص301 از مرزا قادیانی)
- شیخ نامہ سیاہ (آئینہ کمالات اسلام ص306، روحانی خزائن جلد 5 ص306 از مرزا قادیانی)
- شیخ مضل (کرامات الصادقین ص27، روحانی خزائن جلد 7 صفحہ 69 از مرزا قادیانی)

- شریر بھیڑیئے (انجام آتھم ص 9، روحانی خزائن جلد 11 ص 9 از مرزا قادیانی)
- شیخ ضال بطالوی (انجام آتھم ص 241، روحانی خزائن جلد 11 ص 241 از مرزا قادیانی)
- شیخ الضالۃ (اعجاز احمدی ص 76، روحانی خزائن جلد 19 ص 188 از مرزا قادیانی)
- شیخ چالباز (کرامات الصادقین ص 22، روحانی خزائن جلد 7 ص 65 از مرزا قادیانی)
- شیاطین (نزول المسیح ص 11، روحانی خزائن جلد 18 ص 389 از مرزا قادیانی)
- شریر النفس (آریہ دھرم ص 31، روحانی خزائن جلد 10 ص 31 از مرزا قادیانی)
- ضال بطالوی (انجام آتھم ص 241، روحانی خزائن جلد 11 ص 241 از مرزا قادیانی)
- ضلالت پیشہ (حقیقۃ الوحی ص 311، روحانی خزائن جلد 22 ص 324 از مرزا قادیانی)
- طوائف (انجام آتھم ضمیمہ ص 23 / حاشیہ، روحانی خزائن جلد 11 ص 307 از مرزا قادیانی)
- ظالم طبع (دافع البلاء ص 18، روحانی خزائن جلد 18 ص 238 از مرزا قادیانی)
- علیہم نعال لعن اللہ الف الف مرۃ (انجام آتھم ضمیمہ ص 46، روحانی خزائن جلد 11 ص 330 از مرزا قادیانی)
- عبد الشیطان (انجام آتھم ضمیمہ ص 58، روحانی خزائن جلد 11 ص 342 از مرزا قادیانی)
- عورتوں کے عار (اعجاز احمدی ص 83، روحانی خزائن جلد 19 ص 196 از مرزا قادیانی)
- عبد الحق کا منہ کالا (انجام آتھم ضمیمہ ص 58، روحانی خزائن جلد 11 ص 342 از مرزا قادیانی)
- غالون (انجام آتھم ص 224، روحانی خزائن جلد 11 ص 224 از مرزا قادیانی)
- غوی فی البطالۃ (انجام آتھم ص 230، روحانی خزائن جلد 11 ص 230 از مرزا قادیانی)
- غاوین (انجام آتھم ص 254، روحانی خزائن جلد 11 ص 254 از مرزا قادیانی)
- غول (انجام آتھم ص 252، روحانی خزائن جلد 11 ص 252 از مرزا قادیانی)
- غبی (انجام آتھم ضمیمہ ص 33، روحانی خزائن جلد 11 ص 317 از مرزا قادیانی)
- غدار زمانہ (اعجاز احمدی ص 77، روحانی خزائن جلد 19 ص 190 از مرزا قادیانی)
- غول البراری (کرامات الصادقین ص (د)، روحانی خزائن جلد 7 ص 152 از مرزا قادیانی)
- غزنویوں کی جماعت پر لعنت (انجام آتھم ضمیمہ ص 58، 59 روحانی خزائن جلد 11 ص 342، 343 از مرزا قادیانی)
- فرعون سے مراد محمد حسین بطالوی (انجام آتھم ضمیمہ ص 56، روحانی خزائن جلد 11 ص 340 از مرزا قادیانی)
- فمت یا عبد الشیطان (انجام آتھم ضمیمہ ص 58، روحانی خزائن جلد 11 ص 342 از مرزا قادیانی)

- ❑ فاسق آدمی (تتمہ حقیقۃ الوحی ص14، روحانی خزائن جلد22 ص445 از مرزا قادیانی)
- ❑ قوم کے خناسوں (انجام آتھم ص17 / حاشیہ، روحانی خزائن جلد11 ص17 از مرزا قادیانی)
- ❑ کتے (استفتاء ص20، روحانی خزائن جلد12 ص128 از مرزا قادیانی)
- ❑ کج طبع (آئینہ کمالات اسلام ص301، روحانی خزائن جلد5 ص301 از مرزا قادیانی)
- ❑ کوتہ نظر مولوی (آئینہ کمالات اسلام ص (د)، روحانی خزائن جلد5 ص608 از مرزا قادیانی)
- ❑ کوڑمغزی (نزول المسیح ص66، روحانی خزائن جلد18 ص444 از مرزا قادیانی)
- ❑ کذاب (تتمہ حقیقۃ الوحی ص128 / ح، روحانی خزائن جلد22 ص565 از مرزا قادیانی)
- ❑ کیڑا (ضمیمہ براہین احمدیہ پنجم ص165، روحانی خزائن جلد21 ص332 از مرزا قادیانی)
- ❑ کینہ ور (چشمہ معرفت ص131 ج2، روحانی خزائن جلد23 ص336 از مرزا قادیانی)
- ❑ کمینگی (مواہب الرحمٰن ص13، روحانی خزائن جلد19 ص352 از مرزا قادیانی)
- ❑ کرگس (اعجاز احمدی ص43، روحانی خزائن جلد19 ص155 از مرزا قادیانی)
- ❑ کجدل (کرامات الصادقین ص6، روحانی خزائن جلد7 ص48 از مرزا قادیانی)
- ❑ کمینوں (الہدیٰ ص18، روحانی خزائن جلد18 ص262 از مرزا قادیانی)
- ❑ کمینہ (انجام آتھم ص206، روحانی خزائن جلد11 ص206 از مرزا قادیانی)
- ❑ کتوں (انجام آتھم ضمیمہ ص25، روحانی خزائن جلد11 ص309 از مرزا قادیانی)
- ❑ کالانعام (انجام آتھم ص265، روحانی خزائن جلد11 ص265 از مرزا قادیانی)
- ❑ گندی روحو (انجام آتھم ضمیمہ ص21 / حاشیہ، روحانی خزائن جلد11 ص305 از مرزا قادیانی)
- ❑ گدھے (انجام آتھم ضمیمہ ص47، روحانی خزائن جلد11 ص331 از مرزا قادیانی)
- ❑ گمراہ (تتمہ حقیقۃ الوحی ص115، روحانی خزائن جلد21 ص320 از مرزا قادیانی)
- ❑ گرگ (مواہب الرحمٰن ص13، روحانی خزائن جلد19 ص352 از مرزا قادیانی)
- ❑ گمراہی اور حرص جنگل کے شیطان (نور الحق ص89 ج1، روحانی خزائن جلد8 ص120 از مرزا قادیانی)
- ❑ لیموں (تتمہ حقیقۃ الوحی ص14-15 ح، روحانی خزائن جلد22 ص445 از مرزا قادیانی)
- ❑ لاف وگزاف کے بیٹے (براہین احمدیہ پنجم ص149، روحانی خزائن جلد21 ص317 از مرزا قادیانی)
- ❑ مردار خور (انجام آتھم ضمیمہ 21 / حاشیہ، روحانی خزائن جلد11 ص305 از مرزا قادیانی)

❑ منحوس چہروں	(انجام آتھم ضمیمہ ص53، روحانی خزائن جلد 11 ص337 از مرزا قادیانی)
❑ مفتریو	(انجام آتھم ضمیمہ ص58، روحانی خزائن جلد 11 ص342 از مرزا قادیانی)
❑ ملعونین	(انجام آتھم ص252، روحانی خزائن جلد 11 ص252 از مرزا قادیانی)
❑ مخنثوں	(آئینہ کمالات اسلام ص402، روحانی خزائن جلد 5 ص402 از مرزا قادیانی)
❑ مردار	(نزول المسیح ص224، روحانی خزائن جلد 18 ص602 از مرزا قادیانی)
❑ ملعون	(تتمہ حقیقۃ الوحی ص14-15 ح، روحانی خزائن جلد 22 ص445 از مرزا قادیانی)
❑ مفسد	(تتمہ حقیقۃ الوحی ص14-15 ح، روحانی خزائن جلد 22 ص445 از مرزا قادیانی)
❑ مگس طینت مولویوں	(آسمانی فیصلہ ص32، روحانی خزائن جلد 4 ص342 از مرزا قادیانی)
❑ مخبط الحواس	(استفتاء ص20، روحانی خزائن جلد 12 ص128 از مرزا قادیانی)
❑ مخالفوں کی ذلت	(انجام آتھم ضمیمہ ص28 / حاشیہ، روحانی خزائن جلد 11 ص312 از مرزا قادیانی)
❑ مولویوں کی ذلت	(انجام آتھم ص24 / ح، روحانی خزائن جلد 11 ص24 از مرزا قادیانی)
❑ مولوی سخت ذلیل	(انجام آتھم ص24 / ح، روحانی خزائن جلد 11 ص24 از مرزا قادیانی)
❑ مکذوبوں	(انجام آتھم ص224، روحانی خزائن جلد 11 ص224 از مرزا قادیانی)
❑ منحوس	(تتمہ حقیقۃ الوحی ص14، روحانی خزائن جلد 22 ص445 از مرزا قادیانی)
❑ مغرور	(تتمہ حقیقۃ الوحی ص115، روحانی خزائن جلد 22 ص551 از مرزا قادیانی)
❑ مجنون درندہ	(آسمانی فیصلہ ص14، روحانی خزائن جلد 4 ص324 از مرزا قادیانی)
❑ ناپاک طبع	(ایام الصلح ص165، روحانی خزائن جلد 14 ص413 از مرزا قادیانی)
❑ نادان بطالوی	(انجام آتھم ص20 / حاشیہ، روحانی خزائن جلد 11 ص20 از مرزا قادیانی)
❑ نفاق زدہ	(انجام آتھم ص24 / حاشیہ، روحانی خزائن جلد 11 ص24 از مرزا قادیانی)
❑ نیم عیسائیو	(مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ 69 از مرزا قادیانی)
❑ نالائق نذیر حسین	(انجام آتھم ص45، روحانی خزائن جلد 11 ص45 از مرزا قادیانی)
❑ نجاست خور جانور	(نزول المسیح ص8، روحانی خزائن جلد 18 ص386 از مرزا قادیانی)
❑ نابکاروں	(انجام آتھم ضمیمہ ص24 (حاشیہ)، روحانی خزائن جلد 11 ص308 از مرزا قادیانی)
❑ نادان صحابی	(براہین احمدیہ پنجم ص120، روحانی خزائن جلد 21 ص285 از مرزا قادیانی)

- نالائق چیلوں (ضیاء الحق ص 27، روحانی خزائن جلد 9 ص 285 از مرزا قادیانی)
- ناپاک فرقہ (انجام آتھم ضمیمہ ص 23/ح، روحانی خزائن جلد 11 ص 308 از مرزا قادیانی)
- وہ گدھا ہے نہ انسان (انجام آتھم ضمیمہ ص 47، روحانی خزائن جلد 11 ص 331 از مرزا قادیانی)
- جنگل کے وحشی (انجام آتھم ضمیمہ ص 49، روحانی خزائن جلد 11 ص 333 از مرزا قادیانی)
- ولد الحرام (انوار اسلام ص 30، روحانی خزائن جلد 9 ص 31 از مرزا قادیانی)
- ولد الحلال نہیں (انوار اسلام ص 29، روحانی خزائن جلد 9 ص 31 از مرزا قادیانی)
- واہ رے شیخ چلی کے بڑے بھائی (انوار اسلام ص 30، روحانی خزائن جلد 9 ص 40 از مرزا قادیانی)
- والدجال البطّال (انجام آتھم ص 251، روحانی خزائن جلد 11 ص 251 از مرزا قادیانی)
- ہامان (انجام آتھم ضمیمہ ص 56، روحانی خزائن جلد 11 ص 340 از مرزا قادیانی)
- ہندوزادہ (انجام آتھم ص 59 حاشیہ، روحانی خزائن جلد 11 ص 59 از مرزا قادیانی)
- ہواوہوس کا بیٹا (اعجاز احمدی ص 43، روحانی خزائن جلد 19 ص 154 از مرزا قادیانی)
- ہزار لعنت کا رسہ (مجموعہ اشتہارات جلد دوم ص 77 از مرزا قادیانی)
- ہیچو گرگ (مواہب الرحمٰن ص 131، روحانی خزائن جلد 19 ص 352 از مرزا قادیانی)
- ہیچو جنین (مواہب الرحمٰن ص 138، روحانی خزائن جلد 19 ص 359 از مرزا قادیانی)
- یہودی صفت (انجام آتھم ضمیمہ ص 3، روحانی خزائن جلد 11 ص 287 از مرزا قادیانی)
- یاوہ گوہ (انجام آتھم ضمیمہ ص 19/ح، روحانی خزائن جلد 11 ص 303 از مرزا قادیانی)
- یہودی سیرت (انجام آتھم ص 24/ح، روحانی خزائن جلد 11 ص 24 از مرزا قادیانی)
- یہودی (انجام آتھم ضمیمہ ص 45، روحانی خزائن جلد 11 ص 329 از مرزا قادیانی)
- یا شیخ الضلالۃ (اعجاز احمدی ص 76، روحانی خزائن جلد 19 ص 188 از مرزا قادیانی)
- یک چشم (انجام آتھم ضمیمہ ص 24/ح، روحانی خزائن جلد 11 ص 308 از مرزا قادیانی)
- یہودیت کا خمیر (انجام آتھم ضمیمہ ص 21/ح، روحانی خزائن جلد 11 ص 305 از مرزا قادیانی)
- یہ غول البراری (کرامات الصادقین صفحہ د(4)، روحانی خزائن جلد 7 ص 152 از مرزا قادیانی)

(زمیندار 9، 14، 15 تا 16 فروری 1918ء)

اسلام اور قتل مرتد، مخالفین کے اعتراضات اور شریعت کی تصریحات

افغانستان میں نعمت اللہ قادیانی کی سنگساری نے ان حلقوں میں جو آزادئ ضمیر کے نام سے شریعت غرا کی سیزدہ صد سالہ روایات کو مسخ کرنے یا من مانی تاویلات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک خاص قسم کی شہرت حاصل کر چکے ہیں، مخالفت کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا اور پیروان دین حنیف کے کانوں میں یہ غیر مانوس صدائیں پڑنا شروع ہوگئیں کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے۔ شرع مبین کے علم برداروں کی غیرت اس سوفسطائی تحریف کی تاب نہ لاسکی اور انہوں نے قتل مرتد کے احکام شرح و بسط کے ساتھ پیش کر کے فریق ثانی کی غلط روش کو عالم آشکار کر دیا۔ انکار و اثبات اور ردو کد کا یہ جوش و خروش فریقین کو کچھ دیر تک گرم نزاع رکھ کر آخر امتداد زمانہ سے تھم گیا اور میرا خیال تھا کہ اب اس مسئلہ پر قلم اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ لیکن افسوس کہ کابل میں سنگساری کے جدید واقعات نے اس فتنہ خوابیدہ کو از سر نو بیدار کر دیا ہے۔

پہلے واقعہ سنگساری پر تو مخالفت کی آواز علی العموم قادیانیوں اور بعض غیر مسلم حلقوں ہی کی طرف سے بلند ہوئی تھی لیکن موجودہ واقعہ پر بعض بلند مرتبت مسلمان بھی مخالفین کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے سنے جاتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان حضرات نے محض اجمالی مخالفت ہی پر کفایت نہیں کی بلکہ تفصیل و تشریح کا دامن تھاما اور امر و افتا کے منصب بلند کی حقیقی خصوصیات و لوازم سے بہت بڑی حد تک بے بہرگی یعنی علوم کتاب و سنت اور حقائق قرآن و حدیث سے ناواقفیت کے باوجود بزعم خود حجج و براہین شرعیہ کے رو سے قتل مرتد کو غلط ثابت کیا۔ اپنی اس غیر مآل اندیشانہ روش سے انہوں نے ایک آزاد و اسلامی سلطنت کے خلاف دشمنان اسلام کی فتنہ انگیزیوں کو دبانے کے بجائے اس آگ کو زیادہ بڑھکانے اور مشتعل کرنے کی راہ اختیار کی۔ ان حالات میں میرے لیے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ اس مبحث کے اطراف و نواحی پر ایک مبسوط مضمون سپرد قلم کروں۔

اس حقیقت کا شروع ہی میں بصد عجز اعتراف کر لینا ضروری ہے کہ میں مذہبی امور میں حکم بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور نہ ہی مصالح شریعت پر مجھے ایسی نظر حاصل ہے کہ اس مسئلہ کو بہمہ وجوہ صحیح اور درست شکل میں قارئین کرام کے سامنے پیش کرنے کا دعویٰ زبان پر لاسکوں۔ یہ ان علمائے کرام کا کام ہے جن کی زندگیاں دینی علوم کے بے پایاں سمندر کی شناوری میں بسر ہو چکی ہیں۔ محض عربی کے چند جملوں کو الٹا سیدھا پڑھ لینے یا مترجم قرآن و مترجم احادیث اور شروح و حواشی کتب دینیہ کی چندروزہ ورق گردانی سے یہ حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ تاہم دل اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ جن حضرات نے اپنے حقیقی دائرے سے متجاوز ہو کر شرعی امور کے فیصلے کا منصب اختیار کیا ہے اور قتل مرتد کے متعلق کتاب و سنت کی تصریحات، ائمہ و علمائے اسلام کے متفقہ فیصلے اور اسلامی حکومتوں کے مستقل تعامل کے خلاف آواز بلند کی ہے، ان کے دلائل و براہین کا اندازہ نہ کیا جائے اور یہ نہ دیکھا جائے کہ جو کچھ وہ فرما رہے ہیں، اس کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟

واقعہ سنگساری کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو سرسری طور پر تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا گروہ مرزائیوں پر مشتمل ہے جس میں لاہوری اور قادیانی یکساں حیثیت سے شریک ہیں، دوسرا گروہ نامسلمانوں کا ہے جن میں سے بعض نے اپنے خیالات و معتقدات کے مطابق نیک نیتی کے ساتھ اس کے خلاف احتجاج کیا ہے اور بقیہ اصحاب محض اس وجہ سے شور مچا رہے ہیں کہ ان کے جذبہ معاندت اسلام اور داعیہ عداوت افغانستان کا تقاضا یہی ہے۔ تیسرے گروہ میں بعض مسلمان شامل ہیں، ان کے خیالات سامنے رکھنے سے یہ حقیقت الم نشرح ہو جاتی ہے کہ وہ قتل مرتد کے کچھ اس وجہ سے مخالف نہیں ہیں کہ شریعت کی تمام تصریحات و توضیحات کا بہ امعان نظر مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں بلکہ اصلیت یہ ہے کہ ان کا دل دانستہ یا نادانستہ یورپ کے پیش کردہ مفہوم ''آزادی ضمیر'' سے متاثر ہو چکا ہے اور اس مادر پدر آزادی کی تائید کے لیے ان کی متفرنجانہ حیلہ جوئی نے بہ تکلف چند باتیں جمع کر لی ہیں جو ان کے نزدیک قتل مرتد کے عدم جواز کی تائید میں مسلم الثبوت شہادت کا حکم رکھتی ہیں۔

قادیانیوں کی مخالفت کو کسی طویل بحث کا موضوع قرار دینا سراسر موجب تضیع اوقات اور بالکل لاحاصل ہے۔ اس قوم کا یہ مخالفانہ رویہ اربابِ عقل و ہوش کے لیے وجہ استعجاب بھی نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ کسی وجہ شکایت کے بغیر آج تک ہمہ تن اسلام و جمعیۃ اسلامیہ کی مخالفت میں

بازوئے کفر کی قوت وطاقت بنے رہے، جنہوں نے مسلمان کہلانے کے باوجود گزشتہ بیس پچیس سال کی مدت میں اپنے آپ کو کلیتہً طاغوت کے استحکام واستواری اور قوتِ حق کے استیصال و بیخ کنی کے لیے وقف رکھا، جو اسلام کی سب سے بڑی حکومت کو پارہ پارہ کرنے والوں اور جزیرۃ العرب کے مختلف حصص پر قبضہ جمانے والوں کو آیہ ''**اولی الامر**'' کا صحیح مصداق (مصداق مان کر) ان کی اطاعت وفرمانبرداری کو خدا اور رسول کی اطاعت وفرمانبرداری کا لاینفک جزو سمجھتے رہے، جن کی آنکھوں کے سامنے مولد و ماورائے اسلام کفر کے سیلاب استعمار واستیلاء کی جولاں گاہ بنا۔ مگر اس زہرگداز حادثہ پر ان کے دلوں میں دینی حمیت کی کوئی خفیف سی تڑپ بھی پیدا نہ ہوئی بلکہ وہ اپنی سابقہ بے غیرتی میں زیادہ سخت وشدید ہوگئے۔ اگر آج وہ اپنے ہم مشربوں کی سنگساری پر روئیں، پیٹیں، چیخیں، چلائیں، ایک آزاد، غیور اور خود مختار اسلامی سلطنت کے خلاف ناشائستہ کلمات استعمال کریں، اپنی دادرسی کے لیے نامرادانہ کفر کے دروازوں کی خاک چاٹتے پھریں تو اس پر تعجب کا کون سا مقام ہے؟

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

رہا نفس قتل مرتد تو اس کی نسبت قادیانیوں سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ان میں سے چند لوگ بہائی بن گئے تھے۔ ان بیچاروں کے ساتھ انتہائی بدسلوکیاں کی گئیں، ان پر نفرینوں اور لعنتوں کی بوچھاڑ کی گئی، انہیں مارا پیٹا گیا، بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ انہیں مرتد قرار دے کر مستوجب قتل بھی مانا گیا۔ خدا نے گنجے کو ناخن ہی نہیں دیے ورنہ اگر مرزا بشیرالدین کے ہاتھ میں بھی امان اللہی تلوار ہوتی تو نہ محض بہائیت اختیار کرنے والوں کے ساتھ بلکہ سارے مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک ہوتا جو قادیانیوں کے ساتھ کابل میں ہوا۔ عام مسلمانوں کے خلاف قادیانیوں کا بغض وعناد اور جوش غیظ وغضب خود اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ بہ حالت موجودہ قتل مرتد کے خلاف واویلا محض بے بسی ونا داری کا ماتم ہے، ورنہ قوت ہو تو آج بلاتامل اسے شریعت کا لازمی و لاینفک جزو مان لیا جائے، جیسا کہ قادیانیوں نے 27 فروری 1925ء کو دہلی میں اپنے بھرے جلسے کے اندر علی الاعلان یہ کہہ کر مان لیا کہ ''اگر ہندوستان میں ہماری حکومت ہوتی تو بہائیوں کو قتل کر دیتے۔'' (''کوکب ہند'' دہلی جلد 2 صفحہ 77 مورخہ یکم مارچ 1925ء)

غیر مسلم معترضین میں سب سے پہلے مہاتما گاندھی کی تحریر قابل غور ہے جو میرے خیال کے مطابق از سر تا پا ناواقفیت اور غلط اندیشی پر مبنی ہے۔ مہاتما جی لکھتے ہیں کہ:

''عقل و دانش کے اس دور میں اگر کسی مذہب کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہو گا کہ اس کا کوئی اصول موضوعہ عالمگیر حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے تو پہلے اسے عقل کی حق و باطل کو پرکھنے والی کسوٹی پر کسے جانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا پڑے گا۔''

اس اصول سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور تمام ادیان و شرائع میں اسلام سب سے پہلا مذہب ہے جس نے حق و باطل کے امتیاز کا یہ اصول پیش کیا اور اسی پر اپنی قبولیت و عدم قبولیت کا انحصار رکھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ''عقل کی حق و باطل کو پرکھنے والی کسوٹی'' کیا ہوگی۔ کیا اس باب میں فیصلے کے لیے تنہا مہاتما گاندھی یا مرزا بشیر الدین محمود یا محمد علی لاہوری، یا مولانا محمد علی (جوہر) یا کسی دوسرے شخص کی عقل معیار قرار دی جا سکتی ہے۔ اگر ہر فرد کی عقل ہر دین و شریعت اور ہر نظام و آئین کی صحت و عدم صحت کی کسوٹی بن جائے تو آج دنیا میں ایک نظام اور ایک شریعت بھی قائم نہ رہے۔ ایک بت پرست اپنے ہاتھ سے پتھر کی مورت تراشتا ہے اور صبح و شام اس کے سنگ آستان پر پیشانی رگڑ رگڑ کر جلب منافع اور دفع مضار کی التجائیں کرتا ہے۔ پھر کیا اس بت پرست کی عقل **رب المشرقین و المغربین** اور **فاطر السموات والارض** کے تسلیم و عدم تسلیم کا معیار بن سکتی ہے؟ ایک چور اپنے ہم سایوں اور ہم جنسوں کے مال و متاع کا احترام ملحوظ نہیں رکھتا اور اس کی عقل کبھی اس بات کو درست نہیں مان سکتی کہ رات کی تاریکی میں کسی کے مکان کی چھت پھاڑ کر یا اس مکان کی دیوار میں سیندھ لگا کر اثاث البیت کو لینا بھی ایک ناروا حرکت ہے، پھر کیا حد سرقہ کے لیے اس چور کی نادرست عقل کسوٹی بن سکتی ہے؟ انگلستان کے کسی باشندے کی عقل نہیں مان سکتی کہ انگریزوں کا ہندوستان پر کوئی حق نہیں ہے، دنیا جہان کے ارسطوؤں کی منطق سے بھی اس کے اس استدلال پر حرف نہیں آ سکتا کہ اگر وہ اور اُس کی تہذیب نہ ہو تو ہندوستان جنت ہونے کے بجائے جہنم بن جائے۔ لیکن کیا اس عقل کے مطالبہ پر جہاد آزادی ہند ترک کیا جا سکتا ہے یا نادرست مانا جا سکتا ہے؟ ایک خونی کسی بات پر اپنے کسی ہم جنس سے ناراض ہوتا ہے اور اس کی عقل بھی کہتی ہے کہ اس ہم جنس کی گردن اُڑا دے۔ پھر کیا آپ اس خونی کی عقل کو معیار

حق قرار دے کر قتل عمد کے قصاص کا قانون کتاب التعزیرات سے خارج کر سکتے ہیں؟ غرضیکہ اس قسم کی صدہا مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن کی بناء پر آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ حق و باطل کے پرکھنے والی عقل کی بھی خاص حدّیں ہیں اور اسے مطلق العنان چھوڑنے سے کام نہیں چل سکتا۔ کسی قانون یا دفعہ یا تعزیر کی اچھائی یا برائی کے فیصلے کے لیے کسی فرد واحد کا مزعوم عقیدہ، خود ساختہ معیار، باطل خیال یا مسخ شدہ عقل معیار نہیں بن سکتی بلکہ ایک ایسی عقل کی تلاش کرنی پڑے گی جس کے پیش نظر کائنات انسانیت کی فلاح و بہبود ہو۔ جو بنی آدم کے امن وامان اور راحت و آسائش کی حفاظت کے فرائض کو پورے طور پر محسوس کرتی ہو اور فتنہ وفساد اور بغض و عداوت کی شرانگیزیوں کے سدباب میں انسانی دماغ، انسانی ذہنیت اور انسانی جذبات وحسیات سے تجاوز نہ کرتی ہو۔ یعنی انسانوں کو انسان سمجھتی ہو، ایسی ہی عقل کی بناء پر قتل مرتد کے حکم کا اندازہ کرنا چاہیے لیکن اس باب میں حَکَم بننے کے لیے اس عقل کا معیار کیوں کر صحیح مانا جا سکتا ہے جو کائنات انسانیت تو ایک طرف رہی، اس کے ایک ٹکڑے یعنی اہل ہند کے گزشتہ چار پانچ سال کے معاملات میں خود اپنے قول کے مطابق ہمالیہ جتنی بڑی غلطیاں کر چکی ہے۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ ''ینگ انڈیا'' کا تازہ پرچہ (مورخہ 5 مارچ 1925ء) ڈاک میں آیا۔ اس میں مہاتما گاندھی نے ''میرا جرم'' کے عنوان سے میرے اولین مکتوب کا جواب سپرد قلم کرتے ہوئے یہ تو تسلیم کیا ہے کہ جس چیز کو غلطی کہا جاتا ہے، وہ کوئی حقیقت مطلقہ نہیں بلکہ محض ایک اعتباری شے ہے جو مکان اور زبان کے تغیرات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ بعض غلطیاں ایسی ہیں جن کے قابل گرفت ہونے پر بنی آدم کے ضمیر کا یکساں صاد ہے اور کسی جرم کی پاداش میں خواہ وہ کیسا ہی سنگین اور گھناؤنا کیوں نہ ہو، مجرم کو عذاب کے ساتھ قتل کرنا اسی قسم کی غلطی ہے۔ قرآن اگر ایسی غلطی کرے گا تو آپ اس پر ضرور معترض ہوں گے۔ اسی کے ساتھ اپنے تازہ مقالہ میں آپ نے چند اور تصریحات بھی فرمائی ہیں جنہیں آپ کے ملفوظات متر شدہ 26 فروری 1925ء کے ساتھ اگر ملا کر پڑھا جائے تو مضطرانہ تناقض، مجبورانہ تباین اور بنجرانہ بے ربطیوں کا ایک حیرت انگیز منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور میں آنکھیں مل مل کر اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی ایسی انمل بے جوڑ تحریر اس شخص کے قلم سے نکل سکتی ہے جس کی زبردست انشا پردازی، اپنے منطقیانہ زور، اپنی

دلفریب سلاست اور اپنے دلنواز تسلسل کی بدولت آج تک فلک سے ''احسنت'' اور ماہ ''زہ'' کا خراج وصول کرتی رہی ہے۔ فرماتے ہیں:

1- میں سمجھتا ہوں کہ صرف بعض حالات میں قرآن طریق سنگساری کا حکم دیتا ہے لیکن واقعات زیر بحث ان حالات سے خارج ہیں۔

2- میں قرآن اور تاریخ اسلام سے واقف ہوں اور جانتا ہوں کہ کثیر التعداد مفسرین نے آیات قرآنی کی تاویل اپنے ذہنی مفروضات اور پہلے سے قائم نمودہ خیالات پر کی ہے۔

3- (حضرت) محمد (ﷺ) کی زندگی اور اس زمانہ میں خواہ کچھ بھی ضروری اور مباح کیوں نہ ہو، لیکن اس طریق سزا کی حمایت محض اس وجہ سے نہیں کی جاسکتی کہ اس کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔

4- میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ خود قرآن کی تعلیمات بھی نکتہ چینی سے مستثنیٰ قرار نہیں دی جاسکتیں۔

5- مولانا نے میرے بیان کا وہ مفہوم پیش کیا ہے جو اس سے نہیں اخذ کیا جاسکتا۔ میں نے قرآن مجید کی تعلیمات پر مخالفانہ یا کسی دوسرے طریقہ پر نکتہ چینی نہیں کی۔ البتہ مفسرین قرآن پر ضرور اعتراض کیا ہے۔

ان پنجگانہ اقتباسات کے کھلے ہوئے نواقض اپنے شارح آپ ہیں۔ مہاتما جی یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ قرآن اور تاریخ اسلام سے واقف ہیں لیکن ساتھ ہی اس واقفیت کا یہ انوکھا ثبوت بھی پیش کرتے ہیں کہ قرآن میں طریق سنگساری کا حکم دیا گیا ہے حالانکہ جس شخص نے سرسری نظر سے بھی قران حکیم کو دیکھا ہو، اُسے معلوم ہوسکتا ہے کہ رجم کا حکم اس صحیفۂ مقدس میں کہیں بھی بالتصریح مندرج نہیں ہے۔ آپ علی روس الاشہاد یہ بھی کہے چلے جاتے ہیں کہ قرآن کی تعلیمات نکتہ چینی سے مستثنیٰ نہیں قرار دی جاسکتیں اور اس تاکید میں شان تاسیس پیدا کرنے کے لیے ڈنکے کی چوٹ یہ بھی اعلان فرمائے جاتے ہیں کہ کوئی قابل اعتراض فعل محض اس بناء پر جائز نہیں ٹھہر سکتا کہ اس کی حمایت قرآن میں کی گئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی آپ کی خود فراموشی کا یہ عالم ہے کہ چند سطروں کے ایک مکتوب میں اپنی تردید آپ ہی اس اعتراف سے فرما دیتے ہیں کہ میں نے تو قرآن مجید کی تعلیمات پر مخالفانہ یا کسی دوسرے طریق پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی۔ جب

ایک شخص پکار کر کہہ رہا ہو کہ قرآن نکتہ چینی سے مستثنیٰ نہیں ہے تو پھر اُس کے اس قول میں کیا وزن ہوسکتا ہے کہ اُس نے اس صحیفہ پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی۔

بہ ہر حال میں اس سے پیشتر یہ عرض کر چکا ہوں کہ آسمانی صحائف اور منزل من اللہ کتب کے اوامر ونواہی کی اچھائی یا برائی کے اندازے کے لیے کسی ایک فرد کی محدود، ممسوخ (بہ معنی صورت بگاڑنا) اور قدم قدم پر لغزش میں آنے والی عقل معیار نہیں بن سکتی اور یہ ایک ایسی صاف، واضح اور کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مہاتما جی یا کسی دوسرے شخص کو اس سے ایک لمحہ کے لیے بھی انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی۔ اب میں مہاتما جی کی تحریرات کے اُس حصے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس سے کتب سماوی کی اس حیثیت پر زد پڑتی ہے کہ وہ ہر قسم کی غلطیوں اور خطاؤں سے پاک ہیں اور انسان کو اپنی ہدایت وراہنمائی کے لیے انہیں بے چون وچرا تسلیم کر لینا چاہیے۔

اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو مہاتما جی نے متعدد بار انجیل وتورات کی طرح قرآن کو بھی ایک آسمانی صحیفہ تسلیم کیا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی انکار پر دلائل لائے تو بلحاظ اصول اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔ لیکن ایک کتاب کو منزل من اللہ تسلیم کر لینے کے بعد اپنے چند لایعنی اوہام کی بناء پر اس کے کسی حکم کو غلط قرار دینا عقلاً مہمل ہے۔ **افتومنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض** (البقرۃ:85)۔ ایک ادنی سی مخلوق کی عقل، دانش وبینش، وسعت نظر، نشو وارتقا اور علم وفن کی کتنی ہی منزلیں طے کر جائے لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہوسکتا کہ اپنے خالق وفاطر کے مقرر کیے ہوئے راستوں اور معین کی ہوئی حدوں پر معترض ہو۔ مہاتما جی کو اس اعتراض سے پہلے یہ اعلان کر دینا چاہیے تھا کہ قرآن مجید خدا کا نہیں بلکہ انسان کا کلام ہے اور اسی لیے وہ غلطی، خطا اور لغزش سے مبرا ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اس صورت میں آپ کا یہ انوکھا خیال ارباب دانش و بینش کے نزدیک معقول بھی ٹھہر سکتا تھا کہ یہ کتاب اور دوسری کتابیں کہ وہ بھی قرآن کی طرح انسانوں ہی کی تصنیف کی ہوئی ہیں۔ آپ کے یا کسی دوسرے انسان کے خودساختہ اور بودے عقلی مفروضات کی گرفت سے نہیں بچ سکتیں، لیکن یہ عجیب منطق ہے کہ قرآن کو خدا کا کلام بھی مانتے چلے جاتے ہیں اور انسان ضعیف البیان ہوکر رب المشرقین ورب المغربین کے آخری اور مکمل پیغام پر خردہ گیری (بہ معنی عیب جوئی) کرنے کا بھی داعیہ رکھتے ہیں۔

خاک کے پتلے نے دیکھ کیا ہی مچایا ہے شور

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ مہاتما جی نے میری اس گزارش کے حرف حرف سے اتفاق کیا ہے کہ غلطی ایک اعتباری اصطلاح ہے لیکن آپ ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ:

"بعض امور ایسے ہیں جن کے غلط ہونے پر ساری دنیا متفق ہے۔ مجھے امید ہے کہ عذاب کے ساتھ کسی کی جان لینا ایک ایسی ہی غلطی سمجھی جائے گی"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ عذاب کے ساتھ کسی کی جان لینا ساری دنیا کے نزدیک مسلم طور پر غلطی ہے اور ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک قتل بالتعذیب ایک ناروا فعل سمجھا جاتا رہا ہے۔ میں مہاتما جی کے اس دعوے پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتا ہوں۔ جس بحث پر میں نے قلم اٹھایا ہے، اس کی تہہ کو پہنچنے کے لیے یہ اصولی نکتہ ذہن نشین کر لینا ناگزیر ہے کہ کائنات انسانی کے نشو و ارتقا میں جو قوتیں ابتدائے آفرینش سے حصہ لے رہی ہیں، ان میں مذہب کو نمایاں درجہ حاصل ہے اور اگر بنی آدم کی راہنمائی کے لیے مذہب موجود نہ ہوتو اس جہان رنگ و بو میں جو جنت نگاہ اور فردوس گوش ہے، خاک اڑتی ہوئی نظر آئے۔ مذہب کیا ہے، محض اُن تعلقات کا آسمانی شیرازہ ہے جو انسان کو ایک طرف اپنے خالق اور دوسری طرف اپنے ابنائے جنس سے وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ عقل انسانی نے بھی اپنی ناچیز بساط کے مطابق ان دوگونہ رشتوں کو جوڑنے کی کوششیں کی ہیں لیکن آج تک تمام کوششیں بے سود ثابت ہوتی رہی ہیں اور اس دور تفلسف میں بھی جبکہ انسان کی عقل اپنے معراج کو پہنچ چکی ہے اور عقل مند انسانوں کا ایک طبقہ مذہبی احکام کو لایعنی اوہام کا ایک بے سروپا مجموعہ سمجھنے لگا ہے، دنیا کا جزو غالب بدستور مذہب کی گرفت میں ہے اور تا قیام قیامت رہے گا۔

خدائے بزرگ و برتر نے اس تیرہ خاکدان میں جس کا ذرہ ذرہ اس کی حکمت کا گواہ ہے جس کے تمام اجزا کی پیوستگی اس کے ازلی و سرمدی رابطہ کی استواری کی شہادت زبان حال سے دے رہی ہے جس کا ہمہ گیر قانون مہر و ماہ اور کوہ و کاہ (یعنی پہاڑ اور گھاس کی پتی) پر یکساں محیط ہے، انسان کی فطرت کی صحیح رہ نمائی کے لیے وقتاً فوقتاً اپنے خاص خاص بندوں کو بنی آدم کی ہدایت و راہنمائی کے منصب پر مامور کیا ہے، جنہیں ہم انبیا و مرسلین کہتے ہیں۔ خدا کی مشیت انہیں برگزیدہ انسانوں کی وساطت سے دنیا پر ظاہر ہوئی ہے اور یہ مشیت ترقی انسانی کے مختلف ادوار میں بعض کتابوں کی شکل اختیار کرتی رہی ہے جنہیں صحائف سماوی کے نام سے تعبیر کیا جاتا

ہے۔ افلاطون کی حکمت اشراقی افسانہ بن چکی ہے، ارسطو کی حکمت مشائی کے سر بفلک قصر کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہے۔ فرفوریوس کی ''ایساغوجی'' کے محکم اصول کی دھجیاں اڑ چکی ہیں، نیوٹن کا ''پرنسپیا'' تقویم پارینہ کی طرح محض المماریوں کی زینت بنا ہوا ہے لیکن آسمانی کتابیں آج بھی ہر مقام پر دنیا کے لیے شمع ہدایت بنی ہوئی ہیں اور کروڑوں بندگان خدا اپنی دنیوی فلاح اور اخروی نجات کو انہی کے دامن سے وابستہ سمجھ رہے ہیں۔ موجودہ دور کے الحاد، دہریت، تفلسف اور تشکک کی بادسموم نے انسانی رشد وہدایت کے ان آسمانی چمن زاروں پر جھلسانے، برباد کرنے اور اجاڑنے کی صدہا کوششیں کیں مگر ان کی طراوت رنگینی، عطر بیزی اور بہار آرائی پہلے سے دوچند ہو رہی ہے اور ان شاء اللہ اسی طرح دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی جائے گی۔ **یریدون ان یطفؤا نور اللّٰہ بافواھھم ویابی اللّٰہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون۔** (التوبہ:32)

ان صحائف سماوی کی تعلیمات پر غائر نظر ڈالی جائے اور ان کا باہم تقابل کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکار دکھائی دے گی کہ ان سب کا ماخذ، ان سب کا سرچشمہ اور ان سب کا اصل الاصول ایک ہے۔ بلاشبہ ان کی تعلیمات میں بلحاظ تغیر زمان و مکان اور بنظر ارتقائے ذہنیت انسانی کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور پایا جاتا ہے لیکن اکثر معاملات میں صاف صاف اور کھلم کھلا اشتراک ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک کائنات انسانیت کے مامور من اللہ ہادیوں، قائدوں اور رہنماؤں کا جو سلسلہ قائم ہے، ان سب کی تعلیم ایک ہے۔ اگرچہ معلم جدا جدا ہیں، مظروف ایک ہے، اگرچہ ظرف مختلف ہیں، معانی ایک ہیں، اگرچہ حروف والفاظ کے صور واشکال اور ادائے مطالب کے اسلوب وعنوان متنوع ہیں ؎

عباراتنا شتی و حسنک واحد
و کل الی ذاک الجمال یشیر

البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہدایت آسمانی کی یہ شراب مختلف خمستانوں میں رہتی ہوئی اور مختلف ادوار وازمنہ کی صافی میں چھنتی ہوئی ساقی بطحا صلی اللہ علیہ وسلم کے مینا میں پہنچ کر ایک ایسا آسمانی زلال بن گئی جس کے بعد اس کے لیے صفائی اور لطافت کا اور کوئی درجہ، کوئی نئی دعوت اور کوئی غیر معروف تعلیم نہیں بلکہ تمام سابقہ تعلیمات کے بہترین پہلوؤں کا ایک ایسا جامع اور محتوی علی الکل مرقع ہے جو اکمال واتمام کی آخری حد پر پہنچ کر زمان ومکان کے تغیرات سے بہت بالا ہو

چکا ہے اور جس کے اندر ذہنیت انسانی کی تمام ممکنات ارتقا کا پورے طور پر حصر و احاطہ ہو چکا ہے۔

صحائف سماوی کی تعلیمات کے اصولی اشتراک کی نسبت اوپر جو دعویٰ کیا گیا ہے، وہ مختلف کتب کی مقررہ سزاؤں اور حدوں میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے معلومہ و مشہورہ کتب سماوی میں سے توریت، زبور، انجیل، وید اور شرح اوستا ہیں۔ تین کتابوں کے منزل من اللہ ہونے کے متعلق قرآن حکیم میں صراحت موجود ہے لیکن بقیہ کتب کے متعلق صاف طور پر کوئی ایسا ذکر نہیں کیا گیا۔ تاہم قرآن نے ہمارے سامنے یہ حقیقت پیش کر دی ہے کہ **وان من امة الاخلا فیها نذیر** (فاطر: 24) اور **ولکل قوم هاد** (الرعد: 7) اس اصول کی بنا پر ہم ویدوں کو آسمانی کتب تسلیم کرتے ہوئے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا ان میں مختلف جرائم کے متعلق ایسی سزائیں موجود ہیں یا نہیں جو قتل بالتعذیب کے تحت میں آتی ہیں۔

قتل بالتعذیب کے نظائر وامثلہ کی تلاش میں سب سے پہلے ویدوں کے ضابطہ تعزیرات کی ورق گردانی کرنی چاہیے جو مشہور مذاہب کی معلومہ و متمسکہ کتب سماوی میں سب سے زیادہ قدیم اور بنی نوع انسان کے دور طفولیت و زمانہ حداثت سن کا دستور العمل سمجھے جاتے ہیں نیز ہنود کے معتقدات کا مرکز و محور ہیں۔ اس کے لیے کسی دیدہ ریزانہ تفحص و تجسس اور دماغ سوزانہ تلاش و کنج کاوی کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ میں قتل بالتعذیب کے تمام احکام کا حصر و احاطہ نہیں کرنا چاہتا بلکہ سرسری طور پر محض چند مثالوں کا پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں مثلاً:

- ''اے راج پرش! آپ دھرم کے مخالف دشمنوں کو آگ میں جلا ڈالیں۔ اے جاہ وجلال والے پرش! وہ جو ہمارے دشمنوں کو حوصلہ دیتا ہے، آپ اس کو الٹا لٹکا کر خشک لکڑی کی طرح جلا دیں''۔ (یجر وید۔ باب 13 اشلوک 12)

''منوسمرتی'' قدیم ہندو دھرم کا مستند ترین شاستر اور ویدوں کی بہترین فقہی کتاب ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

- ''ذات وصفات کے غرور سے اپنے شوہر کو ترک کرنے والی عورت کو راجہ بہت سے آدمیوں کے روبرو کتوں سے بھوجن کرا دے۔ دوسرے کی عورت مرقومہ بالا سے جماع کرنے والے آدمی کو لوہے کے پلنگ پر سلا کر

چاروں طرف لکڑی رکھ کر آگ لگا دے جس سے وہ پاپی جل جائے‘‘۔

(منو۔باب 8۔اشلوک 37 و 372)

ممکن ہے کہ موجودہ زمانہ کے بعض ’’روشن خیال‘‘ ہندوؤں کے نزدیک ’’منوسمرتی‘‘ کا حوالہ اس وجہ سے درخور پذیرائی نہ سمجھا جائے کہ سمرتی ایک ماضی مجہول کا ضابطہ تھی، ان کے لیے میں دور حاضر کے سب سے بڑے مصلح اور آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند کی تحریر پیش کرتا ہوں جو ’’ستیارتھ پرکاش‘‘ کے چھٹے باب میں منوسمرتی کی متذکرہ صدر تعزیرات کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

- ’’جو اس سزا کو سخت جانتے ہیں وہ انتظام ملکی کے اصول کو نہیں سمجھتے......اگر نرم سزا دی جائے تو برے کام بہت بڑھ کر ہونے لگیں گے۔بس جس کو تم نرم سزا کہتے ہو، وہ کروڑوں گنا زیادہ ہونے کی وجہ سے کروڑوں گنا سخت ہوتی ہے کیونکہ جب بہت آدمی برے کاموں کے مرتکب ہوں گے تو سب کو تھوڑی تھوڑی سزا ضرور دینی پڑے گی‘‘۔

(ستیارتھ پرکاش پانچواں ایڈیشن صفحہ 188)

یہ تو ہندو دھرم کی کیفیت تھی۔اسی طرح تورات میں قتل بالتعذیب کی مثالیں موجود ہیں مثلاً:

- ’’اگر تیرا بھائی یا تیری ماں کا بیٹا یا تیرا بیٹا یا بیٹی یا تیری ہم آغوش بیوی یا تیرا دوست جس کو تو اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا ہے، تجھ کو چپکے چپکے پھسلا کر کہے کہ چلو ہم اور دیوتاؤں کی پوجا کریں جن سے تو اور تیرے باپ دادا واقف بھی نہیں۔یعنی ان لوگوں کے دیوتا جو تمہارے گرداگرد تیرے نزدیک رہتے ہیں یا تجھ سے دور زمین کے اس سرے سے اس سرے تک بسے ہوئے ہیں۔تو تو اس پر اس کے ساتھ رضامند نہ ہونا اور نہ اس کی بات سُننا۔تو اس پر ترس بھی نہ کھانا اور نہ اس کی رعایت کرنا اور نہ اسے چھپانا۔ بلکہ تو اس کو ضرور قتل کرنا اور اس کو قتل کرتے وقت پہلے تیرا ہاتھ اس پر پڑے۔اس کے بعد سب قوم کا ہاتھ اور تو اسے سنگسار کرنا تا کہ وہ مر جائے۔‘‘(استثناء:باب 13 فقرہ:6 تا 10)

نیز تورات میں زانی کے لیے رجم کی سزا موجود ہے۔ یہ اقتباسات اس امر کی قطعی وحتمی شہادت ہیں کہ بعض جرائم ومعاصی کے مہلک، تباہی خیز اور اجتماع وعمران کی جڑیں کھوکھلی کر دینے والے اثرات کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن سے پہلے کی تقریباً ان تمام آسمانی کتابوں میں قتل بالتعذیب کو ضروری و لازمی قرار دیا گیا ہے جو انجیل کی طرح محض متصوفانہ اخلاقی دعوت اور عارفانہ پندوموعظت کی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ قوم کے لیے ایک منضبط و مدون ضابطہ وقانون لے کر آئی تھیں۔ پھر کیا ان حقائق کی روشنی میں مہاتما جی کا یہ انوکھا اور بے بنیاد دعویٰ ایک لحظہ کے لیے بھی بجائے خود قرار پا سکتا ہے کہ قتل بالتعذیب کو عالمگیر طور پر ایک مسلمہ غلطی سمجھا جاتا ہے؟ اور کیا محولہ اقتباسات سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ قتل بالتعذیب کو مسلمہ غلطی قرار دینا ایک افسوسناک غلطی اور حیرت انگیز غلط بیانی ہے۔ میں اس سلسلہ میں موجودہ زمانہ کی مہذب ومتمدن سلطنتوں کے ضوابط وتعزیرات سے بھی خاص خاص حالات میں تعزیر کی مثالیں پیش کر سکتا تھا لیکن میں نے محض صحائف سماوی کے حوالوں پر اس وجہ سے اکتفا کیا کہ صحائف سماوی کی غیر خاطیانہ اور معصومانہ حیثیت سب کے نزدیک مسلم ہے۔ اس کے خلاف عام دنیاوی ضوابط کی ہر دفعہ کو محل نظر قرار دیا جا سکتا ہے۔

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا، اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ میں قتل بالتعذیب کا کوئی بہت ہی بڑا اور سرگرم حامی ہوں۔ میرا حقیقی مقصود یہ ہے کہ جس چیز کو مہاتما جی بلا تامل وتدبیر اور بدون غور وفکر ایک مسلمہ غلطی ظاہر کرتے ہیں، وہ قدیم صحائف سماویٰ کے نزدیک خاص خاص حالات میں اصلاح بنی نوع انسان اور حفظ عمران وتمدن کا ایک ضروری اور لازمی وسیلہ متصور ہوتی رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر جرم کی سزا گردوپیش کے حالات، جرم کے اثرات، قوم کی ذہنی و دماغی کیفیت اور تنبیہ وتادیب کے متوقع نتائج پر موقوف رہنی ہوتی ہے۔ اگر قوم بہت درشت مزاج اور درشت طبع ہے کہ کسی ہولناک جرم کی پاداش میں مرتکب جرم کی محض جان لے لینے سے عام افراد پر ایسا اثر نہیں پڑتا کہ وہ اس جرم کے اعادہ سے باز رہیں تو اس صورت میں قومی مفاد اور سدباب مفاسد کا اقتضا یہی ہوگا کہ سزا میں زیادہ سخت، زیادہ شدید اور زیادہ مؤثر طریقہ اختیار کیا جائے تا کہ عام لوگ عبرت حاصل کریں۔ کیا مہاتما جی کو یہ معلوم نہیں کہ کسی ضابطہ تعزیرات اور کسی مجموعہ آئین وقوانین میں آج تک سزا کو فی نفسہا مقصود قرار نہیں دیا گیا بلکہ یہ محض اعادہ جرم کے

سد باب اور حفظ امن عامہ کا ایک موثر وسیلہ ہے اور اس کے طرق واشکال اور صور وانواع کے حسن وقبح کا اندازہ کرتے وقت یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ سزا کسی حال میں بھی اپنے مقصد ومدعا کی تکمیل یا کم از کم تکمیل کی مؤثر سے مؤثر کوشش میں ناکام نہ رہے۔اس روشنی میں مہاتما جی واقعات سنگساری پر غائر نظر ڈالیں گے تو قتل بالتعذیب کے متعلق ان کے تمام عاجلانہ اضطرابات اور غیر محققانہ پریشانیاں یک قلم دور ہو جائیں گی۔

شاید مجھ پر یہ اعتراض کیا جائے کہ مہاتما جی نے تو صرف تعزیر با تعزیر کے خلاف آواز بلند کی تھی۔اصل مسئلہ یعنی نفس قتل مرتد کی نسبت نفیاً یا اثباتاً ایک حرف بھی نہیں لکھا تھا۔پھر میں نے ان کی تحریر پر اس بسط وتفصیل کے ساتھ بحث کیوں کی؟ لیکن حقیقت حال کے اعتبار سے یہ اعتراض صحیح نہیں ہوگا۔بلاشبہ مہاتما جی کی ابتدائی تحریر میں ایسے فقرات موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف تعزیر کے خلاف ہیں، نفس قتل مرتد کے متعلق کچھ نہیں کہتے، لیکن دراصل وہ باوجود ادعائے غیر جانبداری غیر جانبدار نہیں رہ سکے مثلاً وہ واقعات سنگساری پر قادیانی جماعت کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں۔پھر کیا یہ ہمدردی محض اس امر پر مبنی ہے کہ عدالت افغانستان نے قادیانیوں کو رجم کے ذریعے کیوں ہلاک کیا اور پھانسی پر کیوں نہ لٹکا دیا یا تلوار سے کیوں نہ قتل کر ڈالا؟ اظہار ہمدردی کی اس ''توجیہ'' کو غالباً کوئی صحیح العقل اور سلیم الفطرت انسان قبول نہیں کرسکتا، پھر کیا یہ ہمدردی مہاتما جی کے ادعائے غیر جانبداری کے اندام ناموزوں پر راست اترتی ہے؟ پھر مہاتما جی نے لاعلمی وبے خبری کے باوجود بلند آہنگی کے ساتھ قرآن دانی کا صور پھونکتے ہوئے یہ بے بنیاد دعویٰ فرمایا ہے کہ قرآن خاص خاص حالات میں رجم کا حکم دیتا ہے۔تیسرے انہوں نے اپنے چند خود تراشیدہ معتقدات یا باصطلاح قرآن حکیم ''اضغاث احلام'' کی بناء پر صحف سماوی کی ہادیانہ ومرشدانہ حیثیت کے حقیقی پاس ولحاظ سے بے پروائی برتی۔ان وجوہ کے پیش نظر میرے لیے مہاتما جی کے بیان پر تفصیلی نقد وتبصرہ ضروری ہوگیا۔لیکن میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہوں اور کہتا ہوں کہ مہاتما جی کا اس مسئلے کی نسبت اظہار خیال کرنا ہی ایک افسوس ناک غلطی تھی۔انہیں ہندوستان میں بلند ترین سیاسی رہنما کی حیثیت حاصل ہے اور ان سے بجا طور پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ہندوستان کے کسی باشندے کے مذہبی معتقدات سے تعرض نہیں کریں گے یا ایسے رنگ میں اپنے خیالات ظاہر نہیں فرمائیں گے

جس سے کسی فرد یا جماعت کے دینی جذبات مجروح ہوں۔ وہ اپنے مذہبی معتقدات کے اظہار میں ہر طرح سے آزاد ہیں۔ان کا بہار آفرین قلم صنم پرستی کے ''محاسن'' کی تشریح وتوضیح میں رواں ہو یا بتوں کے ''عظیم الشان'' کارناموں کی سرگزشت مدون کرے یا عدم تشدد کو دنیا بھر کے اعمال و افعال کا اصل الاصول قرار دے، کسی شخص کو بھی ان پر اعتراض نہیں ہوگا لیکن یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے مذہب کے مسائل میں حَکَم کی حیثیت اختیار کریں۔اس مذہب کے کثیر التعداد حلقہ بگوشوں کے معتقدات کی تنقیص کریں۔ان کے مسلم علماء، مسلمہ ائمہ اور مسلمہ کتب کی صاف، واضح اور غیر مشتبہ تصریحات کے خلاف آواز اٹھائیں اور ایک حدیث العہد اور قلیل التعداد جماعت کی تائید وتمجید کا دامن تھامیں۔اس صورت میں مہاتما جی کی سیاسی پیشوائی اور وطنی قیادت کا منصب محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ ناروا داری، عدم مسالمت یا عدم برداشت نہیں بلکہ بے خبرانہ، غیر مدبرانہ اور غیر محتاط نکتہ چینی کے نقصان رساں اثرات اور مضرت پرور نتائج کے سد باب کی مخلصانہ کوشش ہے۔

مہاتما جی اس مسئلہ کی نسبت اظہار خیالات کی ایک وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ ان سے بہ حیثیت صدر کانگرس اس قسم کی درخواست کی گئی تھی لیکن انہیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے تھی کہ نیشنل کانگرس کی مسند صدارت کسی شخص کے اندر دنیا جہان کے معاملات میں حَکَم بننے کی صلاحیت پیدا نہیں کر دیتی۔آج مہاتما جی نے قادیانیوں کی ایک درخواست پر مذہبی حَکَم بن کر قتل مرتد کی نسبت اظہار خیالات کیا، کل وہ دوسری استدعا پر اسلام کے حکم پر جہاد بالسیف کی نسبت قادیانیوں کی ''یہودیانہ تاویل'' کو اپنے عقیدہ عدم تشدد کے مطابق سمجھ کر اسے تعلیمات دینِ قیم کا لازم جزو قرار دیں گے۔اسی طرح پرسوں کسی ایسے ہی دوسرے مذہبی مسئلے کی نسبت فیصلہ وتحکم کا قلم اٹھائیں گے۔اور اگر صدارت کانگرس کا ہمہ گیر اور ہمہ رس مفہوم اسی طرح وسعت اختیار کرتا گیا تو نہیں معلوم کل ہندوستان جنت نشان میں کیا کیا گل کھلیں اور لالوں کے کیسے کیسے باغ لہکیں۔میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ منصب صدارت کا لحاظ رکھتے ہوئے مہاتما جی کے لیے اس باب میں خاموشی بہ درجہ اولیٰ ضروری تھی۔قادیانیوں پر افسوس لاحاصل ہے کہ انہوں نے ایک خالص اسلامی معاملے میں مہاتما جی سے اظہار رائے کی استدعا کیوں کی؟ مہاتما جی تو پھر ہندوستانی ہیں، اور ان کی بارگاہ معلیٰ میں فریاد کرنا چنداں قابل اعتراض نہیں لیکن قادیان والے تو ان لوگوں کے دروازوں پر پہنچتے ہوئے بھی نہیں جھجکے جو اسلام کے شدید ترین دشمن اور ملت بیضا کے سخت ترین

اعداء واقع ہوئے ہیں۔ جو تیرہ سو سال سے اسلام کو مٹانے کی نامراد کوششیں کرتے چلے آئے ہیں۔ جو پیٹروی ہرمٹ سے لے کر گلیڈ اسٹن اور گلیڈ اسٹن سے لے کر لائڈ جارج کے عہد مشؤم تک اسلام کے دل و جگر کی تواضع اپنی نمکین اور میٹھی چُھریوں سے کرتے رہے ہیں۔ یہ قادیانی تو وہ ہیں جنہوں نے کبھی اپنی پیشانی کو ڈاؤننگ سٹریٹ کے سنگ آستان پر رگڑا۔ کبھی اپنے جزع و فزع سے وہائٹ ہاؤس کے در و دیوار میں شگاف ڈالا۔ کبھی اپنے نالہ وشیون سے جمعیۃ الاقوام کے گنبد بے در میں الامان والغیاث کی گونج پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں سے تو ہمیں یہی توقع تھی۔ لیکن افسوس کہ مہاتما جی نے اپنی حقیقی حیثیت اور حقیقی دائرے کی حدود ملحوظ نہ رکھیں۔ اگر کل سناتن دھرمیوں اور آریوں کے کسی مختلف فیہ مسئلے میں کوئی جماعت مولانا ابوالکلام آزادؔ کو حَکم تسلیم کرلے اور مولانائے ممدوح خدانخواستہ کاشی کے ودیا دانوں کا چولا پہن کر ویدوں اور شاستروں پر عبور کا دعویٰ کرتے ہوئے پرتی ندھی بن بیٹھیں تو کیا سلیم الفطرت دنیا ایسی لغویت کو تمسخر واستہزا کا ہدف بنانے میں حق بہ جانب نہ ہوگی؟ مہاتما جی اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہوں گے کہ ان کے اظہار خیالات سے اصل مسئلہ کے تصفیہ کو تو کوئی مدد نہ پہنچی، البتہ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کے احسان پذیرائیوں کے نازک آبگینے کو اس سے ٹھیس لگ گئی۔

مہاتما جی کے علاوہ جو ہندو سنگساری کے خلاف شور مچا رہے ہیں، ان کا یہ افسوسناک رویہ زیادہ درخور اعتنا نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کا مخالفانہ شور محض اسلام و افغانستان کے خلاف ایک عمیق جذبہ بغض وعناد اور خدا واسطے کی عداوت وخصومت کا کرشمہ ہے۔ ان کی نظروں میں تو اسلام، افغانستان اور دوسری اسلامی سلطنتوں کا وجود ہی قابل اعتراض ہے۔ تا بہ حسن وقبح افعال و اعمال شان چہ رسد! اگر اسلام میں مرتد کے لیے قتل کی سزا موجود نہ ہوتی یا افغانستان کی امارت شرعیہ ایسی سزا کے نفاذ کا سلسلہ نہ اٹھاتی یا مسلمان اسے جائز تسلیم نہ کرتے تو ان ہندوؤں کا افغانستان کے خلاف مخالفانہ ومعاندانہ غوغا اس حالت میں بھی بدستور جاری رہتا جس طرح کہ واقعات سنگساری سے پہلے جاری تھا۔

تاہم میں ان کی خدمت میں چند اہم گزارشات پیش کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ وہ شریعت اسلام میں مرتد کے لیے قتل کی سزا پر معترض ہیں لیکن اگر وہ اپنے دھرم کی کتابوں کا بہ امعان نظر مطالعہ کریں، ان کے احکام کو پس پشت نہ ڈالیں، ان کا حلقہ اپنی گردنوں سے نہ اتار

پھینکیں، تو انہیں وہاں بھی مرتد کے لیے قتل ہی کی سزا ملے گی۔ مثلاً منوسمرتی کے آٹھویں باب کے اشلوک نمبر 35 و 153 میں ہے۔

- ''خواہ گرو یا نابالغ لڑکا اور بوڑھا و عالم براہمن ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اتھتائی ہونے کی حالت میں اس کو ضرور بلا سوچے قتل کر دینا چاہیے۔ اتھتائی کے قتل میں مارنے والے کو پاپ نہیں ہوتا''۔ (منوسمرتی مترجمہ پنڈت آتمارام جی)

اتھتائی اُس شخص کو کہتے ہیں جو دھرم کو چھوڑ کر ادھرم میں پھنس جائے یعنی مرتد ہو جائے اور یہ تعریف دور حاضر کے سب سے بڑے ہندو مصلح یعنی سوامی دیانند کی تحریر سے مستفاد ہے۔ (ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش پانچواں ایڈیشن صفحہ 181) پھر شریعت اسلام میں تو مرتد سرکاری عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ اسے توبہ کے لیے مہلت دی جاتی ہے۔ نابالغ لڑکے کو سزا سے بری الذمہ سمجھا جاتا ہے لیکن ہندو دھرم میں صاف صاف مرقوم ہے کہ مرتد کو بلا سوچے سمجھے قتل کر دینا چاہیے، خواہ نابالغ لڑکا ہو اور مرتد کے قتل کرنے والے کو پاپ نہیں ہوتا۔ کیا اسلام کا ایک منظّم، منضبط اور اہم مصالح و حکم شرعیہ پر مبنی حکم ہندو دھرم کے اس اجازت نامہ قتل عام سے بھی زیادہ سخت ہے کہ ہندو اپنے مذہب پر غور کرنے اور سوچنے سمجھنے کے بغیر اس پر معترض ہو رہے ہیں؟

سوامی شردھانند قتل مرتد کے خلاف شور و غل مچانے میں حسب معمول سب سے پیش پیش ہیں۔ وہ براہ کرم فرمائیں کہ ''منوسمرتی'' کی محولہ بالا دفعہ اور سوامی دیانند کی طرف سے اس کی توثیق و تصدیق کی نسبت دنیا کیا رائے قائم کرے؟ پھر ہمیں بتائیں کہ وہ ویدوں کو خدا کا کلام سمجھتے ہیں یا نہیں سمجھتے؟ اگر سمجھتے ہیں تو کیا ویدوں میں مرتد کی سزا قتل ہے یا نہیں ہے اور اگر ہے اور یقیناً ہے تو اس کے جواز سے انکار کے بعد کیا ہم ان سے بجا طور پر اس بات کے متوقع نہیں ہو سکتے کہ وہ ایک کھلا ہوا اعلان کر کے اپنی حیثیت کو واضح فرمائیں اور دنیا کو بتا دیں کہ ویدوں کی حکومت قلوب ہند سے اُٹھ چکی۔ آج واجب التسلیم اور واجب الامتثال صرف انسان کے تصنیف کیے ہوئے ضابطے ہیں اور ان ضابطوں میں قانون تعزیرات ہند کو وہ درجہ حاصل ہے جو رگ وید، شام وید، یجر وید، اتھر وا وید، منوسمرتی اور ستیارتھ پرکاش کو بھی حاصل نہیں۔

ہندوستان کی ہندو ریاستیں اگرچہ اپنی نیم آزادی اور نیم خود مختاری کی وجہ سے سمرتی کے محولہ بالا حکم کے نفاذ میں قاصر ہیں۔ تاہم انہوں نے دوسرے طریقوں سے اس کی تلافی کی

کوششیں کر رکھی ہیں۔ مثلاً بعض ریاستوں میں ہندو سے مسلمان بننے والے کو ایک سال کی سزائے قید اور مسلمان بنانے والے کو تین سال کی سزائے قید دی جاتی ہے۔ علاوہ بریں تمام ہندو ریاستوں میں ذبح بقر ممنوع ہے۔ حالانکہ یہ ممانعت ہندو ریاستوں کی مسلم آبادی کے مذہبی معتقدات سے صریح متعارض ہے۔ بعض ریاستوں میں گاؤ کشی کرنے والے کو سات سال کے لیے قید کر دیا جاتا ہے۔ قتل مرتد کا مطلب تو زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ جو شخص اسلام قبول کرتا ہے، اس کے احکام کو واجب التعمیل مانتا ہے، اس کے قانون کی پابندی اپنا فرض قرار دے لیتا ہے، وہ اگر دیدہ دانستہ اس کی تصریحات سے اعراض کر کے تحریف و تخریب دین کا باب مفتوح کرتا ہے تو اسے قتل کر ڈالا جائے۔ اس کے علاوہ ہندو ریاستیں علانیہ اپنی مسلم رعایا کے مذہبی جذبات کو بیدردانہ پامال کرتی ہیں لیکن آزادی ضمیر، آزادی رائے، آزادی خیال اور آزادی مذہب کے بلند بانگ دعویداروں کی اس صف پر علی الکل موت کی خاموشی اور عدم کا سکوت طاری رہتا ہے جو قتل مرتد کے باب میں اسلام و افغانستان کے خلاف ہرزہ سرائی اور بے ہودہ گوئی کی دف زنی میں سب سے پیش پیش ہیں۔

اینگلو انڈین جرائد نے واقعات سنگساری کے سلسلے میں دولت اسلامیہ افغانستان کے خلاف جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی دراصل ایک دیرینہ جذبۂ عناد و خصومت کا مظاہرہ ہے۔ اگر یہ مایہ ناز اسلامی حکومت مقررہ شرعی قانون و ضابطہ کی تعمیل میں احیائے سنت و دین کا یہ عظیم الشان کارنامہ انجام نہ دیتی تو اس صورت میں بھی اسے اینگلو انڈین حلقوں کی طرف سے کسی محبانہ اخلاص و ارتباط، کسی مخلصانہ الفت و وابستگی اور کسی گرمجوشانہ تحسین و تمجید کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ جن لوگوں کے عیب جو قلم اس موقع کی تلاش میں ہر وقت بے تاب رہتے ہیں کہ حکومت افغانستان کے کسی فعل و عمل میں خوردہ گیری و طعن آرائی کا کوئی پہلو نکلے، اسے بدنام و رسوا کرنے کا کوئی حیلہ ہاتھ آئے، زہر عناد کے ابلتے ہوئے چشمے کے لیے کوئی مخرج و منفذ پیدا ہو، ان کی مخالفانہ تعریضات و تنقیصات کتنی ہی رنجیدہ اور کلفت زا کیوں نہ ہوں لیکن ان پر متحیر و متعجب ہونے کا کوئی مقام نہیں۔

مملکت افغانستان کے ساتھ ملوکیت پرستان برطانیہ کی دشمنی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہ مملکت شمالی سمت میں تقریباً سو سال سے انگریزی ہوس استعمار کی سنگ راہ بنی ہوئی ہے اور اس سیلاب بلا کی گوناگوں روکو ناکام و نامراد پیچھے ہٹا رہی ہے۔ پھر جو لوگ کائنات ارضی کی ہر بلندی

پر یونین جیک کولہراتا ہوادیکھنے کے آرزومند ہیں، وہ افغانستان کے اس جرم ردودفع کوکس طرح معاف کرسکتے ہیں؟ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ 1907ء کے معاہدہ روس و برطانیہ کی بدولت عساکرزار کے ہندوستان پر ہلہ بول دینے کا جوخطرہ کسی حدتک کم ہوا تھا، وہ بولشویکوں کے برسر اقتدار آنے اور علیٰ الرغم الفت ملوکیت پرستان برطانیہ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان غازی کے ساتھ گہرے دوستانہ وحلیفانہ تعلقات پیدا کرلینے کی وجہ سے ازسرنوتازہ ہوگیا ہے، بلکہ پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ یہ محض میرا ہی خیال نہیں ہے بلکہ خودانگریز ارباب علم ورائے بھی اس بات میں میرے ہم آہنگ ہیں۔ چنانچہ انگلستان کے مشہوراخبار ''مانچسٹر گارڈین'' کے ایک نامہ نگار مسٹرآرتھر لنیم نے ماہ جولائی 1921ء میں جنگ آزادی افغانستان کے اسباب بیان کرتے ہوئے ضمناً اس طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ وسط ایشیا میں روس کے شاہنشاہانہ اقتدارات کی دوررس اور ہمہ گیرفوقیت کاتمہیدی حال قلم بند کرنے کے بعد مسٹر لینم لکھتے ہیں:

> ''روس کا انقلاب خواہ اشتراکی تفلسف کے پیرایہ سے عاری بھی ہوتا۔ ضعیف اقوام کے پیدائشی حقوق کومسلم نہ بھی قرار دیتا اورنشروتبلیغ کے کسی قسم کے وسائط اختیار نہ بھی کرتا، تاہم ضرور تھا کہ اس کے فوری نتائج سے ایک نازک صورت حالات پیدا ہوجائے۔ پرانے نظام سلطنت کے مٹتے ہی وہ دباؤ جوروس نے وسط ایشیا پرڈال رکھا تھا، دفعۃً ہٹ گیا اورانگریزی فوجیں معاً خراسان میں مشہد تک پہنچ گئیں اور سرحد ایران سے گزرکرترکستان میں اشک آباد سے مروتک پھیل گئیں۔ پرانا توازن قوت یک بیک جاتا رہا اور افغانوں نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ ان کا کوہستانی نشیمن جس کی آزادی برقراررکھنے میں دوعظیم الشان دشمن طاقتوں کی باہمی رقابت ان کی قوت بازوکی معاون تھی، اب سلامت نہیں رہا۔ ان دونوں میں سے ایک (روس) کا وجوددنیا سے ناپید ہوچکا تھا، دوسری طاقت (برطانیہ) آگے بڑھ رہی تھی اور بالکل نئی سمتوں سے پیش قدمی کرتی ہوئی افغانستان کوچاروں طرف سے گھیرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی''۔ (فسانہ حجاز صفحہ 118)

اینگلوانڈین جرائد کی قوت واہمہ کوپھر ماورائے پشاورکی بہ ظاہر آسودہ وساکن فضا کے

اندر ایک ہولناک طوفان آمادہ تموج وتلاطم نظر آرہا ہے، پھر اگر وہ واقعات سنگساری پر حکومت افغانستان کی تنقیص و تقبیح میں سرگرمی کا اظہار کرتے ہیں تو اس پر تعجب کا کون سا مقام ہے؟

البتہ یہ بات واقعی بے حد حیرت انگیز ہے کہ اس سلسلے میں اینگلو انڈین جرائد کی زبان پر بار بار ''آزادی ضمیر'' اور ''تہذیب'' کے الفاظ آرہے ہیں اور تہذیب انسانی کے یہ استاد نعمت اللہ اور اس کے جانشینوں کے انجام پر وحشیانہ سفک دم کے آوازے کس کس کر دنیا کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ گویا ان کی برادری تو جناب مسیح علیہ الثنا کی شان جمالی کا مظہر اتم اور قدوسیان فلک الافلاک کی طرح منزہ عن الخطا واقع ہوئی ہے جس نے کسی انسان کے ساتھ آج تک کوئی سختی نہیں کی اور کسی مجرم کو کبھی بھی عقوبت کے شکنجہ ایلم میں نہیں کھینچا۔ اگر ایک اندھا صلاحیت دید سے فطری محرومی کے باعث آفتاب کے جہاں آرا جمال کا اعتراف نہ کرے تو دنیا قدرتی طور پر اسے معذور و مرفوع القلم تصور کرے گی لیکن اگر وہ اپنی خلقی کور سوادی و بے بصری کے باوجود اس جمال میں عیب نکالے تو کوئی سلیم الفطرت انسان بھی اس پر خاموش نہ رہ سکے گا۔ کاش اینگلو انڈین اصحاب افغانستان کی ''تہذیب'' اور آزادی ضمیر کو معرض نقد و اصاب میں لانے سے پیشتر اپنے قومی گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے اور اپنی حکومت کے اعمال و افعال کا بھی سرسری طور پر جائزہ لے لیتے۔ وہ واقعات سنگساری کے سلسلے میں جس آزادی ضمیر و تہذیب کے ''ماتم'' کا حق سینہ کوبی ادا کر رہے ہیں، کیا آج یہی آزادی ضمیر یہی تہذیب کینیا، مصر، آئر لینڈ، جنوبی افریقہ، فلسطین، عراق اور ہندوستان کے ایک ایک ذرے کے اندر اپنی تمام فنا سامانیوں کے ساتھ کرشمہ سنج نہیں ہے؟ یا للعجب! اگر ہندوستان کے غریب باشندے یہ کہیں کہ ان کے وطن عزیز و محبوب پر انگریزوں کو قبضہ و تصرف کا کوئی حق حاصل نہیں ہے تو ان غریبوں پر دفعہ 121، 124 الف، 135۔ الف کے تحت قیدیں، جرمانے، قرقیاں، ڈگریاں، جلاوطنیاں، پھانسیاں اور نہیں معلوم کیا کیا بلائیں بلا تامل نازل ہو جاتی ہیں اور اس کے باوجود انگریزوں کے ادعائے تہذیب و احترام آزادی ضمیر کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ لیکن اگر افغانستان کی اسلامی حکومت ایک مقررہ و مسلمہ قانون شریعت نافذ کرتی ہے تو دفعتاً شور مچ جاتا ہے کہ افغان آزادی ضمیر کے دشمن ہیں۔ اس سرزمین کو مہذب ممالک کی صف میں جگہ پانے کا کوئی استحقاق نہیں ہے، کیا شریعتِ حقہ اسلام کے ایک مستند اور مبنی علی الحکم قانون کو ایک آزاد و خود مختار اسلامی سلطنت میں وہ پایہ اور مرتبہ

بھی حاصل نہیں جو لارڈ میکالے کے مرتبہ ضابطہ تعزیرات کو انگریزوں کے ایک متصرفہ مقبوضہ ملک میں حاصل ہے؟ حکومت انگلشیہ کا ایک ذمہ دار افسر ایک نہتے مجمع پر کلدار توپوں کے ہلاکت بار دہانے کھول دے تو اسے قیام و تحفظ امن عامہ کا ایک ضروری و ناگزیر وسیلہ قرار دیا جاتا ہے۔ حکومت انگلشیہ کے کارندے اگر سرحد اور عراق کے بے دست و پا بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کو بلا امتیاز مجرمیت و معصومیت ہوائی جہازوں سے بم گرا کر فنا کریں تو اس سے ادعائے تہذیب و شائستگی کا اجلا دامن ہرگز داغدار نہیں ہوتا۔ حکومت انگلشیہ اگر یونان کو اٹھا کر اور ابھار کر تھریس وانا طولیہ کی مستامن آبادیوں میں حشر برپا کرادے یا مصر کے چند نادان اشخاص کے جرم کی پاداش میں ساری مصری قوم کو شدید ترین عقوبت و تعزیر کے شکنجے میں کس دے تو اس صورت میں بھی انگریزوں کی تہذیب و آزادی ضمیر کی شان قدوسیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ لیکن حکومت افغانستان کو اپنے ایک مسلمہ قانون کے نفاذ پر فوراً تہذیب کے دائرے سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ انگریزوں کو تو یہ حق حاصل ہے کہ محض اپنے وطن ہی میں نہیں بلکہ کائنات انسانیت کے چپے چپے میں جو چاہیں کریں، کسی کی آزادی سلب کریں، کسی کی دولت پر قبضہ جمائیں، کسی کے حقوق پاؤں تلے روندیں، کسی کو حکمداری کی زنجیروں میں جکڑیں اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد بھی تہذیب و آزادی ضمیر کے آسمانی پیکر بنے رہیں۔ لیکن غریب افغانوں کی نسبت اتنا بھی گوارا نہیں کہ وہ اپنے ایک مذہبی قانون کو اپنی سرزمین کے اندر حسب صوابدید عمل میں لائیں۔ اینگلو انڈین جرائد کے دیدے اگر بالکل ہی پٹم نہیں ہو گئے ہیں تو وہ از برائے مسیح غور کریں کہ کیا انہیں افغانستان کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکالنے کا حق پہنچتا ہے؟ کیا بے بصروں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ دنیا کی بینائی میں نقص نکالیں؟ اور کیا بہروں کے لیے یہ موزوں ہے کہ وہ مرغان سحر کی ترانہ ریزیوں میں عیب چینی کرتے پھریں؟

اب میں ان مسلمانوں کے خیالات پر غور کرنا چاہتا ہوں جو افغانستان کے دشمن نہیں بلکہ دوست ہیں، مخالف نہیں بلکہ بہت بڑے حامی ہیں اور تہہ دل سے اس بات کے معتقد ہیں کہ اسلام دنیا کا بہترین مذہب، اس کا قانون دنیا کا بہترین قانون، اس کی تعلیمات دنیا کی بہترین تعلیمات اور اس کا راستہ دنیا کا مستقیم ترین راستہ ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے اور میں حیران ہوں کہ کیا کہوں اور کیا لکھوں۔ میرے سامنے مسلمانوں کی ایک ایسی

جماعت ہے جس کا اخلاص وایثار آفتاب کی طرح عالم آشکار ہے اور جو اپنی زندگی شریعت اسلام اور ملت بیضا کے لیے وقف کر چکی ہے، لیکن آہ صد ہزار حسرت و آہ! کہ افرنجیت کے جس مرض نے میرے لاکھوں بھائیوں کے قوائے ذہنی و دماغی کو ماؤف کر ڈالا، اس کی دست برد سے یہ مخلص وممتاز جماعت بھی محفوظ نہیں۔ بلاشبہ اس کی نیت یہ نہیں کہ دین کے ساتھ تلعب اختیار کرے یا شرعی احکام میں استہزا و استخفاف سے کام لے لیکن افسوس کہ عمل و نتائج کے اعتبار سے وہ اسی منزل میں پہنچی ہوئی ہے جہاں عام فرنجیت پرست مسلمان بیٹھے ہیں۔ بے حد رنج اس بات پر ہے کہ اس جماعت نے دینی علوم کی تحصیل میں محنت و مشقت نہیں کی، کتاب وسنت کے حقائق و وثائق اور بصائر و حکم پر غور نہیں کیا، اسفار و دواوین، تفاسیر واحادیث پر نظر نہیں ڈالی، ائمہ وعلماء کی تصنیفات ومدونات کا مطالعہ نہیں کیا، اجتہاد وافتا اور تحکیم وفیصلہ امور شرعیہ کے لوازم وخصائص اور شروط واصول معلوم نہیں کیے، خلافت کی تحریک عامہ کے دوران میں علمائے کرام سے چند آیات سن کر وہ آج ہر معاملہ میں مجتہد بنی بیٹھی ہے اور مسائل شرعیہ کے رد وقبول میں اپنے آپ کو کلیتاً آزاد اور خود مختار سمجھتی ہے۔ غالبؔ مرحوم نے اپنے زمانہ کی خیرہ ذوقی اور جوش ادعا وتحکم سے متاثر ہو کر شاعری کے مستقبل کی نسبت یہ پیشگوئی کی تھی کہ ؎

چشم کور آئینہ، دعویٰ بکف خواہد گرفت
دست شل مشاطہ زلف سخن خواہد شدن

لیکن آج علم وفن کا ہر دائرہ اسی پیش گوئی کا مصداق و مورد بنا ہوا ہے۔ علی الخصوص مذہب کے معاملہ میں تو اجتہاد کا یہ عالم ہے کہ آج ہر وہ شخص جسے قرآن کی چند آیات یا چند احادیث یاد ہیں، اپنے عہد کا ابوحنیفہ اور شافعی (رحمہما اللہ تعالیٰ) بنا بیٹھا ہے۔ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ روپے کی ملازمتوں کے لیے مسلسل ومتواتر پندرہ پندرہ سولہ سولہ سال انگریزی درس گاہوں میں بسر کیے جاتے ہیں۔ سرکاری عدالتوں کی سند وکالت حاصل کرنے کے لیے عمر کا ایک حصہ تحصیلات علمی و قانونی میں صرف ہو جاتا ہے۔ بیرسٹر و وکیل سالہا سال کی کامیاب وکالت کے بعد اس قابل بنتے ہیں کہ انہیں ججی یعنی قضا کا منصب ملے لیکن میرے نو تعلیم یافتہ مسلمان بھائی شرعی مسائل کے فیصلے کے لیے چند مہینے بھی شرعی کتب کے فہم ومطالعہ کے لیے وقف کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اور جب کوئی مسئلہ سامنے آتا ہے تو مولوی نذیر احمد

کے مترجمہ قرآن سے ایک آدھ مفید مطلب آیت نکال کر آخری فیصلہ کر دیتے ہیں یا کسی نئی وضع کے مولوی کی خوشہ چینی کر کے بزعم خود مضامین تازہ کے انبار لگا دیتے ہیں۔ اتنی تکلیف بھی گوارا نہیں فرماتے کہ گزشتہ تیرہ سو سال کی مدت میں جن بزرگوں نے اپنی زندگیاں اس سمندر کی شناوری میں گزاریں، وہ کیا کہتے اور کیا سمجھتے ہیں۔ پہلے جمود کا یہ عالم تھا کہ حرکت و جنبش کے خیال پر بھی ہر طرف سے آوازیں اٹھنے لگتی تھیں۔

مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را

اب حرکت شروع ہوئی تو ہر فرد نے بدحواسی کے عالم میں دوڑنا شروع کر دیا ہے اور گریز پائی کا یہ عالم ہے کہ شرع کی کاکل مشکیں سے دو بال بھی مستعار نہیں لیے جاتے کہ رسن کا کام دیں، نہ کسی کو یہ پاس ہے کہ حرکت کے اصول کیا ہیں، اجتہاد کے لیے کن کن خصائص و لوازم کی ضرورت ہے؟ تقویٰ، زہد اور پرہیزگاری کی کیا حالت ہونی چاہیے؟ دینی علوم میں تبحر کس درجہ لازمی ہے؟ مجتہدین ائمہ کرام کی حیثیت کیا تھی؟ گزشتہ گیارہ بارہ سو سال کی مدت میں ملت بیضا کے نادر روزگار ارباب علم و فضل کن وجوہ کی بنا پر جلیل القدر ائمہ فقہ و حدیث کی تصریحات کو دلیل عمل بنائے رکھا؟ زہد و تقویٰ تو رہا ایک طرف، نماز پنجگانہ کی پابندی تک قائم نہیں اور قرآن حکیم کا مطالعہ محض اردو تراجم و تفاسیر میں محدود رہ گیا ہے لیکن اجتہاد کا دعویٰ قائم ہے۔

ھم رجال ونحن رجال

یہ صدا ہر حلقہ سے برابر آ رہی ہے۔ اس حرکت کے مقابلے میں تو شاید سابقہ جمود ہزار درجہ بہتر تھا، اس لیے کہ ہر حال میں دین کے خط و خال تو قائم تھے۔ یورپ کے ملحدانہ اصول مسائل شرعیہ کا معیار نہیں بنے تھے۔

قال انما اشکوابثی و حزنی الی اللّٰہ (یوسف:86)

میں اس مضمون کے آغاز ہی میں اپنی علمی فرومایگی کا عاجزانہ اعتراف کر چکا ہوں۔ علی الخصوص دینی علوم میں تو میری قلیل البضاعتی کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ اوپر عرض کر چکا ہوں، اس کا بھی اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا لیکن آہ! کہ درد دل کسی صورت چین نہیں لینے دیتا اور طبیعت یہ گوارا نہیں کرتی کہ دین کے ساتھ اس طرح استہزا و استخفاف عمل میں آئے اور میں اس کے خلاف آواز بلند نہ کروں۔

من بہ ایں وادی زخود آیم ....

میں اس مقام پر اُن معترضین کے خیالات سے مزید تعرض کی ضرورت نہیں سمجھتا جن کے ایرادات سراسر تفرنج پر مبنی ہیں۔ یعنی وہ یورپ کی الحاد پرور تعلیمات اور خلیع العذ ارحریت ضمیر کی بنا پر یہ عقیدہ قائم کیے بیٹھے ہیں کہ مذہبی معتقدات واعمال کو مستوجب تعزیر قرار دینا ظلم ہے لیکن اس عقیدے کی توثیق وترصیص کے لیے وہ کوئی شرعی دلیل وبرہان پیش نہیں کرتے۔ البتہ جن لوگوں نے مخالفت میں شرعی استدلال کا شیوہ اختیار کیا ہے اور نفی قتل مرتد کے نصب واثبات میں بزعم خود حجج وبراہین کتاب وسنت سے تمسک کیا ہے، ان کے خیالات کا جائزہ ومحاسبہ اور ان کے دلائل کا امتحان واندازہ میرا اصل موضوع بحث ہے۔

خوش بود گر محک تجربہ آید بہ میان
تا سیہ روی شود ہر کہ در او غش باشد

جہاں تک مجھے معلوم ہے اس گروہ کی عنان راہنمائی میرے عزیز بھائی مولانا محمد علی (جوہر) کے ہاتھ میں ہے جنہوں نے ''ہمدرد'' کی 19، 20 اور 21 فروری کی اشاعتوں میں قتل مرتد کے اس فتنہ خوابیدہ کو از سر نو بیدار کیا جو نعمت اللہ (قادیانی) کی سنگساری کے سلسلے میں ارباب دانش وبینش کے حلقہ میں تقریباً دو ماہ تک ہل چل ڈالے رکھنے کے بعد خود بخود آسودۂ سکون ہو گیا تھا۔ ان مضامین میں مولانا محمد علی نے اول قرآن وحدیث کی رو سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ شریعت اسلامی میں مرتد کے لیے قتل کی سزا تو درکنار، سرے سے کوئی سزا مذکور ہی نہیں۔ اس فرض سے سبکدوش ہو کر آپ نے قادیانیوں کو ارتداد کے الزام سے بری الذمہ قرار دیا ہے۔ یہی مضامین ہیں جن کی وجہ سے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں سزائے قتل مرتد کی نسبت منکرانہ شکوک اور جاہلانہ اشتباہات کا مرض پھیلا۔ اور مجھے یہ طویل الذیل سلسلہ مضامین مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بنابریں میں اپنے نقد وتبصرہ اور رد وجرح کا دائرہ ''ہمدرد'' کے انہی تین مضامین میں محدود رکھوں گا اور ان شاء اللہ تعالیٰ اسی سلسلے میں دوسرے معترضین ومنکرین کے اعتراضات وشکوک کا ازالہ بھی ہو جائے گا۔

بانگ گاوی چہ صدا بازدھد؟ عشوہ مخر
سامری کیست کہ دست از ید بیضا ببرد

بعض دوسرے اسلامی جرائد میں بھی سزائے قتل مرتد سے انکار کیا گیا ہے مثلاً روزنامہ

''خلافت'' کی ایک مختصر سی تحریر اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس تحریر کو کوئی مستقل حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ وہ ''ہمدرد'' کی صدائے مخالفت کی محض اجمالی آراو بازگشت ہے جس کے ہر ہر زیر و بم سے تقلیدِ جامد کی لے پیدا ہو رہی ہے۔اس لیے اسے جداگانہ موضوع قرار دینا چنداں ضروری نہیں ہے۔

اصل بحث کا سلسلہ شروع کرنے سے پیشتر میں مولانا محمد علی (جوہر) سے معافی مانگتا ہوں۔اس امر کی توضیح بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ''ہمدرد'' کے محولہ بالا تین مضامین خود کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے۔ان میں سے پہلے دو مضامین محمد علی لاہوری قادیانی امیر جماعت احمدیہ لاہور کے ایک رسالہ کا خلاصہ ہیں۔ یہاں تک کہ تمام آیات، آیات کا ترجمہ، تفسیر، انداز استدلال شروع سے لے کر آخر تک اسی رسالہ سے ماخوذ ہیں اور ایک حرف کا بھی اپنی طرف سے اضافہ نہیں کیا گیا۔اسی طرح صحیح بخاری کی حدیث **من بدل دینه فاقتلوه** کے ایک راوی ابوالنعمان محمد بن فضل پر اعتراض، لفظ ''دین'' کی عالمگیر عمومیت کا دعویٰ، ہدایہ کی عبارت سے بے بنیاد استشہاد کہ مرتد صرف حربی ہونے کی صورت میں واجب القتل ہوتا ہے، صاف صاف محمد علی لاہوری قادیانی کے رسالہ سے اٹھا کر نقل کر دیا گیا ہے اور اتنی کوشش بھی نہیں کی گئی کہ ان ''دلائل'' کی نسبت کسی دوسرے واقف کار سے استصواب کر لیا جائے۔حالانکہ اس مسئلہ کے آخری وقطعی فیصلے کے لیے کسی قادیانی کے دلائل کا درجہ اعتماد و وثوق از سرتاپا محل نظر تھا۔چہ جائیکہ خالصتاً انہی پر انحصار رکھا جاتا اور انہیں اپنے دلائل قرار دے کر مسلمانوں میں ان کی اشاعت کی جاتی۔مجھے ڈر ہے کہ جس ڈگر پر میرے بھائی مولانا محمد علی (جوہر) پڑ لیے ہیں، اگر کچھ دن اور یہی راہ انہوں نے اختیار کیے رکھی تو قرآن مجید کی آیات بینات کے کھلے ہوئے معانی کی تحریف کا ایک نیا دروازہ کھل جائے گا اور مسلمانوں کے سر پر ایک نئی مصیبت نازل ہو جائے گی۔مثلاً اگر کل کلاں کو مسئلہ ولادتِ مسیحؑ کی تشریح کے سلسلہ میں کسی نے یہ بحث چھیڑ دی کہ دودھ پیتے بچے کا ناطق ہونا محال عقلی ہے اور اپنے دعوے کی تائید میں محمد علی لاہوری قادیانی کی تفسیر قرآن سے یہ اقتباس پیش کر دیا کہ **''فَأَتَتْ به قومها تحمله''** (مریم:27) لازماً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ نبوت سے تعلق رکھتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت حضرت مریم علیہا السلام کی گود میں نہ تھے بلکہ گدھے پر سوار ہو کر یروشلم میں داخل ہوئے تھے تو کیا مولانا اس انوکھے مفسرانہ اکتشاف پر صاد

کرتے ہوئے تفسیر بالرائے کی وہ ذمہ داری اپنے سر لینے کے لیے آمادہ ہوں گے جس کے تصور سے ہی دنیائے اسلام کا دل لرزتا ہے۔ ''ہمدرد'' کا تیسرا مضمون مولانا ابوالکلام آزاد کے اس استنا پر مبنی ہے کہ متول کافر نہیں ہوتا۔

سب سے پہلے میں ''ہمدرد'' کی پیش کردہ آیات پر بحث کروں گا۔ ان آیات کو باعتبار معانی و مفہوم دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصہ ان آیات پر مشتمل ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دین کے بارے میں جبر جائز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں **لااکراہ فی الدین.** (البقرۃ:256) **و قل الحق من ربکم فمن شاء فلیومن و من شاء فلیکفر** (الکھف:29) اور **ولو شآء ربک لاٰمن من فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مومنین** (یونس:99) نقل کی گئی ہیں۔ دوسرا حصہ ان آیات پر مشتمل ہے جن میں منطوقاً یا مفہوماً ارتداد کا ذکر ہے مگر اس کے ساتھ سزائے قتل مذکور نہیں۔ میں ان آیات پر علیحدہ علیحدہ نظر ڈالوں گا۔

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ ''ہمدرد'' کی پیش کردہ آیات میں مرتد کے لیے سزائے قتل کا ذکر نہیں ہے اور ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ غالباً کسی دوسری آیت میں بھی بالتصریح ایسا حکم نظر نہیں آتا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سارا دین محض قرآن کی تصریحات ہی میں محدود و محصور ہے اور مثلہ معہ یعنی حامل قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات و تنبیہات اس باب میں کوئی درجہ، کوئی منصب اور کوئی حیثیت نہیں رکھتیں؟ علاوہ بریں ان آیات سے یہ مطلب اخذ کرنا صریح زیادتی ہے کہ ان میں قتل مرتد کی نفی کی گئی ہے مثلاً اس سلسلے میں یہ دو آیتیں پیش کی جاتی ہیں:

- **و قالت طآئفة من اھل الکتاب اٰمنوا بالذی انزل علی الذین اٰمنوا وجه النھار واکفروا اٰخرہ لعلھم یرجعون** (آل عمران:72)

ترجمہ: اہل کتاب کی ایک جماعت نے کہا کہ جو کچھ مسلمانوں پر نازل ہوا ہے، صبح کو اس پر ایمان لے آؤ اور شام ہوتے ہوتے اس سے منکر ہو جاؤ شاید اس تدبیر سے مسلمان بھی دین سے برگشتہ ہو جائیں۔

- **کیف یھدی اللّٰہ قوماً کفروا بعد ایمانھم و شھدوآ ان الرسول حق و جآء ھم البینٰت واللّٰہ لایھدی القوم الظلمین o اولٓئک جزاؤھم ان علیھم لعنة اللّٰہ والملٓئکة والناس اجمعین.** (آل عمران:86،87)

ترجمہ: خدا اس قوم کو کیسے ہدایت کی راہ سمجھائے جنہوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا۔ انہوں نے گواہی دی کہ رسول سچا ہے اور (اس کی صداقت پر) انہیں کھلے کھلے نشان بھی مل گئے۔۔(مگر اس کے باوجود وہ منکر ہو گئے) اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ایسے لوگوں کی سزا یہی ہے کہ ان پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔

ان آیات کو نفی قتل ارتداد کے اثبات میں پیش ہوتے دیکھ کر بے اختیار ہنسی بھی آتی ہے اور پیش کرنے والوں کی لاعلمی و بے خبری پر خون کے آنسو بہانے کو بھی جی چاہتا ہے۔ کسی شخص نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ ان آیات کا سیاق کیا ہے۔ خطاب کن لوگوں سے ہے، ذکر کس معاملہ کا ہے، صرف ایمان کے بعد کفر کا کلمہ دیکھا اور جھٹ آیت نقل کر دی کہ دیکھیے اس میں کہیں یہ ذکر نہیں ہے کہ ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والوں یعنی مرتدوں کو قتل کی سزا دی جائے۔ فوا اسفاثم وا اسفا!

گر تو قرآں بدیں نمط خوانی
ببری رونق مسلمانی را

حقیقت یہ ہے کہ ان آیات کا بہ سلسلہ ارتداد پیش کرنا ہی قرآن سے انتہا درجہ کے جہل کا ثبوت ہے۔ یہ دونوں آیتیں سورۂ آل عمران میں آتی ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرنے کے بعد اس سورۃ کے ساتویں رکوع سے صاف صاف اہل کتاب مخاطب ہیں۔ قرآن اٹھا کر دیکھیے ہر دوسری یا تیسری آیت کے بعد خطاب کا اعادہ ہے۔ مثلاً

- **قل یاهل الکتٰب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم ......** (آل عمران: **64**)
- **یاهل الکتٰب لم تحآجون فی ابراهیم ......** (آل عمران: **65**)
- **یاهل الکتٰب لم تکفرون بایت الله و انتم تشهدون o یاهل الکتٰب لم تلبسون الحق بالباطل و تکتمون الحق و انتم تعلمون.** (آل عمران: **70،71**)

بعد ازاں خطاب کو چھوڑ کر اہل کتاب کے حقیقی خصائص بیان کرنے شروع کر دیے ہیں۔ اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

- **وقالت طائفة من اهل الکتٰب اٰمنوا بالذی انزل علی الذین......** (آل عمران: **72**)
- **و من اهل الکتٰب من ان تامنه بقنطار یؤده الیک......** (آل عمران: **75**)

- ❑ **ان الذین یشترون بعھداللہ و ایمانھم ثمنا قلیلا......** (آل عمران:77)
- ❑ **و ان منھم لفریقا یلوٗن السنتھم بالکتٰب لتحسبوہ من الکتٰب وما ھو من الکتٰب......** (آل عمران:78)

اسی سلسلہ میں **کیف یھدی اللہ قوماً کفروا بعد ایمانھم** (آل عمران:86) فرمایا گیا ہے اوراس کفر بعد ایمان کی تصریح آیت مذکورہ سے چار آیتیں پہلے ملتی ہیں:

- ❑ **واذ اخذ اللہ میثاق النبین لمآ اتیتکم من کتٰب و حکمۃ ثم جآء کم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ قال ء اقررتم و اخذتم علی ذٰلکم اصری قالوا اقررنا قال فاشھدوا و انا معکم من الشھدین.** (آل عمران:81)

ترجمہ: اور (یاد کرو) جب لیا تھا اللہ نے عہد، نبیوں سے کہ یہ جو عطا کی ہے میں نے تم کو کتاب وحکمت (اس احسان کا تقاضا یہ ہے کہ) پھر جب آئے تمہارے پاس ایک عظیم رسول تصدیق کرتا ہوا اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اور بہرحال ایمان لاؤ گے اُس پر اور مدد کرو گے اُس کی۔ ارشاد ہوا! کیا اقرار کرتے ہو تم اور کرتے ہو اِن شرائط پر مجھ سے عہد؟ انہوں نے کہا ہم نے اقرار کیا۔ ارشاد ہوا! سو گواہ ہو تم اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

بنا بریں **کیف یھدی اللہ قوماً کفروا بعد ایمانھم** (آل عمران:86) کا مطلب یہ نہیں کہ کسی جماعت نے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد کفر اختیار کیا تھا۔

حقیقی مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا اقرار اور عہد و پیمان کرنے کے بعد آپ ﷺ کی تشریف آوری پر تمام ''بینات'' سے منکر ہو گئے تھے۔ اسی کفر بعد ایمان کا اس آیت میں ذکر ہے۔

محمد علی لاہوری قادیانی اپنی تفسیر بیان القرآن میں خود اس آیت کو اہل کتاب سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ کی اصل عبارت یہ ہے:

- ❑ ''گو بعض نے کہا ہے کہ اس آیت میں ایک خاص گروہ کا ذکر ہے جو اسلام لا کر پھر مرتد ہو گئے اور اہل مکہ سے جا ملے اور ان میں ابو عامر راہب کا نام بھی لیا گیا ہے۔ مگر حسن اور ابن عباس سے روایات صریحہ ہیں کہ ان آیات میں اہل کتاب کا ہی ذکر ہے اور یہی سیاق وسباقِ

عبارت چاہتا ہے...... **کفروا بعد ایمانهم** سے یہ مراد ہے کہ وہ پہلے انبیاء پر ایمان لائے اور اس کے بعد اب محمد رسول اللہ صلعم کا کفر کرتے ہیں **وشهدوا ان الرسول حق** میں یہ اشارہ ہے کہ درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا یہ لوگ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے ہیں...... **بینات** سے مراد وہ کھلے دلائل ہیں جن میں سے کئی ایک یہاں بھی بالتفصیل بیان ہو چکے ہیں''۔(بیان القرآن جلد اول ص 243)

یہ اس وقت کی تحریر ہے جبکہ قتل مرتد کا مسئلہ سامنے نہیں آیا تھا اور امیر جماعت لاہوری قادیانی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ گزری تھی کہ **قوماً کفروا بعد ایمانهم** کا آسمانی آوازہ یہودیوں کے بجائے انہیں کبھی مسلمانوں پر بھی کسنے کی ضرورت پیش آئے گی، لیکن جس طرح زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی، اسی طرح قادیانیوں کی تاویل بھی ایک موم کی ناک ہے کہ جب چاہی اور جدھر چاہی موڑ لی۔ آج محمد علی لاہوری اپنی تفسیر پر آپ ہی خط تنسیخ کھینچ کر اپنے بیان سے آپ ہی اعراض کر کے اس آیت سے نفی قتل مرتد پر استدلال کرتے ہیں اور مولانا محمد علی (جوہر) اس خندہ آفرین استدلال کو اٹھا کر بلا تامل و بدوں تدبر ''ہمدرد'' میں نقل کر دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اس انتقاط سے نفی قتل مرتد کے دعوے پر قضا و قدر کی مہر تصدیق ثبت ہو گئی۔

وقالت طائفة من اهل الكتاب (آل عمران:72) کا حوالہ دیتے ہوئے میں کنایۃً ظاہر کر چکا ہوں کہ اس آیت میں جس گروہ سے خطاب کیا گیا ہے، وہ گروہ اہلِ کتاب ہے جسے مشرف باسلام ہونے کی توفیق نہ بخشی گئی تھی اور اس لیے اس آیت کو اسلام سے برگشتہ ہونے والوں کے حسب حال سمجھ کر اس سے نفی قتل مرتد کا حکم مستنبط کرنا ایک افسوسناک غلطی ہے۔ اگرچہ کنایہ تصریح سے ابلغ ہوا کرتا ہے۔ لیکن خوردہ گیروں کی جس قوم سے مجھے پالا پڑا ہے، بلاغت کے اس انداز کو عجب نہیں کہ میرے اعترافِ عجز کا پردہ دار خیال کرے، اس لیے تھوڑی سی تصریح و توضیح ناگزیر ہے۔ اس آیت سے نفی قتل مرتد پر ان الفاظ میں استدلال کیا گیا ہے:

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی شرارتیں کی جایا کرتی تھیں، مگر اس کے باوجود ان کے قتل کا حکم نہیں دیا گیا۔

لیکن یہ آیت تو زیادہ سے زیادہ یہودیوں کا صرف یہ قول پیش کرتی ہے کہ بھائیو!

قرآن پرصبح کو ایمان لے آؤ اور سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے منکر ہو جاؤ، تاکہ اور نہیں تو اسی حیلے سے تمہاری دیکھا دیکھی مسلمان بھی اپنے دین سے برگشتہ ہو کر تم میں آملیں۔ بالفاظ دیگر اس آیت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ اہل کتاب کی ایک جماعت نے مسلمانوں کو دین مبین کی صراط مستقیم سے منحرف کرنے کے لیے منافقانہ مومنیت کا دام تزویر بچھانے کی تجویز کی تھی۔ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ریائی قبا، یہ نمائشی جامہ انہوں نے واقع میں پہن بھی لیا تھا اور اپنے ابلیسانہ منصوبہ کو وہ قوت سے فعل میں بھی لے آئے تھے۔

اس سلسلے میں اور جو آیات پیش کی جاتی ہیں، وہ یہ ہیں:

- **من كفر بالله من بعد ايمانه الا من اكره و قلبه مطمئن بالايمان ولكن من شرح بالكفر صدراً فعليهم غضب من الله ولهم عذاب عظيم.** (النحل:106)

جو شخص کفر پر مجبور کیا جائے مگر اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو اس پر کچھ مواخذہ نہیں، لیکن جو کوئی دل کھول کر کفر اختیار کرے تو ایسے لوگوں پر خدا کا غضب اور ان کے لیے بڑا (سخت) عذاب ہے۔

- **ان الذين اٰمنوا ثم كفروا ثم اٰمنوا ثم كفروا ثم ازدادوا كفراً لم يكن الله ليغفرلهم ولا ليهديهم سبيلا.** (النساء:137)

جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہوئے، پھر ایمان لائے پھر کافر ہوئے، پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے تو اللہ ان کو نہ بخشے گا اور نہ سیدھا راستہ بتائے گا۔

ایک اور آیت ہے جسے اگرچہ ''ہمدرد'' نے نقل نہیں کیا لیکن میں مناسبت موضوع کے لحاظ سے اس پر بھی اسی سلسلے میں نظر ڈال لینا ضروری سمجھتا ہوں۔ **وھو ھذا.**

- **ولا يزالون يقاتلونكم حتىٰ يردوكم عن دينكم ان استطاعوا و من يرتدد منكم عن دينه فيمت وهو كافر فاولٰئك حبطت اعمالهم فى الدنيا والاٰخره واولٰئك اصحٰب النار هم فيها خٰلدون.** (البقرۃ:217)

اور (کفار و مشرکین) ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہیں دین سے برگشتہ کر دیں اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے برگشتہ ہو گا اور کفر کی ہی حالت میں مر جائے گا تو ایسے لوگوں کا تمام کیا کرایا دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہے اور یہی

لوگ اہل دوزخ ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

پہلی دو آیتوں میں ارتداد کی مختلف صورتوں کا ذکر ہے۔ایک میں اُن اشقیائے ازلی کا حوالہ دیا گیا ہے جو بشرح صدر کفر اختیار کریں۔دوسری میں ان بدبختوں کا بیان ہے جو پہلی مرتبہ ارتداد سے تائب ہو کر دوبارہ مرتد ہو جائیں اور پھر اسلام کا دامن تھام کر از سرِ نو کفر کی چوکھٹ پر پیشانی رگڑتے ہوئے ہمیشہ کے لیے اپنے ہاتھ سے اپنے اوپر توبہ کا دروازہ بند کر لیں۔لیکن ان آیات سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں بدبخت گروہوں کو اس اُخروی وعید کے علاوہ جس کی سنا وُنی انہیں دی گئی ہے،اس دنیا میں اور کوئی سزا نہ ملنی چاہیے۔

تیسری آیت میں بھی ''**فیمت**'' کا لفظ سزائے قتل کا منافی نہیں ہے۔اس لیے کہ اول تو یہ لفظ موت بالقتل اور موت طبعی دونوں پر یکساں حاوی ہے اور اس کے استعمال سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام مرتدین کے ساتھ ساتھ ان مرتدین کے متعلق بھی صراحت کر دی جائے جو ارتداد اختیار کرتے ہی ہیئتِ حاکمہ اسلام کے دائرہ اثر واقتدار سے باہر نکل جائیں اور اسلامی حکومت کا محکمہ قضا ان پر حد جاری نہ کر سکے۔اس کے علاوہ یہ آیت ان مرتدین کی حالت پر بھی منطبق ہوتی ہے جو کسی غیر مسلم حکومت کے ماتحت ہونے کے باعث شرعی سزائے قتل سے محفوظ رہتے ہیں۔مثلاً جس طرح آج کل ہندوستان کے حلقہ ارتداد کے مرتدین محفوظ و مصئون ہیں۔

بلاشبہ ان تینوں آیات قرآنی میں سزائے قتل کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن ان سے سزائے قتل کی نفی کا بھی تو کوئی پہلو پیدا نہیں ہوتا۔زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے مرتد کی دنیوی سزا کے متعلق سکوت اختیار کیا ہے لیکن اس سکوت کو مرتد کی سزایابی کے خلاف ایک قطعی برہان کے طور پر پیش کرنا حامیانِ آزادیٔ ضمیر کی سراسر دھاندلی ہے۔قرآن حکیم ''**حد شارب الخمر**'' یا ''**رجم زانی محصن**'' کے باب میں بھی تو اسی طرح ساکت ہے پھر کیا نئی روشنی والے مفسرین اس سکوت کی بناء پر یہ دعویٰ بھی کر بیٹھیں گے کہ قرآن نے شراب پینے والے کو درّے لگانے اور زانی محصن کو سنگسار کرنے کا حکم نہیں دیا۔اس لیے شرع کو اس قسم کے خاطیوں سے مواخذہ کرنے کا کوئی حق نہیں؟

دین کے بارے میں جبر کی ممانعت کے متعلق ''ہمدرد'' نے جو آیات پیش کی ہیں،انہیں میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔قارئین کرام کی سہولت کے لیے یہاں انہیں دوبارہ پیش کیے دیتا ہوں۔

- ❑ **ولو شآء ربک لاٰمن من فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین.** (یونس:99)

اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو وہ تمام لوگ جو زمین پر بستے ہیں، ایمان لے آتے تو کیا تم سب کو مجبور کر سکتے ہو کہ وہ ایمان لے آئیں۔

- ❑ **قل الحق من ربکم فمن شآء فلیؤمن و من شآء فلیکفر.** (الکھف:29)

اے پیغمبر کہہ دے کہ حق تو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے پس جو چاہے، ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے۔ دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت اور گمراہی واضح ہو چکی۔

ان آیات کی تفسیر میں (اگر اس بلند پایہ لفظ کا اسی سلسلہ میں استعمال جائز سمجھا جائے) ''ہمدرد'' نے جس خلیع العذارانہ اسلوب و انداز سے کام لیا ہے، اگر اسے تھوڑی دیر کے لیے صحیح اور درست مان لیا جائے تو پھر شریعت کا کوئی قانون، کوئی قید، کوئی حد اور کوئی حکم بھی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتا اور وہ سارا مجموعہ قوانین وضوابط چشم زدن میں پارہ پارہ ہو جاتا ہے جسے کائنات انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں لائے اور جس سے بُعد و ہجر کے باعث آج مسلمان ذلت و نامرادی کے درک اسفل میں گرے ہوئے ہیں۔

ولو شآء ربک کا مفہوم قدسی صرف اس قدر ہے کہ پروردگار عالم و عالمیاں کے حیطۂ اختیار سے یہ بات باہر نہ تھی کہ وہ انسان کو ملکی القویٰ یعنی فرشتوں کی طرح بنا دیتا اور اس صورت میں آدمی زادہ اگر کافر ہونا بھی چاہتا تو نہ ہو سکتا مگر جناب باری کے مصالح نے فطرت بشری کو فرشتہ و حیوان کی صفات متضادہ کی طرفہ معجون بنا کر انسان کو اختیار دے دیا کہ چاہے تو فرشتہ سے بہتر ہو جائے اور چاہے تو حیوان سے بھی بدتر بن جائے۔ پھر کیا پیغمبر ﷺ کی یہ خواہش ہو سکتی ہے کہ کافروں کو جبراً مسلمان بنا لیا جائے، یہی معنی **قل الحق من ربکم** کے ہیں۔ پیغمبر ﷺ کا فرض بس اتنا ہے کہ کفر و ایمان کی تصریح کر دے اور اس بات کو دنیا کی مرضی پر چھوڑ دے کہ وہ کفر اختیار کرتی ہے یا ایمان، انسان اپنے لیے راستی یا ناراستی کا شیوہ پسند کرنے میں بالکل آزاد ہے۔ **لکم دینکم ولی دین.**

لیکن ان آیات بینات سے ''ہمدرد'' کی طرح یہ نتیجہ نکالنا کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے صراط مستقیم پر چلنا شروع کر دیں، وہ بھی ہر قسم کی تقیدات

سے آزاد ہیں۔ جس بات کو چاہیں مان لیں اور جو بات ان کے اوہام واہوا کی مساعدت نہ کرے، اسے چھوڑ کر شتر بے مہار کی طرح اِدھر اُدھر بھاگے دوڑے پھریں۔ کوئی ان سے تعرض نہ کرے اور کوئی ان کا مزاحم نہ ہو۔ وہ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں بعید سے بعید تاویلات اور سخت سے سخت تحریفات کی بناء پر اوامر ونواہی کا حلقہ اپنی گردن سے اتار پھینکیں۔

میں اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہوں اور تھوڑی دیر کے لیے بر سبیل **فمن شآء فلیؤمن و من شآء فلیکفر**۔ (الکھف: 29) کے اس مفہوم کو صحیح مان لیتا ہوں کہ ہر شخص اسلام کے ترک واختیار میں ہر حیثیت سے آزاد ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ مفہوم زیر بحث معاملہ پر منطبق بھی ہوتا ہے؟ یعنی کیا اس وقت ہمارے سامنے کسی ایسی جماعت کا قضیہ درپیش ہے جو اسلام کے دامن سے منقطع ہو کر کسی دوسرے مذہب کا رشتہ اپنی گردن میں ڈال چکی ہے؟ اس سوال کا جواب ہر شخص نفی میں دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قادیانی بعض اہم امور شرعیہ میں سخت تحریف کرنے کے باوجود اس وقت تک اپنے آپ کو شریعت اسلامی سے منسوب کرتے ہیں۔ اسلام ہی کے قانون کو واجب الامتثال سمجھتے ہیں اور اسی کے ضابطہ کی پابندی کے دعویدار ہیں۔

''ہمدرد'' نے **فمن شآء فلیؤمن و من شآء فلیکفر**۔ (الکھف: 29) کی جو تفسیر کی ہے، اس کی بناء پر زیادہ سے زیادہ یہ مانا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان ہندو یا عیسائی بن جائے تو اس سے تعرض نہ کیا جائے لیکن مسلمان کہلا کر اور اپنے آپ کو مسلمان جتلا کر اسلام کی تحریف کرنے والوں کو تو باز پرس سے محفوظ رکھنے کی کوئی دلیل اور کوئی حجت اس سے نہیں نکلتی۔ مثلاً یہ تو تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ جو شخص آج افغانستان میں سکونت پذیر ہے اور افغانستان کے قوانین کا پابند ہے۔ اگر کل نقل مکان کر کے ہندوستان میں چلا آئے تو اسے عدالت وقانون کے افغانی شکنجہ میں نہ جکڑنا چاہیے بلکہ اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے جو انگریزی رعایا کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا بجا ہوگا کہ ایک شخص ہندوستان میں رہے، ملک معظم جارج پنجم کی رعایا ہو اور پھر بھی وہ اس بات کا مجاز سمجھا جائے کہ تعزیرات ہند کی دفعات میں سے جسے چاہے مانے اور جسے چاہے ٹھکرا دے۔ کیا کوئی اس سرزمین میں رہ کر بغی، طغیان اور مخالفت حکومت کا سلسلہ اٹھا کر دفعہ 120۔ 121 اور دفعہ 124 (الف) کے چنگل سے مصئون و مامون رہ سکتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر **فمن شآء فلیؤمن و من شآء فلیکفر**۔ (الکھف: 29) کو پیش کر

کے یہ توقع کیوں رکھی جاتی ہے کہ اسلام اپنے باغی، اپنے مخرب، اپنے ہادم اور اپنے مخالف سے کوئی مزاحمت نہ کرے، علی الخصوص اس حالت میں کہ وہ باغی باوجود بغی و عدوان اپنے آپ کو قانون اسلام کا پابند بھی ظاہر کرتا ہو؟

لا اکراہ فی الدین کی نسبت یہ عرض ہے کہ اول تو اس کا یہ مفہوم ہی محل نظر ہے جسے ''ہمدرد'' بہ شدومد پیش کر رہا ہے اور پھر اس پر اپنے سارے دعوے کی بنیاد رکھ رہا ہے۔ حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ علوم کتاب وسنت کا ایک ایسا درخشاں آفتاب ہیں جس کی ضیاء باریوں سے دنیائے اسلام کا ایک ایک ذرہ مستنیر ہے اور جن کی نظیر سے کم از کم اسلامی ہند کی تاریخ علم وفضل یکسر خالی ہے۔ وہ اپنے مشہور ترجمہ قرآن الموسوم بہ فتح الرحمٰن میں اس آیت کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں:

- نیست جبر کردن برائے دین، ہر آئینہ ظاہر شدہ است، راہ یابی از گمراہی

اس کی تشریح وہ حاشیہ میں اس طرح فرماتے ہیں:

- یعنی حجت اسلام ظاہر شد۔ پس گویا جبر کردن نیست اگر چہ فی الجملہ جبر باشد

اردو میں یہ مطلب اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے آتے ہی حق اور باطل کا معیار دنیا کے سامنے آ گیا اور انسان کے سامنے سچائی پیش کر دی گئی۔ اب اس کے لیے بجز اس کے چارہ نہیں کہ اس سچائی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اگر نہ کرے تو اس کی گردن عدوان و طغیان کے جھکانے کے لیے کچھ طریقے ایسے اختیار کرنے پڑیں گے جن پر بہ ظاہر جبر کا گمان ہوگا لیکن وہ جبر دراصل جبر نہ ہوگا۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی اس تفسیر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علمائے امت کا ایک برگزیدہ طبقہ تمسک بالحق کے معاملہ میں جبر اور اکراہ کو کیا سمجھتا ہے۔

مشہور عالم و محدث ابوبکر بن العربی صاحب ''احکام القرآن''، آلوسی بغدادی، صاحب روح المعانی اور امام ابن تیمیہؒ کے شاگرد رشید حافظ ابن قیمؒ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ لیکن میں اس تصریح کو نظر انداز کر کے تھوڑی دیر کے لیے ''ہمدرد'' ہی کے ترجمے کو صحیح تسلیم کیے لیتا ہوں اور بپاس خاطر مولانا محمد علی (لاہوری) مانے لیتا ہوں کہ **لا اکراہ فی الدین** سے حقیقت میں یہی مراد ہے کہ اگر کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے تو پھر بھی اسے یہ اختیار باقی رہتا ہے کہ جب چاہے اور جس طرح چاہے دین قیم کی اطاعت کا جوا اپنے کندھے سے اتار پھینکے۔ لیکن

سوال یہ ہے کہ کیا یہ معانی قرآن حکیم اور سنت رسول اللہ ﷺ سے بھی پیدا ہوتے ہیں؟ اور کیا **لااکراہ فی الدین** کی کوئی مخصصات اور تفصیلات بھی کتاب وسنت میں موجود ہیں یا نہیں؟ آج ہر شخص بات بات پر **لااکراہ فی الدین** کی رٹ لگا رہا ہے اور یہ چہار لفظی جملہ اپنی زبان سے نکال کر سمجھ لیتا ہے کہ وہ اپنے عہد کا ابوحنیفہ اور اپنے وقت کا بخاری ہے اور اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ اس مختصر سے کلیہ کو لے کر علمائے دین قیم کے گزشتہ سیزدہ صد سالہ علمی کارناموں پر خط نسخ کھینچ دے۔ گویا اسلام کا یہ ایک ایسا آسمانی مرکز دریافت ہوا ہے جس کے گرد اس کا سارا نظام شمسی چکر لگا رہا ہے۔ دواوین (دیوان کی جمع) فقہ و حدیث کی تو حیثیت ہی کیا ہے کہ اس کلیہ کے روبرو درخور وثوق واعتماد قرار پاسکیں۔ خود صدہا قرآنی احکام واوامر بھی اس کے سامنے بلا تامل ٹھکرائے جاسکتے ہیں۔ افسوس! صد ہزار حسرت وافسوس!! کہ ہماری بدبختی ہمیں تسفل کی کیسی عمیق گہرائیوں میں گرا چکی ہے۔

"ہمدرد" **لااکراہ فی الدین** کی تفسیر کے سلسلے میں حافظ ابن کثیر کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ:

- **لاتکرھوا علی الدخول فی دین الاسلام**

  (یعنی کسی شخص کو جبراً مسلمان نہ بناؤ)

  اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ:

  جب جبر کے ذریعہ سے مسلمان بنایا نہیں جا سکتا تو مسلمان رکھنے کے لیے جبر کا کیوں حکم دیا جاسکتا ہے۔

اس قول کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے کہا جائے کہ جب حکومت برطانیہ کا قانون اناطولیہ کے باشندوں پر نافذ نہیں ہوسکتا تو اسے مقبوضات برطانیہ میں نافذ کرنا کیونکر جائز قرار پا سکتا ہے۔ "ہمدرد" کے مدبر علامہ از برائے خدا مجھے یہ بتائیں کہ آخر اس قانون کو جس کا نام اسلام ہے، بے حرمتی سے بچانے کے لیے وضع قانون کو کسی تدبیر کے اختیار کرنے کا حق بھی حاصل ہے یا نہیں؟ اسلام کی اس سلطنت کو جس کے اندر آج چالیس کروڑ نفوس بستے ہیں، بغی وعدوان کی فساد انگیز قوتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شارع کو کچھ تعزیری ضوابط کے نفاذ کا اختیار بھی ہے یا نہیں؟ دین مبین کو فتنہ پردازوں کی تخریب وتحریف سے مصئون رکھنے کے لیے کسی حد شرعی کا اجرا بھی اس سلطنت کی حدود کے اندر ضروری ہے یا نہیں؟ کیا دنیا جہان کی نرم وگرم تعزیرات صرف ان دنیوی

حکومتوں کی رعایا میں امن و امان قائم رکھنے اور ان کی اخلاقی حالت کے سدھارنے کے لیے وقف ہو چکی ہیں جو ڈھلتی پھرتی چھاؤں کی طرح آج ہیں اور کل نہیں اور جو ہزاروں کی تعداد میں دنیا سے اس طرح مٹ چکی ہیں کہ گویا سطح روزگار کبھی ان کے وجود سے آشنا ہی نہ ہوئی تھی؟ کیا اس قسم کی تعزیرات و حدود سے صرف اسلام کی ہئیت حاکمہ ہی مستثنیٰ ہے جسے لیل و نہار کے انقلاب اور آئے دن کے تغیرات کا ردعمل کرنے کے لیے ان کی بہت بڑی ضرورت ہے؟

اگر **لا اکراہ فی الدین** کا مطلب یہی ہے کہ ہر شخص جو چاہے کہے جو چاہے کرے اور جو چاہے بکے تو پھر آپ کے نزدیک **شارب الخمر** پر حد جاری کرنے کی کونسی دلیل ہے؟ تارک صلاۃ کو کس طرح سزا دی جاسکتی ہے؟ زانی کو کیوں کر تازیانے لگائے جاسکتے ہیں یا سنگسار کیا جاسکتا ہے؟ کیا یہ اور اس قسم کے صدہا دوسرے احکام آپ کے مفہوم '**لا اکراہ فی الدین** کے مقابلے میں ایک لحظہ کے لیے بھی ٹھہر سکتے ہیں؟ آج اگر آپ ایک متنبّی کی امت کو **لا اکراہ فی الدین** کے اصول پر باز پرس سے بری الذمہ قرار دے سکتے ہیں تو پھر زنا، ترک صلاۃ، شراب نوشی وغیرہ جرائم کو کس طرح مستلزم سزا ثابت کر سکتے ہیں؟ پھر کیا آپ کے اس جوش اجتہاد و خروش افتاد کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ اسلامی حکومت بھی ان تمام سیاہ کاریوں کا سرچشمہ بن جائے جو یورپ کے چپے چپے کو خباثت و لعنت کے آتشیں سیلاب میں غرق کر چکی ہیں۔ نہ آپ کسی مسلمان کو قمار بازی سے روک سکتے ہیں، نہ سود خواری سے منع کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر شخص آپ کے سامنے ہر بات کے لیے '**لا اکراہ فی الدین**' کا زریں اصول پیش کر سکتا ہے۔ پھر فرمایئے کہ کیا قرآن حکیم میں یہ آیت اس غرض سے نازل ہوئی تھی کہ ''متنور مجتہدوں'' اور بیسویں صدی کے ''شافعیوں'' اور ''مالکیوں'' کے واسطے ہدم بنیان شریعت اور تخریب اساس دین کا آلہ بن جائے؟ کیا یہی وہ ''آزادی ضمیر'' ہے جس کا حق قائم کرنے کے لیے بقول آپ کے مسلمانوں کو قتال کی اجازت دی گئی تھی یا بالفاظ صحیح تر جس کے نصب و قیام کے لیے اسلام دنیا میں آیا تھا اور اس کائنات کا عظیم ترین انسان (**بابی انت و اُمی یا رسول اللہ**) خلعت ختم رسالت ﷺ سے سرفراز ہوا تھا؟

اگر حقیقت یہی ہے اور آپ کے پیش کردہ مفہوم **لا اکراہ فی الدین** کے مطابق اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں تو میں حیران ہوں کہ تیس پاروں کا قرآن نازل کرنے کی کیا ضرورت

تھی؟ کیا صرف اتنا حکم کافی نہ تھا کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں؟ اگر آج آپ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ **لااکراہ فی الدین** کے اصول کی بناء پر ہر دینی حکم کے امتثال وعدم امتثال کے خیالات سے بے پرواہو جائیں تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ان تمام احکام کا نزول کیوں ضروری متصور ہوا؟

''آزادی ضمیر'' کا یہ غیر مقید وغیر مشروط مفہوم مہاتما گاندھی کے غیر مقید وغیر مشروط ''معیار عقل ودانش'' کا خواجہ تاش ہے۔ کاش مولانا محمد علی (جوہر) ایسی غیر محتاط بات کہنے سے پیشتر ذرا اس کے نتائج پر زیادہ اچھی طرح غور فرما لیتے اور سوچ لیتے کہ وہ اس طرح اسلام کی خدمت کر رہے ہیں یا اس کی بنیاد پر ایک کاری ضرب لگا رہے ہیں؟

بحث آیات کے بعد ''ہمدرد'' نے احادیث پیش کی ہیں اور ازراہ کفایت تحکیم احادیث کی صحت وعدم صحت کا فیصلہ کرنے کے لیے ذیل کا دنیا جہان سے نرالا کلیہ وضع کیا ہے:

> سب سے پہلے یہ حقیقت ذہین نشین کر لینی چاہیے کہ کوئی حدیث خواہ وہ **اصح الکتب بعد کتاب اللّٰہ** یعنی بخاری ہی میں کیوں نہ ہو، اگر وہ آیت قرآنی کے معارض ومتضاد ہوگی تو قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

اول تو امام بخاری جیسے بزرگ کی نسبت جن کی کتاب کو خود ''ہمدرد'' کتاب اللہ کے بعد اس آسمان کے نیچے صحیح ترین کتاب تسلیم کرتا ہے، یہ خیال بھی دل میں لانا ایک حیرت انگیز جرأت ہے کہ امام موصوف اپنے مجموعہ میں کوئی ایسی حدیث درج کر سکتے ہیں جو قرآن مجید کے مخالف ہو۔ اس کے علاوہ یہ خیال کہ ''جو حدیث صحت و درستی کے مقررہ اور مفید یقین معیار پر پوری اترے، اس کا معارض نص قرآنی ہونا اس کی پذیرائی کے مانع ہے''۔ اہل علم کے نزدیک پرکاہ جتنی وقعت بھی نہیں رکھتا۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس بادی النظری تعارض کے باب میں قول فیصل کا معیار کیا ہوگا اور احادیث کی صحت وعدم صحت کس طریقے سے جانچی جائے گی؟ آپ ایک حدیث کو صحیح مان رہے ہیں اور وہ آپ کے نزدیک کسی قرآنی نص سے معارض نہیں لیکن دوسرے کا فہم و تدبر اس پر تعارض کا حکم لگا رہا ہے، پھر کیا اس اختلاف کے ہوتے ہوئے دواوین حدیث کی کوئی حیثیت باقی رہ سکتی ہے؟ اگر ہر زید وبکر کے فہم ہی کو فیصلے کا معیار مان لیا جائے تو احادیث تو درکنار خود آیات میں بھی ظاہر بینوں کو تعارض کی کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔ کیا ہمدرد کو معلوم نہیں کہ علماء کے ایک گروہ نے اسی مزعوم تعارض کی بنا پر بیسیوں آیتوں کو منسوخات میں داخل کر دیا تھا؟

احادیث کی صحت و عدم صحت کے اصول وہی ہیں جن کی تصریح و تدوین محدثین کرام فرما چکے ہیں۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) اور موجودہ زمانہ کی تمردکیش اور الحاد آئین عقل بھی آسمان میں جا کر پیوند لگا آنے کے ادعا کے باوجود ان اصول کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتی جو حدیث ان اصول کے رُو سے صحیح ثابت ہو جائے، اس کا معارض قرآن ہونا قطعاً غیر ممکن ہے۔ اگر بہ ظاہر تعارض معلوم ہو تو اسے خود اپنے فہم و بصیرت کا قصور سمجھنا چاہیے۔

ہر چہ ہست از قامت ناساز و بے اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

احادیث کے رد و قبول کا مسئلہ اتنا سہل نہیں ہے جتنا مدیر علامہ ''ہمدرد'' اسے سمجھے بیٹھے ہیں کہ جہاں فہم نارسا کی کمند کنگرۂ حقائق تک نہ پہنچی، وہاں جھٹ **لانسلم** کے نالے کو رسا باندھ دیا۔ ممکن ہے کہ بعض جلیل القدر راویوں سے بھی فہم حدیث میں بعض دفعہ غلطیاں ہو گئی ہوں لیکن ان غلطیوں کی بنا پر یہ کلیہ قائم کر لینا کہ فی زمانہ ہذا ہر عامی و خاصی کو احادیث ماثورہ میں سقم نکالنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور اس حقیقت کبریٰ کی طرف سے خالی الذہن ہو جانا کہ اس تیرہ سو سال کی مدت میں رواۃ کی ہر لغزش کی اصلاح حکیمانہ تنقید کے ساتھ ہو چکی ہے اور کوئی امکان احادیث متواترہ کے غلط ہونے کا باقی نہیں رہا، ایک بہت بڑی غلطی ہے جس سے بچے بغیر اسلام کا نظام ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے علاوہ کسی دائرے میں حکم بننے کے لیے اس دائرے کے لوازم و خصائص سے بوجہ اتم نہیں تو کم از کم معقول واقفیت تو لازمی ہے۔ یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ کسی شخص کا مطبوعہ رسالہ سامنے آیا اور اسے صحیفہ آسمانی سمجھ کر رد و قبول احکام و اوامر کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جو درازی میں زلف یار کو بھی شرما رہا ہے۔

حضور آقائے دو جہاں ﷺ کی سنت مطہرہ سے قتل مرتد کے عدم جواز کا ثبوت بہم پہنچانے کی دھن میں مولانا محمد علی (جوہر) کے خامۂ بداعت طراز نے سب سے پہلے عکل والی حدیث نقل کی ہے۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ عکل کے چند آدمی دربار نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر اسلام لائے۔ کچھ دن بعد یہ لوگ قضا کار بیمار ہو گئے۔ حضور آقائے دو جہاں ﷺ نے انہیں تبدیل آب و ہوا کے لیے ایک صحت بخش مقام پر بھیج دیا جہاں صدقے کے اونٹ رکھے جاتے تھے۔ یہاں پہنچ کر ان لوگوں کی صحت بحال ہو گئی لیکن قلب کا چھپا ہوا مرض نہ جانا تھا،

نہ گیا۔اسلام کا لبادہ اتار پھینکا، گلیم ارتداد اوڑھ لی اور لگے ہاتھوں اونٹوں کے چرواہوں کو قتل کر کے اونٹوں کی قطار لے کر چمپت ہو گئے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے ان اشقیائے ازلی کو پکڑ وا منگایا، لوہے کی سلائیاں گرم کرا کے ان کی آنکھوں میں پھروا دیں، ان کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیے، زخموں کا خون روکنے کی بھی کوئی تدبیر نہ فرمائی، پھر انہیں دھوپ میں ڈال دیا۔وہ پانی مانگتے رہے مگر پانی نہ دیا یہاں تک کہ وہ سسک سسک کر فنافی السقر ہو گئے۔

''ہمدرد''اس واقعہ پر حسب ذیل حاشیہ چڑھاتا ہے:

> اس حدیث سے نفس ارتداد کا پتہ نہیں چلتا بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ چرواہوں کے قتل کا جرم ان سے سرزد ہوا تھا، اس لیے ان کو بطریق قصاص قتل کیا گیا۔اگر ان کے بجائے کوئی مسلمان ہوتا تو وہ بھی قتل کیا جاتا۔

''ہمدرد'' کی اس منطق پر ارسطو کی بوسیدہ ہڈیاں بھی قبر میں کھڑ کھڑا اٹھی ہونگی۔ایک کھلے ہوئے تاریخی واقعہ کے متعلق روایت اور درایت کے تمام مسلمہ مراتب کی نفی کرتے ہوئے ایسا انوکھا انداز استنباط اختیار کرنا اسی کا حصہ ہے۔صاف ظاہر ہے کہ اگر عکل والے محض قتل رعاۃ کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے تو اس کے قصاص میں بجز ضرب عنق کے اور کوئی سزا ان کے حق میں تجویز نہ کی جاسکتی تھی۔لیکن حدیث میں ان کی سزا کی جو تفصیل موجود ہے، وہ خود اس بات پر گواہ ہے کہ یہ سزا محض قتل رعاۃ کی پاداش میں نہیں دی گئی تھی۔ورنہ کائنات انسانیت کی جس مقدس ترین ہستی کے سراپا رحمت ہونے کی شہادت خود کلام الٰہی ببانگ دہل دے رہا ہے، جس کی عفو و درگزر کا یہ عالم ہو کہ اس نے اپنے ذاتی دشمنوں سے عمر بھر انتقام نہ لیا ہو بلکہ ان کے حق میں دعائیں کی ہوں، وہ ایسی سخت سزا، ایسی دردناک عقوبت پر کبھی رضامند نہ ہوتی۔حدیث پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اہل عکل پر ایک فقط قتل رعاۃ کا جرم ہی عائد نہیں ہوا تھا بلکہ بقول ابی قلابہ:

ھؤلاء قوم سرقوا و قتلوا و کفروا بعد ایمانھم و حاربوا اللّٰہ و رسولہ.

(بخاری:6805)

''یہ وہ قوم ہے جو چوری، قتل، ارتداد اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ

کرنے کی مجرم تھی''۔ یہی وجہ تھی کہ صاحب آیۃ **وما ارسلناک الا رحمة للعالمین** نے اس شدید معذبانہ سزا کا حکم دیا۔

قرآن وحدیث کے مطالب کو اپنی خواہشات اور ضروریات کے سانچے میں ڈھال لینے ومقتضیات وقت کے لحاظ سے ان میں قطع وبرید کرتے رہنے کا فن جیسا محمد علی لاہوری قادیانی کو آتا ہے، کسی کو کم نصیب ہوا ہوگا۔ حدیث عکل پر بحث فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امام بخاری خود اسے ارتداد کی سزا قرار نہیں دیتے بلکہ قتل اور محاربہ کی سزا قرار دیتے ہیں۔ اول تو اس باب کا عنوان ہی یوں باندھتے ہیں **باب المحاربین من اهل الکفر والردة**''۔(بخاری جلد 8،ص 162)

گویا جس حد تک حدیث عکل کو تعلق ہے، محمد علی لاہوری قادیانی نفس ارتداد کو وجہ سزائے قتل نہ سمجھنے میں بزعم خود امام بخاری کو اپنا ہم عقیدہ تصور فرماتے ہیں۔ اس کوشش کی ناکامی کا حال ان لوگوں سے چھپا نہیں رہ سکتا جنہوں نے بخاری کو بامعان نظر دیکھا ہے۔ میں چند ہی سطر پہلے ابوقلابہ کا قول بحوالہ بخاری نقل کر چکا ہوں کہ اہل عکل پر چار جرم ثابت تھے۔ وہ قتل اور محاربہ ہی کے مجرم نہ تھے جن سے محمد علی لاہوری کے نزدیک ان کے جرائم کی فہرست پایہ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے بلکہ سرقہ اور ارتداد کے بھی مرتکب ہوئے تھے۔

رہا صحیح بخاری کے عنوان کا معاملہ سو امام بخاری کے نزدیک تو نفس کفر وارتداد ہی اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محاربہ کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ امام ممدوح کتاب التفسیر میں **الذین یحاربون اللّٰه ورسوله ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا** (المائدہ: 33) .... ابوقلابہ کا مندرجہ ذیل قول لاتے ہیں:

ماعلمت نفسا حل قتلها فی الاسلام الا رجل زنی بعد احصان او قتل نفساً بغیر نفس او حارب اللّٰه و رسوله صلی اللّٰه علیه وسلم. (بخاری: 4610)

اسلام میں بجز اس کے اور کسی کا قتل جائز نہیں جو احصان کے بعد زنا کرے یا کسی شخص کو قتل کر ڈالے یا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرے۔

کتاب الآیات بالقیامة میں امام بخاری نے ابوقلابہ کا ایک اور قول پیش کیا ہے جس سے یہ بحث بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ **حارب اللّٰه و رسوله** کے مصداق وہ لوگ ہیں جو مرتد

ہو جائیں۔ وہ قول یہ ہے:

فواللّٰہ ماقتل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم احداً قط الا فی احدی ثلاث خصال: رجل قتل بجریرۃ نفسہ فقتل او رجل زنی بعد احصان او رجل حارب اللّٰہ رسولہ وارتد عن الاسلام. (بخاری:6899)

خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز اس وقت تک کسی شخص کے قتل کا حکم نہیں دیا جب تک اس میں ان تین باتوں میں سے کوئی ایک بات نہ پائی گئی ہو: 1۔ قتل عمد۔ 2۔ زنا بعد احصان۔ 3۔ خدا اور رسول ﷺ کے ساتھ جنگ اور دین اسلام سے برگشتگی۔

اس مضمون کی متعدد احادیث مختلف طرق کے ساتھ ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابوداؤد میں بھی مروی ہیں جن میں بصراحت بتایا گیا ہے کہ **یحاربون اللّٰہ و رسولہ** سے مراد وہ لوگ ہیں جو ارتداد اختیار کریں اور اس لیے واجب القتل ہیں۔ ان تمام احادیث سے یہی واضح ہوتا ہے کہ نفس ارتداد بھی اللہ اور رسول کے ساتھ محاربہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لیے مستلزم قتل ہے۔ اس سلسلے میں حدیث **المفارق من الدین التارک للجماعۃ** (بخاری:6878) شہرت شہیرہ رکھتی ہے۔

محمد علی (لاہوری قادیانی) نے اس حدیث کے الفاظ سے حسب معمول اپنے ڈھب کا مطلب نکال لیا۔ مروق عن الدین اور ترک جماعت کی یکجائی آپ کے نزدیک اس بات کا ثبوت ہے کہ صرف کفر بعد اسلام یعنی ارتداد ہی وجہ قتل نہیں ہے۔ ''جب تک کہ ایسا شخص مسلمانوں کی جماعت کو ترک کر کے دشمن سے نہیں جا ملتا۔'' دہلی بھی لاہور کے اسی خرمن کی خوشہ چیں ہے اور مولانا محمد علی (جوہر) نے بھی بعینہ یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ''دشمن سے جا ملنا'' حدیث کے کن الفاظ سے مستفاد ہے؟ کیا ہر تارک جماعت ہمیشہ اور ہر حال میں جماعت کے دشمنوں سے جا ملا کرتا ہے یا کیا محض ترک جماعت ہی کو شمولیت گروہ اعدائپر محمول کیا جا سکتا ہے؟

انسان جب جان بوجھ کر ایک غلطی کرتا ہے اور اس سے اس غلطی کے اعتراف کی توفیق چھین لی جاتی ہے تو وہ اس پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک شدید تر غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے تا آنکہ وہ سراپا غلطی بن جاتا ہے۔ یہی حال امیر جماعت لاہوری قادیانی کا ہے۔ وہ پہلے جی میں یہ بات ٹھان لیتے ہیں کہ ''**حارب اللّٰہ و رسولہ**'' کا مصداق ان لوگوں کو

ہرگز ثابت نہ ہونے دیں گے جنہوں نے ارتداد اختیار کیا ہے۔ **انما جزؤا الذین یحاربون اللہ و رسولہ ویسعون فی الارض فساداً** (المائدہ:33) کے معانی کی شرح کرتے ہوئے آپ اپنی تفسیر بیان القرآن میں لکھتے ہیں کہ:

یہاں **یحاربون** سے مراد فی الواقع جنگ کرنے والے نہیں بلکہ مراد اس سے صرف معصیت ہے۔

اس شرح پر آپ نے آگے چل کر ذیل کا اضافہ فرمایا ہے:

یہاں **یحاربون اللہ و رسولہ** سے مراد زمین میں فساد کرنے والے لیے گئے ہیں اور بالخصوص ڈاکو جو جان سے مار کر یا جان سے مارنے کا خوف دے کر لوگوں کا مال لوٹتے ہیں۔

لیکن قرآن حکیم کے اس مفسر نے اتنا نہیں سوچا کہ آیت محاربہ کے بعد کی آیت کا مفہوم اُس ساری عمارت ہی کو منہدم کیے دیتا ہے جو اس نے اس اہتمام سے کھڑی کی تھی۔ محاربہ کی سزائیں بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

- **ذلک لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم o الاّ الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیھم.** (المائدہ:33،34)

ترجمہ: یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے (یعنی سزائیں) اور آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے۔ اس (دنیوی واخروی عذاب) سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو اس سے پہلے توبہ کر لیں کہ تم ان پر قابو پا جاؤ۔

بھولے سے یہاں تک تو محمد علی (لاہوری قادیانی) ٹھیک لکھ گئے تھے کہ **یحاربون** میں وہ لوگ داخل نہیں ہیں جو واقع میں شمشیر بکف ہو کر خدا اور رسول سے برسر پیکار ہوں بلکہ اس لفظ کا اطلاق صرف اس جماعت پر ہوتا ہے جو مبتلائے معصیت ہوگئی ہو۔ اگر چہ معصیت کے بجائے شاید عمداً آپ نے شرک کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن دوسرے ہی فقرے میں آپ نے یہ کہہ کر تلافی مافات کر دی کہ **یحاربون اللہ و رسولہ** سے مراد مفسدہ پردازوں اور خصوصاً قطاع الطریق کا گروہ ہے۔ تفسیر بالرائے کے سلسلے میں یہ آپ کی پہلی غلطی تھی۔

پہلی غلطی کی پردہ پوشی کے لیے آپ نے دوسری غلطی یہ کی کہ قتل سولی، **قطع الید**

وارجل من خلاف اور اجلاء کی گوناگوں تعزیرات کو صرف ڈاکوؤں اور لٹیروں سے مخصوص قرار دے کر اور **الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیھم**(المائدہ:**34**) کی روشن تصریح کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسلام کی تعلیم ہی کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ لکھتے ہیں:

''یہ تعلیم صرف اسلام سے خاص ہے کہ جب سچے طور پر ایک شخص توبہ کرلے تو اسے معاف کر دیا جائے، گو کتنا ہی بڑا جرم ہو اور سچی توبہ کے لیے یہ شرط رکھ دی کہ ان پر قابو نہ پایا ہو اور انہوں نے ایسے افعال سے رجوع کر کے دوسری زندگی اختیار کرلی ہو۔ جب جرم کی حالت میں پکڑے جائیں تو توبہ بے معنی ہے''۔

(بیان القرآن از محمد علی لاہوری قادیانی جلد اوّل صفحہ **422**)

جس تعلیم کو محمد علی (لاہوری قادیانی) نے اسلام سے منسوب کیا ہے، اسے اگر صحیح تسلیم کرلیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ کسی اسلامی سلطنت میں کسی شخص کی جان مال اور عزت ایک لحہ کے لیے بھی سلامت نہ رہ سکے گی۔ ہر ڈاکو، ہر قزاق، ہر بدمعاش دن وہاڑے راہ چلتوں کو لوٹا مارا کرے گا اور محکمہ احتساب سے آنکھ بچا کر بعد میں توبہ کر کے مواخذہ سے محفوظ ہو جایا کرے گا۔ لوگوں کی بہو بیٹیوں کی آبروریزی کرنے والوں، قاتلوں، چوروں، اٹھائی گیروں کو صرف اتنی احتیاط کرنی ہوگی کہ شریعت کے عمال کی نظر ان پر نہ پڑے۔ اس کے بعد وہ بدترین جرائم کے ارتکاب میں آزاد ہوں گے کیونکہ قادیانی لاہوری جماعت کے امیر کے فتوے کے بموجب حقوق العباد کے پامال کرنے والوں کے لیے ہر وقت توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور اسلام نے مجرموں کے لیے سزائیں صرف اس حالت میں تجویز کی ہیں کہ مجرم عین ارتکاب جرم کی حالت میں گرفتار کرلیا جائے، اگر نہ گرفتار ہو تو وہ جھٹ توبہ کا اعلان کر کے قتل اور زنا اور ڈکیتی کا خمیازہ بھگتنے سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ **انا للّٰہ و انا الیہ راجعون.**

کاش قادیانی لاہوری جماعت کے امیر آیات قرآنی کو اس قسم کی تاویلات رکیکہ سے یوں بازیچہ اطفال نہ بناتے! وہ اگر ذرا بھی تدبر فرماتے اور آیہ محاربہ کے مفہوم پر سلف صالحین کے ملفوظات نہ سہی، عقل سلیم ہی کی روشنی ڈالنے کی زحمت اٹھاتے تو انہیں صاف نظر آ جاتا کہ اس آیت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے سے خاص ارتداد مراد ہے اور فساد فی

الارض کا مطلب یہ ہے کہ ارتداد فی حد ذاتہ ایک نہایت ہولناک فساد کا سرچشمہ ہے جس کو سختی اور شدت کے ساتھ بند نہ کیا جائے تو اسلامی جماعت اور وہ شیرازہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس کا باندھا ہوا ہے، دیکھتے دیکھتے پریشان ہو جائے۔

قادیانی لاہوری جماعت کے امیر نے عکل والی حدیث کی بحث میں دیدہ ودانستہ جس کتمان وتحریف والتباس سے کام لیا ہے، اس پر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ امام بخاری اس حدیث کو چار مختلف ابواب میں لائے ہیں اور ان طرقِ متنوعہ سے انہوں نے مختلف مسائل کا استخراج کیا ہے۔ محمد علی لاہوری اپنے رسالہ میں حدیث عکل کو بخاری کے پہلے باب سے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> خود بخاری کو ایک نظر دیکھ لیا جائے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری خود اسے ارتداد کی سزا قرار نہیں دیتے بلکہ قتل اور محاربہ کی سزا قرار دیتے ہیں۔ (رسالہ مذکور صفحہ **11**)

اس رسالے کے صفحہ **14** پر وہ لکھتے ہیں کہ امام بخاری نے:

> اس باب کی حدیثوں کے آخر پر ایسے الفاظ بڑھائے ہیں **قال ابو قلابہ سرقوا وقتلوا وحاربوا اللّٰہ ورسولہ.** (بخاری:**6804**) (انہوں نے مال چرایا، خون کیے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کی۔)

حالانکہ ابوقلابہ کا یہ قول بخاری کے تیسرے باب کے آخر میں ہے اور میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ بخاری حدیث عکل کو چار بابوں میں لائے ہیں، چوتھے باب کے آخر میں اسی ابوقلابہ کا قول موجود ہے:

قال ابو قلابہ فھؤلاء سرقوا وقتلوا وکفروا بعد ایمانھم وحاربوا اللّٰہ و رسولہ۔ (بخاری:**233**، بخاری:**6805** ایضاً)

ان لوگوں نے مال چرایا، خون کیے، ایمان کے بعد کفر اختیار کیا یعنی مرتد ہوئے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کی۔

اب اہل نظر وانصاف فرمائیں کہ اس سے بڑھ کر کتمان اور تدلیس اور کیا ہو سکتی ہے۔ محمد علی لاہوری کو ابوقلابہ کا وہ قول تو نظر آ گیا جس میں کفر بعد ایمان کا لفظ نہ تھا لیکن اصل، جامع

اوراس باب کی حدیثوں کا سب سے آخری قول وہ انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ پی گئے، پھر کیا اس طرح محض اپنے مفید طلب مطلوب پہلوؤں کا اظہار اور مخالف پہلوؤں کا کتمان انتہا درجہ کی افسوسناک تحریف نہیں؟ اگر کتب واسفار شریعت کی ورق گردانی صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ دو جملے نکال کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیے جائیں جن سے اپنے پندار اوہام، اہواء، وساوس اور ''اضغاث احلام'' کے لیے تنکے کا سہارا ملتا ہو اور اس کے خلاف تمام تصریحات بینہ تشریحات واضح سے غضِ بصر و غمضِ نظر کر لیا جائے تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ شرعی کتب کا نام زبان پر لانے یا بروئے کتاب وسنت کسی معاملہ کے متعلق استدلال کا مہمل ولایعنی ادعا پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ فیصلہ امور شرعیہ کی یہ وہی شکل ہے جسے ایک شاعر نے اوامر ونواہی قرآن کے متعلق پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

لاتقربوا الصلوٰۃ ز نہیم بہ خاطر ست
و ز امر باد ماندہ کلوا و اشربوا مرا

ایک دنیا جانتی ہے کہ حضور سرورکون ومکان ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد عربوں کا ایک بہت بڑا گروہ اسلام کے پانچویں رکن یعنی زکوٰۃ کی فرضیت سے منکر ہو کر دین حنیف سے برگشتہ ہو گیا تھا اور ان مرتدین کی سرکوبی کے لیے حضرت صدیق اکبرؓ کو جن سے بڑھ کر شریعت مطہرہ کا رازداں اور کوئی نہ ہو سکتا تھا، علم جہاد بلند کر کے تیغ بکف ہونا پڑا تھا۔ اس کھلی ہوئی حقیقت کی من مانی تاویل ''ہمدرد'' نے حسب ذیل الفاظ میں کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاویل کے علاوہ مسلمہ تاریخی واقعات کو توڑنے مروڑنے کے فن میں بھی اسے یدطولیٰ حاصل ہے۔

''وہ حکومت وقت سے بغاوت پر آمادہ تھے، زکوٰۃ کا ٹیکس دینے سے انکار کر دیا تھا اور مدینہ پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہے تھے''۔

کتب تاریخ واحادیث اور تصریحات علماء وائمہ اسلام متفقہ طور پر شہادت دے رہی ہیں کہ منکرین زکوٰۃ کے ساتھ انکار زکوٰۃ کے سوا اور کوئی وجہ قتال نہ تھی۔ مدینہ پر چڑھائی کی تیاریوں کا ادعا بداہتاً غلط اور فاضل مدیر ''ہمدرد'' کے تخیل کا محض ایک کرشمہ ہے جسے حقائق نفس الامری سے دور کی نسبت بھی نہیں۔ حدیث میں صاف مذکور ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے قتال کا ارادہ فرمایا تو حضرت فاروق اعظمؓ نے اس ارشاد نبوی ﷺ کی بنا پر مخالفت فرمائی کہ:

امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یقولوا ان لا الہ الا اللّٰہ وان محمدا رسول اللّٰہ فاذا قالوا لا الہ الا اللّٰہ عصموا منی دماء ھم و اموالھم الا بحقھا.

(بخاری: 7284، 7285)

(بخاری: باب قول اللہ تعالیٰ وامرھم شوریٰ......الخ جلد 2، ص 1094 قدیمی)

مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک برابر جنگ کرتا رہوں جب تک کہ وہ اللہ کی وحدانیت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر گواہی نہ دیں اور جب یہ گواہی دے چکیں تو ان کا جان و مال میرے ہاتھ سے محفوظ ہے۔ الا اس صورت میں کہ وہ اسلام کے حقوق کو تلف کریں۔

اگر مرتدین حقیقت میں مدینے پر چڑھ دوڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں تو حضرت فاروق اعظمؓ تہیہ قتال کی مخالفت کیوں فرماتے؟ کیا آپ نے قرآن حکیم میں یہ نہیں پڑھا تھا کہ:

- **فان قاتلوکم فاقتلوھم** (البقرۃ: 191)

اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم انہیں قتل کر ڈالو۔

یہ یا نص صریح آپ کی نظر سے نہیں گزری تھی کہ

- **فقاتلوا التی تبغی حتیٰ تفیٓءَ الٓی امر اللّٰہ.** (الحجرات: 9)

جو لوگ بغاوت کریں ان سے اس وقت تک برابر لڑتے رہو یہاں تک کہ ان کی گردنیں اللہ کے فیصلے کے آگے جھک جائیں۔

لیکن حضرت صدیق اکبرؓ جانتے تھے کہ محض **لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ** کہہ دینے سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے مخصصات کا قائل اور اس کے پنجگانہ لوازم کا عامل نہ ہو۔ قرآن کے تیسوں پاروں کا منکر بھی اسلام کا ویسا ہی باغی ہے جیسا اس کی ایک آیت سے روگردانی کرنے والا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس مرتبہ حضرت فاروقؓ کے شبہ کا ازالہ **الا بحقھا یعنی واتوا الزکٰوۃ** کے امر کی بنا پر اس عزم بالجزم سے فرمادیا کہ میں منکرین زکوٰۃ کے ساتھ برابر اُس وقت تک قتال جاری رکھوں گا جب تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کی طرح زکوٰۃ کا ایک ایک حبہ ادا کرنے پر رضامند نہ ہوجائیں۔

اس حدیث کے آخری حصے سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ:

واللّٰہ لا قاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوۃ۔ (بخاری: 6925)

خدا کی قسم میں یقیناً اُس شخص کے ساتھ جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں کوئی فرق سمجھے گا۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد اسلام کے اس زندہ رکھنے والے کے ان اقوال کے برحق ہونے کا اعتراف حضرت فاروق اعظمؓ الفاظ ذیل میں فرماتے ہیں:

قد شرح الله صدر ابی بکر للقتال فعرفت انه الحق. (بخاری:**6925**)

اللہ تعالیٰ نے قتال کے لیے حضرت صدیق اکبر کو انشرح صدر کا مرتبہ بلند عطا فرمایا۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ جو کچھ انہوں نے فرمایا، بالکل درست و بجا تھا۔

فاروق اعظمؓ کے لیے جن کی سعید فطرت کو پیمبری جیسے منصب جلیل کے ساتھ ایک طرح کی مناسبت تھی، یہ اشارہ ہی کافی تھا۔ ورنہ اگر انہیں اپنے اختلاف پر اصرار ہوتا اور جیسا کہ ارباب تاویل آج کہہ رہے ہیں کہ مانعین زکوٰۃ واقع میں مدینہ پر فوج کشی کی تیاریاں کررہے تھے تو یقیناً حضرت صدیق اکبر ''**الا بحقها**'' کی مزید توضیح یہ کہہ کر فرما دیتے کہ یہ لوگ تو تلوار ہاتھ میں لے کر مرکز اسلام کی طرف جارحانہ اقدام کررہے ہیں پھر اُن سے جنگ کرنے میں کیا تامل ہوسکتا ہے؟ لیکن یہ توضیح تو آپ اُس وقت فرماتے کہ مانعین زکوٰۃ کی فوج کشی کے افسانے کی کوئی اصلیت بھی ہوتی۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب 'منہاج السنہ' میں اس مسئلہ پر بسط وتفصیل کے ساتھ بحث فرمائی ہے۔ امام ممدوح اس بارے میں بہت سے دلائل لائے ہیں اور آخر میں فرماتے ہیں:

- **وهؤلاء لم يقاتلو هم لكونهم لم يؤدوها الى الصديق فانهم لوا عطوها بانفسهم لمستحقيها ولم يؤدوها اليه لم يقاتلهم هذا قول جمهور العلماء كأبى حنيفه و احمد و غيرهما** (منہاج السنہ جلد **4**، ص **495**)

ترجمہ: مانعین زکوٰۃ کے ساتھ قتال کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ حضرت صدیقؓ کو زکوٰۃ نہیں دیتے تھے۔ اگر وہ خود بخود زکوٰۃ نکال کر مستحقین کو تقسیم کردیتے اور حضرت صدیقؓ کے پاس نہ پہنچاتے تو اس صورت میں بھی ان سے قتال نہ کیا جاتا۔ یہ امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ وغیرہما جمہور علماء کا قول ہے۔

امام ابن تیمیہؒ کی اس تصریح سے یہ تاریخی حقیقت عالم آشکار ہو جاتی ہے کہ زکوٰۃ کوئی سرکاری ٹیکس نہیں، جیسا کہ مدیر علامہ ''ہمدرد'' سمجھے بیٹھے ہیں کہ اس کا بیت المال اسلامی میں داخل

کرنا شریعت کے دستور اساسی کی رُو سے ہر مسلمان پر فرض ہو اور اس فرض کے ادا نہ کرنے سے خاطی پر خلاف ورزی یا سرکار کا سیاسی جرم عائد ہو بلکہ نماز کی طرح یہ فرض ہر صاحب نصاب پر منفرداً عائد ہوتا ہے اور اسے اختیار دے دیا گیا ہے کہ بطور خود اپنے مال میں سے اڑھائی فیصدی نکال کر مستحقین میں تقسیم کردے اور اس فرض سے سبکدوش ہو جائے۔ چنانچہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہد سے جبکہ دولت اسلامیہ دور دور پھیل گئی تھی، زکوٰۃ کا سرکاری طور پر وصول کرنا موقوف ہو گیا اور ہر شخص مجاز کردیا گیا کہ زکوٰۃ خود ہی ادا کردیا کرے۔ قرن اول کے مسلمان چونکہ مذہباً بہت ہی ذکی الحس واقع ہوئے تھے اور پابندی شعائر اسلام کا انہیں بدرجہ اتم احساس تھا اور بعد میں بھی صدہا سال تک خلافت اسلامیہ کی سطوت بالواسطہ اس فرض کی انفرادی بجا آوری میں ممد و معین بنی رہی۔ اس لیے حکومت کی طرف سے زکوٰۃ کی فراہمی کی ضرورت داعی نہ ہوئی، لیکن آجکل جبکہ قوائے اسلامیہ ہر طرف روبہ انحطاط ہیں۔ اس بات کی بہت بڑی ضرورت ہے کہ فراہمی زکوٰۃ کی خدمت جماعتی حیثیت سے انجام پذیر ہو، پھر بھی یہ ایک جداگانہ بحث ہے جسے میں کسی دوسری موزوں تر فرصت پر اٹھا رکھتا ہوں۔ اس وقت مجھے یہی ثابت کرنا تھا کہ زکوٰۃ کی حیثیت کبھی بھی ایک سرکاری ٹیکس کی نہ تھی جیسا کہ مدیر ''ہمدرد'' کا خیال ہے۔ بلکہ نماز کی طرح یہ بھی اسلام کا ایک رکن تھا اور جس طرح **تارک الصلوۃ** باوجود کسی سیاسی جرم کا مرتکب نہ ہونے کے شرعی تعزیرات کے پنجے سے نہیں بچ سکتا، اسی طرح **منکر الزکوٰۃ** بھی شرعاً واجب التعزیر ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں اگر زکوٰۃ کو اسلامی حکومت کا ٹیکس مان لیا جائے تو ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جو مسلمان غیر مسلم حکومت کے ماتحت آجائیں، وہ ادائے زکوٰۃ سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ جب حکومت نہ رہی تو ٹیکس کیونکر باقی رہا؟ پھر کیا مدیر ''ہمدرد'' یا ان کے دوسرے ہم خیال اصحاب بہ حالت موجودہ اپنے آپ کو زکوٰۃ سے بری الذمہ سمجھتے ہیں؟

فرض مانعین زکوٰۃ کے ساتھ قتال کی علت نہ بغاوت تھی اور نہ مدینے پر حملہ کی تیاری، حقیقی وجہ محض یہ تھی کہ انہوں نے حکم زکوٰۃ میں ایک محرفانہ تاویل کرلی تھی اور کہتے تھے کہ **خذ من اموالهم صدقه تطهرهم و تزكيهم بها** (توبہ:**103**) اخذ زکوٰۃ کا حق صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختص تھا۔ اس لیے کہ آپ ہی تطہیر و تزکیہ کے خصائص سے ممتاز تھے۔ دوسروں میں نہ یہ خصوصیت پیدا ہوسکتی ہے اور نہ آیت میں ان سے خطاب ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی

خاص طور پر قابل غور ہے کہ فرائض اللہ میں سے کسی ایک میں محرفانہ تاویل بھی موجب ارتداد اور مستلزم سزائے قتل ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے حضرت صدیق اکبرؓ کے داعیۂ قتال اور حضرت عمرؓ کے اعتراض کے جواب والی حدیث پر مستقل باب باندھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ **باب قتل من ابی قبول الفرائض وما نسبوا الی الردة.** (بخاری جلد 2، ص 123 قدیمی)

اس سلسلہ میں مسیلمہ کذاب کا واقعہ بھی خاص طور پر غور طلب ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ مسیلمہ کذاب، رسالت یا وحدانیت کا منکر نہیں تھا بلکہ حسب صراحت طبری اذان میں **اشهد ان محمد رسول الله** کا اعلان کراتا تھا۔ البتہ نبوت میں شرکت کا دعویدار تھا جس طرح کہ دوسرے رنگ میں باوجود قادیانیت کے دعاوی سے مستفاد ہوتا تھا۔ یا کم از کم اس کے پیروؤں کی ایک جماعت اور بہت بڑی جماعت ایسا سمجھ رہی ہے اور کہہ رہی ہے۔ علاوہ بریں مسیلمہ کذاب نے بعض احکام میں تحریف کردی تھی، سجاح کے ساتھ نکاح کے مہر میں فجر وعشا کی نمازیں معاف کردی تھیں۔ ایسی تحریف اور تصرف فی الدین کا سلسلہ مسیلمہ کے پیمانے پر نہیں تو اس سے کسی قدر چھوٹے پیمانے پر مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاں بھی موجود ہے۔ مثلاً جہاد کے متعلق، لیکن افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مسیلمہ کے ساتھ قتال کیا اور **لااکراه فی الدین** کے اس مفہوم پر عمل نہ فرمایا جو ہتھیار تیرہ سو سال کے بعد محمد علی لاہوری قادیانی اور مولانا محمد علی جوہر نے پیش کیا ہے۔

اس کے بعد ''ہمدرد'' نے حدیث **من بدل دينه فاقتلوه** پر چند اعتراضات کر کے بزعم خود اسے قطعاً ناقابل قبول ثابت کیا ہے۔ ان میں سے پہلا اعتراض اپنی خندہ آفریں غرابت کے لحاظ سے علمی دنیا میں اپنی نظیر آپ ہے۔ فاضل مدیر ''ہمدرد'' بہ تقلید امیر جماعت احمدیہ لاہور فرماتے ہیں کہ اس روایت کے الفاظ عام ہیں اور ان کی عمومیت کی لپیٹ میں تمام انسان بلاتمیز مسلم وغیر مسلم آجاتے ہیں اور اس کا مطلب جہاں یہ ہوسکتا ہے کہ دین اسلام سے برگشتہ ہونے والے واجب القتل ہیں، وہاں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر ایک ہندو اپنا مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہو جائے تو فوراً اس کی گردن اڑا دینی چاہیے۔ اگر ایک عیسائی اپنا دین بدل کر بدھ مت اختیار کرلے تو اسے معاً قتل کردینا چاہیے۔ افسوس قادیانیوں کے رسوائے عالم انداز استدلال کے کورانہ اتباع نے مولانا محمد علی (جوہر) جیسے طباع اور نکتہ رس شخص کو کج بحثی کی کن بھول بھلیاں

میں پھنسا دیا۔ ’’**من بدل دینه**‘‘ سے مسلمان کے سوا کوئی دوسرا شخص مراد لینا اور ’’دین‘‘ کو اس مقام پر بلحاظ سیاق وسباق اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب بھی سمجھنا صرف اسی شخص کا حصہ ہوسکتا ہے جو اپنی کتاب عقل طاقِ قادیان پر رکھ چکا ہو۔ اگر مولانا محمد علی (جوہر) نے اپنے لاہوری ہمنام کے رسالے کے علماء وبزرگان سلف کے سفار ودواوین کی ورق گردانی بھی کی ہوتی اور کم از کم بخاری ہی کو کھول کر دیکھ لیا ہوتا تو انہیں ایک نظر میں معلوم ہو جاتا کہ حدیث زیر بحث اس موقع پر بیان کی گئی ہے جبکہ حضرت علی المرتضیٰؓ کے حضور میں کچھ زنادقہ لائے گئے تھے اور آپ نے انہیں آگ کے دہکتے ہوئے الاؤ میں جھونک دیا تھا۔ یہ خبر حضرت ابن عباسؓ تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر میں علیؓ کی جگہ ہوتا تو ان لوگوں کے جلائے جانے کا حکم نہ دیتا بلکہ انہیں قتل کرادیتا۔ اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ **من بدل دینه فاقتلوه**۔ اس سارے واقعہ کو پیش نظر رکھ کر ’’من‘‘ پر غیر مسلم کا اطلاق کرنا قادیانیوں کے نزدیک تو جائز ہوسکتا ہے کیونکہ اس قسم کی تحریف اور اس انداز کی تاویل ان کا شیوہ خصوصی ہے لیکن مولانا محمد علی (جوہر) سے مجھے ہرگز اس کی توقع نہ تھی۔ کاش ان کے پیش نظر امیر جماعت احمدیہ لاہور کا رسالہ نہ ہوتا جس کے مطالعہ نے ان کے لیے اس قسم کی مضحکہ خیز لغزش ممکن بنادی۔

دوسرا اعتراض بھی کچھ کم انوکھا نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اس حدیث کے آخری راوی ابوالنعمان محمد بن الفضل اگرچہ امام بخاری کے شیوخ میں سے ہیں لیکن آخری عمر میں خلط ملط کرنے لگے تھے۔ اس دعوے کے ثبوت میں مدیر ’’ہمدرد‘‘ نے ’’تہذیب التہذیب‘‘ سے باحوالہ امیر جماعت احمدیہ لاہور، ابن حبان کا یہ قول نقل کردیا ہے کہ ’’**اختلط فی آخر عمره**‘‘۔ کاش مدیر علامہ ابونعمان کے متعلق مزید تفحص وتحقیق کی زحمت گوارا فرماتے۔ ’’تہذیب التہذیب‘‘ اس وقت میرے سامنے نہیں جس سے معلوم ہو کہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ابن حبان کے اس قول کے متعلق کیا کہا ہے لیکن ’’فتح الباری‘‘ کے مقدمہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابوالنعمان نے **224**ھ میں وفات پائی۔ مختلط وہ بے شک ہوگئے تھے لیکن وفات سے صرف دوسال پیشتر یعنی **222**ھ تک ان کا حافظہ بالکل صحیح تھا اور روایت حدیث میں اس وقت تک باتفاق جمہور محدثین ان سے خفیف سے خفیف لغزش بھی نہ ہوئی تھی، جو حدیث آج دہلی لاہور کے اعتراضات کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے، وہ امام بخاری نے اپنے اس شیخ سے **213**ھ میں لی تھی۔ قادیانی جماعت کے امیر سے

تو شکوہ لاحاصل ہے، لیکن مولانا محمد علی کی نظر اگر زیادہ وسیع ہوتی اور حافظ ذہبیؒ کی ''میزان الاعتدال'' کوانہوں نے دیکھا ہوتا تو اس میں ابوالنعمان کے متعلق خود بخاری کا یہ قول جلی حروف میں لکھا ہوا نظر آ جاتا کہ **تغیر عارم** (ابوالنعمان) ''**فی آخر عمرہ**''۔ کیا اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا مصنف جس کی غایت احتیاط کا یہ عالم ہے کہ چھ لاکھ حدیثوں میں سے بہ شمولیت مکررات صرف (**9882**) حدیثیں اپنی کتاب میں درج کرتا ہے اور حدیث کے ہر باب کے مرتب کرنے سے پہلے دو رکعت نفل پڑھ کر حضرت باری عزاسمہ سے بہزاراں خضوع وخشوع دعا مانگ لیتا ہے کہ الٰہی تیرے حبیب ﷺ کا کلام پاک جمع کرنے میں کوئی لغزش مجھ سے سرزد نہ ہو جائے، اتنا گیا گزرا تھا کہ اسے ایک شخص کے ضعیف الحافظ ہونے کا علم ہوا اور پھر بھی اس کی حدیثیں اپنی صحیح میں درج کرلے۔

ابوالنعمان کے علو مرتبت کا اندازہ کرنا ہو تو حافظ ذہبیؒ کا یہ قول پڑھ جاؤ جو ''میزان الاعتدال'' میں درج ہے کہ '' حافظ صدوق، مکثر'' اس سے بھی تشفی نہ ہو تو دارقطنی کے اس بیان سے اپنی تسکین کرو کہ اگرچہ آخر عمر میں ابوالنعمان کے دماغ کی حالت صحیح نہیں رہی تھی مگر **وما ظھر لہ بعد اختلاطہ حدیث منکر وھو ثقة** (یعنی مختلط ہو جانے کے بعد بھی انہوں نے ایک منکر حدیث بیان نہیں کی اور ان کے ثقہ ہونے میں کوئی کلام نہیں)۔ ابوالنعمان کے متعلق اس سارے زمانہ میں اگر کسی نے شکوک و وساوس پیدا کیے ہیں تو وہ ابن حبان ہے لیکن حافظ ذہبیؒ اس کی بڑے زور سے تردید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ **لم یقدر ابن حبان ان یسوق لہ حدیثا**۔۔۔ (یعنی ابن حبان نکتہ چیں ہونے کے باوجود ایک منکر حدیث بھی ابوالنعمان سے منسوب نہیں کرسکے۔)

جب حالات یہ ہوں تو مولانا محمد علی (جوہر) کا محمد علی لاہوری قادیانی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ''ہمدرد'' میں تو یہ لکھ دینا کہ ابوالنعمان محمد بن الفضل کے آخر عمر میں مختلط ہو جانے کے باعث ان کی بیان کی ہوئی حدیث قابل اعتماد نہیں اور اس عدم اعتماد کے باوجود '' کامریڈ'' کے کالموں میں اس سے قتل بالتعذیب کی نفی پر استدلال کرنا ایک منطقی اچنبھا نہیں تو اور کیا ہے؟ جب تک ''**من بدل دینہ**'' سے انکار ضروری معلوم ہوتا تھا، اس وقت تو اس حدیث کی صحت ہی سے انکار تھا۔ اس کا آخری راوی ضعیف الحافظہ بھی تھا، مسلوب الحواس بھی تھا، غلط ملط بھی

کر دیا کرتا تھا اور خدا جانے کیا کچھ تھا لیکن جب **قتل بالتعذیب** کی نفی پر استدلال کی ضرورت پیش آئی تو یک بہ یک ''اور دفعتہً اور بغتیاً ابوالنعمان محمد بن الفضلؒ سرآمد محدثین کبار اور رسا نشہ صہبائے اعتبار بن گیا۔

یہ لوگ بھی غضب کے ہیں دل پر یہ اختیار
شب موم کرلیا سحر آہن بنا دیا

لیکن اصل سوال یہ ہے کہ کیا ''**من بدل دینه**'' کی حدیث کا یہی ایک سلسلہ روایت ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے طریق پر اس کا ذکر نہیں آیا کہ فقط ابوالنعمانؒ پر اعتراض کر کے اسے مسترد کر دیا جائے اور اپنا پیچھا اس ساری بحث سے چھڑا لیا جائے؟ اس سوال کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ امام بخاری **''کتاب الجهاد''** باب **''لایعذب بعذاب الله''** میں اسی حدیث کو بہ اسناد ذیل لائے ہیں:

حدثنا علی بن عبداللّٰه حدثنا سفیان عن ایوب عن عکرمة ان علیاً حرق قوماً ...... من بدل دینه فاقتلوه. (بخاری: **3017**)

اس کے علاوہ اس حدیث کے اور بھی متعدد سلاسل ہیں جسے اس دریائے بے کراں کی غواصی کا اشتیاق ہو، وہ نسائی، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند امام احمد بن حنبلؒ، مستدرک حاکم، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، معجم کبیر اور معجم صغیر کے مجلدات کی ورق گردانی کر لے جن میں یہ حدیث دوسرے سلسلوں اور دوسرے واسطوں سے غیر مختتم تواتر کے ساتھ مروی ہے۔ ان سلاسل و وسائط کے باب میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ کیا ان میں بھی ابوالنعمان کی طرح شائبہ اختلاط موجود ہے؟

باقی رہا یہ دعویٰ کہ نفس ارتداد موجب قتل نہیں بلکہ جب مرتد محارب بن جائے تو صرف اسی حالت میں بفحوائے آیہ کریمہ ''**انما جزؤا الذین یحاربون اللّٰه و رسوله**'' (المائدہ: **33**) مستوجب قتل ہوتا ہے۔ سو اگر اس دعوے میں کچھ بھی وزن ہو تو مجھے استفسار کا حق ہے کہ حدیث میں سرے سے ارتداد کی بحث ہی کیوں چھیڑی گئی اور جابجا ''ارتداد'' اور ''کفر'' کی گردان کیوں کی گئی؟ کیا محض ''حارب'' کہہ کر ان پر قتل کا حکم نہیں لگایا جا سکتا تھا؟

اس سلسلہ میں فاضل مدیر ''ہمدرد'' نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت

’’**المفارق من الدین التارک للجماعه**‘‘ پر بھی قلم انقار اٹھایا ہے اور جیسا کہ مختصراً کسی دوسری جگہ بیان کیا جا چکا ہے، انہوں نے نغمہ سرایان قادیان کے ساتھ سُر ملاتے ہوئے حق ہم آہنگی اس طرح ادا کیا ہے کہ ’’**المفارق من الدین**‘‘ اور ’’**التارک للجماعة**‘‘ کی دوگونہ ترکیبوں کا اتصال اپنا شارع آپ ہے۔ دونوں جملوں کو ساتھ ملا کر پڑھنے سے صرف یہی معنی نکل سکتے ہیں کہ مرتد واجب القتل بے شک ہے لیکن محض بصارت محاربہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب تحدی کے ساتھ پھر کہتا ہوں کہ یہ معنی بطن الشاعر میں ہوں تو ہوں، حدیث سے کسی طرح بھی متبادر نہیں ہوتے۔ قارئین کرام کی تشفی کے لیے محدثین و شارحین کی تصریحات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے حدیث زیر نظر کا متن سامنے رکھ لینا چاہیے تا کہ تصریحات کے ذہن نشین ہونے میں آسانی بھی ہو۔

لایحل دم امری مسلم یشھد ان لااله الا اللّٰه و انی رسول اللّٰه، الا باحدی ثلاث ا۔ النفس بالنفس، ۲۔ والثیب الزانی. ۳۔ والمفارق من الدین التارک للجماعة. (بخاری: 6878)

جو مسلمان خدا کی وحدانیت اور میری رسالت کا مقر ہو، اس کا خون صرف تین صورتوں میں حلال ہے، پہلی صورت یہ ہے کہ وہ قتل عمد کا مرتکب ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ زنا کرے، تیسری صورت یہ ہے کہ وہ دین سے نکل جائے اور سنن ابوداؤد میں ’’**المفارق من الدین التارک للجماعة**‘‘ کے بجائے ’’**والتارک لدینه المفارق للجماعة**‘‘ کے الفاظ آئے ہیں اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو جماعت مسلمین کو چھوڑے اور روت اختیار کر کے اپنا تعلق ملت بیضا سے منقطع کر لے۔ **المفارق للجماعة التارک لدینه** کی صفت موکدہ ہے۔

امام نوویؒ شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں:

فھو عام فی کل مرتد عن الاسلام بأي ردة کانت فیجب قتله ان لم یرجع الی الاسلام. (شرح النووی علی مسلم: ص165، جز11)

اس حدیث کے مثلث ثالث کا اطلاق عمومیت کے ساتھ ہر اس شخص پر ہوتا ہے جو دین

اسلام سے برگشتہ ہو جائے اور اگر تائب ہو کر از سر نو اسلام نہ قبول کرے تو وہ واجب القتل ٹھہرتا ہے۔

صاحب عون الباری لکھتے ہیں کہ مارق خارج کا مترادف ہے اور تارک جماعت کا مطلب یہ ہے کہ وہ جماعت مسلمین سے نکل جائے، ان کے زمرے سے باہر ہو جائے۔

جس طرح شہادت ''**لا اله الا اللّٰه وانی رسول اللّٰه** کی کوئی نئی مستقل صفت اس جگہ لفظ مسلم کی شرح ہے، اسی طرح ''**التارک للجماعة**'' **المفارق من الدین** کا کوئی جداگانہ وصف نہیں بلکہ محض اس کی مزید تفصیل ہے۔ نسائی میں سند صحیح سے حضرت عثمانؓ کی جو حدیث آئی ہے، وہ اس خیال کی موکد ہے۔ اس حدیث میں ''**المفارق من الدین**'' کے بجائے ''**او کفر بعد اسلام**'' کے الفاظ ہیں۔ نسائی کی ایک اور حدیث میں "**ارتد بعد اسلام**" کے درج ہے کہ طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے۔ اس میں "**مرتد بعد ایمان**" کے الفاظ موجود ہیں۔

ان تمام تصریحات کے بعد جن سے مرتد کا مسلمانوں کی جماعت سے کٹ کر دشمنان اسلام کے ساتھ **بخر من قتال** جاملنا اور اس طور پر محارب بن جانا کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث کو محض محارب مرتدین سے مخصوص کرنا کھلی ہوئی کج بحثا نہ زیادتی ہے۔

اس بات پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ بخاری نے اپنا عنوان ہی "**باب المحاربین من اهل الکفر و الردة**" قرار دیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مرتد صرف بصورت محارب واجب القتل ہے۔ قادیان اور دہلی کے غواص خوش ہوں گے کہ ان کی محدثانہ شناوری بڑی دور کی کوڑی لائی لیکن وہ اس دریائے زخار کی تہ میں ذرا اور ہاتھ پاؤں مارتے تو اپنے جیب و داماں کو خرمہرہ کی جگہ لالی شہوار سے بآسانی بھر سکتے تھے۔ بخاری نے آگے چل کر ''**استتابة المرتدین والمعاندین وقتالهم**'' کا ایک اور بھی عنوان قائم کیا ہے جس کے نیچے **باب حکم المرتد والمرتده** میں دو حدیثیں درج ہیں۔ ان حدیثوں میں محاربہ کا ذکر تک نہیں۔ پھر آپ انہیں کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں؟

''ہمدرد'' نے ''ہدایہ'' سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچانے کی ناکام کوشش کی ہے کہ احناف کے نزدیک بھی نفس ارتداد مستوجب قتل نہیں ہے۔ احناف کی کتب شہیرہ و متداولہ کی موجودگی اور ان کے غیر مشتبہ تعامل کے ہوتے ہوئے اس قسم کا دعویٰ کرنا پرلے درجہ کی دیدہ دلیری

کا کام ہے۔تمام احناف اور دوسرے ائمہ کے پیرو نفس ارتداد کو موجب قتل قرار دینے میں بالکل متفق ہیں اور بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ قادیانیوں یا اس عہد کے بعض متنورین کے سوا جو امت مرزائیہ کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں، ابتدائی اسلام سے لے کر آج کے دن تک ایک شخص نے بھی اس بارے میں اختلاف نہیں کیا۔خفیف سا جزئی اختلاف اگر ہے تو مرتدہ کے بارے میں ہے۔احناف مرتدہ کو قتل کے بجائے حبس دوام کی سزا دیتے ہیں اور اس کی وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے قتل سے نہی فرما دی ہے۔ یہ نہی ائمہ احناف کی رائے میں ''**من بدل دینه**'' کی تعمیم کی مخصص ہے اور اس تخصیص میں حکمت یہ ہے کہ عورتوں میں خلقی ضعف کے باعث محاربہ بننے کی صلاحیت موجود نہیں ہوتی، صرف مرد میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔

محمد علی لاہوری قادیانی لکھتے ہیں کہ بعض ائمہ مجتہدین کی رائے میں مرتد کے لیے مرتے دم تک توبہ کا دوازہ کھلا ہوا ہے، اس رائے سے آپ نفی قتل مرتد پر استدلال کرتے ہیں۔ان ائمہ مجتہدین کا قول یہ ہے کہ اگر ایک شخص بار بار مرتد ہو اور قاضی کے سامنے پیش ہو کر ہر دفعہ توبہ کرتا رہے تو اسے قتل نہیں کرنا چاہیے۔اس کے خلاف عام ائمہ کا قول ہے کہ دوسری تیسری مرتبہ ارتداد واختیار کرنے والوں کو توبہ کے باوجود قتل کی سزا دینی چاہیے۔**ان الذین آمنوا ثم کفروا ثم آمنوا ثم کفروا ثم ازداد واکفرا** (النساء:137) سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دوسری یا تیسری مرتبہ مرتد ہونے کے بعد توبہ بے سود ہے۔

قادیانیوں پر ارتداد کی تعریف کے صادق آنے یا نہ آنے کے بارے میں ''ہمدرد'' نے جو کچھ لکھا ہے، اس پر تفصیلی بحث کا یہ موقعہ نہیں۔البتہ اس اصول کی حیثیت مطلقہ کے تسلیم کرنے میں مجھے کلام ہے کہ تاویل کرنے والا کافر نہیں ہوتا۔ بلاشبہ مؤولین اور **منکرین یا محرفین الکلم عن مواضعه** میں فرق ہے۔لیکن جب تاویل اپنی حد مناسب سے متجاوز ہو جائے، اس میں اور انکار وتحریف میں کوئی تمیز باقی نہ رہے، دین کے اصول پر اس کے مہلک تیشہ کی ضرب تو بر تو پڑنے لگے تو اس دعوے کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی کہ مؤول کافر نہیں ہوتا، اسی لیے مانعین زکوٰۃ، زنادقہ، جہمیہ، قدریہ، باطنیہ، وغیرہ فرق باطلہ کی تاویلات سلف کے نزدیک بالاتفاق تحریف دین کی حیثیت رہی ہیں اور انہیں قتل وقتال کا موجب قرار دیا جاتا رہا ہے۔آخر یہ لوگ بھی

خدااور رسول کے منکر تو نہ تھے اور کلام اللہ کی حقیقتوں سے سرتابی کا داعیہ تو نہ رکھتے تھے، صرف اپنی ممسوخ عقل کے مطابق آیات ربانی کی تاویل ہی کرتے تھے، پھر کیا اس تاویل کی پاداش میں ان کے ساتھ وہی سلوک نہیں کیا گیا جو منکرین کے ساتھ کیا جاتا تھا؟

بات بات میں ''**لااکراہ فی الدین**'' کی رٹ لگانے والے شرع کی **بطش شدید** سے تو پہلے ہی دامن جھٹک کر الگ ہو چکے ہیں، رہی سہی کسر حدیث العہد متورین کا یہ اصول موضوعہ پوری کر دے گا کہ مؤول کافر نہیں ہوتا۔ آج ختم رسالت کی تاویل کی جاتی ہے۔ ظل و بروز کی نامعقول حجت تراش کر کہا جاتا ہے کہ

ظاہرا گو سایہ عین نور نیست
کج مبیں کز نور چنداں و در نیست

حکم جہاد کی تاویل کرتے کرتے اسے قرآن مجید سے بالکل ہی خارج کر دیا جاتا ہے اور اس پر قادیان کی شان جمالی کا پردۂ فاسق ڈال دیا جاتا ہے۔ ''**اسمه احمد**'' والی تاویل سب کے سامنے ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آج جو احمد بنے پھرتے ہیں، کل کو احمد بے میم نہ بن جائیں گے یا نہ بنا دیے جائیں گے؟

گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواحد شدن

اس کے بعد نہیں معلوم کہ دین میں کیا باقی رہ جائے گا۔ اگر یہی وہ آزادی ضمیر، یہی وہ روشن خیالی اور یہی وہ دینی اجتہاد ہے جس پر بار بار زور دیا جاتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ تہذیب انسانی کے ان بالغ نظر پروفیسروں سے تو وہ جامد مقلدین ہی ہزار درجہ بہتر ہیں جو اپنی جگہ سے بال برابر بھی ہٹنا گوارا نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ بھلے یا بُرے طریقے سے دین کے اصول کو تو قائم رکھتے ہیں۔ آپ کے عالم آشوب اجتہاد کا سٹیم رولر جس انداز سے متحرک ہو رہا ہے، اس سے تو چند روز کے بعد کسی چیز کے بھی صحیح و سالم رہنے کی امید نظر نہیں آتی۔

''**لااکراہ فی الدین**'' اور عدم تکفیر مووّل کے جو من مانے اصول ''ہمدرد'' نے وضع کیے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ حدیث میں ''**من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ**'' اور ''**فمن جاھدھم بیدہ فھو مؤمن**'' کی جو تصریحات آئی ہیں، ان کی نسبت بھی فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ ''**ید**'' سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ وہی چیز ہے جو کفر کے

منہ پر طمانچہ مار کر اسے لال کر دیا کرتی ہے یا افلاطون کے عالم مثال کی کوئی محض مابعد الطبعی حقیقت ہے؟ اگر شکل اول صحیح ہو تو پھر "**ید**" کہاں کہاں استعمال ہوگا اور "**امر منکر**" کا وقوع کس صورت میں "**لا اکراہ فی دین**" کے عالمگیر حصار سے باہر آئے گا، کیا "**امر منکر**" کو روکنے کے لیے "**جہاد بالید**" کا حکم بھی حقیقت میں واجب الامتثال ہے یا "**من بدل دینہ فاقتلوہ**" کی طرح محض اوراق حدیث ہی کی تزئین کے لیے صاحب "**وما ینطق عن الھوی** (النجم:3)" کی زبان الہام ترجمان پر جاری ہوا تھا؟

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا، اس کی غایت محض یہ تھی کہ جن اصحاب نے تیرہ سو سال کی مدت میں سب سے پہلی مرتبہ قتل مرتد کی مخالفت میں آواز بلند کی ہے، ان کے دلائل و براہین کی قدر و قیمت اور حیثیت و مرتبت کا اندازہ کیا جائے۔ گزشتہ مباحث کے ملاحظہ سے قارئین کرام پر اچھی طرح آشکار ہو چکا ہوگا کہ منکرین قتل مرتد کی تحریرات تمام تر آیات قرآنیہ کی غلط تفسیر وارشادات حضور سرور دو عالم ﷺ کی نادرست تاویل یا دیدہ و دانستہ تحریف پر مبنی و متفرع ہیں۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ذیل میں شریعت کی تمام تصریحات، ائمہ کرام کے فیصلے اور علماء و شیوخ کتاب وسنت کے اقوال جمع کر دوں تا کہ منکرین قتل مرتد پر روشن ہو جائے کہ یہ معاملہ اتنا آسان اور معمولی نہیں ہے کہ چند آیات کا موافق مطلب ترجمہ کر کے یا ایک آدھ حدیث میں بزعم خود نقص نکال کر سمجھ لیا جائے کہ اب اس بات میں آخری، حتمی اور منصوص فتویٰ جاری ہو گیا۔ میرے مبحث کا یہ حصہ اس قدر وسیع اور اس درجہ فصیح ہے کہ مجھے اس کا حصر واستقصاء محال نظر آتا ہے۔ نہ سر دست کتابوں کا پورا ذخیرہ میرے پاس موجود ہے، نہ اتنی فرصت و مہلت ہے کہ گزشتہ تیرہ سو سال کے ہر دور کی بلند ترین شخصیتوں کے فیصلے جمع کر سکوں اور نہ صحیح معنوں میں اپنے آپ کو اس عظیم الشان کام کا اہل پاتا ہوں۔ تاہم جو مواد اس وقت میرے پاس موجود ہے، اسے پیش کر دینے میں توقف و تامل مناسب نہیں سمجھتا۔ بہت ممکن ہے کہ میری یہ ناچیز مگر مخلصانہ کوشش اس میدان کے حقیقی شہسواروں کے ہاتھ میں مزید تگ و تاز کے لیے تازیانہ کا کام دے اور میری یہ چند غیر مکمل سی گزارشات ارباب علم و فضل کے اندر اس مبحث کی ہمہ وجوہ تکمیل کا جذبہ حقہ و داعیہ صادقہ پیدا کر دیں۔

می گویم و بعد از من گویند بہ دوران ہا

اس سلسلے میں سب سے پہلے قرآن حمید آتا ہے۔ بعض اصحاب نے ''**انما جزواء الذین یحاربون الله و رسوله**'' (المائدہ:33) سے قتل مرتد پر استدلال کیا ہے اور میں اس کی نسبت اجمالاً چند کلمات اوپر عرض کر چکا ہوں۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اپنے رسالہ ''**الشهاب لرجم الخاطف المرتاب**'' میں واقعہ عکل کی اس آیت سے قتل مرتد کا ثبوت پیش کرتے ہیں:

❑ **انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل فتوبو الیٰ بارءکم فاقتلوآ انفسکم.** (البقرۃ:54)

ترجمہ: اے بنی اسرائیل! تم نے گوسالہ کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر سخت ظلم کیا، اب خدا کی طرف رجوع کرو پھر اپنے آدمیوں کو قتل کرو۔

مولانائے ممدوح فرماتے ہیں کہ اس استدلال پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ شریعت موسوی سے تعلق رکھتا ہے، لہٰذا اس سے امت محمدیہ کے حق میں تمسک نہیں کیا جا سکتا، مگر اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ قرون خالیہ کے جن احکام و شرائع کو قرآن نے نقل کیا ہے، ان کی پیروی و اتباع ہمارے لیے اس وقت تک ضروری ہے جب تک کہ کسی خاص حکم یا خاص معاملے کی نسبت کتاب یا سنت میں صاف ممانعت نہ آ جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ایک مقام پر بہت سے انبیاء و مرسلین علیہم السلام کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمادیا گیا ہے کہ:

❑ **اولٓئک الذین هدی الله فبهدهم اقتده.** (الانعام:90)

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جنہیں خدا نے ہدایت دی۔ پس آپ بھی ان کی ہدایت پر چلیے۔

لیکن اگر کوئی شخص ان استدلات کے قبول کرنے میں متامل ہو تو بدرجہ آخر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قرآن مقدس سزا کے باب میں ساکت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے تمام جرائم کے لیے سزاؤں کی تخصیص نہیں کی مثلاً شاتم رسولؐ کے لیے کوئی سزا مذکور نہیں حالانکہ یہ جرم بہت ہی سخت ہے۔ قمار بازی کے لیے کوئی سزا نہیں حالانکہ اس فعل شنیع کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ لواطت کی نسبت صرف اتنا فرمادیا گیا ہے کہ

❑ **والذان یاتینها منکم فاٰذوهما.** (النساء:16)

ترجمہ: اور تم میں سے جب دو مرد بے شرمی کے فعل کے مرتکب ہوں تو انہیں اذیت دو۔

لیکن اس اذیت کی تحدید و تعیین کوئی نہیں کی گئی۔ اس سے بھی بڑھ کر شراب کا معاملہ ہے، یہ سمجھتا ہوں کہ شراب کا ذکر قرآن میں متعدد دفعہ آیا ہے۔ ایک دفعہ یہ فرمایا گیا ہے:

❑ **یسئلونک عن الخمر و المیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما.** (البقرۃ:219)

ترجمہ: آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دیجیے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں۔ لیکن گناہ فائدوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

❑ **یایھا الذین اٰمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب و الازلام رجسٌ من عمل الشیطٰن فاجتنبوہ لعلکم تفلحون.** (المائدہ:90)

ترجمہ: اے ایمان والو! شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک چیزیں ہیں جو عمل شیطان سے ہیں پس ان سے بچو، تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔

دونوں مقالات پر شراب کا ذکر ہے مگر سزا کی طرف اشارہ تک نہیں اور طرفہ یہ کہ آیات ارتداد میں تو ہولناک عذاب اخروی کا تذکرہ ہے مگر شراب کی آیات میں اس کی نسبت بھی ایک حرف نظر نہیں آتا۔ حالانکہ حدیث میں اسے زنا اور سرقہ کے ساتھ رکھا گیا ہے جس طرح بحالت ارتکاب زنا و سرقہ ایمان کے مسلوب ہو جانے کی صراحت ہے۔ اسی طرح شراب کی نسبت بھی صاف صاف فرما دیا گیا ہے کہ **لایشرب الشارب حین یشرب و ھو مومن**، علاوہ بریں تازیانوں کی سزا موجود ہے۔ پھر جو لوگ سزائے ارتداد کے متعلق قرآن حکیم کے سکوت کو نفی سزا پر محمول کرتے ہیں، وہ براہ کرم مجھے بتائیں کہ شرب خمر اور لواطت وغیرہ کی نسبت ان کا کیا ارشاد ہے؟

قرآن حکیم کے سکوت کی صورت میں ہمارے لیے احادیث کی طرف رجوع کرنا لازمی ہے۔ احادیث پر نظر ڈالی جائے تو ان میں قتل مرتد کی نسبت ایسی تشریحات و تنبیہات موجود ہیں جن کے متعلق ایک لحظہ کے لیے بھی شبہ، تامل یا تذبذب کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ میں یہاں چند احادیث و آثار نقل کرتا ہوں جن میں سے اکثر و بیشتر میں نے اصل کتابوں سے نکالے ہیں اور بعض کے سلسلے میں مستند علما کی تحریرات پر اعتماد کیا ہے۔ امید واثق ہے کہ یہ منقولات قارئین کرام کے لیے بے حد تسلی بخش اور تسکین افزا ثابت ہوں گی اور جو لوگ مولانا محمد علی (جوہر) اور

محمد علی لاہوری قادیانی کے مضامین ورسائل کی تنگ بخشی کو دریا نوالی تصور کیے بیٹھے ہیں، ان کے وہم باطل وظن فاسد کا ان سے پورا ازالہ ہو جائے گا۔

1۔ بخاری کی حدیث ''**من بدل دینه فاقتلوه**'' کی مفصل بحث اوپر گزر چکی ہے اور میں بتا چکا ہوں کہ اس کے آخری راوی ابوالنعمان محمد بن الفضل کے متعلق ابن حبان کے معترضانہ قول کی حیثیت کس درجہ بودی اور ناقابل اعتنا ہے۔ صحابہؓ میں سے اس حدیث کو حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت معاویہ بن حیدہؓ نے روایت کیا ہے۔ بخاری میں یہ حدیث دو مختلف سندوں سے دو مختلف کتابوں یعنی **کتاب الجهاد** اور **کتاب استتابة المرتدین** میں آئی ہے۔ علاوہ بریں مستدرک حاکم، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، معجم کبیر، معجم صغیر، نسائی، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند امام احمد ابن حنبل میں موجود ہے۔ نیز امت کے مشہور ترین ائمہ وعلمانے اسے بہمہ وجوہ مستند مانا ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر یہ "**بلوغ المرام**" اور "**منتقی الاخبار**" میں بھی ملتی ہے۔ صاحب "**منتقی الاخبار**" فرماتے ہیں کہ **رواه الجماعة الامُسلما**۔ نسائی نے اسے پانچ مختلف اسناد سے روایت کیا ہے۔ میں یہاں ان تمام سلاسل کی تفصیل غیر ضروری سمجھتا ہوں جو صاحب چاہیں سنن نسائی اٹھا کر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

ترمذیؒ اس حدیث کو اپنی سنن میں درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

❑ **والعمل علیٰ هذا عند اهل العلم فی المرتد واختلفوا فی المرأة اذا ارتدت عن الاسلام فقالت طائفة من اهل العلم تقتل و هو قول الاوزاعی، واحمد و اسحاق. و قالت طائفة منهم تحبس ولا تقتل. وهو قول سفیان الثوری وغیره من اهل الکوفة.** (ترمذی:**1458**)

ترجمہ: مرتد کے بارے میں تمام اہل علم کا عمل اسی پر ہے، بس مرتدہ کی نسبت اختلاف ہے۔ اوزاعی، احمد، اسحاق وغیرہ کا فیصلہ ہے کہ اسے بھی قتل کیا جائے لیکن سفیان ثوری وغیرہ اہل الکوفہ فرماتے ہیں کہ مرتدہ کو قید کیا جائے، قتل نہ کیا جائے۔

2۔ ''ہمدرد'' اور محمد علی لاہوری قادیانی نے اس حدیث کے الفاظ کی عمومیت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کا اطلاق ان کافروں پر بھی ہو سکتا ہے جو اپنی ملت کو چھوڑ کر اسلام اختیار کریں۔ اس کا جواب میں اوپر عرض کر چکا ہوں لیکن ان کی مزید تسکین کے لیے ایک ایسی حدیث پیش کرتا

ہوں جس میں عمومیت نہیں بلکہ تحدید و تخصیص موجود ہے۔**وھو ھذا:**

❑ **من خالف دینه دین المسلمین فاضربوا عنقه.**

(المعجم الکبیر طبرانی ص242 حدیث نمبر 11617)

ترجمہ: جو شخص اپنے دین یعنی دین اسلام کی مخالفت کرے تو اس کی گردن ماردو۔

3۔ "من بدل دینه" کی ہم معنی ایک حدیث امام مالک، موطا کے باب "القضاء فیمن ارتد عن الاسلام" میں لائے ہیں۔

❑ **مالک عن زید بن اسلم ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال من غیر دینه فاضربوا عنقه. (المنتقیٰ شرح موطا۔ص281)**

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، مستویٰ شرح موطا'' میں اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

❑ **علیه اهل العلم اذا کان المرتد رجلا واختلفوا فی المرتدة قال الشافعی تقتل وقال ابو حنیفه لاتقتل ولکن تحبس حتیٰ تسلم.**

ترجمہ: قتل مرتد کے باب میں اہل علم متفق ہیں۔البتہ مرتدہ کے متعلق اختلاف ہے۔شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مرتدہ کو بھی قتل کیا جائے۔ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ قتل نہ کیا جائے، قید رکھا جائے یہاں تک کہ وہ اسلام لے آئے۔

4۔ نسائی باب **"الحکم فی المرتدیة"** میں یہ روایت لائے ہیں:

❑ **عن ابن عمران عثمان قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لایحل دم امری مسلم الاباحدیٰ ثلاث: رجلٌ زنی بعد احصانه فعلیه رجمٌ او قتل عمداً فعلیه القود اوارتد بعد اسلامه فعلیه القتل.**

(سنن نسائی ص103، حدیث نمبر 4057)

ترجمہ: یعنی مسلمان کا خون تین صورتوں میں جائز ہے۔اول یہ کہ کوئی مسلمان احصان کے بعد زنا کرے، اسے سنگسار کیا جائے یا قتل عمد کا مرتکب ہو، اس سے قصاص لیا جائے یا مرتد ہو جائے، اسے قتل کیا جائے۔

نسائی کی دو ر روایتوں میں ان خصائل ثلاثہ کی تفصیل یوں ہے:

الف۔ **زنا بعد احصان. کفر بعد اسلام قتل.**

ب۔ **کفر بعد اسلام. زنا بعد احصان. قتل.**

5۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کا قتل جائز نہیں مگر تین قسم کے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

❑ **النفس بالنفس والثیب الزانی والمفارق من الدین التارک للجماعة.**

(بخاری:**6878**)

یہ روایت ابوداؤد، ترمذیؔ اور سنن دارمی میں بھی موجود ہے۔

6۔ نسائی کی ایک روایت میں ان تین قسم کے لوگوں کی تفصیل یہ ہے۔

التارک للاسلام مفارق الجماعة والثیب الزانی والنفس بالنفس.

(سنن نسائی:**4021**)

7۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یمن کے عامل تھے۔ بعدازاں حضرت معاذؓ وہاں پہنچے، اس وقت ایک شخص گرفتار ہوکر آیا۔ حضرت معاذؓ نے اس کی نسبت پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ پہلے یہودی تھا، پھر اسلام لے آیا، مگر بعدازاں پھر یہودیت کے حلقے میں داخل ہوگیا۔ حضرت معاذؓ سے کہا گیا ہے کہ آپ بیٹھیے، آپ نے فرمایا:

❑ **لااجلس حتیٰ یقتل قضاء اللّٰہ و رسولہ ثلاث مرات فامر بہ فقتل.**

(بخاری:**6923**)

ترجمہ: میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا جب تک کہ اسے قتل نہ کرلوں، خدا اور رسول کا یہی حکم ہے۔ یہ تین مرتبہ فرمایا چنانچہ مرتد یہودی کو قتل کیا گیا۔

یہ حدیث بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی میں موجود ہے۔ صاحب منتقی الاخبار کے قول کے مطابق امام احمدؒ کی ایک روایت میں یوں ہے:

❑ **قضی اللّٰہ و رسولہ ان من رجع عن دینہ فاقتلوہ.** (مسند احمد:**22016**)

8۔ ابوداؤد میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی ایک روایت ہے کہ:

❑ **قدم علی معاذ و انا بالیمن ورجلٌ کان یھودیا فاسلم فارتد عن الاسلام فلما قدم معاذ قال لا انزل عن دابتی حتی یقتل فقتل.** (سنن ابی داؤد:**4355**)

ترجمہ: میں یمن میں تھا کہ معاذ وہاں پہنچے۔ ایک یہودی مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو گیا تھا۔ معاذ وہاں پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ میں سواری سے نہیں اتروں گا جب تک کہ مرتد کو قتل نہ کرا لوں، چنانچہ اسے قتل کیا گیا۔

9۔ معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف گورنر بنا کر بھیجتے وقت رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا:

❑ **ایما رجل ارتد عن الاسلام فادعه فان عاد والا فاضرب عنقه وایما امراة ارتدت عن الاسلام فادعها فان عادت والافاضرب عنقها**(فتح الباری:ص272)

ترجمہ: جو شخص مرتد ہو جائے اسے اسلام کی طرف بلانا، اگر وہ توبہ کر لے تو توبہ قبول کر لینا ورنہ گردن مار دینا اور اگر کوئی عورت مرتد ہو جائے تو اسے بھی اسلام کی طرف بلانا، اگر توبہ کر لے تو فبہا۔ ورنہ اس کی بھی گردن مار دینا۔

یہ حدیث فتح الباری شرح صحیح بخاری (حافظ ابن حجر عسقلانیؒ) اور ''نیل الاوطار فی اسرار منتقی الاخبار'' (قاضی محمد بن علی الشوکانی) معجم طبرانی اور زرقانی میں موجود ہے۔ قاضی شوکانی ''نیل الاوطار'' میں قتل مرتدہ کے اختلاف پر بحث کرتے ہوئے اس حدیث کو درج کر کے فرماتے ہیں۔**هو نص فی موضع النزاع فیجب المصیر الیه.**

10۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے پاس ایک مرتد لایا گیا۔ آپ بیس رات تک یا اس کے قریب قریب اسے اسلام کی طرف بلاتے رہے۔ حضرت معاذؓ پہنچے تو آپ نے بھی اسے اسلام کی طرف بلایا۔ انکار پر اس کی گردن ماردی گئی۔ (ابوداؤد)

یہ روایت دوسرے سلسلے سے بھی درج ہے لیکن اس میں استتابہ کا ذکر نہیں۔

11۔ **اذا ابق العبد الی الشرک فقد حل دمه.** (ابوداؤد:4360)

12۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانہ مبارک میں ام قرفہ نامی ایک عورت بوجہ ارتداد قتل کی گئی۔ (نیل الاوطار، عینی شرح بخاری و فتح الباری)

13۔ حضرت عمرؓ کے پاس بنی ثور کی طرف سے ایک آدمی آیا۔ حالات پوچھے تو معلوم ہوا کہ ایک مرتد کو قتل کیا گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا تم نے اسے تین روز کی مہلت دی تھی اور اس سے توبہ کرانے کی کوشش کی تھی؟ (یہ اثر کئی کتابوں میں مذکور ہے مثلاً موطا امام مالک اور موطا امام محمد میں)

14۔ **من کفر بعد ایمانه طائعاً فانه یقتل** (کنز العمال: **1470** بحوالہ بیہقی عن عثمانؓ)

15۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک مرتبہ اہل عراق میں سے ایک مرتد جماعت کو گرفتار کیا تھا۔ سزا کے مشورے کے لیے حضرت عثمانؓ کو لکھا تو ارشاد ہوا:

❑ **اعرض علیهم دین الحق. و شهادة ان لا اله الا اللّٰه فان قبلوها فخل عنهم وان لم یقبلوها فاقتلهم.** (کنز العمال: **1469**)

ان پر اسلام پیش کرو۔ اگر قبول کرلیں تو چھوڑ دو، ورنہ قتل کر ڈالو۔ (کنز العمال)

16۔ حضرت محمد بن ابوبکر نے ایک مرتبہ چند مقدمات، ابتدائی تحقیقات کے آخری حکم کے لیے حضرت علیؓ کے ملاحظہ میں پیش کیے۔ ان میں دو زندیقوں کا معاملہ بھی تھا۔ حضرت علی نے فرمایا:

❑ **أما اللذان تزندقا فان تابا و الا فاضرب اعناقهما.** (مصنف عبدالرزاق: **15668**)

ترجمہ: یعنی جن لوگوں نے زنادقہ اختیار کرلیا ہے اگر وہ توبہ کرلیں تو فبہا ورنہ ان کی گردنیں مار دو۔ (مصنف عبدالرزاق، عن قابوس بن المخارق)

17۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں زنادقہ کے احراق کے واقعہ کی تفصیل پیش کی ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ لوگ ایک گروہ کو حضرت علیؓ کے پاس لائے جو آپ کو خدا سمجھتا تھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں تمہاری طرح کھاتا ہوں، تمہاری طرح پیتا ہوں، تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ پھر ان سے کہا کہ توبہ کرو، لیکن وہ انکار کرتے رہے۔ آخر کار حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں بہت برے طریقے سے قتل کردوں گا۔ وہ اس پر بھی انکار کرتے رہے۔ حضرت علیؓ نے خندق کھدوائی، اس میں لکڑیاں بھروادیں اور آگ سلگادی، پھر زنادقہ سے کہا کہ اگر تم باز نہ آئے تو تمہیں اس الاؤ میں ڈال دوں گا وہ پھر بھی اپنے کفر پر جمے رہے۔ انجام کار حضرت علیؓ نے انہیں آگ میں ڈلوادیا اور وہ جل گئے۔ حضرت نے فرمایا:

❑ **انی اذا رایت امرا منکرا. اوقدت نار و دعوت قنبرا.** (فتح الباری: ص **270**)

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس کے اسناد صحیح ہیں۔ قاضی شوکانیؒ نے بھی ''نیل الاوطار'' میں اسے درج کیا ہے۔

18۔ خلفائے راشدینؓ کے ساتھ ساتھ اس بزرگ کے ارشاد کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس کے قلیل سے عہد حکومت کو خلافت علیٰ منہاج النبوت کے ساتھ ایسی گہری وابستگی

ہے کہ گویا وہ اسی کا ایک حصہ اور اسی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس سے میری مراد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں۔ موطا امام مالک میں ہے:

❑ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابوسہیل بن مالکؒ سے قدریہ کے باب میں رائے پوچھی۔ ابوسہیل نے کہا کہ ان سے توبہ کرائی جائے۔ اگر وہ نہ مانیں تو انہیں قتل کردیا جائے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ میری بھی یہی رائے ہے۔ (مصفٰی شرح موطا جلد ثانی)

ائمہ ربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا فیصلہ معلوم کرنے کے لیے شیخ عبدالوہاب شعرانی کی کتاب المیزان اٹھا لیجیے۔ شیخ موصوف فرماتے ہیں کہ قتل مرتد کے بارے میں تمام ائمہ متفق ہیں۔ یعنی نفس قتل میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ البتہ مرتدہ کی نسبت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اسے قید رکھا جائے، قتل نہ کیا جائے۔ (ان کے نزدیک اس کی علت رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ عورتوں کو قتل نہ کیا جائے لیکن باقی ائمہ ''**من بدل دینه**'' کی عمومیت کے پیش نظر مرتد اور مرتدہ دونوں کو واجب القتل سمجھتے ہیں اور اس کی تائید میں حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میمنت مہد کا وہ واقعہ پیش کیا جاتا ہے جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ (یعنی ام قرفہ کا قتل) مہلت کے باب میں بھی اختلاف ہے۔ امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تین روز کی مہلت مستحب ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ وجوب مہلت کے قائل ہیں۔ امام احمدؒ سے دونوں قسم کی روایتیں منقول ہیں لیکن آخری فیصلہ سب کا یہی ہے کہ مرتد اگر توبہ نہ کرے تو اسے قتل کردیا جائے۔ ''**رحمة الأمة فی اختلاف الائمة**'' کے مصنف بھی یہی فرماتے ہیں کہ ''**اتفقوا الائمه علیٰ أن من ارتد عن الاسلام وجب علیه القتل**''۔

''**فتح الباری**''، ''**سبل السلام**'' اور ''**نیل الاوطار**'' میں اختلافات کے متعلق تفصیلی بحثیں موجود ہیں۔ میں یہاں انہیں بالاستیعاب درج کرنے سے قاصر ہوں۔ بغرض توثیق مزید میں ائمہ اربعہ کے مذاہب کی کتابوں سے ایک ایک دو دو قول یہاں نقل کرتا ہوں۔

1۔ فقہ حنفیہ کی مشہور و متداول کتاب کنز الدقائق'' ملاحظہ فرمائیے:

❑ **یعرض الاسلام علی المرتد وتکشف شبهته ویحبس ثلاثة ایام فان اسلم والا قتل. ولا تقتل المرتدة بل تحبس حتی تسلم.**

(کنز الدقائق۔ باب المرتدین ص213)

ترجمہ: مرتد پر اسلام پیش کیا جائے۔اس کا شبہ دفع کیا جائے، اگر وہ اسلام قبول کر لے تو فبہا ورنہ قتل کر دیا جائے۔ مرتدہ کو قتل نہ کیا جائے بلکہ اسے قید رکھا جائے، یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کر لے۔

علاوہ بریں ہدایہ، مختصر وقایہ، درمختار، ردالمحتار، عالمگیری وغیرہ کتب شہیرہ احناف سب اس امر پر متفق ہیں۔

2۔ اسی کے ساتھ امام محمدؒ کی جامع صغیر کی مندرجہ ذیل عبارت پڑھ لیجیے

❑ **ویعرض علی المرتد حراً أو عبدا الأسلام فان ابی قتل ویجبر المرتدة علی الاسلام و لاتقتل حرة أو امة.** (الجامع الصغیر وشرحہ النافع الکبیر ص 306)

ترجمہ: مرتد آزاد ہو یا غلام اس پر اسلام پیش کیا جائے۔ اگر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کرے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ مرتدہ کو اسلام پر مجبور کیا جائے مگر قتل نہ کیا جائے، خواہ وہ آزاد ہو یا لونڈی ہو۔

3۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ زنادقہ وغیرہ کا زنادقہ ظاہر ہو جائے تو انہیں قتل کر دیا جائے اور توبہ نہ کرائی جائے۔ اس لیے کہ ان کی توبہ کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ لوگ دل میں کافر رہتے ہیں اور زبان سے اسلام کا اظہار کر دیتے ہیں۔

❑ **واما من خرج من الاسلام الی غیرہ واظھر ذالک فانه یستتاب فان تاب والاقتل.** (مؤطا امام مالک: ص 1065 حدیث نمبر 2727)

ترجمہ: جو شخص اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لے اس سے توبہ طلب کی جائے اگر توبہ کر لے تو فبہا ورنہ قتل کر دیا جائے۔

4۔ **قال الشافعی و من ارتد عن الاسلام الی ای کفر کان مولودا علی الاسلام او اسلم ثم ارتد قتل.** (مختصر المزنی ص، 367)

ترجمہ: امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اسلام سے مرتد ہو جائے۔ خواہ پیدائشی حیثیت سے مسلمان ہو یا دوسرے مذہب سے اسلام میں داخل ہوا ہو، اسے قتل کر دیا جائے۔

5۔ **ویقتل مریض المرتد عن الاسلام والعبد والامة والمکاتب وأم الولد**

والشیخ الفانی اذا کانوا یعقلون ولم یتوبوا. (کتاب الام للشافعی: ص172، جز6)

ترجمہ: یعنی مرتد خواہ مریض ہو یا غلام یا لونڈی یا مکاتب، یا ام ولد یا شیخ فانی اور بصحت ہوش و حواس ارتداد اختیار کر لے اور توبہ نہ کرے تو اسے قتل کر دیا جائے۔

6۔ **ولا یترک بحال حتی یسلم او یقتل.** (کتاب الام للشافعی: ص169، جز6)

ترجمہ: مرتد کو علیٰ حالہ نہ چھوڑا جائے یا تو اسلام قبول کرے یا اسے قتل کر دیا جائے۔

7۔ فقہ حنبلی کی مشہور کتاب "المقنع" مولفہ عبداللہ ابن قدامہ (جزء ثانی) میں ہے:

❑ **ومن ارتد عن الاسلام من الرجال والنساء وھو بالغ عاقل دعی الیہ ثلاثۃ ایام وضیق علیہ فان لم یتب قتل و عنہ لاتجب استتابۃ بل تستحب و یجوز قتلہ فی الحال.** (المبدع فی شرح المقنع: ص482، جز7)

ترجمہ: جو شخص اسلام سے مرتد ہو جائے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور عاقل و بالغ ہو تو اسے تین روز تک اسلام کی طرف بلایا جائے اور اسے تنگ کیا جائے اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے، توبہ طلب کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے اور مرتد کو معاً قتل کر ڈالنا بھی جائز ہے۔

مشہور علماء کے فیصلے بھی بالتفصیل درج کرنے کے قابل ہیں لیکن افسوس کہ نہ تو میرے پیش نظر اتنی گنجائش ہے اور نہ تمام کتب و اسفار امت کی طرف رجوع کرنے کی فرصت ہے۔ لہٰذا میں یہاں صرف چند اقوال اور حوالوں پر اکتفا کروں گا:

-1 **قال ابن دقیق العید الردۃ سبب لأباحۃ دم المسلم بالاجماع.**

(فتح الباری: ص202، جز12)

-2 **قال النووی یجب قتلہ ان لم یرجع الی الاسلام.**

(فتح الباری: ص202، جز12)

امام نوویؒ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر کوئی مرتد پیاس سے مر رہا ہو اور کسی شخص کے پاس طہارت کی ضرورت کے لیے پانی موجود ہو تو یہ جائز نہیں کہ وہ پانی مرتد کو پلا دے اور خود تیمّم کرے۔ اگر ایسی حالت میں کوئی ذمی یعنی ہندو یا عیسائی وغیرہ یا جانور ہو تو اسے پانی پلا دینا واجب ہے اور ایسے وقت میں پانی سے وضو جائز نہیں۔ (ملاحظہ ہو شرح صحیح مسلم)

-3 **وقد اجمع العلماء علی قتل الرجل المرتد اذا لم یرجع الی الاسلام**

واصر علی الکفر. (عمدۃ القاری شرح بخاری: ص 41، جز 24)

4- شیخ الاسلام حضرت امام ابن تیمیہؒ نے فتاویٰ کی چوتھی جلد میں بسط و تفصیل کے ساتھ ارتداد یا خروج عن الاسلام کی صورتوں پر بحث کی ہے۔فرمایا ہے کہ ایسے اشخاص کے ساتھ باتفاق ائمہ مسلمین قتال واجب ہے۔علاوہ بریں ان کی مشہور تصنیفات مثلاً ''**الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول**'' اور منہاج السنہ وغیرہ میں صاف صاف قتل مرتد کے وجوب کی صراحت ہے۔

5- شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ایک قول بحوالہ مستویٰ شرح موطا اوپر گزر چکا ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں آپ نے ''**من بدل دینه**'' کے ارشاد نبوی ﷺ کو اصل قرار دے کر قتل مرتد کی تائید فرمائی ہے اور ذیلاً اس کی حکمت و مصلحت بھی بیان کر دی ہے۔**وھو ھذا:**

ومرضی اللّٰہ تعالیٰ ان تجعل الملة السماویة بمنزلة الامر المجبول علیه الذی لاینفک عنه. (حجۃ اللہ البالغۃ: ص 255، جز 2)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ ملت سماویہ یعنی اسلام کائنات انسانیت میں ایک جبلی اور فطری حیثیت اختیار کرے اور اس سے انفکاک و علیحدگی کا خیال تک بھی دل میں موجود نہ رہے۔

میں نے بر سبیل ایجاز جو چند حوالہ جات قارئین کرام کے سامنے پیش کیے ہیں، ان کی روشنی میں ارباب نظر کے لیے مسئلہ زیر بحث کا ہر پہلو واضح ہو گیا ہوگا اور ان نیک نیت لوگوں کو جن کا مقصد کسی بحث میں پڑنے سے سخن پرورانہ ضد نہیں بلکہ احقاقِ حق ہوتا ہے، ان تمام تصریحات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مرتد کے واجب القتل ہونے پر رازداران دین مبین اور علمبرداران شرع متین یکسر متفق ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ ساڑھے تیرہ سو سال کی مدت میں عالم اسلام کے ایک فرد نے بھی قتل مرتد سے انکار نہیں کیا اور اس پر امت کا ایسا اجماع ہے کہ شاید بہت کم مسائل میں ایسے اجماع کامل کے نظائر پیش کیے جا سکتے ہیں۔پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا حضور سرور کون و مکاں ﷺ کو جن پر قرآن اترا، ان آیات ربانی کے معانی معلوم نہ تھے، جن کی بناء پر حضور ﷺ نے دین سے برگشتہ ہو جانے والے کے واسطے ضرب عنق کی سزا تجویز فرمائی؟ کیا خلفائے راشدینؓ، ائمہ اربعہؒ، محدثین کرامؒ اور علمائے کبارؒ سب کے سب غلطی پر تھے جنہوں نے اس فیصلہ نبوی ﷺ کے آگے سر جھکا دیا اور برابر اس پر عمل کرتے رہے؟ کیا قرآن کے اشارات کی تفسیر اور حدیث کی تصریحات کی تاویل کا حق جس کے مطالبہ کے شور سے دہلی و لاہور کی فضا متلاطم ہو رہی

ہے، صرف مقدسین قادیان اور ان کے خوشہ چینوں ہی کے لیے وقف ہو چکا ہے؟

بات یہ ہے کہ جن بزرگواروں کا خمیر مایہ خاک قادیان سے اٹھایا گیا ہے، وہ تہیہ کر چکے ہیں کہ کلام مجید کی تعلیمات کے اس حصے کو جو جہاد سے تعلق رکھتا ہے یعنی جس کے اندر مسلمانوں کی بقا کا راز چھپا ہوا ہے، دنیا سے مٹا دیں گے یا کم از کم اساطیر الاولین بنا دیں گے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی دو شانیں ہیں جلالی اور جمالی۔ اسلام کا دور اول جس میں اسے اپنی حفاظت کے لیے تلوار بے نیام کرنی پڑی، شان جلالی کا مظہر تھا۔ یورپ کی تہذیب نے اسلام کو آزادی تبلیغ کا آسمانی حق بخش کر تلوار کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا اور قادیان میں ''اسمہ احمد'' کے بروزی مصداق کے ظاہر ہوتے ہی محمدی دور جلالی ختم اور ''احمدی'' دور جمالی شروع ہو گیا جس میں ''سلطان القلم'' کے شاگرد شمشیر کا کام خامہ سے لیں گے۔ اپنے زور منطق سے مسلمانان عالم کو اول نصاریٰ کا حلقہ بگوش بنائیں گے۔ آزاد اسلامی ممالک میں جہاد کے خلاف پروپیگنڈا کر کے وہاں کے باشندوں کی حیات عسکری کو ایسا پامال کریں گے کہ مسیحی طاقتوں کے لیے ان پر قبضہ کر لینا آسان ہو جائے۔ پھر ان غلام مسلمانوں اور ان کے نصرانی آقاؤں کو امن وامان اور صلح و سلام والی ''احمدیت'' کی دعوت دے کر ایک نیا جہان بسائیں گے جس کا دینی مرکز اور شاید دنیوی پایہ تخت بھی قادیان ہوگا۔ قادیانیوں کو خوب معلوم ہے کہ ان کا یہ ملحدانہ عقیدہ صرف ان سرزمینوں میں نشوونما پا سکتا ہے جو صلیبی ریاستوں کے زیر نگیں ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر کسی آزاد اسلامی حکومت میں انہوں نے اس قسم کے ناپاک خیالات پھیلائے تو حضرت محمد ﷺ کی شان جلالی ان کا سر قلم کرنے کے لیے موجود ہوگی اور ان کا کوئی حمایتی انہیں بچا نہیں سکے گا۔

مرزا بشیر الدین محمود کو تو شاید اس نکتہ پر غور کرنے کی توفیق سرے سے بخشی ہی نہیں گئی کہ کسی شخص کا جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو، کسی اسلامی حکومت کے مزعومہ مظالم کے خلاف مسیحیوں کے دروازے پر جا کر آواز بلند کرنا عامہ مسلمین کے دل میں اس کی طرف سے ہمدردی کا کوئی جذبہ پیدا نہیں کر سکتا، خواہ وہ شخص حقیقت میں کیسا ہی مظلوم کیوں نہ ہو، لیکن لاہوری جماعت کے امیر فطرت انسانی کے پہچاننے میں زیادہ مہارت رکھتے ہیں۔ مرزا محمود کی طرح آپ نہ یورپ میں جا کر روتے پیٹتے ہیں نہ آپ نے مسیحی طاقتوں کو سنگسار شدہ قادیانیوں کا بدلہ لینے کے لیے افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کی دعوت دی ہے بلکہ ایک نئی قسم کا حربہ استعمال

کیاہے جس کے مہلک اثرات کی شہادت مولانا محمد علی (جوہر) کی نیم بسملی دے رہی ہے۔

مرتد کے واجب القتل ہونے کے باب میں اس وقت تک میں نے معترضین کے اس نقطہ نگاہ کو پیش نظر رکھا ہے کہ نفس ارتداد مستوجب تعزیر نہیں بلکہ صرف محاربہ کی صورت میں مرتد گردن زدنی ٹھہرتا ہے۔ میں اس دعوے کی تردید اب خود اُن لوگوں کے منہ سے کراتا ہوں جنہوں نے اس کی تائید میں تاویل وتحریف وتدلیس تک کو بطیّب خاطر گوارا کرلیا۔ قادیانی جماعت لاہور کے خیالات کا ترجمان اخبار ''پیغام صلح'' 15 اکتوبر 1924ء کی اشاعت میں رقمطراز ہے:

- ''اس جگہ ہم بہت بڑے مغالطہ کو بھی دور کردینا چاہتے ہیں جو دیوبندی مولوی اس فقرے سے کہ مرتد حربی ہوتا ہے، پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ابتدائے اسلام میں جبکہ کفار مسلمانوں کو کسی طرح زندہ نہ دیکھ سکتے تھے اور جب کبھی موقع ملتا، ہر طرح سے انہیں نیست ونابود کرنے کی کوششیں کرتے تھے اور مسلمان اور کفار کے مابین لڑائی اور جنگ چھڑی رہتی تھی۔ اس وقت کسی کا مرتد ہوجانا ہی گویا حکومت سے بغاوت کرنا تھا...... ابتدائے اسلام میں بے شک کسی مسلمان کا ارتداد اسے حربی بنا دینے کے لیے کافی تھا کیونکہ زمانے اور ملک کے حالات اس کے متقاضی تھے۔ لیکن آج یہ صورت نہیں''۔

یہ اُسی قادیانی جماعت کے پانچ مہینے پہلے کے الفاظ ہیں جس کا امیر آج اس بات کے ثابت کرنے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا رہا ہے کہ قرآن وحدیث سے حربی ہونے کے سوا اور کسی صورت میں قتل مرتد کے جواز کا پہلو کہیں بھی نہیں نکلتا۔ ایسے لوگوں سے کوئی کیا بحث کرسکتا ہے جو کل تک تو یہ کہتے رہے ہوں کہ ابتدائے اسلام میں کسی کا مرتد ہوجانا ہی گویا حکومت سے بغاوت کرنا تھا'' اور اس طور پر حدیث ''**من بدل دينه فاقتلوه**'' کے کھلے ہوئے الفاظ کو تاویل کی ضرورت سے بے نیاز سمجھتے رہے ہوں۔ لیکن آج یہ بلند آہنگ دعوے کرتے سنے جاتے ہیں کہ اس حدیث کی صحت ہی مشکوک ہے۔ اسلام میں نفس ارتداد کبھی بھی مستوجب قتل نہیں ہوا۔ بہرحال لاہور والی قادیانی جماعت کم از کم اتنا تو اپنے منہ سے تسلیم کررہی ہے کہ بعض اوقات ایسے حالات و واقعات رونما ہوجایا کرتے ہیں کہ نفس ارتداد ہی مرتد کو حربی بنا دیتا ہے، خواہ وہ میدان محاربہ میں اُترے یا نہ اُترے۔ ع

عمرش دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

یہی اعتراف ایک اور موقع پر قادیانی جماعت کے ایک دوسرے فرد نے ''ریویو آف ریلیجز'' میں کیا ہے۔اس مجلّہ کی فروری 25ء کی اشاعت میں ڈاکٹر زویمر کی کتاب ''اسلام کا قانون ارتداد'' پر تبصرہ کرتے ہوئے دین محمد ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ احادیث میں قتل مرتد کے متعلق جو تصریحات ملتی ہیں، انہیں معرض غور میں لانے سے پہلے ابتدائے اسلام کی حالت سامنے رکھ لینی چاہیے۔ابتدا میں کفار مسلمانوں پر بے حد ظلم کررہے تھے۔ہجرت کے بعد مسلمانوں نے مدینہ میں یہود نصاریٰ اور بت پرستوں کو ساتھ ملا کر ایک مشترک جمہوری حکومت قائم کی لیکن کفار مکہ کے جور و ظلم نے انہیں وہاں بھی چین نہ لینے دیا۔یہود اگر چہ بظاہر ضرورتاً مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کر چکے تھے مگر باطن میں ان سے سخت بغض وعناد رکھتے تھے۔کفار نے جب مسلمانوں پر چڑھائی کی تو یہود نے اتحاد کی تمام مقتضیات کو پس پشت ڈال کر مسلمانوں سے غداری کی اور آمادۂ فتنہ وفساد ہو گئے۔ یہ مسلمانوں کے لیے بے اندازہ مصائب کا زمانہ تھا۔ مدینہ سے باہر کفار ان کے استیصال کی تیاریاں کررہے تھے اور مدینہ کے اندر فتنہ انگیز یہود کی آگ بھڑک رہی تھی۔

- ''ایسی صورت میں پیغمبر صلعم کے واسطے مومنین کی مختصر سی جماعت کی حفاظت کے لیے کیا چارہ کار ہوسکتا تھا جو اپنے عقیدے اور اصول کے مطابق خدائے بزرگ و برتر کی بلاتعرض عبادت گزاری کے لیے حصول مہلت و فرصت کی ناکام کوششیں کر چکی تھی۔ مجبوراً مارشل لا کا اعلان کر دیا گیا اور مرتدین کے ساتھ اسلامی فوج سے علیحدگی اختیار کرنے والوں کا سا سلوک ہونے لگا''۔

اس عبارت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی اسلامی سلطنت پر ایسی حالت طاری ہو جائے جیسی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانے میں مسلمانوں پر طاری تھی۔یعنی سلطنت ہر طرف سے دشمنوں کے نرغے میں ہو، اعدا اسے مٹانے کی تدبیروں میں مصروف ہوں، ملک کے اندر ایک دشمن دین جماعت حفظ ودفاع کے سب سے بڑے ذریعہ یعنی جہاد کی جڑ پر ضرب لگا رہی ہو۔ایک دوسرا احمق گروہ اغیار کی عیارانہ دراندازیوں سے متاثر ہو کر راہ بغی وطغیان اختیار کر چکا ہو، غرض سلطنت کے اندر اور باہر خطرے ہی خطرے اور فتنے ہی فتنے موجود ہوں تو اس صورت میں ہر مرتد نفس ارتداد ہی کی وجہ سے حربی بن جاتا ہے۔افغانستان آج کل اسی پر آشوب دور میں سے گزر رہا ہے اور اسی لیے اس کا فعل سنگساری محل اعتراض نہیں ٹھہر سکتا۔

اس حقیقت سے آشنا ہونے کے لیے کچھ ایسی بہت بڑی حکیمانہ ژرف نگاہی کی ضرورت نہیں کہ افغانستان کی زندگی کا راز صرف اس کی انتہائی اسلامیت میں مضمر ہے۔ ایک شرذمۂ قلیل سے اگر قطع نظر کیا جائے تو اس کے تمام باشندے ایک مسلک رکھتے ہیں اور جذبہ جہاد جو اسلام کا نچوڑ ہے، ان کی کوہستانی فطرت کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ لاکھوں توپیں اور طیارے ایک طرف اور خدا اور رسول کے رستے میں ان کا والہانہ شوق سرفروشی ایک طرف۔ جبھی تو ایک چھوٹی سی قوم جو تعداد میں بمشکل ایک کروڑ کے کچھ ہی اوپر ہوگی، دنیا کی دوز بردست ترین طاقتوں کے مقابلہ میں آج تک اپنی آزادانہ ہستی برقرار رکھ سکی ہے اور اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ اگر قادیانیوں کو افغانستان میں اپنے مجنونانہ عقائد کے نشر و تبلیغ کی بے روک ٹوک اجازت دے دی جائے اور وہ ہر پٹھان کو جہاد سے متنفر کرنے اور نصرانیت کا کاسہ لیس بنانے کے لیے شتر بے مہار کی طرح کھلے چھوڑ دیے جائیں تو اسلام کے پاؤں کابل سے دو ہی دن میں اکھڑ جائیں۔ حکومت افغانستان انہیں یہ اجازت دیتی نہیں، وہ اپنے خبط سے باز آتے نہیں، حکومت بدرجہ مجبوری انہیں سنگسار کر دیتی ہے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو، اس پر قادیان سے نوحہ ماتم بلند ہوتا ہے۔ لاہور اس نوحہ کی صدائے بازگشت بن جاتا ہے اور دہلی میں بھی اس کی گونج سنائی دینے لگتی ہے۔

بعض حضرت از راہ استعجاب دریافت کریں گے کہ آیا واقع میں قادیانی ایسے سرپھرے ہیں کہ کابل میں بیٹھ کر جہاد کی مخالفت کرتے ہیں اور اس طور پر قرآن حکیم کی اُن آیات کو جھٹلاتے ہیں جن میں مسلمانوں کو حفاظت اسلام کے لیے کفار کے ساتھ قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ ان حضرات کی توجہ مسٹر جی ایف ملک مبلغ قادیان متعینہ لندن کے ایک بیان کی طرف منعطف کی جاتی ہے جو اخبار ''مانچسٹر گارڈین'' کی **27** فروری **1925**ء کی اشاعت میں میری نظر سے گزرا ہے اور جس کا مفاد حسب ذیل ہے:

- ''ہم احمدی اسلام کی اس ابتدائی تعلیم کے پابند ہیں جو بالکل خالص اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک تھی۔ ہم کامل مذہبی رواداری کے حامی ہیں۔ ہمارے نزدیک اسلام نے جہاد کی تعلیم نہیں دی، اسی لیے ہم اس کے مخالف ہیں۔ افغانستان میں جو کئی سال سے ہم پر ظلم ہو رہا ہے، اس کی وجہ محض ہمارا یہی عقیدہ ہے۔ امیر افغانستان کو انگریزوں یا روسیوں سے لڑنے اور اس جنگ میں اپنے حریفوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنی رعایا کے جذبۂ جہاد پر بھروسا کرنا پڑتا ہے۔

ہم جہاد کی تعلیم ہی کو باطل سمجھتے ہیں اس لیے ہمیں ستایا اور ہمارے آدمیوں کو سنگسار کیا جاتا ہے‘‘۔

حکومت کابل کے طرز عمل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ادلّہ و براہین کے دفتر کے دفتر بھی اگر پیش کیے جاتے تو اس قدر وزنی نہ ہو سکتے جتنا قادیان کے لندنی نمائندہ کا یہ مختصر سا بیان ہے۔ ناظرین خود انصاف کر سکتے ہیں کہ جو قوم ایک آزاد اسلامی سلطنت کو اس کی سب سے بڑی قوت یعنی جذبۂ جہاد فی سبیل اللہ سے محروم کر دینا اپنا وظیفہ حیات سمجھتی ہو، جس کے نزدیک قرآن کا وہ حصہ جس میں مسلمانوں کو جہاد کا حکم دیا گیا ہے، ایک تقویم پارینہ کا حکم رکھتا ہو، جو اپنے اس ناپاک عقیدے کو اپنے دل کے کسی گوشے تک ہی محدود نہ رکھتی ہو، بلکہ ایک شجاع اور دلیر اور باغیرت اور باحمیت اسلامی آبادی میں کھلے بندوں اس کی تلقین کر کے اسے بھی اپنی طرح مخنث بنا لینے کے حق کا مطالبہ کرتی ہو، اگر ایسی مفسدہ پرداز قوم کے دو چار شریر النفس افراد کے کاسہ سر کی تواضع اسلام کا سیاسی ہاتھ چند پارہ ہائے سنگ سے کر دیتا ہے تو کیا برا کرتا ہے اور اس میں مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی اور محمد علی لاہوری قادیانی اور ان کے ہندوستانی ہم خیالوں کا بگڑنا کہاں تک حق بجانب ہے؟

حکومت افغانستان نے قادیانیوں کے متعلق جو روش اختیار کی ہے، اس کی ایک اور حیثیت بھی ہے جس کے چہرے پر آج تک بعض مصلحتوں کا پردہ پڑا رہا ہے۔ ہر شخص کو معلوم ہے کہ قادیانی ہر اسلامی طاقت کے اشد شدید دشمن اور انگریزوں کے زبردست حامی ہیں۔ افغانوں کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے خلاف قادیانیوں کو اپنے آقا و مولا مرزا قادیانی کے وقت ہی سے ایک وجہ شکایت چلی آتی ہے۔ قادیانی اگر رات دن افغانستان کی تباہی و بربادی کے لیے دست بدعا رہتے ہیں اور اس دارالاسلام میں اپنے نصرانی خداوندان ولی نعمت کی عسکری مداخلت کے خواب دیکھا کرتے ہیں تو اس کی وجہ صاف یہ ہے کہ حکومت کابل آئے دن سختی کے ساتھ ان کے اعمال کا جائزہ لیتی رہتی ہے لیکن ترکوں، عربوں اور ایرانیوں نے تو ان کا کوئی گناہ نہیں کیا تھا اور انہیں کوئی دکھ نہیں دیا تھا۔ تاہم گزشتہ سات آٹھ سال کے جاں فرسا مصائب میں قادیانیوں نے ان کے ساتھ جس ’’دینی موالات‘‘ اور ’’اسلامی مواخات‘‘ کا برتاؤ کیا، وہ سب پر روشن ہے۔ سقوط بغداد کی خبر ہندوستان میں آتی ہے تو اسلامی حلقوں میں کہرام مچ جاتا ہے اور مسلمان خون کے آنسو روتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں لیکن قادیانیوں کے گھر میں گھی کے چراغ جلتے ہیں اور

مرزا بشیر الدین محمود کا صحیفہ ''الفضل''، مسلمانوں کے زخموں پر یہ کہہ کر نمک چھڑکتا ہے کہ ''ترک سور سے بھی بدتر ہیں۔ اچھا ہوا جو ان کی حکومت عراق سے اٹھ گئی اور یونین جیک بغداد پر لہرانے لگ گیا۔'' کیا ترکوں نے بھی کسی قادیانی کو سنگسار کیا تھا کہ قادیان کو اپنے اخلاق فاضلہ کی اس نمائش کی ضرورت محسوس ہوئی؟ حقیقت یہ ہے کہ قادیانیوں کا مقصد ہی یہ ہے کہ دنیا کی ہر اسلامی حکومت نیست و نابود ہو جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ انواع و اقسام کی سازشیں کرتے رہے ہیں۔

نعمت اللہ قادیانی کی سنگساری کے سلسلے میں بعض ایسے امور منکشف ہوئے تھے جن سے اس قسم کی سازشوں کے شبہ کو تقویت پہنچی ہے اور حال میں جو قادیانی مارے گئے ہیں، ان کے متعلق بھی غیر ملکی اشخاص کے ساتھ خط و کتابت کرنے کی اطلاع شائع ہو چکی ہے، اگرچہ اس وقت تک بیرونی دنیا کو اس خط و کتابت کی نوعیت کا علم نہیں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ارتداد کے علاوہ بھی قتل کی کوئی مؤثر وجوہ ہیں تو حکومت افغانستان انہیں ظاہر کیوں نہیں کرتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بہت ممکن ہے کہ حکومت کے موجودہ مصالح اس راز کے اخفا کے متقاضی ہوں اور ان کے افشا سے گردوپیش کی حکومتوں کے ظاہری حلیفانہ تعلقات میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔ اس نکتہ پر ذرا غور کیا جائے تو قتل کے خالص سیاسی پہلو کو پوشیدہ رکھنے کے کافی وشافی وجوہ معلوم ہو سکتے ہیں۔

قتل مرتد کے حکم و مصالح کا باب بہت وسیع ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شریعت کی تصریحات پیش کر دینے کے بعد اس پہلو پر بسط و تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم ایک نکتہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ اسلام کی بنائے قومیت مذہب ہے۔ دوسری اقوام کی طرح نسل، رنگ، زبان اور وطن اس کی قومیت کے اجزائے عاقدہ نہیں ہیں بلکہ ملت اسلامیہ اُن افراد کے مجموعہ کا نام ہے جن کے دماغ پر چند خاص وضع کے مذہبی تصورات کا گہرا نقش بیٹھا ہوا ہو۔ اسلام میں یہی تصورات نسل و رنگ اور وطن و زبان کے قائم مقام بن کر افراد ملت میں ربط پیدا کرتے ہیں اور اتحاد، اتفاق، جمعیت اور یکجائی کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ انہیں تصورات میں جنہوں نے تصدیق کے بعد معتقدات کی شکل اختیار کر لی ہے، دنیائے اسلام کی زندگی کا راز چھپا ہوا ہے اور اگر یہ مٹ جائیں تو اسلام ایک بے معنی لفظ رہ جاتا ہے۔ ہر کس و ناکس کو آزادیٔ ضمیر کا غیر مشروط حق دے کر مذہب کے اصول و فروع میں قطع و برید کی اجازت

دے دی جائے تو ملت بیضا کا (خاکم بدہن) دو ہی دن میں جنازہ نکل جائے۔ جو لوگ آج غیر مشروط آزادی ضمیر کے دعوے زبان پر لا رہے ہیں، ان کے دل و دماغ میں افرنجیت کچھ ایسا گھر کر گئی ہے کہ خود اپنی روایات کے احترام کے لیے ان میں مطلق کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اُن (غلو کرنے والے) متفرنجین کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں گزر سکتی کہ اتحاد و اسلام کا جملہ جس سے کبھی کبھی وہ گرمی سخن اور آرائش گفتار کا کام لیا کرتے ہیں، اُن کی مغرب پرستی کے صدقے میں بے معنی ہوا جاتا ہے۔ نقارۂ آزادی ضمیر کی دوں دوں کی خاطر انہوں نے جو چوب مغرب سے مستعار لی ہے، اُس کی پیاپے ضربیں گوش حقیقت نیوش سے اُن لطیف نغموں کا احساس چھین رہی ہیں جو صرف سازِ اسلام ہی سے نکل سکتے ہیں۔ کاش خدائے بزرگ و برتر انہیں اسلام کے تصورِ قومیت سے آشنا ہونے کی توفیق مرحمت فرمائے تا کہ یورپ کے تباہ کن اثرات سے انہیں رُستکاری حاصل ہو سکے۔ پھر انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جس طرح تعزیرات ہند کی دفعہ (130)، (121) اور (124) (الف) ضروری ہیں، اسی طرح قتل مرتد ضروری ہے۔ علاوہ بریں جس غیر مشروط آزادئ ضمیر کے وہ مدعی ہیں، اس کی بناء پر بھی وہ حکومت افغانستان کے فعل سنگساری کو محل اعتراض قرار نہیں دے سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ **"لا اکراہ فی الدین"** کے مطابق کسی کے عقائد سے تعرض نہیں کرنا چاہیے، لیکن میں ان کی خدمت میں مودبانہ یہ عرض کرتا ہوں کہ جن لوگوں کی آزادئ ضمیر قتل مرتد کا فتویٰ دے رہی ہے، وہ اپنی آزادی کی نمائش کے لیے کہاں جائیں؟ اگر آزادئ ضمیر کا مطلب یہی ہے کہ ہر شخص جو چاہے کہے اور جو چاہے کر لے تو پھر افغانستان کے اُن لاکھوں باشندوں پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے جو تہہ دل سے قتل مرتد کے معتقد ہیں؟ کیا ان پر اعتراض ان کی آزادی ضمیر سے تعرض نہیں ہے؟ جو حضرات غیر مشروط آزادئ ضمیر کے حامی ہیں، کیا وہ از راہ نوازش اس سوال کا جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟

رہا یہ سوال کہ مرتد کو قتل کیا جائے یا سنگسار کیا جائے، سو میں سزاؤں کے فلسفے پر ابتدائے مضمون میں بحث کر چکا ہوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ قتل ایک جامع لفظ ہے جو جان لینے کی مختلف صورتوں کو شامل ہے۔ اگر کسی کو جلا دیا جائے تو وہ بھی قتل ہوگا، سولی پر لٹکا دیا جائے تو وہ بھی قتل ہوگا، تلوار سے مار دیا جائے تو وہ بھی قتل ہوگا لیکن احادیث و آیات پر غائر نظر ڈالنے سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ مرتد کو قتل کیا جائے۔ احادیث میں **"فاقتلوہ" فاضربوا عنقه** سے یہی

ثابت ہوتا ہے کہ مرتد کی گردن ایک آلہ جارحہ سے ماری جائے۔ آیۂ محاربہ میں "**ان یقتلوا او یصلبوا**" (المائدہ:33) علیحدہ علیحدہ سزاؤں کا موجود ہونا بھی اسی کا موید ہے۔ ایک روایت میں زانی قاتل اور مرتد کی سزائیں علی الترتیب رجم، قصاص اور قتل بیان کی گئی ہیں۔ ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مرتد کی گردن ماری جائے، اسے رجم نہ کیا جائے، لیکن یہ بہت معمولی سا معاملہ ہے اور مجھے امید ہے کہ حکومت اسلامیہ افغانستان اس معاملہ پر غور کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کرے گی۔

یہ سزائے ارتداد کی وہ صورت ہے جو کتاب وسنت سے مستفاد ہوتی ہے۔ بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ مرتد کے لیے قتل آخری اور انتہائی سزا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر حال میں یہی سزا دی جائے۔ مثلاً اگر اسلامی حکومت اور اسلامی ملت خطرات سے پاک ہو، دشمنوں کی سازشوں اور مخالفوں کی ریشہ دوانیوں کا چنداں اندیشہ نہ ہو یا اندرونی فتنہ انگیزی کی طرف سے کامل اطمینان ہو تو اس صورت میں امام وقت مرتد کو قتل کے سوا دوسری جسمانی عقوبتوں کے ذریعہ سے بھی اسلام لانے پر مجبور کر سکتا ہے لیکن اگر ارتداد خطرات وفتن کا سرچشمہ بن جائے تو اس صورت میں مرتد کو قتل کر ڈالا جائے۔ یہ ایک بالکل نئی رائے ہے اور گزشتہ تیرہ سو سال کے عرصہ میں اس قسم کی کوئی تفریق کسی عالم و امام نے نہیں کی لیکن چونکہ اس سے مسئلہ کی اصولی حیثیت پر کوئی زد نہیں پڑتی، اس لیے اسلامی حکومتیں اپنے مصالح وصوابدید کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے ماننے یا نہ ماننے میں آزاد ہیں۔

جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے، اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ قتل مرتد کے باب میں یہ قطعی اور آخری فیصلہ ہے۔ میرا مقصود یہ تھا کہ معترضین کے اعتراضات کی حقیقت اور شریعت کی تصریحات یکجا کر دیتا۔ وہ مقصد میں نے اپنی بساط کے مطابق پورا کر دیا۔ دینی علوم سے پوری واقفیت کا مجھے دعویٰ نہیں ہے، بہت ممکن ہے کہ کہیں غلطی یا لغزش بھی سرزد ہو گئی ہو۔ بہر حال ان تصریحات سے بہ ظاہر یہی متبادر ہوتا ہے کہ مرتد کو بلا سزائے قتل چھوڑنے کی کوئی صورت نہیں، ذاتی طور پر میرا عقیدہ یہی ہے کہ جن لوگوں کے پیش نظر ملک کا امن وامان، سوسائٹی کی استواری، قوم کی جمعیت اور شیرازۂ اسلام کی پیوستگی ہے، وہ اس سزا کے حق بجانب ہونے میں

ایک لحظہ کے لیے بھی شبہ نہیں کر سکتے۔ تاہم اگر موجودہ تحقیق کی بنا پر بہ دلائل ثابت کیا جاسکے کہ شریعت اسلام میں مرتد کے لیے کوئی سزا نہیں ہے تو مجھے یا کسی دوسرے طالب حق کو اس کے قبول کر لینے میں تامل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ مقصود شریعت کا صحیح صحیح اتباع ہے نہ کہ اپنے اوہام اور ہوا یا نتائج و مستنبطات پر اصرار۔ جو لوگ اپنے محض چند غیر محققانہ اور بودے دلائل کی بنا پر اس وقت قتل مرتد کے مخالف ہیں، اگر ان کی محققانہ رائے یہی تھی تو افسوس کہ اس کے پیش کرنے کی وہ صورت نہ تھی جو اُنہوں نے اختیار کی۔ اُنہیں یہ تو دیکھ لینا چاہیے تھا کہ امت اسلامیہ گزشتہ تیرہ سو سال کی مدت میں سزائے قتل مرتد پر متفق رہی ہے۔ فقہ حنفی میں بالتصریح مرتد کے لیے قتل کی سزا موجود ہے۔ افغانستان فقہ حنفی کا پابند ہے، خود ہندوستان کے تمام جلیل القدر علماء احناف اب تک اسی عقیدے کے پابند ہیں۔ افغانستان میں بھی عالم موجود ہیں اور گو ہمارے ''محققین متنورین'' کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت ہو یا نہ ہو، تاہم وہ بالکل جاہل نہیں ہیں۔ پھر حکومت افغانستان سے ہم نے کچھ سلسلہ موالات منقطع نہیں کر رکھا تھا اور ہم شرعاً مجبور نہ تھے کہ بات بات میں اس سے بیزاری کا اظہار کیا جائے۔ اگر بعض ''محققین'' کے نزدیک مرتد کے لیے سزائے قتل شرعاً ناجائز تھی تو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا کہ اس گروہ کی تائید میں حکومت افغانستان کی مخالفت کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا جو آج تک جمعیت اسلامیہ کے ہر فعل سے الگ رہا، کفر کی قوت بازو بننے کو اپنا سب سے بڑا اشرف سمجھتا رہا، حکومت افغانستان کی مخالفت میں زہر آلود مضامین شائع کراتا رہا اور اسلام کے ایک مسلمہ ضابطہ تعزیرات کے بدلنے کے لیے انگلستان، جمعیۃ الاقوام، ''سول'' اور مہاتما جی کی دہلیزوں پر ناک گھستا رہا۔ بہتر یہ تھا کہ خود دولت افغانستان کے محکمہ شرعی کے ساتھ اس بارے میں افہام و تفہیم کا سلسلہ جنبانی شروع کیا جاتا۔

سب سے آخر میں اُس ''اجتہاد'' کے خلاف آواز بلند کرتا ہوں جس کا سودا ہماری قوم کے ہر طبقے کے سر میں سمایا ہوا ہے۔ بلاشبہ اجتہاد کی ضرورت ہے اور زمانے کے حالات و تغیرات نے بعض معاملات پر از سر نو غور کرنا لازمی بنا دیا ہے لیکن اجتہاد کے لوازم و خصائص اور شروط و خصائل کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جمود سے ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ عام بے راہ روی شروع ہو جائے اور ہر شخص ''شافعیؒ'' اور ''ابوحنیفہؒ'' بن

بیٹھے۔ ہمارے پاس بہ حالت موجودہ کوئی ہیئت حاکمہ نہیں ہے جو ہر ''مجتہد'' کی اجتہاد طرازیوں کے تباہی خیز اثرات کا اندفاع کر سکے۔ اس لیے اس معاملہ میں ہمیں انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ شریعت کی جو بنیادیں گزشتہ تیرہ سو سال کی مدت میں کسی نہ کسی صورت میں محفوظ رہی ہیں، موجودہ بے راہ روی کے سیلاب میں بہہ نکلیں۔ آج ہر شخص اجتہاد کا دعویدار ہے۔ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ایک ادنیٰ درجے کی قانونی سند حاصل کرنے کے لیے بلامبالغہ پندرہ پندرہ، سولہ سولہ سال سکولوں اور کالجوں میں بسر کیے جاتے ہیں لیکن دین جو کائنات انسانیت کی سب سے ضروری، سب سے اہم اور سب سے اقدم شے ہے، اس کے لیے عدم احتیاط کا یہ عالم ہے کہ کسی عالم سے چند آیات سن لیں اور قرآن میں **''لااکرہ فی الدین''** کا ترجمہ دیکھ لیا اور علی الصباح ابو حنیفہؒ و شافعیؒ کی مسند اُٹھا کر اپنے اجتہاد کی گدی بچھا دی۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح طوالت پذیر رہا تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے مجتہدین کے ہاتھوں دین سلامت نہیں رہے گا۔ بہ حالت موجودہ یہ ادعائے اجتہاد مذہب کے لیے سب سے بڑا خطرہ بنا ہوا ہے۔ میں چند کتابیں اٹھا لیتا ہوں اور بلا خیال ایں و آں تحکیم کے منصب پر جا بیٹھتا ہوں۔ مولانا محمد علی چند کتابیں سامنے رکھ لیتے ہیں اور مجتہد بن بیٹھتے ہیں۔ یہ دین کے ساتھ افسوسناک ہے۔ حیرت انگیز استہزا و استخفاف ہے۔ اللہ تعالیٰ علامہ اقبال کو جزائے خیر دے، وہ اس باب میں کیا خوب فرماتے ہیں۔

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر
عقلِ آبایت ہوس فرسودہ نیست
کارِ پاکاں از غرض آلودہ نیست
فکرِ شان ریسد ہمے باریک تر
ورع شاں با مصطفیٰ ﷺ نزدیک تر

ذوق جعفرؒ کاوشِ رازیؒ نماند
آبروئے ملتِ تازی نماند
تنگ برما رہگذارِ دیں شد است
ہر لیئمے راز دار دیں شد است

ضرورت ہے کہ آج علماء کی ایک ایسی مجلس مقرر ہو جو امام کامل کی قائم مقامی کا حق ادا کر سکے اور افراد امت کی بے راہ روی کا سیلاب دین میں رخنہ اندازی نہ کر سکے۔ جمعیۃ العلماء کے قیام کی حقیقی غرض و غایت یہی تھی، لیکن افسوس صد افسوس کہ جن ہاتھوں نے اس مقدس عمارت کی بنیادیں رکھی تھیں، وہ ایک خاص وقت گزر جانے کے بعد خود اسے ڈھانے کے درپے ہوگئے اور ہر زید و بکر کے خیالات سن کر خود مجتہد بن بیٹھے۔ آہ! صد ہزار حسرت وآہ!! میں کیا عرض کروں کہ اس راہ ناشناسی کے نتائج و عواقب کا کیسا ہولناک منظر آنکھوں کے سامنے ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سیلاب تشتت وانتشار کہاں جا کر دم لے گا؟

بعض ہندو قتل مرتد پر یہ اعتراض کر رہے ہیں کہ اگر شریعت اسلام میں ایسی سزا ہے تو مسلمانوں کے ساتھ اتحاد نہیں ہوسکتا۔ میں اس بات کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ ان کے تصور اتحاد کی بحث یہاں چھیڑوں۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ قانون اُسی مقام پر نافذ ہوگا جہاں حکومت اسلامی ہوگی، ہندوستان میں نافذ نہیں ہوسکتا۔ حکومت سوراج کا قانون مشترک ہوگا۔ اس لیے یہاں اس کے نفاذ کا کسی کو خیال بھی نہیں ہوسکتا، الا اُس صورت میں یہاں خالص اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ سارے ہندو مسلمان بن جائیں پھر جیسا کہ ''**من بدل دینه**'' کے انوکھے مفسر مہاتما گاندھی اور دوسرے ہنود کو سمجھا رہے ہیں۔ سزائے قتل اُن غیر مسلموں کے لیے نہیں ہے جو اپنا دین چھوڑ بیٹھیں بلکہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو مسلمان ہو کر اسلام سے روگردانی اختیار کریں۔

میں نے اپنے علم و بصیرت کے مطابق دیانت کے ساتھ یہ مسئلہ **بالتفصیل** پیش کر دیا۔ اپنے علم، اپنی رائے اور اپنے فیصلے کو میں قطعاً درخور وثوق و شائستہ اعتماد نہیں سمجھتا۔ عالم نہیں ہوں کہ دنیا بھر کے ساتھ تحدی کروں۔ حقائق کتاب وسنت کا ماہر نہیں ہوں کہ اپنے فیصلے کی منصوصیت کا دعویٰ زبان پر لاؤں۔ ہاں علمائے کرام کا ناچیز خادم اور اسلام کا ادنیٰ خدمت گزار ضرور ہوں۔ میں اپنی بے بضاعتی سے خوب واقف تھا اور جانتا تھا کہ ایک اہم دینی مسئلہ میں رائے زنی کرنے

کا میں کسی طرح حقدار نہیں۔ لیکن اپنے بعض واجب الاحترام بھائیوں اور ملت بیضا کے ہزاروں نونہالوں کے رنجیدہ خیالات نے مجھے زبان کشائی پر مجبور کر دیا اور میں اسی از خود رفتگی کے عالم میں اس مسئلہ پر بحث کا سلسلہ شروع کر بیٹھا۔ ممکن ہے مجھ سے فروگزاشتیں بھی ہوگئی ہوں، لیکن نیت نیک تھی۔ اب یہ علماء کا کام ہے کہ میری گزارشات کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ فرمائیں۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم. ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمة انک انت الوھاب. ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا. ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملته علی الذین من قبلنا ربنا ولا تحملنا مالاطاقة لنا به واعف عنا. واغفرلنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القوم الکافرین. آمین یا ارحم الراحمین.

(زمیندار 16 مارچ تا 4 اپریل 1925ء، 15 مئی، 24 مئی 1925ء)

جسم اسلام کا رستا ہوا ناسور

اسلام کی آزاد و خود مختار حکومتوں کے ساتھ قادیانیوں کا بے پایاں بغض و عناد کوئی ایسا واقعہ نہیں جس پر مسلمانوں کو کچھ بھی تعجب ہو۔ جس خاک سے ان باطل پرستان حق پرست نما کا خمیر اٹھایا گیا ہے، اس کا ذرہ ذرہ آزادی اسلام کی دشمنی سے سرشار ہے اور بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب میں آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کی ساعت خروج سے لے کر یورپ میں مرزا محمود کے ہنگام وخول تک قادیانیوں کے کتابچہ اعمال کے ہر ورق کی سیاہی اسی بغض، اسی عناد اور اسی دشمنی کی گوناگوں ظلمتوں کا نچوڑ ثابت ہوتی رہی۔

گزشتہ تیرہ سو سال کی مدت میں اسلام کے اندر صدہا ایسے شیاطین الانس پیدا ہوئے جن کے خبث نفس نے ملت مقدسہ اسلامیہ کے شیرازہ کو درہم برہم کرنے کی دھن میں معاندانہ در اندازیوں اور طاغیانہ فتنہ پردازیوں کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن ان طواغیت عدوان وضلالت میں سے کسی ایک کی نسبت بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام کی ہیئت حاکمہ کے فلک نما قصر کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے لیے اس نے کفر کے جنود مجندہ کے ساتھ سازباز کیا ہو اور انہیں قلب اسلام کو تاخت و تاراج کرنے کی دعوت دی ہو۔ یہ ناقابل رشک امتیاز صرف قادیانیوں کے حصے میں آیا ہے کہ دامن اسلام سے وابستگی کے ادعا کے باوجود وہ غیرت ایمانی وحمیت دینی کے جنازہ کو کندھا دیتے ہوئے مسلمانوں کی جماعت سے کٹ کر مسلمانوں کے پشتنی دشمنوں سے جا ملے اور جو کام صلیب نہ کر سکی تھی، کسر صلیب کے یہ مدعی انجام دینے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ اس گروہ کے معرض وجود میں آنے سے لے کر اس وقت تک ایک موقعہ بھی ایسا نہیں آیا کہ قادیانیوں نے ساری امت کے مقابلہ میں کفر کے قشون مقہور کو تقویت پہنچانے کی کوشش نہ کی ہو۔

سلطنت ترکی پر نصاریٰ کے ہاتھوں گزشتہ بارہ پندرہ سال کی مدت میں ہولناک مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے اور ایک وقت تو ایسا آ گیا تھا کہ بے بصروں کو اس کی ہستی پر عدم کا گمان

ہونے لگا تھا۔مگر اسلام کے نام لیوا قادیانی ترکوں کے اس زہرہ گداز دورِ ابتلا میں لات وہبل کے مانند یوں ساکت وصامت بنے بیٹھے رہے، گویا آلِ عثمان کے ساتھ ان کا کوئی اسلامی رشتہ، کوئی دینی پیوند، کوئی مذہبی رابطہ تھا ہی نہیں۔ ہندوستان کے کروڑوں ہندو اپنے مسلم ہموطنوں کے پاس ہمسائیگی، اپنے بین الاقوامی مصالح کی بزرگ داشت، اپنے وطنِ عزیز کی آئندہ فلاح و بہبود کی نگہداشت اور عدل وانصاف کی ہمہ گیر فطری مقتضیات سے بے تاب ہوکر ترکوں کی حمایت کا دم بھرتے رہے۔لیکن قادیانی جو مسلمان کہلاتے ہیں، جو اپنے سامنے کسی دوسرے کے اسلام کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے، جو بات بات میں قال اللہ اور قال الرسول کی رٹ لگایا کرتے ہیں، اُن دشمن طاقتوں کے ساتھ ملے رہے جو ترکوں کی تباہی پر ادھار کھائے بیٹھی تھیں اور انتہائی بے حیائی و بے غیرتی کے ساتھ اپنے اس ناپاک فعل پر فخر کرتے رہے۔لاکھوں ترکوں نے اپنا سر خدا اور اس کے رسول ﷺ کے نام پر کٹا دیا یہاں تک کہ فلسطین وشام وعراق واناطولیہ کی زمینیں اُن کے خون سے لالہ رنگ ہوگئیں۔اور دوست تو ایک طرف رہے دشمنوں کے دل بھی ان کی توبتو مصیبتوں پر پسیج گئے لیکن سنگدل قادیانیوں کی پھوٹی آنکھوں میں دو آنسو تک نہ آئے۔عرب کی پاک ومقدس سرزمین اغیار کے قبضے میں چلی گئی۔حرم محترم کی حرمت خطرے میں پڑ گئی۔دنیا کے امن وامان کے الٰہی مرکز کی فضا طغیان وعدوان کی گھنگور گھٹاؤں میں چھپ گئی۔ بیت المقدس کے قبضہ میں نصاریٰ اور یہود برابر کے شریک ہوگئے۔دمشق و بغداد پر نصرانیت کا جھنڈا لہرانے لگا، یہ سب مصیبتیں آئیں۔ یہ ساری قیامتیں ٹوٹیں۔لیکن "**لاخرجن الیھود و النصاری من جزیرۃ العرب**" کو حدیث صحیح ماننے والے قادیانیوں کے پتھر دل میں پھر بھی درد کی کوئی ٹیس اور احساس مذہبی کی کوئی تڑپ پیدا نہ ہوئی بلکہ یہ انوکھی وضع کے مسلمان، الٹا دن رات ان سازشوں میں مصروف پائے گئے کہ کسی طرح جزیرۃ العرب کے سر سے اسلام کا سایہ اُٹھ جائے اور وہاں جبوت طواغیت کا تسلط قائم ہوجائے۔

ایران کی سلطنت دہشت ناک مصیبتوں کی جولاں گاہ بن گئی۔مغربی گدھ اس کے خونچکاں جسم سے بوٹیاں نوچ نوچ کر کھانے لگے۔آسیائے فرنگ کے شمالی اور جنوبی پاٹوں میں اس مظلوم سرزمین کے بسنے والوں کے دل صبح وشام پسنے لگے۔ پروفیسر براؤن اور بعض دوسرے نصرانی ہمدردوں تک کے دل ایران کی ان زبوں حالی پر خون ہو بہو گئے مگر امت قادیان ٹس سے

مس نہ ہوئی اور اس کے چھوٹے منہ سے غمگساری و ہمدردی کا ایک جملہ تک نہ نکلا۔ رہی دولت بہیۂ افغانستان، سو اس کے خلاف تو قادیانیوں کی معاندانہ کارروائیوں کی وجہ اظہر من الشّمس اور ابین من الامس ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔

ان ناممکن التردید شواہد کی بنا پر کوئی دردمند مسلمان قادیانی گروہ کو امت اسلامیہ کا جزو قرار نہیں دے سکتا تھا اور جسم اسلام کے اس رستے ہوئے ناسور کے زہریلے اثرات سے بے پروا نہیں ہو سکتا تھا لیکن ہمارے بعض بھائیوں کی سادہ لوحی ملاحظہ ہو کہ سب کچھ جانتے بوجھتے قادیان کے دام مکائد وحیل میں گرفتار ہو گئے اور قادیانیوں کی حمایت کا دم بھرنے لگے۔ کسی نے سوچے سمجھے بغیر یہ فتویٰ دے دیا کہ قادیانی زیادہ سے زیادہ مؤول ہیں اور مؤول کافر نہیں ہوتا۔ کسی نے **لااکراہ فی الدین** کا اصول پیش کر کے فیصلہ کر دیا کہ ہر شخص ہر باز پرس سے مبرا ہے۔ ان ناعاقبت اندیشانہ فیصلوں کا نتیجہ بجز اس کے اور کیا نکل سکتا تھا کہ قادیانی اپنے دشمن اسلام رویہ میں اور زیادہ دلیر ہو جائیں اور جو بات پہلے علی الاعلان نہ کہہ سکتے تھے، اب ڈنکے کی چوٹ کہنے لگیں۔ اس شوخ چشمانہ جسارت کا ثبوت الفضل مورخہ 4 اپریل سے ملتا ہے جس میں مرزا بشیر الدین محمود کے 27 مارچ کے خطبہ جمعہ کی روئداد شائع ہوئی ہے۔ یہ روئداد راقم الحروف کے نقد و تبصرہ سے مطلقاً بے نیاز ہے۔ محض اس کا مرتب صورت میں قارئین کرام کے سامنے پیش کر دینا ہی کافی ہے۔ وہ ایک نظر میں اندازہ کر سکیں گے کہ قادیانیوں کی عداوت اسلام شدت و غلظت کے کیسے کیسے مدارج طے کر چکی ہے۔

مرزا بشیر الدین محمود نے سنگساری کے واقعات پر صدائے احتجاج کے فلسفے کے متعلق طویل بحث کے بعد اپنی کوششوں کی نسبت جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:

(1) ”ہماری اپنی کوئی طاقت اور حکومت نہیں جس سے ہم براہ راست اپنے مظلوم بھائیوں کی امداد کر سکیں کیونکہ کسی ظالم حکومت کو اس کے ظلم سے کوئی دوسری حکومت ہی براہ راست روک سکتی ہے۔ اس لیے یہ تو ہماری طاقت سے باہر ہے۔ اب دوسری صورت یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کی تائید اور مدد حاصل کریں جنہیں طاقت حاصل ہے...... ہم ان حکومتوں اور طاقتوں سے مدد لیں جن کو افغان گورنمنٹ ناراض کرنا نہیں چاہتی یا افغان گورنمنٹ میں انہیں ناراض کرنے کی طاقت نہیں“۔

(2) ”میں نے دنیا کی مختلف **گورنمنٹوں** کو کابل کی اس وحشیانہ اور غیر شریفانہ حرکت کی

طرف توجہ دلائی اور وہ توجہ کر رہی ہیں...... بعض **گورنمنٹوں** نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ وہ اس معاملہ میں پوری توجہ سے کام لیں گی اور سارے یورپ کو اس طرف توجہ دلائیں گی۔ چنانچہ بعض نے تو یقینی طور پر اس کے متعلق کارروائی بھی شروع کر دی ہے اور بعض کے متعلق یقینی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا لیکن معتبر ذرائع سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اس کے متعلق کارروائی شروع کر دی ہے اور ان کا اس طرف متوجہ ہونا ایسا نہیں کہ حکومت کابل پر کوئی اثر نہ کرے''۔

(3) ''ہماری طرف سے وہ اپیل جو لیگ آف نیشنز مجلس بین الاقوام میں کی گئی، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ جب وہ کاغذات مجلس کے میز پر رکھے گئے تو انگریزوں کے علاوہ دوسری حکومتوں کے نمائندوں نے بھی ان کاغذات کو پڑھا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اس معاملہ میں کارروائی کرنے کے لیے اپنا قدم اٹھایا ہے''۔

(4) ''مگر یہ کام ایک دن کا نہیں کہ جھٹ پٹ اس کے نتائج نکل آئیں اور نہ یہ صرف تاروں کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہم نے تاروں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وفد کے طور پر بھی ہمارے آدمی ان حکومتوں کے ذمہ دار لوگوں سے ملے...... انہوں نے ہم سے وعدے کیے ہیں کہ وہ کابل کی ان حرکات پر خاموشی اختیار نہیں کریں گے۔ لیکن **گورنمنٹس** چونکہ سیاسی معاملات کو ظاہر کرنا پسند نہیں کرتیں، اس لیے جہاں انہوں نے ہم سے وعدے کیے ہیں، وہاں انہوں نے بھی ہم سے یہ وعدے لیے ہیں کہ ہماری گفتگو کو کسی پر ظاہر نہ کیا جائے۔ کیونکہ ان دنوں خود ان حکومتوں کو بہت سی سیاسی مجبوریاں اور مشکلات کا سامنا ہے''۔

(5) ''چونکہ افغانستان، روس اور انگریز کے ملک کے درمیان واقع ہے، اس لیے وہ (انگریز) بھی کھلم کھلا کوئی ایسا طریق اختیار نہیں کر سکتے جس سے گورنمنٹ کابل اور ان کے درمیان کشیدگی پیدا ہو۔ کیونکہ ان (انگریزوں) کو خطرہ ہے کہ پھر افغان روس سے مل جائیں گے۔ اسی طرح فرانس اور اٹلی کو بھی یہ خطرہ ہے''۔

(6) ''اگر افغانستان سے ان کا مقابلہ تلوار اور بندوق سے ہوتا تو ان کو کچھ فکر نہ ہوتی۔ لیکن ان کو مشکل یہ ہے کہ یہ جنگ تلوار اور بارود سے نہیں بلکہ خیالات کی جنگ ہے۔ اگر افغانستان روس سے مل جائے تو بولشویک خیالات ان کے ممالک میں اثر کر کے پھر ہندوستان میں بھی پہنچ سکتے ہیں، اس لیے ان مجبوریوں کی بنا پر وہ افغانستان سے صلح رکھنا چاہتے ہیں''۔

(7) ''جن خیالات کی بنا پر اس ملک (افغانستان) میں ہمارے مظلوم بھائیوں پر یہ مصیبت آئی ہے، ان خیالات کا مقابلہ کیا جائے۔ یعنی ان خیالات کی بڑھتی ہوئی روکو روکا جائے تا کہ اس ملک میں اتنے احمدی ہو جائیں کہ ان کو مارنا گویا ملک کو تباہ کر دینے کے برابر ہو۔ ان کی اتنی کثرت ہو جائے کہ اگر کسی جگہ ان پر ظلم ہو تو دوسرے ان کی ہمدردی کرنے کے لیے کھڑے ہو سکیں اور ظالموں کو آپس کی لڑائی کے خوف سے یہ موقع نہ ملے کہ وہ احمدیوں پر ظلم کر سکیں۔ اس کی بھی تجویز کی گئی ہے''۔

(8) ''ہم (قادیانی) ان لوگوں کی مدد کریں جن کو ان مظالم کی وجہ سے نقصان پہنچا ہے۔ خواہ وہ ان شہیدوں کے رشتہ دار ہوں خواہ دوسرے۔ یہ بھی بہت نازک سکیم ہے۔ کیونکہ اگر ذرا بھی مدد کا پتہ لگ گیا یا وہ احمدی جن کی ہم مدد کریں، ظاہر ہو جائیں تو خطرہ ہے کہ نہ صرف ہم ان کی مدد ہی نہ کر سکیں گے بلکہ ان کی جانیں بھی خطرہ میں ڈال دیں گے۔ اس لیے ہمیں ایسی تدابیر اختیار کرنی ہوں گی کہ جو مدد ہم ان کی کریں، وہ خطرات کا باعث نہ ہو۔ مولوی نعمت اللہ خاں صاحب کے والد کی تو کچھ مدد کی بھی گئی ہے اور بقیہ شہیدوں اور رشتہ داروں کی مدد کی بھی تجویز ہے جو کسی مخفی طریق سے ہی کی جا سکتی ہے''۔

(9) ''ان شہدا کی نعشیں حاصل کر کے یہاں یا وہاں ان کو باقاعدہ دفن کیا جائے۔ اس کے متعلق ابھی حکومت کابل سے ہماری خط و کتابت ہو رہی ہے۔ اگر انہوں نے ان شہیدوں کے وہاں یا یہاں دفن کرنے کی اجازت دے دی تو ہم ان کے ممنون ہوں گے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر ہمیں کوئی اور صورت اختیار کرنی پڑے گی''۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ خیالات اور ارادے کسی خاص نقد و تبصرہ کے محتاج نہیں ہیں۔ ان سے صاف طور پر آشکارا ہو رہا ہے کہ قادیانیوں نے حکومت اسلامیہ افغانستان کے خلاف عداوت و عناد کے طوفان برپا کرانے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ وہ ہر حکومت کے دروازے کی خاک چاٹ چکے ہیں تا کہ کسی نہ کسی طرح کوئی حکومت افغانستان کے خلاف اُٹھے اور قادیانیوں کی آتش انتقام فرو ہونے کی صورت نکلے۔ مرزا بشیر الدین محمود نے یورپ کی طاقتوں سے استمداد کی کیفیت پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے:

''اس مدد کا یہ مطلب نہیں کہ کابل کے خلاف چڑھائی کرائی جائے بلکہ

یہ ہے کہ ان سے ہم کہلوائیں کہ حکومت کابل کا یہ فعل اچھا نہیں اور یہ کام ان کی نگاہ میں بھی اسی طرح نفرت دلانے والا ہے جس طرح کہ ہماری نگاہ میں ہے''۔

لیکن ہم حیران ہیں کہ مرزا محمود کو اس تکلف کی کیوں ضرورت پڑی، وہ خود علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ انگلستان، فرانس اور اٹلی میں سے کوئی طاقت بھی افغانستان کی مخالفت نہیں کر سکتی۔ انگریزوں کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں افغان بولشویکوں سے نہ مل جائیں۔ اٹلی اور فرانس کو اپنے فوائد کے زوال کا خطرہ ہے۔ گویا اس طرح مرزا محمود خود یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اگر ان حکومتوں کو ذاتی مجبوریاں نہ ہوتیں تو وہ یقیناً افغانستان پر چڑھائی کر دیتیں۔

دوسرے مرزا محمود غالباً اپنی حقیقت سے ناآشنا نہیں ہوں گے۔ یہ ساری دنیا جانتی ہے کہ ان کے کہنے پر کون کون سی حکومتیں جنگ کا اعلان کر سکتی ہیں۔ جن لوگوں کی فطرتیں کفر کی اضطراری غلامی ہی نہیں بلکہ اس غلامی پر قناعت و مسرت اور اس کے قیام کے لیے سعی و کوشش خاص کی بدولت مسخ ہو چکی ہیں، ان کے ایما پر جو جنود متحرک ہو سکتے ہیں، ان کی حقیقت سب پر آشکارا ہے۔ ان اقتباسات سے یہ بھی صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قادیانی حتیٰ الامکان فتنہ انگیزی سے احتراز پر کاربند نہیں ہونا چاہتے۔ اب وہ خفیہ خفیہ ایسی تدابیر عمل میں لانا چاہتے ہیں کہ افغانستان کی سرزمین خدانخواستہ قادیانیت کے زہر سے اس طرح آلودہ ہو جائے کہ اگر ہیئت حاکمہ شرعیہ کابل کسی دشمن اسلام کے اعمال کا محاسبہ کرنا چاہے تو ایک بہت بڑی جماعت اس کے خلاف کھڑی ہو جائے۔

قادیانیوں کی خفیہ طور پر امداد کے لیے بھی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ہمیں بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت کابل کے برطانوی سفارت خانے میں قادیانی ملازمین کی بہت کثرت ہے۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو یہ اندیشہ بے جا نہیں کہ قادیانیوں کی اس خفیہ امداد کا مرکز برطانوی سفارت خانہ ہوگا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اب تک اس مرکز کے ذریعے سے کیا کیا کارروائیاں عمل میں آ چکی ہیں۔ حکومت افغانستان کا فرض ہے کہ وہ اس باب میں انتہائی احتیاط سے کام لے اور حکومت برطانیہ کو بھی چاہیے کہ اگر وہ افغانستان کے ساتھ دوستانہ و حلیفانہ تعلقات کے قیام کی خواہاں ہے تو اپنے سفارت خانہ کو ایسی خفیہ ریشہ دوانیوں کا مرکز نہ بنائے۔

باقی رہا برطانیہ، فرانس یا اٹلی کی طرف سے قادیانیوں کی حمایت کا مسئلہ تو اس کا حسن و قبح اس درجہ صاف اور روشن ہے کہ اقانیم ثلاثہ کے مدبرین سے اس کی نسبت کچھ کہنا لا حاصل ہے۔ انگریز گزشتہ آٹھ دس سال کی مدت میں مسلمانوں کی مخالفت کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ انہیں اچھی طرح تجربہ ہو چکا ہے کہ ایشیا میں ان کی سلطنت کا قیام مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات پر موقوف ہے۔ بحری و بری طاقتوں کی ہیبت ناکی اور وسائل و ذرائع حرب وضرب کی فراوانی عارضی طور پر انہیں یہاں مسلط رکھ سکتی ہے۔ لیکن اگر سارے مسلمان مخالفت کا تہیہ کر لیں تو یہ چیزیں انگریزوں کو مستقل طور پر کوئی فائدہ نہ پہنچا سکیں گی۔ علی الخصوص اس صورت میں کہ ایشیا کی دوسری بڑی بڑی طاقتیں یعنی جاپان، روس، چین وغیرہ انگریزوں کی مخالفت میں متحد ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں۔ اس لیے ہر وہ جماعت جو انگریزوں کو ایشیا کی کسی اسلامی سلطنت کی مخالفت پر آمادہ کرے گی، سلطنت برطانیہ کی سب سے بڑی دشمن ہوگی۔ مدبرین سلطنت برطانیہ سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ چند لاکھ قادیانیوں کے سوا ہندوستان کا ہر مسلمان مسئلہ قتل مرتد میں حکومت اسلامیہ افغانستان کا تہہ دل سے موید ہے۔ جن چند غیر قادیانی مسلمانوں نے دینی علوم میں کم مائیگی کے باعث یا افرنجیت کے ملحدانہ اثرات سے متاثر ہو کر قادیانیوں کی ہمنوائی کی، وہ بھی محض نفس مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن اگر خدانخواستہ انگریزوں نے قادیانیوں کی تائید میں کوئی ایسا قدم اٹھایا جس سے افغانستان کے ساتھ سیاسی تعلقات میں کوئی پیچیدگی پیدا ہوئی تو وہ لوگ بھی یہاں کے کروڑوں مسلمانوں کی طرح ہمہ تن انگریزوں کی مخالفت کریں گے۔ انگریزوں کے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک طرف ایک مذہبی معاملہ میں قادیانیوں کی حمایت اور سارے مسلمانوں کی مخالفت ہے۔ دوسری طرف اس باب میں غیر جانبداری پر کاربندی اور مداخلت سے احتراز ہے۔ اب انگریز اپنے نفع و نقصان کا اندازہ کر کے جو راستہ چاہیں، اختیار کر لیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ آخر الذکر راستہ اختیار کریں گے اور اس قلیل التعداد گروہ کی خاطر جو اپنی ہوسناکی کی بدولت بلا تامل غیرت ایمانی ان کے حوالے کر دیتا ہے، اپنے خلاف ہولناک مخالفت کا طوفان برپا نہیں کریں گے۔

مرزا بشیر الدین محمود کے مخالفانہ پروپیگنڈے کا ایک نتیجہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ وہ ایک قرارداد ہے جو پروفیسر نکلسن، ایچ جی ویلز، کالن ڈائل، آلیور لاج اور تین دوسرے انگریزوں کے دستخطوں سے احمدیہ مشن لندن کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔ اس میں حکومت

افغانستان کے فعل سنگساری پر ناپسندیدگی اور نفرت کے اظہار کے بعد توقع ظاہر کی گئی ہے کہ آئندہ ایسے فعل کا اعادہ نہیں ہوگا جو مہذب دنیا کی نظروں میں بدرجۂ غایت مذموم ہے۔ ہمیں یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ ایک خالص اسلامی مسئلے اور خالص شرعی معاملے میں غیر مسلموں اور علی الخصوص مخالف اسلام غیر مسلموں کی رائے کس درجے، کس حیثیت اور کس سلوک کی مستحق ہے لیکن قادیانی اس پر بہت مسرور معلوم ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو اس مسئلہ میں آریہ سماجیوں اور بعض دوسرے ہندوؤں کی آراء کو فخر و مباہات کے ساتھ اپنی تائید میں پیش کرتے ہوئے کوئی عار نہ آئی، جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی مرتب فرمودہ شریعت کے باب میں اپنے جیسے غلام اور مسلمہ طور پر دشمن اسلام ہندوؤں کے خیالات کو معیار تحکیم و فیصلہ قرار دیتے ہوئے نہ شرمائے، وہ اگر آج چند غیر مسلم انگریزوں کی ایک قرارداد کو قرآن حدیث اور تصریحات ائمہ کرام وعلمائے اسلام پر ترجیح دیتے ہیں تو اس پر حیران ہونے کی کون سی بات ہے؟ قادیانیوں نے مرزا قادیانی کے اتباع میں جو راستہ اختیار کر رکھا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ وہ شریعت کی ہر بات کو پس پشت ڈال دیں اور انگلستان کے ہر **ابیض اللون افرد** کے ارشاد کو صحیفہ آسمانی اور نوشتہ ایزدی تصور کریں۔

البتہ پروفیسر نکلسن اور ان کے رفقا پر افسوس ہے کہ انہوں نے بلاسوچے سمجھے ایک ایسا افسوسناک راستہ اختیار کیا اور یہ غور نہ کیا کہ ان کی یہ حرکات ازسرنو سلطنت برطانیہ کو ایسے ہی خطرات میں مبتلا کر سکتی ہیں جن سے وہ تین چار سال کی مسلسل و متواتر تگ و دو کے بعد حال میں باہر آئی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جس تہذیب وشائستگی کے پروفیسر نکلسن وغیرہ دعویدار ہیں، ان کی حقیقت ساری دنیا پر آشکارا ہے۔ کیا پروفیسر نکلسن کو معلوم نہیں کہ ان کے ہم قوم آئرلینڈ، کینیا، جنوبی افریقہ، مصر، ہندوستان، عراق، فلسطین وغیرہ میں تہذیب اور شائستگی کے کیسے کیسے ثبوت پیش کر رہے ہیں؟ حکومت افغانستان نے زیادہ سے زیادہ یہی کیا کہ اپنے دو تین راہ گم کردہ افراد کو جن کی گمراہی سارے ملک میں ایک ہولناک فتنہ برپا کر سکتی تھی، واجبی سزا دے دی۔ لیکن پروفیسر نکلسن و رفقا کے ہم قوموں کی یہ حالت ہے کہ اپنی چند ذلیل و ناپاک مادی اغراض کی خاطر انہوں نے اس کائنات کے کروڑوں آزاد انسانوں کی گردنوں میں اپنے تسلط و اقتدار کا حیات کش طوق ڈال رکھا ہے اور ان غریبوں کی سرزمینوں اور ملکوں کو اپنے حرص و آز کے جہنم میں جھونکے بیٹھے ہیں۔ کیا یہ تہذیب وشائستگی ہے؟ ہسپانیہ، اٹلی اور فرانس، شمالی افریقہ کے

بے دست و پا باشندوں کو دنیاوی مصائب کے نہایت ہولناک سیلابوں سے تباہ کر رہے ہیں لیکن اس موقع پر پروفیسر نکلسن وغیرہ کے جذبۂ تہذیب میں حرکت نہیں آتی۔ بلجیم نے کانگو کے باشندوں کو نہایت انسانیت سوز طریق پر اس طرح تباہ کر دیا کہ اس وقت اُن کی تعداد بہت ہی قلیل رہ گئی ہے اور ان کی بھی یہ حالت ہے کہ کسی کے پاؤں کٹے ہوئے ہیں، کسی کے ہاتھ غائب ہیں، کسی مظلوم و بدنصیب عورت کی چھاتیاں سر مشق قطع و برید بن چکی ہیں لیکن بلجیم کی حمایت میں سارے یورپ کو آتش وخون کے سیلاب کا جولاں گاہ بنا دینے پر آمادہ ہو جانے والے انگریزوں کی تہذیب کانگو کے غریب باشندوں کے معاملہ میں یکسر وقف خواب مرگ رہی۔ امریکہ افریقی النسل باشندوں کے تعلق میں بلا تامل لنچنگ (Lynching) تعزیز بالتعذیب اور قتل بالتعذیب استعمال کر رہا ہے۔ ان کے جسم پر تیل چھڑک کر آگ لگا دیتا ہے۔ انہیں آگ کے جلتے ہوئے الاؤ میں جھونک دیتا ہے۔ انہیں تالابوں میں اتنی ڈبکیاں دیتا ہے کہ وہ مر جاتے ہیں۔ افریقی الاصل اور حبشی النسل باشندوں کے محلے کے محلے امریکہ کی اسی بربریت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ چکے ہیں لیکن نکلسن وامثالہم کی رگ تہذیب آج تک پھڑکتی ہوئی نہیں دیکھی گئی۔ افغانستان اگر اپنے اور اسلام کے مسلمہ قانون کی بنا پر دو تین قادیانیوں کو سزا دیتا ہے تو مغربی تہذیب کے یہ پجاری یکا یک خواب غفلت سے بیدار ہوتے ہیں اور انہیں حکومت افغانستان کا یہ فعل مذموم نظر آتا ہے۔ پروفیسر نکلسن اپنے ہم قوموں اور ہم مذہبوں کے اعمال کا جائزہ لے لیں۔ اس کے بعد افغانستان پر بھی توجہ فرمائیں۔ کیا انہوں نے اپنی آنکھ کا شہتیر نکال لیا ہے کہ اب دوسروں کی آنکھ کے ''تنکے'' کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ انگریزوں کے لیے یہ طریق عمل سخت خطرناک ہے۔ حکومت برطانیہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے افراد کو ایسی ناعاقبت اندیشی سے روکے ورنہ حکومت افغانستان کے ساتھ سیاسی تعلقات میں اختلال پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ افغانستان نے آج تک برطانیہ کے کسی داخلی معاملہ میں مداخلت نہیں کی۔ ارباب بست وکشاد برطانیہ، عرب، ایران، ترکی، ہندوستان اور مصر میں نہایت ناجائز کارروائیاں کرتے رہے۔ حکومت افغانستان اگر اسلامی مواخات کو پیش نظر رکھتی ہوئی ان کے خلاف احتجاج کرتی تو اس کا یہ فعل بالکل بجا اور جائز ہوتا مگر اس نے اس سے بھی احتراز کیا۔ پھر کیا انگریزوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ افغانستان کے

اندرونی معاملات میں مداخلت کریں اور ایشیا کے کروڑوں مسلمانوں کی مخالفت میں چند قادیانیوں کی حمایت کا بیڑا اٹھائیں؟ امید واثق ہے کہ حکومت برطانیہ پروفیسر نکلسن وغیرہ کی قرارداد کو ایک مضحکہ خیز طفلانہ مظاہرے سے زیادہ وقعت نہ دے گی اور مرزا بشیر الدین محمود کی پیٹھ پر تھپکیاں دینے کا شعار چھوڑ دے گی کہ یہ ایک سعی لاحاصل ہے۔

(زمیندار 18، 19 اپریل 1925ء)

قادیانیت کی پاپ بھری ناؤ، دریائے مکافات کے گرداب میں

ہندوستان پر اگرچہ اغیار کا بے پناہ اقتدار مسلط ہے اور اس کا بند بند غلامی کی فولادی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے لیکن برطانوی ملوکیت کی بوقلموں مصلحتوں نے اس دیس کے بسنے والوں کو اتنی آزادی بہرحال دے رکھی ہے کہ مذہب کے نام پر جو ناگفتنی بات چاہیں، کہہ ڈالیں اور جو ناکرونی حرکت چاہیں کر بیٹھیں۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
گلے میں جو اتریں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

مرزا قادیانی آنجہانی نے جس کی ناقابل رشک شخصیت تعارف سے بے نیاز ہے، اس آزادی سے جو فائدہ اٹھایا، وہ کسی اور شخص کے حصہ میں کم آیا ہوگا۔ وقت کے اس سب سے بڑے ملحد نے اسلام کے نام پر اسلام کی مقدس ترین روایات کو جس دیدہ دلیری سے رسوا کیا، اُسے دیکھ دیکھ کر خدایاد آتا ہے۔ اُس کے انمل بے جوڑ خرافات کی بنا پر کسی نے اُسے دجال کہا، کسی نے اسے متنبّی قرار دیا، کسی نے اسے مراتی سمجھا لیکن اس کی بکار خویش ہشیار دیوانگی ان رنگا رنگ پھبتیوں پر حقارت کی ہنسی ہنستی رہی۔ اسلام کے سیزدہ صد (تیرہ سو) سالہ فیصلہ کو بیک جنبش قلم منسوخ کر کے اُس نے اعلان کر دیا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا خدا ہوں، اگرچہ ایک ہی وقت میں اُس کا بیٹا بھی ہوں اور باپ بھی۔ اُس نے ڈنکے کی چوٹ پکار کر کہہ دیا کہ دنیا میں آج تک جتنے رسول اور نبی آئے ہیں، میں سب میں افضل ہوں۔ اس کے شوخ چشمانہ تبختر کو اس عارفانہ تعلّی میں بھی تامل نہ ہوا کہ شریعت کے جن اسرار تک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسائی نہ تھی، وہ مجھ پر کھول دیئے گئے ہیں۔ اُس نے کلام اللہ میں تحریف کی اور اس کے بعض کھلے ہوئے احکام کو

اپنے خانہ ساز ُکن فیکونی' اختیارات سے منسوخ کر دیا۔ اُس نے انبیاء کو گالیاں دیں۔ اُس نے اولیاء و اتقیا کی پگڑیاں اچھالیں۔ اس نے علماء امت پر فحش مغلظات کا جھاڑ باندھا۔ اس نے نصاریٰ کو اپنا اولی الامر قرار دے کر حکومت کی ایسی گھناؤنی خوشامد کی کہ بڑے سے بڑے ٹوڈی کی پیشانی مارے شرم کے پسینے سے شرابور ہوگئی۔ اُس نے یہ کہہ کر کہ مکہ اور مدینہ کی چھاتیوں کا دودھ خشک ہو چکا ہے، قادیاں کو اپنی امت کا کعبہ بنا دیا۔ اُس نے یہ میکائیل کے بجائے ُٹیچی ٹیچی' کو اپنا فرشتہ بنالیا اور عقل کے اندھوں اور گانٹھ کے پوروں سے چندے لے لے کر سیم وزر کے انبار فراہم کر لیے۔ فن محاکات (لفظی گھوڑے دوڑانا) میں اس حد تک کمال بہم پہنچایا کہ حجاز کے جنت المعلیٰ کی جگہ بہشتی مقبرہ نے لے لی۔ بزعم خود تو (معاذ اللہ) نبی تھا ہی، اس کے گھر کی ہر لگائی (زوجہ) بھی ''ام المؤمنین'' بن گئی اور اس کا ہر حاشیہ بردار ''صحابہ کرام'' کا ہم مرتبہ ہو کر ''رضی اللہ تعالیٰ عنہ'' کے دعائیہ کلمے کا مستحق ہو گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انگریزوں کی بخشی ہوئی آزادی کے صدقہ میں اس نے جو کچھ کہا اور جو کچھ کیا، اس کی نظیر اسلام کی سیزدہ صد سالہ تاریخ میں نہیں ملے گی۔''

فن محاکات میں اُس نے اس حد تک کمال بہم پہنچایا کہ حجاز کے جنت المعلیٰ کی جگہ قادیاں کے بہشتی مقبرہ نے لے لی۔ وہ خود تو صلی اللہ علیہ وسلم تھا ہی اُس کے گھر کی ہر لگائی بھی ام المومنین بن گئی۔ اور اُس کا ہر حاشیہ بردار صحابہ کرام کا ہم مرتبہ ہو کر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دعائیہ دم چھلے کا مستحق ہو گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انگریزوں کی بخشی ہوئی مذہبی آزادی کے صدقہ میں اُس نے جو کچھ کہا اور جو کچھ کیا اُس کی نظیر اسلام کی سیزدہ صد سالہ تاریخ میں چراغ لے کر بھی ڈھونڈ نے نکلو تو نہ ملے گی پر نہ ملے گی۔

مرزا قادیانی کے بعد نئے قادیانی مذہب کی وہ تمام روایات جن کا نقشہ اوپر کی چند سطور میں کھینچا گیا ہے، امت مرزائیہ کو ترکہ میں ملیں۔ انگریزی ملوکیت کا سایہ اگر چہ اس قسم کی روایات کے نشوونما کے لیے بے حد سازگار واقع ہوا ہے لیکن ایک طاقت اس دنیا میں اور بھی ہے اور اُسے رب کعبہ کی غیرت کہتے ہیں۔ مرزائے آنجہانی کی آنکھیں بند ہوتے ہی مرزائیت کے طاغوتی نظام میں آثار خلل نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ حکیم نورالدین کی خلافت نے قانون مکافات کے بے پناہ عمل کو ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ ازلی و سرمدی قانون کس طرح ٹل سکتا تھا۔ حکیم صاحب پر بھی جب وہ وقت آیا جو متنبّی قادیاں مرزا قادیانی پر آیا تھا تو قادیانی خلافت کے دو

ٹکڑے ہو گئے۔ ایک گدی میرزائے قادیانی آنجہانی کے فرزند مرزا محمود کے حصہ میں آئی، دوسری پر جس کا صدر مقام لاہور ہے، مسٹر محمد علی لاہوری تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔

ان دونوں کی رقیبانہ کشمکش نے چند سال تک جنگ زرگری کی شکل اختیار کیے رکھی۔ دونوں مرزائے آنجہانی کو وقت کا امام اور مقتدائے انام سمجھتے تھے اور اُس کی ہر خرافات کے ایک ایک لفظ کو آیۃ من آیات اللہ خیال کرتے تھے لیکن محمد علی لاہوری از بسکہ خود سے زیادہ کائیاں واقع ہوئے ہیں اور فن تاویل میں بعض دفعہ مسیلمہ کذاب کے بھی کان کاٹ لیا کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی پہلی اور سنہری مصلحتوں نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ مرزا قادیانی کو نبی ماننے سے انکار کر دیں اور اس جھوٹ کو سچ کر دکھائیں کہ ''مرزا صاحب تو صرف چودھویں صدی کے مجدد تھے جن کے نہ ماننے والا دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوسکتا، بخلاف اس کے کہ بشیر الدین محمود اپنے والد کی تعلیم کا صحیح منطقی نتیجہ تھے۔ انہوں نے بلاخوف لومۃ لائیم اس سچی بات کا اعلان کر دیا کہ جو شخص میرے باپ کو نبی نہیں مانتا، وہ انہی کے قول کے مطابق دائرہ اسلام سے قطعاً خارج ہے۔

دمشقی (قادیانی) اور اندلسی (لاہوری) گروہوں کی اس بحث نے رفتہ رفتہ سخت ناگوار صورت اختیار کر لی تا آنکہ دونوں تو تو میں میں پر اتر آئے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ دونوں جماعتوں کے تعلقات کا اندازہ ذیل کی تحریر سے ہو سکے گا جو مسٹر محمد علی لاہوری کے آرا وافکار کے ترجمان خصوصی اخبار پیغام صلح کی اشاعت مورخہ 26 جولائی 1937ء میں مرزا بشیر الدین محمود کی بداعمالیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے حوالہ قلم کی گئی ہے۔

> ''مسلمان قوم کی تباہی کا باعث ہمیشہ وہ گروہ رہا ہے جس نے اپنی ہوس رانیوں، خواہشات نفسانی، حرص و آز اور نفس پرستی کی خاطر قرآن وسنت کے نام پر دنیا کو دھوکا دیا۔ تقدس کی آڑ میں لوگوں کے ایمانوں پر ڈاکے ڈالے، ان کے خون پسینہ ایک کر کے پیدا کردہ روزی کو دونوں ہاتھوں لوٹ کر عالیشان محلات تعمیر کیے، جائیدادیں پیدا کیں، عیش وعشرت میں بسر اوقات کی اور ہمیشہ مکر و حیل سے غربا کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتے رہے۔
>
> سچ فرمایا مخبر صادق صلعم نے کہ ایک وقت میری امت پر آئے گا جبکہ آئمہ دین کی کثرت آئمہ تلبیس کا جامہ پہن لے گی۔ ان کے وجود فتنہ وفساد کا

موجب ہوں گے۔ وہ اپنے ناسزا اعمال کی رو سے دنیا کی بدترین مخلوق
ہوں گے۔ان کا وجود نسل انسانی میں سوروں اور بندروں کا حکم رکھے گا۔
ان کی زبانوں پر قرآن ہوگا مگر ان کے قلوب شیطنت کا گہوارہ ہوں گے۔
وہ یہود کے نقش قدم پر چلیں گے۔احکام الٰہی کی تفاسیر اپنی ذاتی اغراض
کے حصول کے مطابق کریں گے اور معبودان باطل کی جگہ لیں گے''۔

ان گالیوں کا جواب اگلے ہی دن یعنی 27 جولائی کے ''الفضل'' میں مرزا محمود کی طرف سے صرف ایک سطر میں دیا جاتا ہے اور یہ کہہ کر دیا جاتا ہے۔

''اے لعنتی دیکھ! میں تیرے سارے منصوبے خاک میں ملادوں گا''۔

مرزا بشیر الدین محمود کی خلافت بے شک مسٹر محمد علی لاہوری کے سارے منصوبوں کو خاک میں ملا دینے کی قدرت رکھتی ہے لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ خود مرزا صاحب کے دست و بازو انہیں جواب دے رہے ہیں۔قادیاں کے در و دیوار سے صدائیں آنے لگی ہیں کہ اب میرزا بشیر الدین محمود کے اقتدار کا چل چلاؤ ہے۔جن لوگوں کا ان کا عمر بھر کا ساتھ تھا اور جن کی نظر سے ان کی زندگی کا کوئی گوشہ اوجھل نہ تھا،انہوں نے اشتہار دینے شروع کر دیئے کہ بشیر الدین محمود ایک نہایت ہی اخلاق باختہ شخص ہے جس نے مذہب کو دھوکے کی ٹٹی بنا رکھا ہے اور ایسا شخص بھلے لوگوں کا خلیفہ نہیں ہوسکتا۔مرزا بشیر الدین محمود کے ان نئے دشمنوں کے سرگروہ شیخ عبدالرحمٰن مصری اور مسٹر فخر الدین ملتانی ہیں جنہوں نے اعلان کر دیا ہے کہ مرزا صاحب منصب خلافت سے معزول کیے جاتے ہیں اور ایک آزاد کمیشن مقرر کیا جاتا ہے جو اُن کے چال چلن کی تحقیقات کرے گا۔

(زمیندار قادیان نمبر اگست 1937ء)

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے دشمنوں کا انجام

اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ

ہم مسلمانوں کا یہ ایمان کہ آفرینندہ کون ومکان کے بعد اس کائنات کی بزرگ ترین ہستی ہمارے آقا و مولا حضرت محمد عربی ﷺ ہیں کہ ان پر ہماری جان، ہمارا ایمان، ہماری آل و اولاد، ہمارے ماں باپ، ہمارا ننگ و ناموس اور ہر چیز جو ہمیں عزیز سے عزیز ہو، نچھاور ہو جانے اور قربانی کر دینے کے لیے بنائی گئی ہے۔ چالیس کروڑ انسان آج آپ ﷺ کے نام اقدس پر کٹ مرنے کو ذریعہ فلاح دینوی و وسیلہ نجات اخروی سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے کہ جو شخص یا جو قوم دونوں جہانوں کے اس سردار ﷺ، انسانیت کے اس سب سے بڑے محسن کی دشمن ہوگی، وہ خود خدائے بزرگ و برتر سے اپنی دشمنی کا اعلان کرے گی اور ذلیل وخوار و رسوا ہو کر اس طرح تباہ و برباد ہوگی اور اس کا نام و نشان دنیا سے یوں مٹا دیا جائے گا کہ گویا وہ سراپردۂ عدم سے نکل کر کبھی منصۂ شہود پر آئی ہی نہ تھی۔ ہمارے اس ایمان کا مضحکہ اڑانے والے اس دنیا میں بہت سے لوگ موجود ہوں گے اور ہمارے عقیدہ کو اوہام باطلہ کا ایک گورکھ دھندا سمجھنے والوں کی بھی اس سرائے سپنجی میں کمی نہیں لیکن وہ جنہیں آنکھیں دی گئی ہیں، گزشتہ تیرہ سو سال کی تاریخ کی ورق گردانی کریں اور دیکھ لیں کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے، اس کا حرف حرف سچ ہے یا نہیں۔ وہ جو دل کے کان رکھتے ہیں، انہیں کھولیں اور زمانہ سے سن لیں کہ ہر وہ بے ادب جس نے سرور کون ومکان ﷺ سے گستاخی کی، کتے کی موت مرا اور اس کی نسل تک اس دنیا سے مٹا دی گئی۔

کفار قریش رسول ﷺ کو گالیاں دیتے تھے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ بدر کے میدان میں ان گالیوں کا ان بدبختان ازلی نے کیسا ہولناک خمیازہ کھینچا۔ عرب کے بدزبان یہودیوں کو حضور انور ﷺ سے دشمنی تھی، دنیا نے دیکھ لیا کہ ان دریدہ دہن خبیثوں کا ایک بھی نام لیوا جزیرۃ العرب میں آج نظر نہیں آتا۔ آل ساسان کی عظمت وجلال کے زندہ مجسمہ خسرو پرویز سے اتنا ہی قصور ہوا

تھا کہ حضور اقدس ﷺ کے نامہ مبارک کو اس شقی ازلی نے چاک کر کے رود قرد سو کی موجوں میں بہا دیا تھا اور یہ ناپاک خرافات بکی تھی کہ (نعوذ باللہ) محمدؐ ہمارا غلام ہو کر ہم کو جو سورج کے بیٹے ہیں، ایک خدا کی پرستش کی گستاخانہ دعوت دیتا ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ ساسانیوں کی قبائے حشمت کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑ گئیں، اور اس کی نسل، اس کی قوم اور اس کی سلطنت کی یادگر درروزگار میں دب کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو گئی۔ پرستارانِ صلیب نے تاجدار یثرب و بطحا ﷺ کی دشمنی کا علم اٹھایا لیکن دنیا نے دیکھا لیا کہ ہر موقع پر ذلیل ہوئے اور منہ کی کھائی۔

حضور سرورکون و مکان ﷺ کی رحمۃ للعالمینی نے ایک ہزار سال تک ہندوستان کے ہندوؤں کو اپنے دامانِ عاطفت میں پناہ دیے رکھی۔ ان کے دھرم کی حفاظت کی گئی۔ ان کے مندروں کو جاگیریں بخشی گئیں۔ ان کی چوٹیاں اور زنار سلامت رہے۔ ان کو سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز کیا گیا اور آج یہ قوم جو اپنے تیس کروڑ ہونے پر اترا رہی ہے، صرف اسلام کے علمبردار اعظم کی شریعت کی بیکس نوازی کے صدقہ ہی میں اپنی ہستی پر نازاں ہے۔ ورنہ ان کا حشر بھی وہی ہوا ہوتا جو اندلس میں مسلمانوں کا ہوا اور آج ایک ہندو بھی رام نام جپنے کو بھارت میں موجود نہ ہوتا۔ لیکن آہ دنیا کس قدر حق ناشناس اور احسان فراموش واقع ہوئی ہے کہ انہی ہندوؤں کا ایک طبقہ اٹھتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو ایسی ایسی گالیاں دینے لگ جاتا ہے کہ تہذیب انسانی مارے شرم کے اپنا منہ چھپا لیتی ہے۔ خدائے ذوالجلال کی غیرت کا پیالہ چھلک اٹھتا ہے اور قریب ہے کہ ان ملاعنہ کا تختہ اُلٹ دیا جائے اور جو حشر اس وضع وقماش کے بدبختانِ ازلی کا اس سے پہلے ہو چکا ہے، وہی ان کا بھی ہو۔

ہندو دھرم کو ایک ہزار سال تک اسلام سے متصادم ہونے کی جرأت نہیں ہوئی۔ وہ برابر ورن آشرم کی کمین گاہ میں چھپا رہا اور اسی لیے بچا رہا۔ اب وہ گھات پا کر باہر نکلا اور شدھی اور سنگھٹن کے اوچھے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اسلام کو نیست و نابود کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس کی اسے اجازت ہے۔ اسلام کی چٹان سے وہ اپنا سر ٹکرا کر دیکھ لے اور یہ ارمان بھی دل میں نہ رہنے دے۔ لیکن دھرم کے نام پر آریہ ساجیوں اور ان کی پیٹھ پر تھپکی دینے والوں نے خدا کے برگزیدہ ترین رسول حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کو اپنے ناپاک سب وشتم کی آماجگاہ بنانے کا جو ابلیسی وتیرہ

اختیار کیا ہے اس کا ایک اور صرف ایک انجام ہوگا۔ وہ ذلت کی موت مریں گے۔ ان کی نسل قطع کر دی جائے گی اور ان کی شمشان بھومی پر بھارت کے طول و عرض میں دو آنسو بہانے کو بھی کوئی موجود نہ ہوگا۔ اسے مجذوب کی بڑ نہ سمجھو۔ کیونکہ خود خداوند جل و علیٰ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ اے محمد ﷺ تیرے دشمنوں کی نسل تک دنیا سے مٹا دی جائے گی۔

اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ

(روزنامہ زمیندار 3 جون 1927ء)

خسرو پرویز کا انجام

فانتقمنا منهم فانظر كيف كان عاقبة المكذبين

جنگ احزاب میں جب وہ تمام منصوبے جو کفر، اسلام کی بیخ کنی کے لیے باندھ کر آیا تھا، خاک میں مل چکے اور حدیبیہ کی ''فتح مبین'' نے سازگار حالات پیدا کر دیے تو وقت آ گیا کہ تاجدار کونین ﷺ سلاطین عالم کو پیام توحید پہنچا کر اس فرض عظیم سے سبکدوش ہوں جس کی بجا آوری کے لیے رحمت باری نے آپ کی ذات گرامی کو شرف اختصاص بخشا تھا۔ نجاشی حبش کو دعوت اسلام دینے کے بعد جو فرمان بارگاہ رسالت ﷺ سے نافذ ہوا، وہ خسرو پرویز کے نام تھا۔ اس وقت ہرقل اور خسرو کی طرف سے جنگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور خسرو اپنے خدم وحشم کے ساتھ کردستان حد پر دریائے قراسو کے کنارے خیمہ زن تھا۔ رسول ﷺ کے سفیر حضرت عبداللہ بن قدافہ مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر کوہ وصحرا قطع کرتے ہوئے خسرو کے دربار پہنچے اور نامہ مبارک پیش کیا جس کی عبارت حسب ذیل تھی:

بسم الله الرحمن الرحيم

من محمد رسول اللّٰه الیٰ کسریٰ عظیم فارس

سلام علیٰ من اتبع الهدی وامن باللّٰه و رسوله وشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لاشريک له، وأن محمداً عبدهٗ ورسولهٗ وأدعوک بدعاء اللّٰه فانی أنا رسول اللّٰه الی الناس کافة، لانذر من کان حیا و بحق القول علی الکافرین، فأسلم تسلم، فان أبیت فان اثم المجوس علیک.

بسم الله الرحمن الرحيم

ترجمہ: محمد رسول اللہ (ﷺ) کی طرف سے کسریٰ رئیس فارس کے نام اس شخص پر سلام ہے جو ہدایات کی پیروی کرے اور خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور اس بات کی گواہی

دے کہ بجز اللہ کے اور کوئی معبود نہیں۔ اور نیز اس بات کی گواہی دے کہ میں تمام دنیا کے انسانوں کی طرف خدا کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں تا کہ ہر ذی حیات انسان کو اس کا خوف دلاؤں۔ پس اگر تو اسلام لے آئے گا تو سلامت رہے گا لیکن اگر تو نے انکار کیا تو مجوسیوں کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔‘‘

دولت کے نشہ کی ترنگ میں آ کر انسان بارہا اپنی ہستی بھول چکا ہے اور خود فراموشی کے عالم میں اسے اپنی بے مائیگی پر اکثر خدائے بے ہمتا کی ہم مائیگی کا دھوکا ہوا ہے۔ چاند اور سورج سے اپنا سلسلہ نسب ملاتے ملاتے اس نے اپنے کو خود خداوند عالم کی اولاد بتا کر اپنے لیے وہ آسمانی حقوق تجویز کر لیے ہیں جن میں غیرت کبریائی کسی مخلوق کو تصرف کی اجازت نہیں دے سکتی۔ یونان، روما، مصر، کادیہ، ہندوستان سب کے سب کبر و پندار کی اس مرد افگن شراب کے متوالے ہو چکے تھے لیکن ایران کی سرمستیوں کا انداز ہی کچھ اور تھا۔ تاجداران سلسلہ ساسانیہ اپنے آپ کو خدائے بزرگ و برتر کا شریک و سہیم سمجھتے تھے اور ان کی اس حیثیت کے اعتراف کے لیے ہر شخص کو ان کے دربار میں حاضر ہوتے وقت انہیں سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ حاجی آباد کے پہلوی کتبہ میں جس پر ماہرین آثار عتیقہ کے اکتشافات نے روشنی ڈالی ہے، شاپور ساسانی کے القاب آج بھی ان الفاظ میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پرستار ہرمزو پیکر الوہیت شاپور شہنشاہ ایران و ماورائے ایران از نسل آفریدگار۔ پسر پرستار ہرمزو پیکر الوہیت ارتخشتر شہنشاہ ایران از نسل آفریدگار نبیرہ پیکر الوہیت شاہ بابک۔

پرویز ان ہی روایات کی گود میں پلا تھا اور اپنے آپ کو اس دنیا کا دوسرا خدا سمجھتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے نامہ مبارک پر نظر پڑی تو اس کے آزاد لہجہ، اس کے بے باکانہ ایجاز اور اس کے صاف گویانہ اقتدار کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ جس کے آستانہ عظمت و جبروت پر لاکھوں انسان ناصیہ فرسائی کے خوگر تھے، حیران تھا کہ اس ربع مسکوں میں کوئی ایسا سرکش شخص بھی ہو سکتا ہے، جسے اس کے نام سے پہلے اپنا نام لکھنے کی جرأت ہو۔ وہ جو طرابلس سے لے کر پنجاب تک شہنشاہ جہاں و جہانیاں اور خداوند عالم و عالمیان کہلاتا تھا، سمجھ نہ سکتا تھا کہ کس طرح عرب کا ایک بادیہ نشین اس سے صرف رئیس فارس کہہ کر خطاب کر سکتا ہے۔ قیصر روم اور خاقان چین کی متحدہ طاقت ایشیا اور یورپ کی متفقہ سطوت اسے وہ دھمکی نہ دے سکتی تھی جو ان چند جلال آفرین الفاظ میں مضمر تھی۔

اسلم تسلم فان ابیت فعلیک اثم المجوس

غضب ناک ہو کر پکارا کہ یہ محمد (ﷺ) کون ہے جو ہمارا غلام ہو کر ہم سے اس طرح خطاب کرتا ہے۔ یمن کے صوبہ دار کو کہہ دو کہ اسے پکڑ کر ہمارے دربار میں بھیج دے۔ یہ کہہ کر مکتوب نبی کو پارہ پارہ کر ڈالا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ رسولِ خدا کے مکتوب کی نہیں بلکہ خود اپنی سلطنت کی دھجیاں اپنے ہاتھ سے فضائے آسمانی میں اڑا رہا ہے۔

یمن کے ایرانی گورنر بازان نے جب مدینہ منورہ میں اپنے قاصد بھیج کر خسرو کے تہدیدی احکام سے حضور سرورِ کون و مکان کو اطلاع دی تو آپ نے صرف اس قدر فرمایا کہ اسلام عنقریب کسریٰ کے پایۂ تخت میں پہنچ جائے گا۔ کس طرح سچے الفاظ تھے جو جلی حرفوں میں خود خسرو کے خون سے مداین کر کے در و دیوار پر لکھے گئے۔

نینوا کی شکست فاش کے بعد دوست دشمن سبھی کا یہ خیال تھا کہ نوشیرواں کا پوتا اور کسی خیال سے نہ سہی، آلِ ساسان کی شاندار روایات کا بھرم رکھنے ہی کے لیے اپنی بکھری ہوئی قوتوں کو سمیٹ کر مردانہ وار اپنے حریف کا مقابلہ کرے گا اور اس آخری مقابلہ میں یا تو اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کرے گا یا قصرِ وستاگرو کے کھنڈروں میں ڈھیر ہو کر آنے والی نسلوں کے لیے اپنی مردانگی کا فسانہ چھوڑتا جائے گا۔ لیکن پیغمبر آخر الزمان ﷺ کے مکتوب کے پرزے اپنے ساتھ اس امید کو بھی آبِ فراسو کی نیلگوں موجوں میں بہالے گئے تھے۔ وہ تلوار جو فلسطین اور مصر کے پرخچے اڑاتی ہوئی طرابلس کے سر پر جا پہنچی تھی، ٹوٹ چکی تھی، وہ علم جو شام اور ایشیائے کوچک پر لہراتا ہوا باسفورس کے ساحل پر جا نصب ہوا تھا، جھک چکا تھا۔ وہ حوصلے جن کی بلندیاں فلک الافلاک کی آغوش میں تربیت پذیر ہوئی تھیں، پست ہو کر خاک میں مل چکے تھے۔ خسرو پرویز اب خسران و خذلان اور یاس و قنوط کا محض ایک پیکرِ متحرک رہ گیا تھا جس کی عزیمت سلب اور استقامت مفقود ہو چکی تھی۔ ہرقل کی آمد سے نو دن پہلے اپنی چہیتی ملکہ شیریں اور دو کنیزوں کو ہمراہ لیے ہوئے اپنے محل کے چور دروازہ سے نکل کر وہ اس بے سر و سامانی سے مدائن کی طرف بھاگا کہ چشمِ عبرت کھلی کی کھلی رہ گئی۔ آخر جب پایۂ تخت میں داخل ہو کر اس نے ہزاروں بندگانِ خدا کو اپنے سامنے سربسجدہ اور دجلہ کی موجوں کو اپنے اور رومی فوجوں کے درمیان حائل پایا تو ذرا اس کی جان میں جان آئی۔

پے در پے شکستوں اور توبرتو ہزیمتوں سے اگرچہ ایران کی جارحانہ قوت ٹوٹ گئی تھی مگر

پھر بھی اس کا مدافعانہ زور بدستور قائم تھا۔ سلطنت کے مشرقی اور وسطی صوبوں کی طاقت ابھی تک دولت ساسانیہ کی دیوار اقتدار کی پشتیبان تھی اور ہرقل اس حقیقت سے بے خبر نہ تھا۔ اسی لیے وہ چاہتا تھا کہ کسریٰ سے معقول شرائط پر صلح ہو جائے۔ دربار مدائن کے ساتھ مصالحانہ تعلقات قائم کرنے کی غرض سے اس نے کئی بار نامہ و پیام بھی کیا۔ لیکن خسرو کی واژگوں طالعی نے اس زریں موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ تقدیر کا گھڑیال بج چکا تھا اور دنیا کی کوئی طاقت بدبخت پرویز اور اس کی سلطنت کو تباہی سے بچا نہ سکتی تھی۔

ہرقل کی مراجعت کو غنیمت سمجھ کر خسرو نے ایک نئے لشکر کی تیاری کا حکم دیا لیکن وہ زمانہ خواب و خیال ہو چکا تھا۔ جب خسرو کے فرمان قضا تو اماں سمجھے جاتے تھے اور اس کے ایک اشارے پر سارے ایران کی گردن جھک جایا کرتی تھی۔ ملک پر سالہا سال سے جو تباہیاں نازل ہو رہی تھیں، ان سب کی جوابدہ رعایا کی نظروں میں اب صرف خسرو کی ذات تھی اور یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ خسرو سلطنت کے بہترین اغراض و مقاصد کو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر قربان کرنے سے کبھی باز نہ آئے گا۔ یہی وجہ تھی کہ امتثال امر میں اس مرتبہ کسی جاں نثارانہ عقیدت، کسی وفادارانہ سرگرمی کا اظہار نہ ہوا اور پایۂ تخت کی آبادی کے ایک قلیل حصہ کے سوا کہ اس کا جزو غالب بھی غلام تھے، نئی فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کسی نے آمادگی ظاہر نہ کی۔ اپنی بے اقبالی کا یہ کھلا ہوا ثبوت دیکھ کر اور رعایا کی روز افزوں بددلی کے چرچے سن کر خسرو کا دل ٹوٹ گیا اور ناامیدی کے عالم میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے سب سے زیادہ محبوب بیٹے مروازویہ کے حق میں تخت و تاج سے دست کش ہو کر زندگی کے باقی ایام گوشۂ عافیت میں گزار دے۔ لیکن اس عافیت کا جنازہ نوزائیدہ اسلام کی غیرت کے کندھے پر اس دن نکل چکا تھا جب خسرو نے پیغمبر آخر الزمان ﷺ کے مکتوب کے پرزے اُڑائے تھے۔

بس تجربہ کردیم در ایں دیر مکافات
با دردکشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد

خسرو کے بڑے بیٹے شیرویہ نے جو شیریں کے بطن سے تھا، خلفِ اکبر ہونے کی بنا پر اس فیصلے کو غیر منصفانہ قرار دیتے ہوئے امرائے سلطنت کے ساتھ جوڑ توڑ شروع کر دیے اور رعایا کے تمام طبقوں کو چپکے چپکے اپنا طرفدار بنا لیا۔ امرا کو اس امید نے اس کی طرف جھکا دیا کہ ایک

جواں سال تاجدار کی نئی نئی حکومت دولت اور عزت کی نئی نئی راہیں ان کے لیے کھول دے گی۔ فوج کے افسر اور سپاہی اس وعدے سے خوش ہوگئے کہ ان کی تنخواہیں بڑھا دی جائیں گی۔ عیسائیوں کو کامل مذہبی آزادی کے عطیہ کی خوش خبری سنائی گئی اور قوم کو یہ یقین دلا دیا گیا کہ رومیوں کے ساتھ فوراً با آبرو صلح کر لی جائے گی اور محصولات گھٹا دیے جائیں گے۔

اس وسیع سازش کا جال پھیلا کر جب شیرویہ نے اپنے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو خسرو کے طرف دار بھی جو آٹے میں صرف بقدر نمک کے رہ گئے تھے، زمانہ کا رنگ بدلا ہوا دیکھ کر اس کے ساتھ مل گئے۔ بے یار و مددگار خسرو نے پایہ تخت سے بچ نکلنے کی کوشش کی لیکن گرفتار کر لیا گیا۔ شیرویہ کے حکم سے اس کے اٹھارہ بیٹے اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کیے گئے۔ پھر وہ خود ایک تیرہ و تار زندان میں جھونک دیا گیا جہاں سفاک بیٹے کے ایما پر شکنجہ کے گونا گوں عذاب کے ساتھ مسلسل پانچ دن کی گرسنگی و تشنگی کی عقوبتوں نے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

نوشیرواں نے اپنے قصر دولت کے جن چودہ کنگروں کو خواب میں گرتے دیکھا تھا، ان میں سے ابھی دو ہی منہدم ہوئے تھے لیکن باقی بھی جلد ہی سرنگوں ہو جانے والے تھے۔ شیرویہ سے لے کر یزدجرد تک بارہ ساسانی تاجداروں نے صرف نو سال کا زمانہ پایا جس کے خاتمہ پر رسول اللہ ﷺ کے ارشاد اقدس کے مطابق اسلام کسریٰ کے پایۂ تخت میں جا پہنچا اور حضرت سعد بن ابی وقاص یہ آیات پڑھتے ہوئے ساسانیوں کی دولت سرا میں داخل ہوئے۔

کم ترکوا من جنٰت و عیون ○ و زروع و مقام کریم ○ و نعمة کانوا فیھا فکھین. کذٰلک و اورثنٰھا ھا قوماً اخرین۔(الدخان:25 تا 28)

(روزنامہ زمیندار 29 مارچ 1929ء)

ایک تاریخی معجزہ

سلطان نورالدین ابوالقاسم محمود ابن عمادالدین زنگیؒ کا شمار ان چند نفوس قدسی میں ہے جو ایک عظیم الشان سلطنت کے فرمانروا ہونے کے باوجود فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ جن کی نظروں میں تواناؤں اور ناتوانوں کی ایک حیثیت تھی۔ جن کا عدل اپنے اور بیگانے، مسلم اور مسیحی میں کسی قسم کا امتیاز روانہ رکھتا تھا۔ جن کو دیکھ کر خیر القرون کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ اسلام کے اس بطل کا ذکر مشہور مورخ ''گبن'' نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''زنگی کے نامور بیٹے نورالدینؒ کی سپاہ گرانہ قابلیت نے دمشق کی حکومت کو حلب کے ساتھ ملا کر شام کی صلیبی طاقتوں کا سالہا سال تک کامیابی سے مقابلہ کیا ہے۔ ہر معرکہ میں اپنے حریفوں کو زک دے کر اس نے بتدریج اپنی قلمرو کی حدود کو دجلہ سے لے کر نیل تک وسیع کر دیا اور لاطینی مسیحی بھی نہ صرف اپنے اس دشمن جانستان کی دانشمندی اور شجاعت بلکہ اس کے عدل و انصاف اور زہد و اتقا کا اعتراف کرنے پر مجبور تھے۔ اپنی روزمرہ زندگی اور سلطنت کے نظم و نسق میں اس مجاہد اعظم نے خلفاء راشدینؓ کے اسلامی جوش اور سادگی کو تازہ کر دیا۔ اس کے محل میں سیم و زر اور دیبا و حریر کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کی مملکت کے طول و عرض میں بادہ کش شراب کی ایک بوند کو ترستے تھے۔ شاہی خزانہ رعایا کی ضروریات کے لیے وقف تھا۔ اس کے گھر کا زیادہ خرچ، مال غنیمت کے اس حصہ میں سے پورا ہوتا تھا جو اسلامی فوج کے دوسرے سپاہیوں کی طرح جائز مقدار میں اسے ہاتھ لگتا تھا۔ ایک دفعہ اس کی چہیتی ملکہ نے ٹھنڈی سانس لے کر تنگی خرچ کی شکایت کی۔ نورالدینؒ نے جواب دیا: ''بانو! افسوس ہے کہ تمہاری خواہش پوری نہیں ہوسکتی۔ خدا کا خوف بیت المال کی طرف میرا ہاتھ بڑھنے نہیں دیتا۔ یہ مسلمانوں کا مال ہے۔ میں صرف اس کا امین ہوں اور اس میں سے ایک درہم کا بھی مستحق نہیں۔ البتہ حمص میں میری تین دکانیں موجود ہیں۔ ان پر تمہیں اختیار ہے۔ انہیں بیچ ڈالو یا ان کے کرایہ سے اپنی ضرورت پوری کرلو''۔

نورالدینؒ کا ایوان عدالت، زبردستوں کا ہیبت گاہ اور زیر دستوں کی جائے پناہ تھا۔ سلطان کی وفات کے بعد یہ نقشہ بدل گیا اور دمشق کی گلیوں میں ایک مظلوم رو رو کر پکارتا ہوا سنا گیا کہ اے نورالدینؒ! تو کہاں ہے، خاک سے اُٹھ اور ہم ستم زدوں کی فریاد سن۔

557ھ کا ذکر ہے کہ حضور سرور کائنات ﷺ ایک مرتبہ سلطان نورالدینؒ کو متواتر تین رات خواب میں نظر آئے۔ ہر دفعہ دو شخصوں کی طرف اشارہ فرماتے کہ مجھے ان کے شر سے بچا۔ از بس کہ عالم رؤیا میں کوئی طاغوتی قوت حضور ختم المرسلین ﷺ کی شکل اختیار کرنے پر قادر نہیں ہے۔ یہ خواب از قبیل اضغاث احلام نہیں بلکہ منجملہ رویاء صادقہ تھا۔ سلطان کی فراست ایمانی نے اسے یقین دلایا کہ مدینہ منورہ میں ضرور کوئی نہ کوئی واقعہ فاجعہ ایسا ظہور پذیر ہوا ہے جس سے آقائے دوجہاں کی روح مبارک بے قرار ہے۔ تیسری بار جب حضور ﷺ تشریف لائے تو رات کا کچھ حصہ باقی تھا۔ سلطان اسی وقت بستر سے اُٹھا اور بہت سا خزانہ اپنے ہمراہ لے کر 20 مقربان دولت کے ساتھ دمشق سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوا۔

سولہ دن کے سفر کے بعد مدینہ پہنچ کر سلطان نے خزانہ کا منہ کھول دیا اور منادی کرا دی کہ اہل مدینہ پر آج درہم و دینار کی بارش ہوگی۔ ہر چھوٹا بڑا اس خبر کے سنتے ہی بارگاہ سلطانی کی طرف دوڑ پڑا۔ ہر شخص باری باری سے باریاب ہوتا تھا اور انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر رخصت ہو جاتا تھا۔ اسی طرح سارا شہر سلطان کی نظر سے گزر گیا۔ مگر وہ موذی جو خواب میں دکھائی دیتے تھے اور جن کا حلیہ پتھر کی لکیر کی طرح سلطان کے دماغ پر نقش تھا، نظر نہ آئے۔ آخر سلطان نے روضہ نبوی ﷺ کے بعض خدام سے دریافت کیا کہ کوئی ایسا شخص تو باقی نہیں رہا جو انعام لینے نہ آیا ہو۔ انہوں نے عرض کیا: ''اور تو سب لوگ حاضر ہو چکے ہیں۔ فقط دو خدا رسیدہ بزرگ نہیں آئے جو مغرب (مراکش) کے رہنے والے ہیں اور دن رات عبادت میں مشغول رہنے کے باعث کسی سے نہیں ملتے۔ سلطان نے کہا کہ ان دونوں کو بھی اسی وقت حاضر کیا جائے۔ کچھ دیر کے بعد دو آدمی سلطان کے سامنے لائے گئے۔ سلطان نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور ایک نظر میں پہچان لیا کہ یہ وہی دو شخص ہیں کہ جن کی طرف حضور ﷺ نے خواب میں اشارہ کیا تھا۔ پوچھا کہ تم کہاں رہتے ہو؟ کہ روضہ مطہرہ کے مغرب کی جانب مسجد کی دیوار سے ملا ہوا ایک ویران سا مکان ہے، ہم اسی میں رہتے ہیں''۔

سلطان نے انہیں تو وہیں چھوڑا اور خود سیدھا اس مکان میں پہنچا۔ مکان میں داخل ہو کر اس نے ہر طرف متجسسانہ نگاہ ڈالی۔ مکان کا سامان مختصر سا تھا مگر جس قدر تھا، زبان حال سے مکینوں کے زہد و ورع کی شہادت دے رہا تھا۔ طاق پر قرآن مجید رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی تھیں جن کے مضامین پند و موعظت سے مملو تھے۔ ایک کونے میں مساکین وفقراء میں تقسیم کرنے کی غرض سے رسد کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ فرش پر ایک بہت بڑا بوریا بچھا ہوا تھا۔ ان میں کوئی چیز بجائے خود قابل اعتراض نہ تھی۔ سلطان حیران تھا کہ اب کیا کرے؟ آخر اسی قدسی جذبہ نے جو اسے دمشق سے کشاں کشاں مدینہ لے آیا تھا، اس کا ہاتھ بوریئے کی طرف بڑھایا کہ دیکھیے تو سہی اس کے نیچے کیا ہے۔ بوریئے کا اٹھنا تھا کہ ایک خوفناک حقیقت کا انکشاف ہوا۔ ان ملعونوں نے جن کے تقدس کا گھر گھر چرچا تھا، ایک نقب لگا رکھی تھی جس کا منہ حجرہ نبوی ﷺ کی طرف تھا۔ پاس ہی ایک گڑھا تھا جس میں کھدی ہوئی مٹی بھر دی جاتی تھی اور جب رات ہوتی تھی تو یہ نقب زن اس مٹی کو تھیلیوں میں بھر بھر کر بقیع کے میدان میں ڈال آتے تھے۔

سلطان نے ان دونوں خبیثوں کو موقع پر طلب کر کے غضب ناک لہجہ میں پوچھا کہ سچ سچ بتاؤ تم کون ہو اور یہ حرکت تم نے کیوں کی؟ پہلے تو انہوں نے واہی تباہی باتیں کرنی شروع کیں۔ لیکن جب شکنجۂ عقوبت میں کھینچے گئے اور موت سر پر منڈلاتی دیکھی تو اس خیال سے کہ اب اخفائے راز بے سود ہے، نڈر ہو کر بولے کہ ہم نصرانی ہیں۔ ہماری قوم نے ہمیں اس مقدس خدمت پر مامور کیا تھا کہ ہم مراکشی حاجیوں کے بھیس میں مدینہ والوں کی آنکھوں میں خاک جھونکتے ہوئے سینڈھ لگا کر تمہارے (معاذ اللہ) پیغمبر کی قبر تک جا پہنچیں اور............ ہمارا کام ختم ہو ہی چکا تھا اور نقب قبر تک پہنچ گئی تھی۔ دفعتاً آسمان پر بادل گرجا۔ جھکڑ چلنا شروع ہوا۔ زلزلہ آیا اور اس کے بعد تم آ پہنچے۔

سلطان کی اس وقت عجیب حالت تھی۔ قلب اُلٹ گیا اور جگر پانی پانی ہو کر آنکھوں میں آ گیا۔ اتنا رویا اتنا رویا کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ پھر سراپا جلال ہو کر اُٹھا اور تلوار کھینچ کر نقب ہی کے کنارے پر دونوں کی گردنیں اُڑا دیں اور ان کی ناپاک لاشیں آگ کے ایک دہکتے ہوئے الاؤ میں ڈلوا دیں کہ رسول اللہ ﷺ کی جناب میں گستاخی کرنے والوں کا یہی حشر ہونا چاہیے۔ اس کے بعد سلطان کے حکم سے حجرہ نبوی ﷺ کے گرداگرد ایک عمیق خندق کھودی گئی

جسے پگھلے ہوئے سیسہ سے پاٹ دیا گیا تا کہ پھر کسی خبیث نقب زن کا گستاخ ہاتھ حضور رحمت عالمیان ﷺ کی آرام گاہ تک نہ بڑھ سکے۔

اس واقعہ کو پیش آئے ہوئے تقریباً سات سو پچاسی سال گزر چکے ہیں۔ (حضرت مولانا کے دور کی بات ہے) اس وقت دمشق مسلمانوں کے زیر نگین تھا اور چند سال بعد صلاح الدین ایوبیؒ کا مقدس ہاتھ بیت المقدس کی بلندیوں پر اسلام کا علم از سر نو نصب کرنے والا تھا۔ حرمین شریفین کی حرمت پر کٹ مرنے کے لیے لاکھوں تیغ بکف مجاہد بے تاب تھے۔ صلیب پرستوں کی مجال نہ تھی کہ مکہ اور مدینہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں۔ تسخیر حجاز کا گستاخانہ عزم رجنالڈ ڈی شائیلان کی زبان سے اچھی طرح ادا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ نور الدین زنگیؒ کی کفر سوز تلوار کی طرح صلاح الدین ایوبیؒ کی شمشیر خون آشام صاعقہ قہر ذوالجلال بن کر اس کی گردن پر تھی۔ مگر آہ! آج حالت کچھ اور ہے:

اے سرا پردۂ یثرب بہ خواب
خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

(زمیندار 13 نومبر 1924ء)

اداریے، شذرات، توضیحات

قادیانیوں کی شرمناک بزدلی

تحریک ترک موالات کے دوران میں ہزاروں سرفروشان وطن کے خلاف مقدمے چلائے گئے اور چونکہ ان مقدمات سے حکومت کا منشا آزادی تقریر وتحریر کے حقوق اور بعض احکام مذہب کی تعمیل پر ناگوار قیود عائد کرنا تھا، اس لیے ملک کے بہادر مجاہدین نے ان مقدمات میں جوابدہی تک نہ کی اور خاموش جیل خانوں میں چلے گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم حق پر ہیں اور حکومت باطل پر اصرار کر رہی ہے۔ یہ حق وصداقت کی طاقت اور خلوص نیت کی قوت ہی تھی جس نے ان لوگوں کو جیل خانوں کی تکلیفیں برداشت کرنے کے قابل بنایا اور ان سے ایسے حیرت انگیز صبر وشکر کے ثبوت صادر ہوئے کہ ایک دنیا ان کی برداشت کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ کوئی مخالف اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا تو نہ کرے لیکن ہم تو کہیں گے کہ جن لوگوں نے ہندوستان کی آزادی کے مقصد کو حاصل کرنے اور خلافت مقدسہ اسلامیہ کا اقتدار بحال کرانے کے لیے جیل خانوں کی مصیبتیں اٹھائیں اور اٹھا رہے ہیں، ان کی نیکیوں کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں نہایت عظیم وجزیل ہے۔ وہ حق پر تھے اور جس بات کو حق سمجھتے تھے، اس کے لیے ہر قسم کا ایثار کرنے پر آمادہ تھے اور انہوں نے اپنے ایثار کے نہایت روشن ثبوت مہیا کیے۔

ان کے مقابل میں ان لوگوں کو دیکھو جنہوں نے اس تحریک کے دوران میں شدت خوف وہراس کی وجہ سے آواز تک نہ نکالی، وہ ہندوستان کی ذلتوں کا تماشا دیکھتے رہے۔ خلافت کی تباہ حالی نے ان کے دلوں کو متاثر نہ کیا اور وہ خاموش اپنے نہاں خانوں میں بیٹھے اپنے قدح کی خیر مناتے رہے لیکن جونہی تحریک کی رفتار نرم پڑنے لگی، وہ میدان میں آئے اور مذہب کی حمایت کا جامہ پہن کر ملک میں اختلاف وفساد کی آگ بھڑکانے لگے۔ لیکن کھرے اور کھوٹے سونے کی پہچان کے لیے کسوٹی موجود ہے، جوں ہی اس پر کسا گیا ملمّع اتر گیا اور اپنی صورت اصلی میں نظر آنے لگے، حکومت نے ان پر تعزیرات ہند کے ماتحت مقدمے چلائے اور یہ لوگ اتنی سی

بات پر لرز گئے۔ اگر وہ حالات کے تغیر کو مدِ نظر رکھ کر عدالتی عدم تعاون نہ کرتے اور مقدمہ کی پوری جواب دہی حسب منشائے قانون کر لیتے تو ہم اس کو بھی غنیمت سمجھتے اور طوعاً و کرہاً گوارا کر لیتے لیکن ان لوگوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ پیشتر اس کے کہ مقدمہ چلے اور حق و باطل کی تمیز ہو، ان لوگوں نے حکومت سے عاجزانہ معافی مانگی اور آئندہ کے لیے وعدہ کیا کہ ہرگز ایسی حرکت نہ کریں گے۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ**۔ یہ و تیرے ہیں ان لوگوں کے جو مذہب کے علم بردار کہلاتے ہیں اور جو اسلام کی حمایت میں تقریر و تحریر کر کے ایڑی سے چوٹی کا زور لگا دیا کرتے ہیں۔

پیغام صلح کے ایڈیٹر اور ان کے رفقا نے حکومت سے معافی مانگ لی، کیوں کہ مولوی عبدالحق شاستری نے اس اخبار میں ایک مضمون ''وید کا بھید'' درج کرایا تھا اور وہ مضمون حکومت کے نزدیک قابل اعتراض ٹھہرا۔ ان مجرموں نے حکومت کی خدمت میں عرض کیا کہ صاحب ہم نے جھک ماری کہ یہ مضمون لکھا اور شائع کیا، آئندہ ہم ہرگز وید کے مقابلے میں قرآن کی حمایت نہ کریں گے، خدا کے لیے ہمیں معاف کر دیجیے اور جیل خانے کی آفتوں سے بچا لیجیے۔

(زمیندار 29 دسمبر 1923ء)

خلیفۃ المسلمین اور خلیفۃ المسیح

قادیانیوں کے امیر مرزا بشیر الدین محمود نے 14 مارچ کو خطبہ جمعہ میں مسئلہ خلافت کے متعلق اظہار خیالات کرتے ہوئے بعض نہایت افسوسناک باتیں کہی ہیں جن کے متعلق خاموشی اور اعراض سے کام لینا ہمیں بے حد نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ان میں سے اکثر باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق ہمیں مرزا محمود کے خیالات پہلے بھی معلوم تھے لیکن ہمیں توقع تھی کہ گزشتہ دو تین سال کے واقعات نے ان کے لیے حالات کے زیادہ صحیح مطالعہ کا موقع فراہم کر دیا ہوگا یا کم از کم وہ اسلام کے موجودہ داخلی اور خارجی خطرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان خیالات کے اظہار سے اجتناب کریں گے لیکن افسوس کہ ہماری یہ توقع پوری نہ ہوئی، اس لیے ہمیں بھی مجبوراً زبان کھولنی پڑی۔............

مرزا بشیر الدین کی ''مسیحیت اسلام'' اس اعلیٰ منزل پر پہنچ گئی ہے کہ وہ دورانِ جنگِ عظیم میں ترکوں کی مخالفت اور انگریزوں کی حمایت کو مذہباً فرض قرار دیتے ہیں اور اس بات کا بہ تفاخر اظہار کرتے ہیں کہ انہوں نے اس فرض کو بوجہ احسن انجام دیا۔

گر مسلمانی ہمیں است کہ واعظ دارد
وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

مرزا صاحب کبھی کبھی یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ انگریزوں نے ہمیں کامل مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔اس لیے ان کی مخالفت جائز نہیں ہے۔اگر اس مذہبی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ سرکار انگلشیہ نے کوئی شرعی محکمہ احتساب و باز پرس قائم نہیں کیا، ہر شخص مذہبی معاملات میں آزاد ہے، اگر کوئی مسلمان صبح سے شام اور شام سے صبح تک شراب کے جواز پر تقریریں کرتا پھرے تو قانون مروجہ حکومت کے مطابق وہ کسی باز پرس کا مستوجب نہیں ہوتا۔اگر کوئی مسلمان نبی ہونے کا دعویٰ کر دے تو تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کے ماتحت وہ مجرم نہیں بنتا۔اگر اس آزادی کا مطلب و

مفہوم یہی ہے تو ہمیں اس سے انکار نہیں ہوسکتا لیکن اگر مذہبی آزادی کا مفہوم اس کے علاوہ بھی کچھ ہے تو پھر خدارا مرزا بشیر الدین بتائیں کہ وہ ہندوستان کے کس گوشے میں موجود ہے؟ ایک مرزا بشیر الدین کی جماعت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ جزیرۃ العرب کی سرزمین کو غیر مسلموں کے تسلط سے پاک رہنا چاہیے۔ مسلمان اس مقصد کے لیے سعی و جہد کرنا چاہتے ہیں، واقف کار اشخاص اپنے ناواقف بھائیوں کو حالات سے آگاہ کرتے ہیں اور انہیں اس اہم مذہبی فرض کے ادا کرنے کی دعوت دیتے ہیں لیکن کیا حکومت انہی حضرات کو قید و بند کی تکلیفوں میں نہیں ڈالتی؟ پھر کیا یہ مذہبی آزادی ہے؟ مرزا بشیر الدین کی جماعت کو مستثنیٰ کرنے کے بعد ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ اسے مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما نہیں ہونا چاہیے۔ اس عقیدہ کی عام طور پر تبلیغ کی کوشش کی جاتی ہے لیکن حکومت نے اس قسم کی تبلیغ میں حصہ لینے والے حضرات کو جیل خانوں میں ڈالا۔ کیا یہ مذہبی آزادی ہے؟ مرزا بشیر الدین کی جماعت کو مستثنیٰ کرنے کے بعد ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ خلافت کی حمایت وحفاظت اہم ترین مذہبی فرض ہے۔ گزشتہ تین چار سال کی مدت میں مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت نے اس فرض کو ادا کرنے کی کوشش کی۔ حکومت نے اس جماعت کے ساتھ جو سلوک کیا وہ مرزا بشیر الدین سے مخفی نہیں ہوگا۔ پھر کیا یہ مذہبی آزادی ہے؟ غرضیکہ کس کس معاملہ کو سامنے لایا جائے اور کس کس داغ کو وقف نظارہ کیا جائے۔ ممکن ہے کہ مرزا بشیر الدین کے ایک دو لاکھ پیروؤں کو ہندوستان میں مذہبی آزادی حاصل ہو جن کی نظروں میں کم از کم سیاسی حیثیت سے مذہب کا تصور یہی ہے کہ جو کچھ حکومت کا منشا ہو، اسے کتاب وسنت کا حکم بتلایا جائے۔ مگر باقی سات کروڑ کی آبادی تو حکومت کو قدم قدم پر اپنے مذہبی معاملات میں مداخلت کے جرم کا بہ کرات ومرات ارتکاب کرتی ہوئی پاتی ہے۔............

ہمیں یہاں اس امر سے بحث نہیں کہ ''مسیح موعود'' یا مرزا صاحب دنیا کے ہادی تھے یا نہیں۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ مصلح قوم ہندوستان سے اٹھے گی یا کسی دوسرے مقام سے۔ لیکن یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکار ہے کہ اگر وہ ہندوستان ہی سے پیدا ہوئی تو وہ مرزا بشیر الدین محمود کی جماعت نہیں ہوسکتی۔ جس جماعت نے ''افساد'' اور ''طاغوت'' کی حمایت ونصرت

کواپنا سب سے بڑا مذہبی وظیفہ قرار دے رکھا ہے، اگر وہی قوم ''مصلح'' کے سربلند نام سے موسوم ہوسکتی ہے تو پھر سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا میں افساد کا وجود ہی نہیں ہے اور جو کچھ ہمیں افساد نظر آرہا ہے وہ سب حقیقت میں اصلاح ہے۔ یاللعجب! کیا اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے مقابلے میں کفر کی حمایت کی جائے۔ ناموس شریعت کو پامال کرایا جائے؟ اسلامی آبادیوں پر سب سے بڑی آفتیں نازل کرنے والی طاقت کی حمایت کو فریضہ مذہبی قرار دیا جائے۔ متحارب کافروں کی غلامی کی ملعون زنجیریں مضبوط کی جائیں؟ اور وہ سب کچھ کیا جائے جو حمیتِ اسلام سے عاری دل کرسکتا ہے۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر مرزا بشیر الدین محمود کس طرح اصلاح کا لفظ اپنی زبان پر لا رہے ہیں؟ کیا اندھوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ دنیا کی بینائی کو درست کریں اور کیا کانٹوں کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ پھولوں کی رنگینی، ملائمت اور عنبر بیزی کے دعوے اپنی زبان پر لائیں؟ اگر ''خدا کا ہاتھ'' وہی ہے جس کا نقشہ مرزا بشیر الدین نے زیر بحث خطبہ میں کھینچا ہے تو پھر ہم نہیں سمجھتے کہ ''طاغوت'' کا ہاتھ کسے سمجھنا چاہیے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ خدائے برتر وتوانا مسلمانوں کو مرزا بشیر الدین کے ''خدائی ہاتھ'' سے بچائے۔ وہ اس ہاتھ سے جس قدر دور رہیں، اتنا ہی ان کے لیے اچھا ہوگا۔

(زمیندار 5اپریل، 9اپریل 1924ء)

کابل میں ایک قادیانی کی سنگساری

نعمت اللہ خاں قادیانی جو کچھ مدت سے زندانِ کابل میں محبوس تھا، بالآخر 31 اگست کو اعلیٰ حضرت شہر یار افغانستان کے حکم سے سنگسار کر دیا گیا۔ چونکہ ابھی افغانستان کے تازہ جرائد ہمیں موصول نہیں ہوئے اور اس کی سزا کی تجویز بہ تفصیل معلوم نہیں، اس لیے اس واقعہ پر رائے زنی قبل از وقت ہے۔ لیکن چونکہ قادیان کے مفتی محمد صادق نے جرائد میں ایک بیان شائع کرایا ہے اور اس سے دولت مستقلہ افغانستان اور اس کے روشن خیال حکمران کے متعلق بعض حلقوں میں غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے، اس لیے ہم چند سطور حوالہ قلم کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مملکت افغانستان میں صرف مختلف فرقہ اسلامی کے افراد ہی نہیں بلکہ ہزاروں ہندو بھی آباد ہیں جن کو توحید و رسالت کے عقیدوں سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس کے باوجود افغانستان کے روشن ضمیر حکمران کے ماتحت نہایت آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس لیے یہ دعویٰ ہرگز قابل اعتبار نہیں کہ نعمت اللہ خاں محض قادیانی ہونے کی وجہ سے سنگسار کیا گیا۔ جہاں تک ہمارا قیاس کام دیتا ہے، اس کی سنگساری کے وجوہ سیاسی ہوں گے اور وہ کسی ایسی سازش یا کسی ایسے منصوبے میں مصروف پایا گیا ہوگا جس سے حکومت افغانستان کو بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ اگر نعمت اللہ خاں پر ایسا جرم ثابت ہو جائے تو ہمارے نزدیک ہندوستان کے قادیانیوں کو بھی مضطرب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان کا اصول کار یہ ہے کہ جس حکومت کے زیر سایہ رہیں، اس کی خیر خواہی و وفاداری میں کبھی پہلو تہی نہ کریں۔ اگر کوئی شخص اس اصول کار کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ اپنی جماعت کی مسلمہ حکمت عملی سے انحراف کر کے خود اپنی جان تہلکہ میں ڈالتا ہے، لہٰذا جماعت اس سے اظہار ہمدردی کرنے میں مکلّف و مجبور نہیں ہے۔

جس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو، اس میں دوسرے مذاہب کے افراد کو ہرگز حق نہیں پہنچتا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کی طرف دعوت دے کر حکومت اسلامی کے استحکام کو

خطرے میں ڈالیں۔ اگر آج افغانستان کے ہندو اس ملک میں شدھی کا سلسلہ شروع کر دیں تو چونکہ یہ امر اسلامی حکومت کے وقار واختیار کے منافی ہوگا، لہٰذا حکماً روک دیا جائے گا۔ اگر نعمت اللہ خاں نے قادیانی عقائد کی تبلیغ کی ہوگی تو یقیناً یہ بھی کہا ہوگا کہ چند ہزار قادیانیوں کے سوا باقی تمام مسلمانان عالم کافر ہیں۔ ایک مسلمان حکمران، اس کے مسلمان ارباب حکومت اور اس کے مسلمان علماء وقضاۃ اس امر کو کیونکر گوارا کر سکتے ہیں اور شریعت اسلامی کب اس امر کی اجازت دے سکتی ہے کہ اس ملک کا ایک شخص اٹھے اور اپنے تمام مسلمان حکمرانوں پر کفر کا فتویٰ جڑ دے اور اس طرح حکومت اسلامی کے دینی ودنیاوی اقتدار کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو۔ ایسا شخص یقیناً شریعت کے نزدیک باغی، کافر اور واجب القتل ٹھہرے گا۔

ہم چاہتے ہیں کہ قادیانی اس معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ ایک بے معنی اور غیر معقول شورش پھیلانے کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکل سکتا۔

(زمیندار 10 ستمبر 1924)

خلیفہ قادیان اور اعلیٰ حضرت امیر غازی

مرزا بشیر الدین محمود نے نعمت اللہ خاں قادیانی کی سنگساری پر جمعیۃ الاقوام، وزیر اعظم برطانیہ، وزیر اعظم فرانس اور صدر جمہوریہ امریکہ کے نام احتجاجی پیغامات ارسال کیے ہیں اور ان سے توقع ظاہر کی ہے کہ وہ حکومت افغانستان کے فعل کے خلاف اظہار ناراضی کریں۔ ظاہر ہے کہ اس خفیف الحرکتی کا کوئی مفید نتیجہ مرتب نہ ہوگا کیونکہ جمعیۃ الاقوام کے صدر یا کسی حکومت کے وزیر اعظم کو کوئی حق نہیں کہ افغانستان کے اندرونی معاملات میں دخل دے۔ اگر اس طرح بعض حکومتیں دوسری حکومتوں کے مجرمین کی تعزیر کے متعلق احتجاج کا سلسلہ شروع کردیں تو سارا بین الاقوامی نظام بگڑ جائے۔ اگر حکومت فرانس اپنی رعایا کے کسی شخص کو کسی جرم پر سزائے موت دے دے تو حکومت ہند یا حکومت جاپان کو کیا پڑی ہے کہ وہ خواہ مخواہ اس سزا کے خلاف آواز بلند کرے۔ ہندوستان میں کئی محبان وطن پھانسی لگا دیے گئے، ہزاروں جیلوں میں بھیج دیے گئے لیکن دنیا کے کسی وزیر اعظم نے حکومت انگریزی کے خلاف احتجاج نہ کیا، اس لیے ان پیغامات سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ خلیفۂ قادیان نے عیسائیوں سے التجائے امداد کرکے بات بھی کھوئی اور فائدہ بھی کچھ نہ ہوا۔

ان قادیانیوں کو اپنی معقولیت پسندی اور حق پرستی پر بہت بڑا ناز ہے لیکن ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ سنگساری کے وجوہ معلوم کیے بغیر دنیا میں شور وشغب مچاتے پھرنا کہاں کی حق پسندی اور کدھر کا انصاف ہے۔ الفضل کی تازہ اشاعت میں نعمت اللہ خاں کی ہلاکت پر جو مقالہ افتتاحیہ شائع ہوا ہے، اس میں سلسلے کی مظلومی اور شہادت کے فلسفہ پر تو کئی کالم سیاہ کیے گئے ہیں لیکن اس امر کی طرف اشارہ تک نہیں کیا گیا کہ آخر حکومت افغانستان نے نعمت اللہ خاں پر کون سا الزام عائد کرکے موت کی سزا دی۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ اس الزام کی صحت وعدم صحت پر بحث کی جائے لیکن اس کی تکلیف نہ الفضل نے گوارا کی ہے نہ خلیفہ قادیان ہی کو باوجود دعوائے ہوشمندی اس ضرورت کا احساس ہوا۔

(زمیندار 14 ستمبر 1924ء)

نعمت اللہ خاں کی سنگساری

معزز معاصر مسلم آؤٹ لک میں ''ایک احمدی'' نے ایک مراسلہ شائع کرایا ہے جس میں نعمت اللہ خاں کی سنگساری پر اعلیٰ حضرت امیر غازی کو متہم کیا ہے اور اسی سلسلہ میں زمیندار کے تبصرہ پر بھی اظہار خیالات کی کوشش کی ہے۔ قادیانی نے بیان کیا ہے کہ حکومت کی وفاداری احمدیوں کا جزو ایمان ہے۔ چنانچہ ہر ملک کے احمدی ہمیشہ اپنی اپنی حکومت کے وفادار رہے ہیں اور آج تک کسی حکومت کو ان کی طرف سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ چنانچہ ہم نے بھی اپنے شذرہ میں اسی حقیقت کو مدنظر رکھ کر یہ شبہ ظاہر کیا تھا کہ غالباً نعمت اللہ خاں نے حکومت افغانستان کے خلاف کسی سازش میں شرکت کی ہوگی۔ اگر شرکت سازش کا شبہ غلط ہے تو اشاعت عقائد باطلہ کا جرم تو نعمت اللہ خاں پر ثابت ہو ہی چکا ہے۔ جب ''احمدی'' صاحب کے بیان کے مطابق ملک افغانستان میں کثیر التعداد ''احمدی'' موجود ہیں اور ان کی طرف سے حکمران افغانستان کے خلاف کبھی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ حضرت امیر غازی کسی شخص کو اس کے عقائد کی وجہ سے مستوجب سزا قرار نہیں دیتے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ کثیر التعداد قادیانیوں میں سے صرف نعمت اللہ خاں ہی سنگساری کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس امتیاز سے واضح ہے کہ نعمت اللہ خاں کا جرم صرف قادیانی ہونا ہی نہ تھا بلکہ اس کے علاوہ بھی کچھ الزام اس پر ثابت ہوا ہوگا جس کی وجہ سے علمائے افغانستان کو اس کی سنگساری کا فتویٰ دینا پڑا۔

''احمدی'' نے بھی اور مدیر مسلم آؤٹ لک نے بھی اس امر پر زور دیا ہے کہ اسلام چونکہ مذہبی آزادی کا حامل ہے، اس لیے حکومت افغانستان کا یہ فعل قابل اعتراض اور روح اسلامی کے خلاف ہے لیکن ہمیں تعجب ہے مذہبی آزادی کے اس قدر غلط معنی کیوں لیے گئے ہیں؟ اگر مذہبی آزادی اس چیز کا نام ہے کہ ہر خالد، عمر اور بکر کو اپنے عقائد باطلہ کے اظہار اور ان کی اشاعات کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے تو ممالک اسلامی میں بھی وہی فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے جو آج کل

ہندوستان میں پیدا ہو رہا ہے۔ حکومت انگریزی کی سیاست کے لیے تو یہی مفید ہے کہ عوام مذہباً بالکل آزاد چھوڑ دیے جائیں۔ بقول مولانا اکبر مرحوم:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

لیکن ظاہر ہے کہ شریعت الاسلامیہ اس قسم کی مادر پدر آزادی کی اجازت نہیں دیتی۔ جو اسلامی حکومتیں احکام شرع پر عمل کرتی ہیں ان کا رویہ یہی ہے اور یہی ہونا چاہیے کہ فروعی اختلافات سے اغماض کریں لیکن اصولی عقائد کے تحفظ میں اپنی پوری قوت صرف کر دیں۔ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ جو شخص کسی اسلامی حکومت کے ماتحت رہ کر ختم نبوت کا قائل نہیں، ایک معمولی شخص کے دعوائے نبوت کا مصدّق ہے، مسلمانان عالم کو کافر مطلق سمجھتا ہے، جماعت اسلامیہ، اتحاد بین المسلمین، خلافت اور جہاد فی سبیل اللہ کو لغو و بیہودہ خیال کرتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ اپنے ان عقائد باطلہ کو جو مذہباً منجر بہ کفر اور سیاستاً مشعر بر بغاوت ہیں، دوسروں تک بھی پہنچانا چاہتا ہے۔ ایسے شخص کے متعلق شریعت غرائے مصطفوی اور سیاست اسلامی قتل سے کمتر سزا تجویز نہیں کر سکتی۔ آج جو شخص ترکی میں رہ کر جمہوریہ ترکی کے بنائے ہوئے قوانین کے خلاف شورش پھیلائے اور ایران میں رہ کر سردار سپاہ آقا رضا خاں کی اصلاحات کے خلاف علم سرکشی بلند کرے، اس کے قتل اور اس کی اسیری پر تو مسلمانان عالم اظہار اطمینان کریں لیکن جو شخص افغانستان کے ماتحت رہ کر نہ صرف اعلیٰ حضرت امیر غازی اور ان کے امراء علما اور رعایا و برایا کو کافر بتا کر سیاست افغانیہ میں ایک فتنۂ عظیم کا باعث ہو بلکہ خود خدا کے رسول کی قائم کی ہوئی صداقتوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے، اس کے قتل پر مسلم آؤٹ لک جیسا پر جوش اسلامی اخبار بھی بیقرار ہو جائے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

مدیر مسلم آؤٹ لک کو معلوم ہونا چاہیے کہ احمدیوں کے نزدیک رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین نہیں ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود، مہدی موعود اور مستقل نبی ہیں جن کی نبوت کا انکار دوسرے انبیا کی نبوت کے انکار کی طرح کفر ہے، جہاد فی سبیل اللہ ناجائز اور غیر ضروری ہے، تمام مسلمانان عالم کافر ہیں، خلافت الاسلامیہ ایک موہوم باطل اور بیہودانہ چیز ہے، حکومت

برطانیہ دنیا کے لیے رحمت کا پیغام ہے اور اس کے تسلط واقتدار کے خلاف شورش پھیلانے والے گمراہ، ناشکرے اور یہودی ہیں۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ آیا کوئی اسلامی حکومت یہ گوارا کر سکتی ہے کہ کسی قادیانی کو ان عقائد باطلہ کے اظہار ونشر کے لیے آزاد چھوڑ دے اور اپنے ملک کی سیاست کو سخت نقصان پہنچانے کے علاوہ خدا اور رسول اور مومنین کی جماعت کو بہتان وافترا اور توہین وتکفیر کا نشانہ بننے دے؟

ہم چاہتے ہیں کہ مسلم آؤٹ لک کے فاضل، پرجوش اور مخلص مدیر اس مسئلہ پر محض شریعت اسلامیہ کے نقطہ خیال سے غور فرمائیں اور قادیانیوں کے ساتھ مل کر اس مسلمان فرمانروا کو بدنام کرنے کی کوشش نہ کریں جس نے محض خدا اور رسول ﷺ کے احکام پر عمل کر کے ایک مرتد کو سنگساری کی سزا دی ہے اور جس کے دم سے مسلمانان ایشیا کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

(زمیندار 18 ستمبر 1924ء)

مذہبی آزادی کی حقیقت

نعمت اللہ خاں کی سنگساری

تمام ہندوستان کے اسلامی جرائد میں غالباً صرف ایک مسلم آؤٹ لک ہی ہے جس نے نعمت اللہ خاں قادیانی کی سنگساری پر دولت عالیہ مستقلہ افغانستان کو متہم کرنے کی کوشش کی ہے اوراس کی اس حرکت پر احتجاج کیا ہے۔اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ معزز معاصر کے نزدیک مذہبی آزادی کا تصور خالص مغربی اور مسیحی ہے۔اس عزت واحترام کے باوجود جو ہمارے دل میں جناب داؤد اپسن کی طرف سے جاگزیں ہے، ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آپ نے علمائے کرام سے استصواب کیے بغیراس سنگساری پر اظہار خیالات فرمانے کی جرأت کی ورنہ اگر آپ اتنا معلوم کر لیتے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا کیا ہے اور قادیانیوں کے عقائد کفر وارتداد کی حد تک پہنچتے ہیں یا نہیں تو آپ کو **لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ** کی غلط تفسیر بیان کرنے کی حاجت پیش نہ آتی۔

واضح رہے کہ جس قسم کی مذہبی آزادی کا تصور بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں کے دماغوں میں جاگزیں ہے اور جسے ہم ''مادر پدر آزادی'' سمجھتے ہیں، وہ انہی حکومتوں میں ممکن ہے جو مذہب سے کچھ واسطہ نہیں رکھتیں اور جن کی تعزیرات کسی الہامی قانون سے ماخوذ نہیں ہیں۔اسلام میں سیاست اور مذہب جداگانہ نہیں بلکہ خود مذہب ہی سیاست ہے اور مسلمانوں کے تمام اعمال و افعال پر حاوی ومسلط ہے۔ایک غیر اسلامی ملک کی حکمراں طاقت اپنے وضع کیے ہوئے قوانین نافذ کرتی ہے اوران کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مبتلائے تعزیر کرنے کا حق رکھتی ہے۔لیکن اس کے خلاف اسلامی حکومت کسی شخص یا کسی جماعت کے اقتدار کا نام نہیں بلکہ خدا اور رسول ﷺ کی حکومت کا نام ہے۔مسلمانوں کا امیر اوراس کے رفقائے حکومت کوئی حکم اپنی مرضی سے نہیں دے سکتے بلکہ ان کا فرض صرف یہ ہے کہ احکام شریعت کی تعمیل کرائیں اوراوامر ونواہی اور حدود وتعزیرات کا نفاذ کریں جو قرآن وحدیث اور ائمہ مجتہدین کے ارشادات سے ماخوذ ہیں۔لہٰذا ثابت ہوا کہ

کسی اسلامی حکومت کے ماتحت قرآن وحدیث کے کسی حکم کی خلاف ورزی ویسی ہی قابل تعزیر ہے جیسی غیر اسلامی حکومتوں کے نافذ کردہ قوانین کی نافرمانی، ان کی رعایا کے لیے موجب حد و تعزیر سمجھی جاتی ہے۔

جب یہ امر مسلم ہوگیا کہ اسلام میں مذہب وسیاست جداگانہ چیزیں نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ جو شخص کفر وارتداد کا مرتکب ہوگا، اس کو شرع اسلامی کی تجویز کردہ سزا دی جائے گی۔ تمام دنیا کے مسلمان علما اس پر متفق ہیں کہ اسلام میں کفر وارتداد کی سزا قتل ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلام میں صدہا ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرتدین کے لیے ہمیشہ علمائے کرام نے سزائے موت کا فتویٰ دیا ہے اور حکومت نے ہمیشہ خدا اور رسول ﷺ کے حکم پر سر تسلیم خم کر کے اس کا اجرا و نفاذ کرایا۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا قادیانی عقائد کو تسلیم کر لینے سے کوئی شخص شرع اسلامی کی اصطلاح میں مرتد ہو جاتا ہے یا نہیں۔ حقیقی بحث یہی ہے اور ہمارے نزدیک قادیانیوں کو بھی بیہودہ شور وشغب مچانے کے بجائے ایسے دلائل وبراہین پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی جن سے ان کے ارتداد کی نفی ہوتی۔ لیکن انہوں نے اس ضروری مبحث کو نظر انداز کر کے ''ظلم وستم'' کی فریاد شروع کر دی جو ایک غوغائے بے دلیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

قادیانیوں کے نزدیک ختم نبوت کا وہ مطلب نہیں جو حضور سرور کائنات ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو سمجھایا جو مفسرین ومجتہدین کرام نے سمجھا اور جن پر آج تک ساری دنیائے اسلام متفق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی ظلّی اور غیر تشریعی نبی ہیں اور وہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد اسی طرح مبعوث ہوئے ہیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے اور اپنی کوئی نئی شریعت نہ لائے تھے بلکہ توریت ہی کے احکام کی تجدید کے لیے مامور کیے گئے تھے۔ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت کا منکر مسلمہ طور پر کافر ہے، گو وہ شریعت موسوی پر پوری طرح عمل پیرا ہو۔ اسی طرح جو مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی نہیں مانتا، وہ قادیانیوں کے نزدیک کافر ہے، گو شریعت محمدی پر عمل پیرا ہو۔ اس طرح گویا قادیانیوں کے نزدیک چند ہزار یا چند لاکھ احمدیوں کے سوا باقی چالیس کروڑ مسلمانان عالم کافر ہیں۔

حضرت رسول کریم ﷺ کی ایک حدیث جو صحاح میں وارد ہے، مظہر ہے کہ جس نے میرے بعد نبوت کا دعویٰ کیا، وہ کافر ہوگیا۔ اس لحاظ سے مرزا قادیانی علمائے اسلام کے نزدیک

کافر ہے اوران کے متبعین بھی اسی قبیل سے ہیں۔گو بعض علما مرزا اوران کے متبعین کو مؤول قرار دے کر صرف ضال اور گمراہ سمجھتے ہیں اور ایسا کافر نہیں جانتے جو ملت اسلامیہ سے خارج ہو۔لیکن جب مقتدیان مرزا خود مسلمانان عالم کو کافر قرار دیتے ہیں تو وہ مکفرین مسلمین ہونے کی حیثیت سے از روئے حدیث خود بخود کافر ہو جاتے ہیں۔

جب قادیانیوں کے نزدیک تمام مسلمانان عالم کافر ہو چکے تو گویا قادیانی عام مسلمانوں کی جماعت میں شریک نہ رہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ خلافت اسلامیہ، جہاد فی سبیل اللہ، اتحاد بین المسلمین غرض تمام مصالح عالیہ اسلامیہ سے منکر ہو گئے ہیں اور آج کل مسلمانان عالم غیر اسلامی طاقتوں کے مقابلہ میں جو جدوجہد کر رہے ہیں، وہ قادیانیوں کے نزدیک حرکت مذبوحی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی حالانکہ ساری دنیائے اسلام اس کو جہاد فی سبیل اللہ سمجھ رہی ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کی ساری زندگی وفاداریٔ برطانیہ میں گزری اور مرزا بشیر الدین محمود بار بار کہہ چکے ہیں کہ حکومت کی وفاداری احمدیوں کا جزو ایمان ہے اور حکومت برطانیہ **اولی الآمر منکم** کی مصداق ہے، گویا خدا و رسول ﷺ کی طرح واجب الاطاعت ہے۔حالانکہ مسلمانوں پر خوب روشن ہے کہ اس حکومت نے ساری دنیائے اسلام میں اپنی حرص و آز اور مسلم آزار حکمت سے ایک قیامت برپا کر رکھی ہے۔لیکن چونکہ حکومت برطانیہ کے ماتحت قادیانیوں کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے، اس لیے وہ اس کی خیر منا رہے ہیں اور چونکہ ان کے نزدیک مسلمانان عالم کافر ہیں، اس لیے ان کی مصیبتیں قادیانیوں کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔قادیانی جہاں کہیں جاتے ہیں، مقاصد برطانیہ کا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔چنانچہ انگلستان اور جرمنی میں انہوں نے جو تبلیغ اسلام کا کام شروع کر رکھا ہے، اس کے متعلق بھی بیسیوں شکایتیں موصول ہو چکی ہیں کہ تبلیغ اسلام کے پردہ میں تبلیغ مقاصد برطانیہ کا کام کیا جا رہا ہے۔

ہم نے قادیانیوں کے جو عقائد لکھے ہیں، وہ بالکل درست ہیں۔اگر کسی مسلمان کو ہم پر غلط بیانی یا متعصّبانہ جانب داری کا شبہ ہو تو وہ کسی قادیانی سے دریافت کر سکتا ہے۔ظاہر ہے کہ ایسے عقائد رکھنے والا آدمی کسی اسلامی حکومت کے نزدیک بے ضرر نہیں سمجھا جا سکتا۔نعمت اللہ خاں کے نزدیک اعلیٰ حضرت امیر غازی، ان کے علماء، ان کے امرا اور تمام ملت افغانیہ کے افراد کافر

تھے اور کسی اسلامی حکومت کی سیاست اجازت نہیں دے سکتی کہ ایسے شخص کو آزاد چھوڑ دیا جائے بلکہ شریعت غرائے اسلامیہ اور سیاست ملکی، دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے مرتد اور باغی کو کم از کم قتل کی سزا دی جائے۔

اگر علمائے اسلام اس قسم کے خوفناک فتنوں کے سدباب میں سرگرم نہ رہیں تو عالم اسلام کی سیاست بالکل تباہ و برباد ہو جائے اور مذہب بازیچۂ طفلاں ہو کے رہ جائے۔ اگر علمائے ایران بابی اور بہائی فتنہ کا مقابلہ زور و شور سے نہ کرتے تو آج یہ فتنہ دنیا کے ملکوں میں پھیل چکا ہوتا اور اس سے جو نقصان پہنچتا، اس کا اندازہ مدیر مسلم آؤٹ لک ہم سے بہتر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ حال ہی میں ایران سے واپس آئے ہیں اور بعض بھائیوں سے ملاقات اور مبادلۂ خیالات بھی کر چکے ہیں۔

ہم مسلم آؤٹ لک کے فاضل مدیر کی خدمت میں نہایت ادب سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ آپ ہمارے مضامین پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں اور جس امر میں کوئی شبہ لاحق ہو، اس کو علمائے کرام کی خدمت میں پیش کر کے اپنا اطمینان کر لیں۔ قادیانیوں نے عام مسلمانوں اور اسلامی سلطنتوں کو بدنام و رسوا کرنے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے، اس میں ان سے تعاون کرنا مقاصد اسلامیہ کو نقصان پہنچانا ہے۔

(زمیندار 20 ستمبر 1924)

نعمت اللہ خاں کی سنگساری

قادیانیوں کی فتنہ انگیزیاں

ضبط کروں میں کب تک آہ
چل مرے خامے بسم اللہ

نعمت اللہ خاں کی سنگساری کے وقت سے قادیانیوں نے اعلیٰ حضرت امیر غازی اور دولت مستقلہ افغانستان کے خلاف شرانگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کا جو طوفان برپا کر رکھا ہے، اس کے بعض پہلوؤں پر قبل ازیں نقد و تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ یہ واقعہ فی نفسہٖ اتنا اہم نہیں تھا کہ اس کے متعلق متواتر و مسلسل طویل شذرات و مقالات سپرد قلم کیے جاتے۔ لیکن اس باب میں قادیانیوں کے شور وغل اور ہاو ہو نے مسئلہ کی حیثیت زیادہ اہم، زیادہ نازک اور بطور خاص توجہ طلب بنا دی ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس معاملہ کے تمام قابل ذکر پہلو قارئین کرام کے سامنے آجائیں۔

قادیانی، مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کے منکرین کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک اپنی جماعت کے چند لاکھ افراد کے سوا دنیا کے کروڑوں فرزندان توحید کافر ہیں۔ قادیانی جماعت مرزا قادیانی کے وقت سے لے کر مسلسل و متواتر مسلمانوں کی تمام اجتماعی قومی تحریکات سے الگ رہی ہے اور گزشتہ بیس پچیس سال میں کسی مسلمان کہلانے والی جماعت نے جماعتی حیثیت سے باطل، کفر اور طاغوتیت کی تقویت و ترقی اور قوت اسلام کے استیصال و بیخ کنی کی اتنی کوششیں نہیں کیں جتنی کہ قادیانیوں نے کیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کو ''نبی'' ماننے والے لوگ مرکز خلافت کی تباہی و بربادی اور مولد و ماویٔ اسلام کی بے حرمتی و بے آبروئی میں سب سے بڑھ کر حصہ لینے والوں کو اولی الامر سمجھتے رہے اور یہ ان کی اطاعت و فرمانبرداری کو خدا اور رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرح واجب قرار دیتے رہے۔ غالبًا یہ عرض کرنے کی

ضرورت نہیں ہے کہ ان سے بڑھ کر اسلامی بے غیرتی، دینی بے حسی اور مذہبی بے حمیتی کے اور کوئی شواہد نہیں ہو سکتے تھے۔

نعمت اللہ خاں کی سنگساری کے واقعہ کی حیثیت بالکل معمولی تھی۔ ہر اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ شریعت حقّہ کے مقررہ اصول کے مطابق مسلمانوں کے عقائد واعمال کے احتساب کے لیے ایک نظام قانون مرتب کرے۔ حکومت افغانستان اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ایک مایہ ناز اسلامی حکومت ہے، اس کے ہاں بھی احتساب عقائد واعمال کا ایک قانون نافذ ہے۔ اگر اس قانون کے مطابق کسی مسلمان کہلانے والے شخص کے اعمال وعقائد مستوجب سزائے قتل ہیں اور اسے یہ سزا دی جاتی ہے تو دنیا کے کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس سزا کے نفاذ پر معترض ہو۔ بہت ممکن ہے کہ بعض اشخاص کے نزدیک وہ قانون حقیقی شرعی قوانین کے ساتھ پوری پوری مطابقت نہ رکھتا ہو لیکن حکومت افغانستان مرزا قادیانی کی باطل دوست امت کے کسی فرد کی خاطر اپنا سارا نظام نہیں بدل سکتی اور ایک نعمت اللہ خاں کی خاطر افغانستان کے لاکھوں کروڑوں فرزندان توحید کے مفاد و مقاصد اور عقائد واعمال سے بے پروا نہیں ہو سکتی۔ جو حقیقت ناشناس اس سلسلہ میں **لا اکراہ فی الدین** کے قرآنی حکم کو پیش کر رہے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ حکم غیر مسلموں کے متعلق ہے نہ کہ مسلموں کے متعلق۔ افغانستان میں صدہا ہندو اور دوسرے مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ اپنے اپنے مذاہب کے مقررہ احکام واوامر کی حسب دل خواہ پابندی کرتے ہیں اور حکومت افغانستان ان میں سے کسی شخص کے افعال سے معترض نہیں ہوتی لیکن وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ ایک فرد مسلمان کہلائے اور اس کے بعد ایسے عقائد واعمال کا اظہار کرے جنہیں اسلام کے ساتھ دور کی نسبت بھی نہ ہو۔ اگر **لا اکراہ فی الدین** کا وہی مطلب سمجھا جائے جو نعمت اللہ خاں کی سنگساری کے سلسلہ میں پیش کیا جاتا ہے تو پھر کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ ہر شخص مسلمان کہلا کر احکام واوامر دین کی مہمل سے مہمل، لغو سے لغو اور باطل سے باطل تاویلات کر سکتا ہے اور حکومت اسلامیہ کو اس کے کسی فعل سے تعرض کا حق حاصل نہیں ہے؟ آج ایک جماعت ختم نبوت کی نئی تاویل کر رہی ہے، کل کوئی شخص اٹھ کر صدہا دوسرے احکام کی بنیادوں پر ضربیں لگا سکتا ہے اور اپنے باطل پرست نفس کی خاطر مذہب کے سارے نظام کو درہم برہم کر سکتا

ہے پھر خدارا ہمیں بتلایا جائے کہ اس باطل وسعت مشرب کا اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکلے گا کہ چند روز کے بعد مذہب عملاً دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ قادیانیوں کو اگر حکومت افغانستان کے اس تعزیری قانون پر کوئی اعتراض تھا اور ان کے دل میں اسلام کی محبت والفت کا کوئی جذبہ موجود تھا تو ان کے لیے واحد طریق کار یہ تھا کہ وہ ادب واحترام کے تمام قواعد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اعلیٰ حضرت امیر غازی کی خدمت میں عرضداشت پیش کرتے اور اپنے عقائد کو اسلام کے مطابق ثابت کر کے اس قانون کے نفاذ کو روکتے۔ وہ مسلمانان عالم سے التجا کرتے کہ وہ اعلیٰ حضرت امیر غازی کی حکومت کو اس فیصلے پر نظر ثانی کی دعوت دیں لیکن افسوس صد ہزار حسرت وافسوس کہ ان کی دشمن اسلام فطرت اس طریق کار کی پابندی پر مائل نہ ہوئی بلکہ وہ اٹھ کر اعلیٰ حضرت امیر غازی کے وجود گرامی کے خلاف انتہائی ناشائستہ کلمات استعمال کرنے لگے اور امریکہ، انگلستان، فرانس اور جمعیۃ الاقوام کے پاس پہنچے کہ یہ ''اسلامی طاقتیں'' اس بارے میں ان کی امداد کریں۔ کیا اسلامی بے غیرتی کی اس سے بدتر بھی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟

قادیانی جماعت کے تمام اعمال ہمارے سامنے ہیں۔ 1918ء میں مرکز اسلامی کی تباہی کے سامان جمع ہو چکے تھے۔ 1920ء میں دول متحدہ اس کی تباہی پر مہر تصدیق ثبت کر چکی تھیں۔ اس پر ساری دنیائے اسلام میں بے چینی، اضطراب اور پریشانی کی آگ لگ گئی لیکن قادیانی جماعت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ جزیرۃ العرب کی پاک سرزمین پر کفر وغداری کی تاریک گھٹائیں مسلط ہو گئیں، اس کی عزت وحرمت خاک میں مل جانے کے سامان جمع ہو گئے لیکن قادیانیوں کے دل ان مہلک اسلامی حوادث سے اسی طرح غیر متاثر رہے کہ گویا انہیں اس اسلام سے قطعاً کوئی تعلق ہی نہ تھا جسے حضور سرور کائنات (**بابی انت و اُمی یا رسول اللّٰہ**) دنیا میں لائے تھے۔ ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں ہندو ہم وطنی کی مقتضیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے ہم آہنگ ہو گئے۔ لیکن قادیانی مرکز خلافت کی قوت وطاقت اور جزیرۃ العرب کی عزت وحرمت کا شیرازہ درہم برہم کرنے والوں کو ''اولی الامر'' بتلاتے رہے اور ان کی اطاعت کو اہم جز و اسلام ظاہر کرتے رہے۔ اب حکومت افغانستان نے اپنے مسلمہ قانون احتساب عقائد کے مطابق ایک قادیانی کو الحاد وارتداد کی سزا دی تو قادیان سے لے کر مرزا بشیر الدین محمود کی

منازل سفر تک ایک آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ قادیانیوں کا اسلام ہے، یہ ان کے جذبہ کی حقیقی تصویر ہے، یہ ان کی غیرت ملی کا غیر مشتبہ مظاہرہ ہے۔ پھر کیا کوئی شخص ان اعمال پر ایک لحظہ کے لیے بھی فخر کر سکتا ہے اور کیا یہی وہ اسلام تھا جس کے احیا و تجدید کی خاطر بہ زعم قادیانیاں مرزا غلام احمد قادیانی چودہویں صدی میں خلعت نبوت سے سرفراز کیے گئے تھے؟

مرزا بشیر الدین محمود خلافت کی تباہی کی کوششیں کرنے والوں کو ''اولوالامر'' قرار دے کر واجب الاطاعت بتلاتے رہے ہیں، وہ جزیرۃ العرب کی پاک سرزمین پر کفر و غداری کی گھٹائیں مسلط کرنے والوں کو اپنے بادشاہ بتلاتے رہے ہیں اور کہتے رہے کہ بادشاہ وقت کی فرمانبرداری اسلام کا ایک لاینفک جزو ہے خواہ اس کے افعال و اعمال کتنے ہی مخرب اسلام کیوں نہ ہوں۔ پھر کیا اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں، نعمت اللہ خاں قادیانی کے ''اولوالامر'' نہ تھے؟ اگر مرزا بشیر الدین محمود اپنے ''اولوالامر'' کی اطاعت کے جوش اشتیاق میں مرکز اسلام کی تباہی کو خاموشی کے ساتھ گوارا کر سکتے ہیں، جزیرۃ العرب کی مقدس و پاک سرزمین کی عزت و حرمت کے زوال کو بطیّب خاطر برداشت کر سکتے ہیں تو پھر مرزا بشیر الدین محمود نعمت اللہ خاں کے ''اولوالامر'' کے قانون احتساب عقائد و اعمال کے نفاذ پر کیوں امریکہ، فرانس، انگلستان اور جمعیۃ الاقوام کے دروازوں پر بے تابانہ دوڑے پھرتے ہیں؟ کیا قادیانیوں کے لیے دنیا بھر میں ''اولوالامر'' صرف انگریز ہیں اور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں غازی کو اپنی سلطنت کی حدود میں بھی ''ولایت امر'' کا حق نہیں پہنچتا؟

مسلمانان عالم نے خلافت کے مصائب میں ترکوں کی ہر ممکن امداد کی اور ہر طاقت کے خلاف اپنی اپنی استطاعت و مقدرت کے مطابق سعی و جہد کرتے رہے جو اس سرتاج دنیائے اسلام قوم کو تباہ کرنے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ لیکن جب مصطفیٰ کمال پاشا نے دنیائے اسلام کے بہت بڑے حصہ کی خواہشوں، آرزوؤں اور اعتقاد کے خلاف منصب خلافت کی ہیئت منقلب کر دی تو مسلمان امریکہ، فرانس، اٹلی، برطانیہ اور جمعیۃ الاقوام کے پاس التجائیں لے کر نہ گئے کہ مصطفیٰ کمال پاشا اور ان کے رفقا کو فنا کر دیا جائے بلکہ اس امر کی کوششیں کرنے لگے کہ ایک بین الملّی اسلامی موتمر منعقد ہو جس میں تمام ذی رائے اور ذی علم مسلمانوں کے مشورہ سے قیام

خلافت کی تدابیر کا خاکہ مرتب کیا جائے۔ اس کے خلاف مرزا بشیر الدین محمود اور ان کے راہ گم کردہ ریوڑ کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے نعمت اللہ خاں کو بہ پاداش الحاد وارتداد سزائے سنگساری ملتے ہی اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں غازی اور دولت مستقلہ افغانستان کے خلاف بے ہودہ شور وشغب کا سلسلہ شروع کر دیا ہے اور وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر ان بڑی بڑی غیر مسلم طاقتوں کے دروازوں پر بھاگے دوڑے پھرتے ہیں جنہوں نے اسلام کو نقصان پہنچانے کی سب سے بڑھ کر کوششیں کیں۔ اگر قادیانیوں کے دل میں محبت اسلام کا کوئی خفیف سے خفیف جذبہ بھی موجود ہوتا تو اس معاملہ کو مسلمانوں کے روبرو پیش کرنے کی بجائے کفر کی پناہ نہ ڈھونڈتے۔

آج ہمیں یہ بتلایا جاتا ہے کہ نعمت اللہ خاں کا صابرانہ جان دے دینا ''مرزائیت'' کی حقانیت کا قاطع ثبوت ہے حالانکہ دنیا کی تاریخ میں باطل پرستوں کے باطل کی خاطر جانیں دینے کی بھی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ قادیانی تو اپنی حقانیت میں افغانستان کے تین قتل پیش کرتے ہیں، بابیت کی تاریخ اس طرح جانیں دے دینے کی کئی حیرت انگیز مثالیں پیش کر رہی ہے لیکن ان مثالوں کی بنا پر بابی مذہب مبنی علی الحق ثابت نہیں ہوسکتا۔ باطنی فرقے کے صدہا کارندے بے دریغ قتل ہوئے لیکن ان کا یہ ''ایثار'' باطنی فرقے کی صداقت کے ثبوت فراہم نہیں کرسکا۔ قادیانیت کی تاریخ کا ماحصل افغانستان کے تین قتل ہی نہیں ہیں بلکہ اس کا ایک ایک ورق صدہا ننگ اسلام حرکتوں سے سیاہ ہے۔ خون کے یہ چند قطرے جو خود باطل پرستی کے راستے میں بہے، تاریخ قادیانیت کے اوراق کی سیاہی کو دور نہیں کر سکتے۔

قادیانیوں کی شرانگیزی حد اعتدال سے متجاوز ہو چکی ہے۔ آج وہ بلا تامل اس وجود گرامی کے متعلق گوناگوں ناشائستہ کلمات استعمال کر رہے ہیں جو چند لاکھ قادیانیوں کو چھوڑ کر چالیس کروڑ فرزندان توحید کی امیدوں اور آرزوؤں کا بہت بڑا مرکز ہے۔ وہ صدہا فخر اسلام کارناموں کے سرچشمے کے بہ زعم خویش ایک غلط فعل کی بنا پر دفعۃً جمعیۃ اسلامیہ سے منقطع ہو کر کفر کو اپنا دائمی مامن وملجا قرار دے رہے ہیں۔ وہ یہ تدبیریں کر رہے ہیں کہ افغانستان کو اپنی فتنہ انگیزیوں کا تختۂ مشق بنا دیں۔ یہ ساری دنیائے اسلام کے خلاف اعلان مخالفت ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس اعلان مخالفت کے متعلق اپنے رویہ پر غور کریں۔

غالباً یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ چند لاکھ قادیانیوں کے سوا ہندوستان اور عالم اسلام کا ہر فرد اس معاملہ میں اعلیٰ حضرت امیر غازی اور ان کی غیور اسلامی حکومت کے ساتھ ہے۔علمائے کرام کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں کی جدید فتنہ پردازانہ حرکات کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کے لیے مناسب طریق عمل تجویز فرما دیں۔اگر چند لاکھ قادیانی اپنے بعض خلاف اسلام عقائد پر قانع نہ رہ کر عالم اسلام کے ایک مایہ ناز حصے کو فتنہ انگیزی کا تختۂ مشق بنانے سے محترز نہیں رہ سکتے تو مسلمانوں کا بھی فرض ہے کہ وہ معاً اس فتنہ انگیزی کے سدباب کی تمام ممکن تدابیر پر عمل پیرا ہوں۔

(زمیندار 21 ستمبر، 24 ستمبر 1924ء)

قادیانی ہونے کی وجہ سے سنگساری

قادیان کا اخبار الفضل لکھتا ہے کہ جب پہلے پہل نعمت اللہ خاں کی سنگساری کی اطلاع ہندوستان میں پہنچی تو زمیندار نے لکھا تھا کہ ’’یہ دعویٰ ہرگز قابل اعتبار نہیں کہ نعمت اللہ خاں محض احمدی ہونے کی وجہ سے سنگسار کیا گیا۔ جہاں تک ہمارا قیاس کام دیتا ہے، اس کی سنگساری کے وجوہ سیاسی ہوں گے اور وہ کسی ایسی سازش یا کسی ایسے منصوبے میں مصروف پایا گیا ہوگا جس سے حکومت افغانستان کو بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔‘‘

یہ اقتباس درج کرنے کے بعد الفضل علمائے افغانستان کے فتوے سنگساری کا حوالہ دے کر لکھتا ہے کہ اس سے نعمت اللہ خاں کا کسی ایسی سیاسی سازش میں شریک ہونا ثابت نہیں بلکہ وہ محض احمدی ہونے کی وجہ سے سنگسار کیا گیا ہے۔ کیا جرائد قومی اس سنگساری کے خلاف آواز بلند کریں گے؟

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ ہم نے پچھلے دنوں مسلم آؤٹ لک کے ایک قادیانی نامہ نگار کی مراسلت کا حوالہ دیا تھا جس میں اس نامہ نگار نے اس امر کو تسلیم کیا تھا کہ افغانستان میں بہت سے قادیانی موجود ہیں۔ اس پر ہم نے لکھا تھا کہ ان سب قادیانیوں میں سے صرف نعمت اللہ کا سنگساری کے لیے منتخب کیا جانا خالی از علت نہیں اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نعمت اللہ خاں دوسرے افغانی قادیانیوں کی نسبت زیادہ خطرناک سمجھا گیا۔ افغانستان کے دوسرے قادیانی اپنے عقائد کا اظہار نہ کرتے ہوں گے، اس لیے شرعاً ان پر کوئی حد نہیں لگائی جاسکتی۔ نعمت اللہ خاں نے برسرعام اپنے عقائد کی تبلیغ و اشاعت کی ہوگی، لہٰذا علمائے کرام نے اس پر حد لگانے کا فتویٰ صادر فرمایا۔ اگر الفضل کے نزدیک نعمت اللہ خاں محض قادیانی ہونے کی وجہ سے سنگسار کیا گیا ہے تو آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت شہریار افغانستان سارے افغانی قادیانیوں کو سنگسار نہیں کرتے؟

ہم نعمت اللہ خاں کی سنگساری اور قادیانیوں کے عقائد پر کافی بحث کر چکے ہیں، مزید

اظہار خیالات کی ضرورت نہیں۔ نعمت اللہ خاں محض اس لیے سنگسار کیا گیا کہ اس نے قادیانی عقائد کا اظہار و اعلان کیا۔ اگر آئندہ بھی کوئی قادیانی افغانستان میں اپنے خلاف اسلام عقائد ظاہر کرے گا تو شرع اسلامی اسے یہی سزا دے گی۔ اس تعزیز میں تمام مسلمان اعلیٰ حضرت شہریار افغانستان کی حکومت کے موئید ہیں کیونکہ اعلیٰ حضرت نے حاملین شریعت نبوی یعنی علمائے کرام کے فتوے کا اجرا و نفاذ کرایا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ قادیانیوں کا شور و شغب ایک اولوالعزم مسلمان حکمران کو خدا اور اس کے رسول ﷺ کے حکم سے سرتابی پر مجبور نہیں کرسکتا۔

(زمیندار 25 ستمبر 1924ء)

لاہوری قادیانی اور واقعہ سنگساری

ہمارا خیال تھا کہ لاہوری قادیانی نعمت اللہ خاں کی سنگساری کے معاملہ میں خاموش رہیں گے اور وہ حالات کا زیادہ ٹھنڈے دل سے مطالعہ کریں گے۔ لیکن افسوس کہ ان سے بھی نہ رہا گیا اور احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کے زیر صدارت ایک جلسہ منعقد کر کے کم و بیش نو قراردادیں منظور کیں اور ان کی نقل معہ ایک افسوسنامہ کے ہمارے پاس بغرض اشاعت بھیج دی۔ افسوس کہ ہم ان قراردادوں کو من وعن درج نہیں کر سکتے۔ ان کا خلاصہ یہ ہے:

''نعمت اللہ خاں کی سنگساری قرآن و شریعت حقہ کی سکھلائی ہوئی رواداری کے خلاف ہے۔ یہ محض ایک شخص پر ظلم و تعدی نہیں ہے بلکہ مہذب دنیا کی نظروں میں اسلام کے دامن پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ احمدیہ جماعت کو یہ سن کر افسوس ہوا ہے کہ افغانستان میں احمدیوں کو نیست و نابود کیا جا رہا ہے، وہ جیلوں میں غیر معلوم طریقے پر مر رہے ہیں۔ علاقہ خوست میں احمدیہ جماعت کے گاؤں جلا دیے گئے ہیں اور باشندوں کو تہ تیغ کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے اسلامی رہنماؤں، اسلامی جماعتوں اور دوسرے اسلامی ممالک کو حکومت افغانستان کے اس فعل کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے۔ احمدیہ جماعت کو اس بات پر سخت افسوس ہے کہ کئی ایک اردو اخبارات اس فعل کے خلاف آواز بلند کرنے کے بجائے دنیاوی فرائض کی بنا پر اسے درست ثابت کر رہے ہیں۔ اس الزام کی سخت تردید کی جاتی ہے کہ مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا یا محمد رسول اللہ کے خاتم النبین ہونے سے انکار کیا یا غیر احمدیوں کو کافر کہا۔''

ان قراردادوں کی نقلیں حکومت افغانستان، دیگر اسلامی حکومتوں اور ہندوستان کے انگریزی اور اردو جرائد کے پاس بھیجی گئی ہیں۔ ہم اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر قبل ازیں شرح و بسط کے ساتھ بحث کر چکے ہیں، اس لیے اب ان مباحث کے اعادہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مذہبی

رواداری کے متعلق ایک مستقل مقالہ زمیندار میں چھپ چکا ہے جو کم از کم ہمارے اور عالم اسلام کے بہت بڑے حصے کے معتقدات کا صحیح ترجمان ہے۔ افغانستان کے قبیلوں کا اور علاقہ خوست میں قادیانیوں پر بیان کردہ مظالم کے متعلق ہم نے آج تک کچھ نہیں سنا۔ البتہ مختلف ذرائع سے یہ اطلاعات موصول ہو رہی ہیں کہ خوست کی بغاوت میں قادیانی عناصر سب سے بڑھ کر کارفرما رہے ہیں اور انہی کے ذریعہ سے باہر کا روپیہ اور باہر کا سامان جنگ باغیان خوست میں تقسیم ہوتا رہا ہے۔ افسوس کہ ہم بہ حالت موجودہ بوجوہ اس راز سے پردہ نہیں اٹھا سکتے۔ جو کچھ ہم نے سنا ہے، اگر اس کا عشر عشیر بھی صحیح ہے تو وہ قادیانی جماعت کے دامن پر ایسا بدنما داغ ہے جو اس کے سارے نامۂ اعمال کو سیاہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اردو اخبارات میں سے اس معاملہ میں سب سے بڑھ کر افغانستان کی تائید زمیندار نے کی ہے۔ کاش لاہوری جماعت ہمارے تمام مقالات کا بہ نظر امعان و انصاف مطالعہ کرتی اور اس کے بعد اس باب میں زبان کشا ہوتی۔ اس سلسلہ میں ''دنیاوی اغراض'' کے الفاظ بھی گوش زد ہوئے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ قادیانی جماعت کے دماغ میں اس مبہم جملہ کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ قراردادوں کا سب سے آخری حصہ خاص طور پر قابل غور ہے یعنی یہ کہ مرزا نے نہ نبوت کا دعویٰ کیا، نہ ختم نبوت کے عام عقیدے سے انکار کیا اور نہ غیر احمدیوں کو کافر کہا۔ لیکن نعمت اللہ خان ان معاملات میں قادیانیوں کا ہم نوا تھا اور قادیانی مرزا کے نبی ہونے کے مقر ہیں، ختم نبوت کی لغو تاویل کر رہے ہیں اور غیر احمدیوں کو کافر کہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے نعمت اللہ کی سنگساری کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اب تک بار بار ''قادیانیوں'' کا ذکر کیا، ''احمدیوں'' کا ذکر نہ کیا جن میں لاہوری جماعت بھی شامل تھی۔

اس بارے میں ہمارے خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہبی رواداری کا فرنگستانی تصور ہمارے نزدیک اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ بلاشبہ جزئیات میں مسلمانوں کے اعمال و عقائد مختلف ہو سکتے ہیں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص مسلمان کہلائے اور رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی دوسرے شخص کی نبوت کا قائل ہو، اس نبی کے منکرین کو کافر کہے اور اسلامی حکومت کا محکمہ احتساب عقائد و اعمال اس پر خاموش رہے۔ غیر مسلموں کو مذہبی معاملات میں کامل آزادی ہو گی لیکن مسلمانوں کی آزادی کا احاطہ محدود ہے۔ افغانستان کے قانون احتساب کے مطابق نعمت اللہ

خان سنگساری کی سزا کا مستوجب تھا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے تین عدالتوں نے یہی فیصلہ کیا۔ ممکن ہے کہ چند افراد کے نزدیک یہ قانون مطابق شریعت نہ ہو لیکن افغانستان کے جمیع علمائے کرام اور ہندوستان کے صدہا وسیع النظر ارباب علم شریعت اس قانون کو صحیح سمجھتے ہیں۔ جو اصحاب اس قانون کو غیر صحیح سمجھتے ہیں انہیں حکومت افغانستان کے دوسرے مایہ ناز اسلامی اعمال کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہ طریق اصلاح اس قانون کے متعلق اپنے خیالات پیش کرنے چاہئیں، یہ نہیں کہ وہ اٹھیں اور سب حقائق کو نظر انداز کر کے حکومت افغانستان کو ظالم اور جابر کہنا شروع کر دیں۔ اس طرح دشمنوں کو اس مایہ ناز اسلامی حکومت کے بدنام کرنے پر آمادہ کریں۔

(زمیندار 27 ستمبر 1924ء)

قادیانیوں کی فتنہ انگیزیاں

در گزر زیں پردہ چوں دمساز غالب نیستی
مدعی ہنجار خود گیرو نوائے ما مسنج

نعمت اللہ خاں قادیانی کے واقعہ قتل کی یہ حیثیت قطعاً نہیں تھی کہ زمیندار اس کے لیے مسلسل ومتواتر بہرہ مقامات افتتاحیہ وقف کر دیتا لیکن افسوس کہ قادیانیوں کی فتنہ انگیزیوں نے اس واقعہ کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ اس فتنہ انگیزی کا تازہ ترین کرشمہ یہ ہے کہ لندن میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کا ایک مشترکہ جلسہ ہوا جس کے صدر ڈاکٹر والٹر واش تھے۔ صدر نے کہا کہ جس شخص میں انسانیت کا کچھ بھی مادہ ہوگا، وہ مذہبی تشدد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے گا خواہ وہ تشدد کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ مرزا بشیر الدین محمود نے جنہیں درحقیقت اس جلسہ کی روح رواں سمجھنا چاہیے۔ مختصراً نعمت اللہ خاں کے قتل کے واقعات بیان کیے۔ بعد ازاں ایک قرارداد منظور ہوئی جس کا مفاد یہ تھا کہ ''ضمیر کی آزادی ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔ یہ جلسہ حکومت افغانستان کے اس فعل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور متوقع ہے کہ حکومت مذکورہ آئندہ ایسے افعال سے اجتناب کرے گی جو مہذب دنیا کی نظروں میں بے حد قابل نفریں ہیں۔'' آخر میں فیصلہ کیا گیا کہ اس جلسہ کی کارروائی کی اطلاع حکومت افغانستان اور صدر جمعیۃ الاقوام کے پاس بھیج دی جائے۔

ہمیں ایسے جلسوں کی حقیقت معلوم ہے اور ہم جانتے ہیں کہ لندن میں بیٹھ کر ڈاکٹر والٹر واش اور مسٹر ولیکر جیسے دو چار آدمیوں کو کسی جلسہ میں مدعو کر لینا یا انہیں چند الٹی سیدھی باتیں سمجھا بجھا کر اپنے حسب منشا تقریریں کرا لینا کوئی اہم کام نہیں ہے۔ لیکن ہمیں مرزا بشیر الدین محمود پر تعجب ہے کہ وہ انگریزوں کی زبان سے ''ضمیر کی آزادی'' اور ''حکومت افغانستان کے فعل قتل پر اظہار نفرت'' کے اعلانات کرانے میں اپنی قوت وطاقت ضائع کر رہے ہیں۔ کیا اندھوں کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ آفتاب جہاں تاب کی ضیا پاشیوں میں عیب نکالیں اور کیا مادرزاد بہروں کو یہ

حق پہنچتا ہے کہ وہ مرغان سحر کی ترانہ ریزیوں کے حسن وقبح پر بحث کریں؟

''آزادی ضمیر'' کا دعویٰ بہت دلکش و دل فریب ہے لیکن کیا ان لوگوں کے لیے اس قسم کے دعاوی کا اظہار و اعلان زیبا ہے جن کی ''ضمیر کشی'' پر اس دنیا کے صدہا خطوں میں برسوں سے ماتم کی صفیں بچھی ہوئی ہیں؟ کیا آئرلینڈ کی تاریخ کے خونچکاں اوراق یکسر انگلستان کی ''ضمیر کشی'' کی الم انگیز داستان نہیں؟ کیا ولف ٹون، رابرٹ ایمٹ، ارسکن چائلڈرس، لیام لنچ اور اس قبیل کے صدہا دوسرے سرفروش شہدائے آئرلینڈ اسی ''ضمیر کشی'' کے قاطع شواہد نہیں؟ کیا مصر، فلسطین، عراق، مشرقی افریقہ وغیرہ آزادی ضمیر کی پامالی کے صدہا المناک مناظر پیش نہیں کرتے؟ کیا ہندوستان کی تاریخ تسلط فرنگ از سرتاپا آزادی ضمیر کی پامالی کی سرگزشت نہیں؟ جلیانوالہ باغ میں کیا ہوا تھا، زیادہ سے زیادہ یہی ہوا تھا کہ چند ہزار بے دست و پا، بے ساز و سامان امن پسند اور امن دوست انسان اس بات کا اعلان کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے جنہیں ان کے ضمیر حق سمجھتے تھے۔ پھر جنرل ڈائر کی ہلاکت خیز آتشبازی ''آزادی ضمیر'' کی پامالی نہیں تھی تو اور کیا تھی؟ تحریک ترک موالات کے آغاز سے اس وقت تک کم و بیش چالیس ہزار سرفروشان ہند قید خانوں کی ہمت آزما مصیبتوں میں مبتلا ہوئے۔ ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ وہ اپنے دلی جذبات و دلی خیالات اور دلی احساسات کا صاف صاف اعلان کرتے رہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر بلا تامل لبیک کہتے رہے۔ پھر کیا انہیں قید کرنا اور مختلف النوع مصائب کا تختہ مشق بنانا ''آزادی ضمیر'' کی پامالی نہیں تھی؟ مرزا بشیر الدین محمود انتہائی سعی و کوشش سے جمعیۃ الاقوام کے پاس اس قسم کی قراردادیں بھیج رہے ہیں کہ ''آزادی ضمیر'' ہر انسان کا پیدائشی حق ہے لیکن جمعیۃ الاقوام کے بڑے بڑے ارکان بھی فرانس، اٹلی اور انگلستان اپنے ایشیا اور افریقہ وغیرہ کے مقبوضات میں جو ظلم و ستم برپا کرتے رہے ہیں اور برپا کر رہے ہیں، کیا وہ سب ''آزادی ضمیر'' کا ماتم نہیں ہیں؟ جن طاقتوں کی بنیاد ہی آزادئ ضمیر کی پامالی اور تباہی پر قائم ہو، ان کے افراد کی زبانوں پر اس قسم کے دعاوی کا اجرا یا ان کے روبرو اس قسم کے دعاوی کا اظہار انتہا درجہ کی نادانی اور عقل سے دشمنی نہیں تو اور کیا ہے؟

جن معاملات کے ساتھ دنیا بھر کی فلاح و بہبود وابستہ ہو ان میں تو آزادی ضمیر کو قطعاً

درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا لیکن جن معاملات سے ملکوں میں فتنہ وفساد پیدا ہونے کے قوی احتمالات ہوں، ان میں آزادی ضمیر کے لیے آوازیں بلند کی جاتی ہیں۔ ہندوستان اگر یہ کہے کہ ان کا اغیار کے تسلط سے آزاد رہنا ہی موجب فلاح و بہبود ہے تو مرزا بشیر الدین محمود سے لے کر والٹر واش تک سب شور برپا کر دیتے ہیں کہ ہندوستان باغی ہوگیا اور اس نے **اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم** کے آسمانی حکم کو پس پشت ڈال دیا لیکن حکومت افغانستان اسباب فساد کو پیش نظر رکھ کر احتساب عقائد واعمال کا قانون نافذ کرتی ہے تو شور وغل مچایا جاتا ہے کہ آزادی ضمیر ہر انسان کا پیدائشی حق ہے اور پھر اس دعوے کا اعلان اس قوم کے افراد کی زبانوں سے کرایا جاتا ہے جس کی ساری تاریخ ''آزادی ضمیر'' کا ماتم ہے اور اسے اس جمعیۃ الاقوام کے روبرو پیش کیا جاتا ہے جس کے ہر رکن کی ہستی آزادی ضمیر کی موت ہے۔

پھر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا افغانستان بھر میں یہ آزادی ضمیر صرف نعمت اللہ خاں ہی کے لیے مخصوص تھی اور اس قابل فخر اسلامی سرزمین کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی اجتماعی آزادی ضمیر کو کوئی حیثیت حاصل نہیں تھی؟ اگر آزادی ضمیر کا مطلب و مفہوم یہی ہے کہ جو جس کے جی میں آئے کہتا اور کرتا پھرے تو خدارا انصاف سے کام لو اور بتاؤ کہ ایک نعمت اللہ خاں کو مستثنیٰ کرنے کے بعد افغانستان کے وہ لاکھوں مسلمان اپنی آزادی ضمیر کے مظاہرے کے لیے کس سرزمین کی تلاش کرتے جن کے عقیدے میں ملحد و مرتد کی سزا قتل تھی۔ اگر آزادی ضمیر، مادر پدر آزادی کا نام نہیں بلکہ وہ نظم ونسق ممالک اور فلاح و بہبود امم کے پیش نظر مرتبہ قوانین وضوابط سے مقید ہے تو پھر بتاؤ کہ کیا حکومت افغانستان نے نعمت اللہ خاں قادیانی کی سنگساری کے لیے اسی قانون پر عمل نہیں کیا جو اسلام کا ایک مسلمہ قانون ہے اور جو دولت ابد مدت افغانستان کے ضابطہ تعزیرات کا شروع ہی سے ضروری جزو چلا آتا ہے اور کیا اس فعل کے لیے دولت مذکورہ نے کوئی نیا قانون وضع کیا؟

قادیانیوں نے اس معاملے میں اصل مباحث کو چھوڑ کر قطعاً غیر متعلق باتوں کا سلسلہ چھیڑ دیا ہے۔ کوئی مراسلہ بھیجتا ہے کہ مرزا قادیانی نے کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا اور انہیں نبی سمجھنا اور کہنا مرزا بشیر الدین محمود اور عام مسلمانوں کا افترا ہے۔ کوئی لکھتا ہے کہ قرآن کے رو سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مرتد کی سزا قتل ہے حالانکہ یہ مباحث قطعاً غیر متعلق ہیں۔ یہ واضح ہے کہ نعمت

اللہ خاں نے عدالت میں مرزا غلام احمد قادیانی کے ''ظلّی نبی'' ہونے کا اعتراف کیا اور اس سے بھی کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اسلامی حکومتوں کا سیزدہ صد سالہ تعامل مرتد کو واجب القتل قرار دے رہا ہے اور نعمت اللہ خاں کے قتل کے فیصلے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ محض ''ارتداد'' ہی نہیں بلکہ ''اشاعت ارتداد'' کا مجرم تھا۔ اگر کسی شخص کا یہ عقیدہ ہے کہ مرتد کی سزا قتل نہیں تو اس صورت میں بھی حکومت افغانستان کو ظالم و جابر یا امیر غازی کو برا بھلا کہنا انتہا درجہ کی لغویت ہے، اس لیے کہ انہوں نے محض اپنے ایک مسلمہ قانون پر عمل کیا۔ اگر وہ قانون غلط ہے اور علمائے افغانستان کو اس کی غلطی پر اطلاع نہیں تو مصالحت کے ساتھ ان پر غلطی واضح کر دو۔ اگر تم اس میں کامیاب ہو جاؤ گے تو یہ قانون بدل جائے گا۔ غیر متعلق اور بے معنی شور و غل سے افزائش رنجش اور اضافہ اختلاف کے سوا اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

الفضل حسب عادت مستمرہ ایک بے سروپا ہاوہو برپا کر رہا ہے۔ ہم اگر اس کی طرح دنیا جہان کے کاموں سے فارغ ہوں تو شاید اس سے بدر جہا بڑھ کر کاغذ سیاہ کر سکتے ہیں لیکن افسوس کہ ہمارے سامنے اس کی طرح چند ہزار انسانوں کے اوہام باطلہ کی اشاعت کا کام نہیں بلکہ چالیس کروڑ مسلمانوں کی حقیقی فلاح و بہبود کا کام ہے۔ اس لیے ہم ایسے مہمل اور بے سروپا مضامین پر متوجہ نہیں ہوسکتے، البتہ ہوش و حواس سے کام لے کر کوئی بات کی جائے تو اس کی نسبت ضرور کچھ نہ کچھ لکھیں گے۔

(زمیندار 2 اکتوبر 1924ء)

قادیانی میدان ''جہاد'' میں

قادیانیوں نے نعمت اللہ خاں کی سنگساری کے سلسلے میں جو شرانگیزیاں کی ہیں، وہ قارئین کرام کے ملاحظہ میں آچکی ہیں۔ ان کی تازہ ترین شرانگیزی یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ کابل میں ''جتھے'' بھیجنے کی تیاریاں کررہے ہیں، دوسری طرف یہ کوشش ہو رہی ہے کہ افغانستان یا بہ درجہ آخر سرحد و پنجاب کے نوجوانوں کی ایک تعداد کو تین چار سال تک قادیان میں تعلیم و تبلیغ دے کر افغانستان بھیجا جائے جو وہاں جا کر اس پاک اسلامی سرزمین میں مرزائیت کا دجل پھیلائیں۔ ''جتھے'' میں چودھری ظفر اللہ خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا جیسے لوگ نام لکھا چکے ہیں۔ اگرچہ مرزا بشیر الدین محمود اپنی ذمہ داریوں پر نظر ڈالتے ہوئے ''لہو کے گھونٹ'' پی کر اس سلسلہ ''جہاد'' کی ریاست و قیادت سے محترز رہنے ہی کو اقرب الی الامن والعافیت تصور فرماتے ہیں۔ ہمیں ان بلند آہنگیوں کی حقیقت معلوم ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حکومت برطانیہ دولت مستقلہ افغانستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات نقصان پہنچائے بغیر ایسے دجل دوست ''مبلغین'' کو پروانہ ہائے راہداری نہیں دے سکتی اور حکومت مذکورہ ایسی ''بے نفس قربانی'' کے لیے بھی تیار نہ ہوگی خواہ مرزا بشیر الدین پچیس ہزار دفعہ براہین میں سلطنت برطانیہ کے قیام و بقا کی دعائیں مانگیں لیکن اس سے قادیانیوں کی شرانگیز اور شر پرور طینت کی حقیقت اچھی طرح آشکار ہو جاتی ہے۔ ان ''جہاد آرائیوں'' کی عملی حیثیت خواہ کچھ ہو ہمیں تو اس بات سے خوشی ہے کہ بارے ''قادیانیوں'' میں جہاد کا مادہ پیدا ہوا۔ اگر وہ مادہ آج افغانستان کے خلاف جوش زن ہے تو کل غیر مسلم طاقتوں کے خلاف بھی جوش زن ہو سکتا ہے۔ بہرحال قادیانیوں نے یہ تو محسوس کرلیا کہ جہاد محض قلم ہی سے نہیں ہوتا بلکہ اس کی دوسری صورتیں بھی ہیں۔ چنانچہ ایک صورت یہ ہے کہ خود عدم تشدد پر کاربند ہو کر اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کیا جائے، اس پر ہندوستان کا اکثر و بیشتر حصہ گزشتہ چار سال سے کاربند رہا ہے اور اس وقت ہمارے اولوالعزم اکالی بھائی کاربند ہیں۔ یہ مرزا کے

''الہامات'' پر اضافہ ہے۔**اللھم زد فزد۔**

یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ جولوگ جزیرۃ العرب اور خلافت کی مصیبتوں کے عالم میں غیر مسلم حاکموں کے خلاف ایک آواز بھی بلند نہ کرسکے، وہ ایک شخص کی خاطر ایک اسلامی حکومت کو کس بناء پر اعلان جنگ دے رہے ہیں۔اس اعتراض کا جواب مرزا بشیر الدین محمود سے پوچھنا چاہیے۔

ہم تو اس دن کے منتظر ہیں کہ قادیانیوں کا ایک ''جتھا'' تیار ہو، چودھری ظفر اللہ خاں اس کے ''جتھے دار'' بنیں، حکومت ہند سے راہداری کے پروانوں کی درخواست کی جائے اور وہاں سے صاف جواب مل جائے۔ پھر ہم دیکھیں کہ مرزا بشیر الدین محمود اور ان کی راہ گم کردہ بھیڑیں نہیں بلکہ بقول مرزا صاحب ''بکریاں'' اپنے ''واجب الاطاعت اولوالامر'' کی اس ''مذہبی مداخلت'' کے خلاف کیا کچھ عمل میں لاتی ہیں۔

کاش مرزا بشیر الدین اور چودھری ظفر اللہ خاں جلد یہاں تشریف لائیں اور قادیان میں پہلے ''شہیدی جتھے'' کی روانگی کا دلکش نظارہ دنیا کے سامنے پیش ہو۔اب قادیانی میدان جہاد میں اترے ہیں۔ہمیں کامل امید ہے کہ وہ اب اپنی غیرت وحمیت کا زیادہ اچھا ثبوت دیں گے۔ وہ جزیرۃ العرب اور خلافت کی مصیبتوں میں شرمناک بے غیرتی سے کام لے چکے ہیں۔لیکن اب اگر حکومت ہند انہیں راہداری کے پروانے نہ دے تو انہیں چاہیے کہ مردوں کی طرح اس مذہبی مداخلت پر معاً اس کے خلاف بھی ''اعلان جہاد'' کردیں۔کیا قادیانی اپنی غیرت وحمیت دینی کا ثبوت دیں گے یا وفاداری کا جذبہ حسب معمول دین وملت کے مقاصد پر غالب آجائے گا۔

(زمیندار 16 اکتوبر 1924ء)

آریہ سماجی اور قادیانی

درگزر زیں پردہ چوں دمساز غالب نیستی
مدعی ہنجار خود گیرد نوائے ما مسنج

معزز معاصر الامان دہلی کے حوالے سے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ دہلی کے ایک قادیانی نے حال ہی میں ایک اشتہار کے ذریعہ ہندوؤں سے یہ اپیل کی تھی کہ جو لوگ نعمت اللہ کی سنگساری کو مذہبی فرض سمجھتے ہیں، ان کے ساتھ ہندوؤں کا اتحاد کیونکر ممکن ہے۔ آخر یہ شرانگیزی رنگ لائی اور دہلی کے آریہ سماج نے 12 اکتوبر کو اپنے ہفتہ وار جلسے میں ایک قرارداد منظور کی جس میں نعمت اللہ کی سنگساری کو مذہبی آزادی کے منافی سمجھتے ہوئے قابل ملامت قرار دیا گیا، قادیانیوں کے ساتھ ہمدردی کی گئی اور جمعیۃ العلما، جماعت علمائے دیوبند اور لاہور کی انجمن اسلامیہ پر بدیں وجہ اظہار افسوس کیا گیا کہ ان جماعتوں نے حکومت افغانستان کے اس ''ظالمانہ'' فعل کی تائید کی۔

تمام ہندو جماعتوں میں سے آریہ سماج کو اسلام و مقاصد اسلام کی مخالفت میں جو نا قابل رشک شہرت ہے، اسے پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں اس قرارداد پر قطعاً کوئی تعجب نہ ہوا، اس لیے کہ تعجب ہمیشہ اس واقعہ پر ہوتا ہے جو غیر متوقع ہو۔ جو سماج اپنی مختلف النوع شرانگیزیوں کے باعث ہندوستان کی قابل صد ناز قومی تحریک کو موجودہ افسوسناک حالت پر پہنچانے میں متامل نہ ہوئی، اس نے اگر حکومت افغانستان کے کسی اسلامی فعل یا عام مسلمانوں کی بڑی بڑی ذمہ دار جماعتوں کے فیصلوں کی مخالفت میں آواز بلند کی تو اس پر تعجب کا کون سا مقام ہے؟ قادیانیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار بھی باعث تعجب نہیں، اس لیے کہ آریہ سماجیوں اور قادیانیوں میں باطناً اتنی وجوہ اشتراک موجود ہیں کہ ان کے پیش نظر یہ ہمدردی بالکل طبعی اور فطری معلوم ہوتی ہے۔ سب سے بڑی وجہ اشتراک یہ ہے کہ آریہ سماجی اور قادیانی اپنے اپنے مقاصد کے مدنظر تمام اسلامی حکومتوں کی تباہی کے متمنی ہیں اور اسی خواہش نے انہیں انگریزوں کی تائید

پرآمادہ کررکھا ہے۔ ہندوستان سے باہر کی اسلامی طاقتوں کا عروج جس طرح قادیان کے لیے ماتم کا پیغام ہے، اسی طرح یہ عروج سماجیوں کے لیے نا قابل برداشت ہے۔قادیانی کبھی قومی تحریک میں شامل ہی نہیں ہوئے۔ سماجی اس وقت تک اس تحریک کے موید رہے جب تک ترکوں کی فتح وکامرانی کے مطلع پر ظلمت چھائی ہوئی تھی لیکن جونہی سمرنا کے افق سے زندہ آزاد اور طاقتور ترکی قوم کا آفتاب جہاں افروز طلوع ہوا، معاً سماجی سب کچھ چھوڑ کر ہندوستان کی قومی تحریک کی جڑ پر ضربیں لگانے لگے۔سب سے آخر میں جس طرح قادیانی امت اسلامیہ کے دشمن ہیں، اسی طرح آریہ سماجی دشمن ہیں۔ اس اشتراک مقاصد کے لحاظ سے قادیانیوں اور آریہ سماجیوں کا کسی معاملہ میں ایک دوسرے کی ہمدردی پر آمادہ ہوجانا تعجب خیز نہیں ہوسکتا۔

لیکن ہمیں افسوس ہے کہ دہلی کی آریہ سماج نے ''مذہبی آزادی'' کا جملہ زبان پر لانے سے پیشتر اپنے اعمال پر اچھی طرح غور نہیں کیا۔ مرتد کے قتل کا قانون تو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے نفاذ کا حقیقی مقام اسلامی حکومت کی حدود ہیں۔لیکن کیا آریہ سماجیوں کو یہ معلوم نہیں کہ ہندوستان کے بعض راجاؤں نے اپنی اپنی حدود میں مسلمان ہونے والے ہندو اور اسے مسلمان کرنے والے مسلم مبلغ کے لیے قید کی سزائیں مقرر کر رکھی ہیں؟ کیا شمالی ہند کے ایک ہندو فرمانروا کی ریاست کی پانچ فیصدی ہندو آبادی مسلمانوں کی ایک مسجد اور مسلمانوں کے ایک مقدس بزرگ کی خانقاہ پر دن دہاڑے قبضہ جمانے کی کوشش نہیں کر چکی؟ پھر کیا یہ مذہبی آزادی ہے؟ کیا ہندوستان کے ہندو مسلمانوں سے جبراً گاؤکشی بند کرنے کی شرمناک کوششیں نہیں کر چکے؟ بعض بلدیات میں اپنی کثرت تعداد کی بنا پر مخالفت گاؤکشی کی قراردادیں منظور نہیں کر چکے؟ صرف گاؤکشی ہی کے سلسلے میں مسلمانوں کو وحشیانہ جرم وقتل کا تختہ مشق نہیں بنا چکے؟ کیا آج سوامی ستیہ دیو موتمر اتحاد کی قرارداد گاؤکشی کے خلاف چیخ پکار نہیں کر رہے؟ پھر کیا یہ سب باتیں مذہبی آزادی کے احترام کی دلیل ہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر کیا دہلی کی آریہ سماج نے آج تک ان شرمناک اعمال کے خلاف بھی آواز بلند کی جو مسلمانوں کے حقوق میں صریح مداخلت کی حیثیت رکھتے ہیں؟ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کیا جمعیۃ العلما اور جماعت علمائے دیوبند جیسی ذمہ دار اسلامی جماعتوں کے فیصلوں کے خلاف آریہ سماج کا آواز اٹھانا مسلمانوں کے حقوق میں صریح

مداخلت نہیں ہے؟ دہلی کی آریہ سماج نابالغ مسلمان بچوں اور بے کس مسلمان عورتوں کو اپنے دام تزویر میں پھانس کر ہندو بناتی رہے تو یہ مذہبی آزادی کے منافی نہیں لیکن حکومت افغانستان اپنی رعایا کے ایک مسلمان کو شرعی سزا دے تو یہ مذہبی آزادی کے منافی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ آریہ سماج کو ان اعمال کے بعد ''مذہبی آزادی'' کا جملہ زبان پر لانے کی جرأت کیسے ہوئی؟

(زمیندار 22 اکتوبر 1924ء)

علمائے افغانستان اور قادیانی

ناظم امور عامہ جماعت احمدیہ قادیان نے جناب وزیر خارجہ دولت افغانستان کی خدمت میں ایک عرضداشت بھیجی جس میں لکھا ہے کہ نعمت اللہ کی سنگساری شریعت اسلام کے قطعاً خلاف ہے اور اگر اعلیٰ حضرت امیر غازی رضامند ہوں تو احمدی علما کابل کے علما سے اس بارے میں بحث کرنے کو تیار ہیں تا کہ اعلیٰ حضرت کو ذاتی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ کابل کے علماء احمدیوں کے خلاف کفر وارتداد کے فتوے دینے میں کہاں تک حق بجانب ہیں۔

لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ قادیانی حضرات کو قادیان سے کابل پہنچنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہندوستان میں بے شمار ایسے علمائے کرام موجود ہیں جو نعمت اللہ کی سنگساری کے مسئلہ میں علمائے کابل کے ہم زبان ہیں۔ قادیانیوں کو چاہیے کہ پہلے انہیں قائل کریں۔ حضرات علمائے دیوبند، ارکان جمعیۃ علما اور متعدد دیگر حضرات جنہوں نے اس حکم شرعی کے نفاذ پر دولت افغانستان کو ہدیہ تہنیت پیش کیا ہے، اس قسم کی بحث کے لیے تیار ہیں۔ قادیانیوں کو پہلے ان سے نبٹنا چاہیے اور اس کے بعد علمائے افغانستان کو دعوت مناظرہ دینے کی جرأت کرنی چاہیے۔

(زمیندار 17 نومبر 1924ء)

موسیومرزا کی ہرزہ سرائی

مرزا بشیر الدین امام جماعت قادیانی نے ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے سے ملاقات کے دوران میں بیان کیا کہ مسلمان اور قادیانیوں کے درمیان جو اختلاف موجود ہے، ان میں سے دو یہ ہیں:

1- احمدیوں کا اعتقاد ہے کہ نبوت کا دروازہ ہر زمانہ میں کھلا ہے۔ خدائے تعالیٰ دنیا کو بے توجہ نہیں چھوڑ سکتا لہٰذا جب مناسب سمجھے گا، انبیا کو مبعوث کرتا رہے گا۔ لیکن دوسرے مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت رسول خدا ﷺ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہ کیا جائے گا۔

2- قرآن مجید میں صاف صاف لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مذاہب اور تمام ممالک میں انبیا مبعوث فرمائے لیکن آج کل کے مسلمان دوسری قوموں کے نبیوں کو نہیں مانتے۔ ہم ہر مصلح کو تسلیم کرتے ہیں، لہٰذا ہمارے فرقے کے بانی نے دنیا بھر کے اتحاد و اتفاق کا دروازہ کھول دیا ہے۔

ان میں پہلی وجہ اختلاف تو بالکل درست ہے۔ مسلمان حضور سرور کائنات، شہنشاہ دو جہاں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو آخری نبی سمجھتے ہیں۔ لیکن قادیانی نبوت کے تسلسل کے قائل ہیں اور منقولہ بالا بیان سے تو یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مرزا محمود کے نزدیک ان کے ابا جان کے بعد بھی برابر نبی آتے رہیں گے۔ جو لوگ اس حسن ظن میں مبتلا ہیں کہ قادیانی ختم نبوت کے قائل ہیں، انہیں موسیومرزا کا یہ بیان آنکھیں کھول کر پڑھنا چاہیے۔

لیکن دوسری وجہ اختلاف بالکل غلط ہے۔ مسلمان بھی **لکل قوم هاد** اور **ان من امة الا خلا فیها نذیر** کے قائل ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے پہلے ہر ملک اور ہر قوم میں انبیا بھیجے۔ ان میں سے جن نبیوں کا ذکر قرآن مجید میں آچکا ہے، ان پر تو مسلمانوں کا پورا پورا ایمان ہے البتہ ان کے علاوہ مختلف قوموں میں جو مصلحین آتے رہے، ان

کے متعلق مسلمان اس قدر آسانی سے کچھ فیصلہ نہیں کر سکتے جس قدر آسانی کے ساتھ قادیانی لوگ کرشن، رام چندر، بدھ اور زرتشت کو نبی قرار دے دیا کرتے ہیں۔ ان مصلحین میں سے جن کی زندگیاں پاکیزہ ہیں اور جنہوں نے توحید کی دعوت دی ہے، ان کے متعلق مسلمان حسن ظن سے کام لے کر یہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے فلاں شخص نبی ہو لیکن ظاہر ہے کہ جب تک نص صریح سے اس کی نبوت ثابت نہ ہو، ہم یقینی طور پر اسے نبی نہیں قرار دے سکتے۔

دنیا بھر کی قوموں کے اتحاد و اتفاق کا دروازہ تو اسلام نے آج سے تیرہ سو سال پہلے کھول رکھا ہے، اس میں موسیو مرزا کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں۔ اس دعوت اتحاد کا سہرا تو مدینہ کے دولہا ہی کے سر ہے۔ (ﷺ) قادیانی لوگوں کی اتحاد پسندی تو اسی سے ظاہر ہے کہ وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے چالیس کروڑ نام لیواؤں کو کافر سمجھتے ہیں۔ اگر اسی کا نام اتحاد ہے تو

وائے گر در پس امروز بود فردائے

(زمیندار 26 نومبر 1924ء)

قادیانی اور کانگریس

حسب وعدہ مرزا بشیر الدین محمود امام جماعت احمدیہ نے بمبئی میں مہاتما گاندھی سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کی جو مختصر کیفیت اشاعت دیروزہ میں شائع ہو چکی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ترک موالات کے مخالف ہیں لیکن سوراج کے حصول کی کوششوں میں اہل ملک کا ساتھ دینا چاہتے ہیں۔ آپ نے وعدہ کیا ہے کہ میں کانگریس کے آئین ترکیبی اور اس کے مسلک کا مطالعہ کروں گا۔ اگر کوئی بات قابل اعتراض نہ ہوئی تو میں اپنی جماعت کو متحدہ کانگریس میں شریک ہونے کی اجازت دوں گا۔

اس امر کا تو کسی شخص کو وہم بھی نہیں ہوسکتا کہ قادیانی کبھی اپنے انگریز بھائیوں کی حکومت کے ساتھ ترک موالات کر سکتے ہیں لیکن ہمیں تو اس امر پر بھی حیرت ہے کہ سوراج کے حصول کا خیال مرزا صاحب کو کیونکر آ گیا۔ سوراج کے معنی یہ ہیں کہ انگریزی حکومت یہاں سے رخصت ہو جائے اور ہندوستانی اپنے تمام معاملات میں آزاد ہو جائیں۔ کیا قادیانی حضرات انگریزوں کی مفارقت گوارا کر لیں گے؟ آخر آج انقطاع کی حکمت عملی اپنانے کی کیا خاص وجہ پیدا ہوگئی۔

کیا جناب وزیر خارجہ یا وزیر ہند نے مرزا کو خاص ہدایات دے کر تو نہیں بھیجا؟

(زمیندار 28 نومبر 1924ء)

صورِ اسرافیل

باز گلبانگِ پریشاں می زنم
آتش اندر عندلیباں می زنم

وہ آخری فتنہ جس کی رسول اللہ ﷺ نے خبر دی تھی، مشرق میں قادیانیت کی شکل پکڑ کر ظاہر ہو چکا ہے اور اُن کو جنہیں دیدۂ بینا دیا گیا ہے، صاف نظر آ رہا ہے کہ اگر اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اجتماعی غیرت دینی اپنے پورے حجازی جوش، اپنی پوری بدنی استقامت کے سامنے نہ اُٹھ کھڑی ہوئی تو اسلام کا ہندوستان میں خدا ہی حافظ ہے۔

میں مسلمانوں کو اللہ کے نام جو **لم یلد ولم یولد** ہے۔ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے نام پر جو خاتم النبیین ہیں۔ اسلام کے نام پر کہ اللہ کے نزدیک وہی دین ہے۔ درد بھرے دل سے صلائے عام دیتا ہوں کہ مجلس مرکزیہ دعوت وارشاد لاہور کی شاخیں ہندوستان کے ہر صوبے، ہر ضلع اور ہر قریہ میں قائم کریں اور اپنے تمام جزئی اختلافات کو اس مجلس عالیہ کے ان دو بڑے مقاصد کی تکمیل کی خاطر مٹا دیں۔

(1) فتنہ قادیان کا استیصال

(2) فتنہ تفرنج کی بیخ کنی۔

اگر مسلمان ان دوگونہ مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو گئے تو دنیا بھی اُن کی ہے اور دین بھی ان کا ورنہ بجز خسران مبین یعنی دنیوی اور دینی رسوائی کے اور کچھ بھی نہیں۔

(روزنامہ زمیندار (قادیان نمبر) 4 مارچ 1933ء)

اسلامی نقار خانہ اور قادیانی توتی ''الفضل'' کی بوالفضولیاں

عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزق گدا را

قادیانی صبح بروز ہی سے طاغوت کے راستے میں ''جہاد'' کے لیے جو امتیازی خصوصیت حاصل کر چکے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس خصوصیت سے کسی حال میں بھی کنارہ کش ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ دنیا میں کہیں شر کی آگ بھڑکے، کہیں بدی اور خبث کا طوفان جوش زن ہو، کہیں اخلاقی گندگی اور اخلاقی نجاست کا سیلاب تلاطم میں آئے لیکن اگر اس آگ، اس طوفان اور اس سیلاب کا رخ کسی غیور و آزاد اسلامی حکومت، کسی اولوالعزم اسلامی سلطنت اور کسی مضبوط و مستحکم اسلامی فرمانروائی کی طرف ہو تو ''دارالامان'' قادیان کا ہر وزہ اس شیفتگی و والہیت کے ساتھ اس کی تائید پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ گویا قدرت نے اسے پیدا ہی اس غرض سے کیا تھا کہ وہ اس آگ کی لپٹ کو تیز کرے، اس طوفان کی جوش زنی کو بڑھائے اور اس سیلاب کی تندروی میں اضافہ کا موجب بنے۔ قادیانیوں کی اس اسلام دشمن فطرت کا تازہ ترین نظارہ مجنوں مسولینی کے اس الٹی میٹم کے سلسلے میں منصۂ شہود پر آیا ہے جو اس نے پپر نو کے قتل کے ضمن میں دولت بہیہ افغانیہ کے نام بھیجا تھا۔ ساری دنیا کی سلیم الوجود اخلاقی فطرت مسولینی کی اس بیہودہ اور لغو حرکت پر لعنت بھیجنے میں ہم آہنگ ہے۔ جن لوگوں کے سیاسی مقاصد کا اقتضا دولت بہیہ افغانیہ کی مخالفت ہے، ان کا بھی اکثر و بیشتر حصہ مسولینی کے اس فعل کی شدید سے شدید مذمت کر چکا ہے یا غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے بالکل خاموش ہے۔ مگر قادیانی قیادت بڑھ چڑھ کر مسولینی کی تائید کے سامان فراہم کر رہی ہے۔ گویا وہ سمجھ رہی ہے کہ قادیان سے اس الٹی میٹم کی تائید کی صدا بلند ہوتے ہی اٹلی کی تمام فوجیں متحرک ہو جائیں گے، اس کے جنگی جہازوں کے بادبان کھل جائیں گے، اس کی توپوں کی قطاریں جنبش میں آجائیں گی اور ایک ہولناک صلیبی

جنگ کا طوفان پطرس کے گرجے کا آستانہ چومتا ہوا کابل کی طرف روانہ ہو جائے گا اور سنگسار قادیانیوں کے انتقام میں (خاک بہ دہن دشمنان اسلام) سرزمین افغانستان کی فضا کو آگ اور خون کے بادلوں سے مستور کر دے گا۔ اس طرح ''نبی'' قادیان کی بعثت کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

عضوا علیکم الا نامل من الغیظ، قل موتوا بغیظکم. (آل عمران: 119)

ہم نے ہر چند چاہا کہ قادیانی سمجھیں، غور و فکر سے کام لیں اور اس آہنی دیوار کے ساتھ سر ٹکرانے سے محترز رہیں جس کا نتیجہ ان کی اپنی پیشانیوں کے زخمی ہونے کے سوا اور کچھ نہ نکلے گا لیکن وہ بار بار کے تلخ تجربات کے باوجود اسی خارزار پر مشق خرام کے لیے نکلتے ہیں جہاں ان کے پائے خرام کا پاشنہ بارہا زخمی ہو چکا ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ ان کے پاؤں کے تلووں میں جو کانٹے چبھے تھے، وہ پاؤں کے اوپر نکل آئے ہیں اور اس کے باوجود انہیں اپنی برہنہ پائی کا احساس نہیں ہوتا۔ چند روز کے بعد ان کے زخم اندال پذیری کے قابل بنتے ہیں تو حواس باختہ اور عقل سوختہ انسانوں کی طرح پھر اسی خارزار پر غیر محتاط انداز میں بھاگنے دوڑنے کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔

انہیں یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہے کہ نعمت اللہ وغیرہ کی سنگساری کے واقعہ پر انہوں نے تمام یورپی حکومتوں کے دروازوں کی خاک چاٹی تھی کہ کوئی ان کی فریاد رسی کے لیے اٹھے۔ انہوں نے دینی غیرت کی متاع عزیز اغیار کے دامنوں میں ڈال کر اور کاغذی لباس پہن کر جمعیۃ الاقوام کی مشورت گاہ میں بار حاصل کیا تھا مگر جمعیۃ الاقوام اور اس کے بڑے بڑے ارکان تو رہے ایک طرف، وہ لوگ بھی ان کی فریاد پر متوجہ نہ ہوئے جن کی دنیاوی قوت کے استحکام و پختگی کی خاطر قادیانیوں نے روز اول ہی اپنی غیرت و حمیت کو بے تکلفانہ ذبح کر ڈالا تھا۔ اس آسمانی ضرب کے بعد بھی قادیانیوں کو ہوش نہ آیا اور آج وہ کابل کے خلاف مسولینی کی تائید میں سرگرم ہیں۔ پھر ساتھ ہی عالم اسلام اور افغانستان سے توقع رکھتے ہیں کہ انہیں مرتد نہ سمجھا جائے اور سیاسی ارتداد کے اس زہریلے پھوڑے کو نشتر سے روشناس نہ کیا جائے۔

''الفضل'' نے اپنی تازہ ترین اشاعت میں جو زہر اُگلا ہے، ہم اس کے مفصل جواب کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس لیے کہ لایعنی زہر افشانی کبھی کسی عقل دوست حلقے میں درخور التفات نہیں سمجھی گئی۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے، اتنا لکھنا بھی گوارا نہ کرتے اگر قادیانیوں کی اسلام دشمن

فطرت کے مکروہ اور گھناؤنے خط و خال کی طرف اشارہ کرنا ضروری نہ ہو جاتا۔ اس امر کی صراحت کی کوئی ضرورت نہیں کہ دولت بیہہ افغانستان نے مسولنی کی گیڈر بھبکی کا کیا جواب دیا۔ وہ جواب من وعن شائع ہو چکا ہے۔ موقر معاصر''امان افغان'' کا طویل مقالہ دنیا کے سامنے ہے۔ معلوم کرنے کی بات یہ ہے کہ مجنون مسولینی نے اپنے الٹی میٹم کو معرض عمل میں لانے کے لیے کیا کچھ کیا؟ اس نے یونان کے خلاف چندروز کے اندراندر فوجی کارروائی کی تھی، افغانستان کے خلاف کیا کارروائی کی؟ کیا افغانستان نے پیرنو کا خون بہا واپس دے دیا؟ کیا کابل میں پیرنو کی تائید میں مظاہرہ ہوا؟ کیا افغانی وزیر خارجہ نے ایک افغانی دستہ فوج کے ہمراہ اطالوی سفارت خانہ میں جا کر اطالوی علم کی سلامی اُتاری؟ قادیانی اٹلی کی بہت تائید کر رہے ہیں۔ مسولینی سے جا کر کہیں کہ وہ اپنے ان مطالبات کو منظور کرائے، اگر ہو سکے تو اس کی فوج کے ساتھ خود بھی رضا کارانہ شامل ہو جائیں پھر تجربہ کرلیں کہ افغانستان اٹلی کے الٹی میٹم کا جواب کس رنگ میں دیتا ہے۔

رہا پیرنو کے زرفدیہ کی واپسی کا معاملہ تو حقیقت یہ ہے کہ ایم فلیکس ویلائی کے اہم اور معقول و مدلل مضامین کی اشاعت کے باوجود اب تک قادیانی غلطی میں پھنسے ہوئے ہیں یا دیدہ و دانستہ غلطی ہی میں رہنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جو غیر ملکی افغانستان کی ملازمت اختیار کرتا ہے، وہ ملازمت سے پیشتر افغانستان کے قانون رائج الوقت کی پابندی کا صاف صاف اقرار کرتا ہے۔ پیرنو اس اقرار کے بعد افغانستان کا ملازم ہوا۔ پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کے ایک باغیانہ وقاتلانہ جرم میں کیوں اسے قرار واقعی سزا نہ دی جاتی؟ جب اسے موت کی سزا کا حکم سنایا گیا تو مسولنی نے اعلیٰ حضرت امیر غازی سے رحم کی درخواست کی، اس بناء پر اعلیٰ حضرت نے ازراہ مراحم خسروانہ پیرنو سے خون بہا لے کر موت کی سزا معاف کر دی۔ حالانکہ افغان ایک غیر ملکی کے ساتھ اس رعایت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے بعد پیرنو قید رہا اور اگر قید میں اس کا رویہ اچھا رہتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ جلد رہا ہو جاتا۔ مگر اس کی شرانگیز اطالوی فطرت پھر زوروں پر آ گئی اور وہ سازش کر کے قید خانہ سے بھاگ گیا، یہ دوسرا جرم تھا، اسی جرم کی پاداش میں اسے قانون کے مطابق قتل کیا گیا۔ لہٰذا یہاں کسی زرفدویہ کی واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مسولینی نے اس واقعہ پر جو رویہ اختیار کیا، وہ اس کی عقل باختگی کی موثق شہادت ہے۔

اس نے افغانی سفر کے دعوت نامے آخری وقت پر منسوخ کیے اور ایسا شرمناک الٹی میٹم دے دیا، حالانکہ وہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ اگر ساری سرزمین اٹلی کو وہ گرد بنا کر ہوا میں اڑا دے تو اس گرد کا ایک ذرہ بھی افغانستان نہیں پہنچ سکتا۔ یہ رویہ مسولینی کی انتہائی اخلاقی پستی کا منظر تھا۔ حکومت افغانستان اگر چاہتی تو اس کی تقلید کرسکتی تھی لیکن اس نے سخت غیظ وغضب کے عالم میں بھی متانت کے رشتہ ملکوتیت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ''ڈیلی ٹیلی گراف'' کے ''طویل'' تار پر زور دینا عبث ہے۔ اس طویل تار کی منصوصیت کا قادیانیوں کے پاس کوئی پروانہ ہو تو ہو، ہمیں تو معلوم نہیں کہ کوئی نبی ''ٹیلی گراف'' نامی کتاب بھی دنیا میں لایا ہے۔ قادیانی ہر حصہ ارضی میں انبیاء کے اثبات کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ شاید انہیں ''ڈیلی ٹیلی گراف'' کے منزل من اللہ ہونے کا بھی علم ہو۔ اگر افغانستان کے خلاف ہی کچھ لکھنا تھا تو بہتر ہوتا کہ اطالوی اخبارات کے تراجم شائع کیے جاتے۔ قادیانیوں کی فطرت بہ دستور عناد پر قائم چلی جاتی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود نے جمعہ کے ایک خطبہ میں امیر امان اللہ خان غازی کو مذہباً کنگ جارج سے کروڑوں درجے بہتر ظاہر کیا تھا۔ اس پر ہمیں خیال ہوا تھا کہ شاید قادیانی راہ راست کی طرف مائل ہو رہے ہیں لیکن افسوس کہ ہمارا خیال غلط نکلا۔ قادیانیوں کا فیصلہ ہی یہ ہے کہ

ماهما نیم که بودیم و هماں خواهد بود

ہمیں یہ کہنے کا حق حاصل نہیں کہ قادیانی اسلام کی مخالفت چھوڑ دیں لیکن کیا ان کا دماغ اتنا بھی نہیں سوچ سکتا کہ افغانستان اور اٹلی کے معاملہ میں اٹلی کی حمایت مخالفت اسلام کا ایسا بیہودہ، لایعنی، بے اثر اور مہمل طریقہ ہے کہ کوئی شخص بہ درستی ہوش وحواس اس کے اختیار کرنے پر فخر نہیں کرسکتا؟ اگر قادیانیوں کا جذبہ عداوت اسلام ایسا ہی تیز ہے تو کم از کم انہیں اس کا اظہار ایسے معاملات میں کرنا چاہیے جن سے کوئی نتیجہ نکلے۔ لغو اور بے نتیجہ باتوں سے مسلمانوں کو اپنے خلاف آمادہ کرنا ''قادیانی'' دانشمندی ہو تو ہو ''انسانی'' دانشمندی تو قطعاً نہیں ہے۔

(زمیندار، 18 اگست 1925ء)

فکاہات

مرفوع القلم شاعر

ہم نے اپنے مخدوم ومحترم ابوالوفا مولانا ثناء اللہ صاحب مدیر ''اہل حدیث'' کو کسی گذشتہ اشاعت میں پنساری سے تشبیہ دی تھی جن کی دکان میں پسی ہوئی سرخ مرچوں کی بوریوں کی بوریاں بھری رکھی ہیں کہ ان میں سے پنساری صاحب ہر ہفتہ قادیانی زبانوں اور نتھنوں کی تواضع بقدر دوایک چٹکی کے فرمادیا کرتے ہیں لیکن 5 اکتوبر کے ''اہل حدیث'' سے معلوم ہوا کہ مولانا پنساری ہی نہیں بلکہ ایک گرگ باراں دیدہ بھی ہیں جس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے ایک اعجازی قصیدہ میں آپ کی باراں دیدگی کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

اآخیت ذئباً عایثاً او ابا الوفا

او افیت مداً اورئیت امرتسر

(اعجازِ احمدی ضمیمہ نزول المسیح صفحہ 78، مندرجہ روحانی خزائن جلد 19، صفحہ 191 از مرزا قادیانی)

مولانا ابوالوفا نے بھی اپنی ذئبیت کا اقرار کرلیا ہے یعنی اپنے نحوی دندان و چنگال سے اس قصیدے کے دامن اعجاز کو اس بری طرح سے نوچا، کاٹا، بھنبھوڑا اور پھاڑا ہے کہ نہ تار اپنی جگہ پر قائم ہے نہ پود اپنے ٹھکانے ہے۔

فرماتے ہیں کہ معلوم نہیں اس کو شعر کہنے کی کون سی ایسی ضرورت پڑی تھی جبکہ خیر سے آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ مفعول بہ منصوب ہوتا ہے، مرفوع نہیں ہوتا۔

مرفوع القلم شاعر شاید ایسے ہی ہوتے ہوں گے کہ امرت سر کو عربی کا مفعول بہ بنا کر اس پر رفع دے دیا کریں۔

قاضی اکمل آف گولیکے نے قرآن حکیم کی آیات کی کتابت کے متعلق ہمارے کاتب کی ایک لغزش کو ہمارے سر چپکایا تھا اور خود اس شان جبروتی کا جلوہ دکھا کر جو جناب باری ہی کو سزاوار ہے، اشارتاً دعویٰ فرمایا تھا کہ آپ جیسے صدر نشینان بزم روحانیت سے ایسی خطاؤں کا سرزد ہونا محال ہے۔

مولانا ثناء اللہ نے جن کی نگاہ میں اکملی اور محمودی کون ومکاں کے جلوے ہیں اور جن

سے نہ کوئی قاضی چھپا ہے نہ کوئی موسیو، جھٹ اس قادیانی التباس کا راز طشت از بام کر دیا کہ یہ لوگ ''**یاایھا الناس** ''کو''**یاایھا الذین امنو**'' لکھ مارتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس کا ترجمہ بھی ''اے لوگو'' نہیں کرتے جس سے خیال ہوسکتا کہ عربی کا تب نے غلطی سے لکھ دی تھی مگر مترجم کے پیش نظر اصل آیت کلام اللہ ضرور تھی اور اس نے صحیح ترجمہ کیا تھا بلکہ ترجمہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ ''اے لوگو'' جو ایمان لائے ہو۔''

دو بھائی مدرسہ میں شرارت کرتے ہیں اور استاد قمچی لے کر ان کی کھال ادھیڑنے کی فکر میں ہوتا ہے تو چھوٹے بھائی صاحب گڑگڑا کر کہتے ہیں کہ قبلہ و کعبہ! میں نے شرارت نہ کی تھی، یہ سب کیا دھرا بڑے بھائی جان کا ہے۔

مولوی ثناء اللہ جب ہنٹر لے کر اکمل آف گولیکے کے گرد ہو گئے تو اکمل صاحب باتباع روش برادر خود استاد جی سے کہتے ہیں کہ ''**یاایھا الناس** ''میں نے نہ لکھا تھا۔ یہ تو بڑے بھائی محمد علی ایم۔اے نے لکھ دیا تھا۔ حضور کی ''خردہ گیری نا معقول اور بعد از وقت ہے''

آج تک کسی شاگرد نے استاد کو نا معقول نہ کہا تھا لیکن اس زمانہ میں جب کہ طلبہ کے نصاب میں باب الفتن داخل ہو، اس قسم کا قال اقوال جائز ہے، خصوصاً جبکہ استاد ثناء اللہ ہوں اور شاگرد موسیو محمود یا اکمل آف گولیکے۔

(زمیندار 12 اکتوبر 1917ء)

قادیانی تاویلات

قادیانی حضرات کی بے پناہ تاویلوں سے خدا بچائے۔ جس وقت یہ لوگ تاویل پر اُتر آتے ہیں تو بلا پس و پیش ظن و تخمین کو یقین کا رتبہ دیتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی نکتہ کی متعدد و مختلف تاویلات کر کے اس کو ہمیشہ کے لیے غارت کر دیتے ہیں اور پڑھنے والا نہیں سمجھتا کہ حاصل کلام کیا ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ایک روایت ہے کہ آپ دجال کی تلاش میں نکلیں گے اور ''لُد'' کے دروازے پر جو بیت المقدس کے قریب ایک گاؤں ہے، اس کو پکڑ کر قتل کر ڈالیں گے۔ اب سنیے کہ اس بابِ لُد کے متعلق ہمارے قادیانی کرمفرماؤں نے کتنی قلابازیاں کھائی ہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی کتاب ''ازالۃ الاوہام'' صفحہ 220 (مندرجہ روحانی خزائن جلد 3، ص 209) میں اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ فی الواقع بیت المقدس کے پاس ایک گاؤں لُد کے نام سے مشہور ہے لیکن ان کے فرزند مرزا بشیر احمد ایم اے نے ''تبلیغ ہدایت'' مطبوعہ 1922ء میں لکھا کہ:

محدثین یہ کہتے ہیں کہ لُد ایک جگہ کا نام ہے جو دمشق کے پاس ہے، یہ محض ان کا خیال ہے۔ (تبلیغ ہدایت ص 104 از مرزا بشیر احمد ایم اے)

مرزا بشیر احمد نے یہ لکھ کر صرف محدثین کرام ہی کی تکذیب نہیں کی بلکہ اپنے والد بزرگوار کے قول کو بھی جھٹلا دیا۔

فلسطین میں لُدّ اب کے ''خلیفۃ المسیح'' صاحب کی سیاحت کے دوران میں اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو لُد دکھا بھی دیا۔ چنانچہ ستمبر کے ایک پرچہ ''الفضل'' میں یہ عبارت مندرج ہے۔

''لُد ایک جنکشن ہے۔ یہاں سے قدس کے لیے پھر گاڑی بدل جاتی ہے۔ گاڑی تبدیل کر کے ہم قدس پہنچ گئے، یہ وہ مقام لُد ہے جس کی نسبت ہمارے مخالف مسلمان کہتے ہیں کہ مسیح، دجال کو بابِ لُد پر قتل کرے گا''۔

لیکن چونکہ مسیح موعود شام میں نازل ہونے کے بجائے قادیانیوں کے نزدیک پنجاب میں ہی تولّد ہو گئے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ اس ''لُد'' کی کچھ تاویل سوچی جائے۔ اب تاویلات ملاحظہ ہوں۔

پنجاب میں لُد: سب سے پہلے ایک قادیانی مولوی نے یہ بات نکالی کہ لُد سے مراد ''لدھیانہ'' ہے، جہاں مرزا قادیانی نے پہلے پہل بیعت لی اور مولوی محمد حسین بٹالوی مرحوم سے بحث کی۔ مولوی صاحب دجال قرار پائے اور قتل ''تیغ دلائل'' سے عمل میں آیا۔ لہٰذا یہ پیشگوئی پوری ہوگئی ہے کہ مسیح موعود دجال کو بابِ لُد پر قتل کرے گا۔

کشمیر میں لُد: قاضی ظہور الدین اکمل قادیانی نے کتاب ظہور المہدی صفحہ 253 پر لکھا کہ لُد اصل میں لداخ کا مخفف ہے۔ چونکہ لداخ کشمیر ہے اور کشمیر میں حضرت عیسیٰ کی قبر (بقول حضرات قادیاں) دریافت ہوئی ہے اور اس دریافت سے چونکہ عیسائیت کا دجال قتل ہو گیا ہے، لہٰذا مان لیجیے کہ مسیح موعود نے دجال کو بابِ لُد پر قتل کر دیا۔

انگلستان میں لُد: تازہ ترین تاویل بہت پر لطف ہے۔ ''الفضل'' لکھتا ہے کہ مرزا

بشیر الدین محمود نے اس دفعہ انگلستان کا جو سفر کیا اس کا انتظام جس کمپنی کے ماتحت تھا، اس کا دفتر لندن کے محلّہ ''لُڈ گیٹ'' میں ہے اور ''خلیفۃ المسیح '' سے جتنی خط و کتابت لوگوں نے کی، اسی لُڈ گیٹ Ludgate کی وساطت سے کی۔ اس کا ترجمہ ''بابِ لُد'' ہے اور چونکہ اس سفر میں مرزا صاحب نے مسیحیت کے دجال کو قتل کر دیا ہے (حالانکہ اب تک قتل کی کوئی خبر نہیں آئی) لہٰذا یہ پیشگوئی پوری ہوگئی کہ مسیح موعود دجال کو بابِ لُد پر قتل کرے گا۔

اب ہم حیران ہیں کہ پیشگوئی میں کون سا ''لُد'' مقصود ہے، لدھیانہ یا لداخ یا لڈگیٹ۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک لُد ہے تو پھر پیشگوئی کے اس حصے کا کیا جواب ہے کہ لُد بیت المقدس کے قریب واقع ہے۔ اب قادیانی دوست ہمیں بتائیں کہ ان چاروں لُدوں میں سے کون سا ''لُد'' حقیقی ہے اور کون سے ''لُد'' مجازی ہیں۔ اگر وہ لدھیانہ والے ''لُد'' ہی پر قائم رہتے اور جس طرح انہوں نے قادیان کو ''دمشق کا مشرقی منارہ'' قرار دیا تھا۔ لدھیانہ کو دمشق کے متصل ایک گاؤں قرار دے دیتے تو ایک بات بھی تھی لیکن اب تو ساری دنیا میں لُد ہی لُد نکل آئے۔ پنجاب میں لُد، فلسطین میں لُد، کشمیر میں لُد، انگلستان میں لُد۔

نوٹ: خود مرزا قادیانی نے لُد سے لدھیانہ مراد لیا ہے۔

(الہدیٰ ص 92 حاشیہ مندرجہ روحانی خزائن جلد 18 ص 130)

(زمیندار، 29 دسمبر 1924ء)

قادیانیوں کی خوشیاں

حضرت امیر مینائی علاوہ اپنی دیگر فضیلتوں کے ایک شاعر بھی تھے اور بہت بڑے شاعر۔ ان کی زبان سے ایک حقیقت کا اظہار ہوا ہے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

وہ انسان ہی کیا جس کی اُمیدوں کا آخری نقطہ ذاتی منافع اور ذاتی سکھ دکھ تک محدود ہے۔ انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان دوسروں کی تکالیف کو بھی اسی طرح محسوس کرے جس طرح اپنی تکالیف سے متاثر ہوتا ہے، ورنہ اپنے رنج پر رونا اور تکلیف سے کراہنا اور زخم میں نالہ وفریاد

بلند کرنا، آدمیوں پر ہی منحصر نہیں حیوانات تک میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں۔

قادیان کے وجود کو دنیا کے لیے بلائے ناگہاں اور دردِ بے درماں کہا جائے تو بجا ہے کیونکہ وہاں سے دنیا کے دکھ اور مصیبت میں بجز کسی رنجیدہ مکروہ آواز کے اور کچھ بھی سنائی نہیں دیتا اور وہاں سے کبھی ایسی آواز بلند کانوں میں نہیں آئی جس سے قیاس کیا جائے کہ سکنائے قادیان اور متعلقین قادیان اور مستطلین قادیان کے سینوں میں بھی زندہ گوشت کا دردمند حساس دل ہو بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں دردِ آشنا اور ہمدرد دل کی جگہ برف کا ٹکڑا یا سنگ خار کی سل دھری ہوئی ہے، مگر ہم یہ بات بھی باور نہیں کر سکتے کیونکہ اگر قادیانی قلوب انسانوں کو رنج و راحت میں بے حس رہتے تو خیال کر لیا جاتا کہ قسام ازل نے انہیں بے حس دل دیا ہے۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ اس دل میں انسانوں کی خوشی سے کوئی خوشی تو یقیناً پیدا نہیں ہوتی، ہاں جب نوع بشر پر کوئی مصیبت آئے تو ان کے دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگتے ہیں اور ایسے بے قابو ہو جاتے ہیں کہ بس چلے تو کہ صندوق سکینہ کو توڑ کر باہر نکل آئیں اور خوشی سے رقص کرنے لگیں۔

اس خوشی کی تہہ میں ایک خیال خام کام کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ ان آفات سے مسیح قادیان کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ دیر کے قصے دہرانا مطلوب نہیں، تازہ واقعہ جو اسی مہینہ میں ظاہر ہوا ہے، قادیانی ادبیات اور نفسیات کا مظہر خاص ہے۔

یقیناً ناظرین کو تو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قادیان کے ارباب عمائم فن تاویل میں بے نظیر واقع ہوئے ہیں۔ دنیا کا کوئی واقعہ ان کے احاطہ قہاریت سے باہر نہیں ہوتا، لیکن شائبہ ہے کہ انہیں ہمیشہ بعد از وقت ہی سوجھا کرتی ہے اور سلسلہ تاویل کسی مہربان چشیدہ کی ٹھنڈی سانس اور آہ سرد کی طرح اتنا لمبا اور نازک ہوتا ہے کہ بغیر خاص دماغوں اور ''معارف آشنا'' دلوں کے اور کسی کو کیا مجال ہے جو سمجھ آ جائے۔

دمشق کی گولہ باری ایسا سانحہ اور فاجعہ کبری نہیں کہ اس کو آسانی سے فراموش کر دیا جائے بلکہ تمدن عالم کی اس قدیم ترین یادگار کی بربادی اور اس کے باشندوں کی مظلومانہ ہلاکت پرستاران تاویل کے لیے حسرت اور تمدن جدید کے دامن پر خوفناک، نہ مٹنے والا تاریک ترین داغ ہے۔ ہر ایک انسان خواہ وہ کسی قوم وملت سے متعلق ہو، اس حادثہ عافیت شور پر متاسف ہے

لیکن ایک حاشیہ برداران قادیان کی جماعت ہے جن کے دل ذرا بھی پسیجتے نظر نہیں آتے۔ اس کی تہہ میں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، وہی جذبہ کام کر رہا ہے کہ اس سے مسیح قادیان کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔

ہم خوش ہوتے اگر اس جذبہ کی کچھ بنیاد بھی ہوتی لیکن ڈھونڈھنے پر بجز ''درخ'' ''درخ'' اور کچھ نہ نکلا۔ ارشاد ہے کہ مسیح قادیان کو ایک ''الہام'' ہوا تھا جس کے الفاظ یہ ہیں ''بلائے دمشق''۔ (تذکرہ مجموعہ وحی و الہامات ص 603 طبع چہارم از مرزا قادیانی) اس کا کیا مطلب تھا خود ملہم نہیں سمجھا۔ ہاں اس الہام کی شہرت اس وقت ہوئی تھی جب مرزا بشیرالدین محمود خلیفہ جماعت قادیان پچھلے سال سیاحت یورپ کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ راستہ میں شام کی بھی آپ نے سیاحت فرمائی۔ آپ نے جب ارض مقدس شام کا رخ کیا تو آپ کے سیکرٹریوں میں سے بعض کے بیانات جو انہی اخبار الفضل قادیان میں شائع ہوئے تھے، مظہر تھے کہ راستہ میں خدا جانے کیوں جناب موصوف کو اسہال شروع ہو گئے۔ اس کثرت اور شدت سے کہ خود موصوف نے مراجعت کے بعد قادیان میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ پاجامہ میں بھی رفع حاجت ہو جاتی تھی، (مفہوم) ایسی حالت دیکھ کر بارہ سیکرٹریوں میں سے ایک شیخ یعقوب علی ایڈیٹر الحکم نے یہ تشریح کی کہ ''بلائے دمشق'' یعنی جناب مرزا محمود احمد کا دمشق میں تشریف لے جانا خود آپ ہی کے لیے بلا ثابت ہوا۔ یہ سب باتیں شائع ہو کر اخبارات قادیان کے صفحات پر موجود ہیں۔

یہ سب کچھ ہو چکا، گویا جماعت قادیان کے نزدیک ''یہ پیشگوئی پوری'' ہو گئی۔ مگر قادیانی لٹریچر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں پیشگوئیاں زمین کی طرح چکر کھاتی رہتی ہیں اور ان کے مفاہیم بھی جرح و وار سے کم سیر نہیں کرتے۔ گو ہر مفہوم کم از کم ایک دوسرے سے اتنا ہی متغائر اور متخالف ہوتا ہے جتنی کہ شب یلدا کی تاریکی اور مہر نیمروز کی ضیاء عالم افروزی مگر قادیانی دماغوں میں یہ سب ضدیں جمع ہو کر ایک ہی ہو جاتی ہیں اور مطلق اجنبیت باقی نہیں رہتی۔

اب جو دمشق پر آفت آئی نہ کہ دمشق سے آفت آئی تو ''پیغام صلح'' میں ایک مضمون بلائے دمشق کے عنوان سے شائع ہو گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ''غشم غشم غشم'' اور ایک کلام

اور ''دولڑکیاں'' اور ''خاکسار پیپر منٹ'' اور ''زار بھی ہوگا تو ہوگا'' اور کسی کی ''دلجوئی'' اور ''مشرقی طاقت'' اور چند روپیہ اور ''ٹھنڈے پانی'' (ایسے الہامات) سے مدعی قادیان کی مسیحیت ثابت ہوسکتی ہے تو پھر غریب ابن صیاد نے کیا قصور کیا تھا کہ اس کے بھی ایسے ہی الہامات سے اس کی تصدیق اہل قادیان نہ کریں۔ کیونکہ روایات سے ثابت ہے کہ جب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا امتحان لینا چاہا تو آپ پر سورۂ دخان نازل ہوئی تھی۔اس سے آپ نے پوچھا تو اس نے کہا ''دخ'' ''دخ''۔اگر ''غثم غثم'' ''بلائے دمشق'' سے جناب مسیح قادیان کا دعویٰ اہل قادیان کے نزدیک سچا ثابت ہوتا ہے تو انصاف یا شکوک دجال کرنا چاہیے کہ ابن صیاد کے لیے وہ کس قصور کی بناپر ''دجال'' کا فتوی صادر فرماتے ہیں۔

(زمیندار، 8 دسمبر 1925ء)

چندے کی آڑ میں

قادیان میں جو مرید حاضر ہوتا ہے، اسے خواستہ ناخواستہ کچھ نہ کچھ نذر و نیاز خلیفہ صاحب کی خدمت میں پیش کرنی ہی پڑتی ہے۔اس لیے خلیفہ صاحب کی خواہش ہے کہ جو لوگ آپ کی ارادت کا حلقہ کانوں میں رکھتے ہیں، وہ سال میں متعدد مرتبہ قادیان آئیں لیکن مرید بھی اب ہوشیار ہوگئے ہیں۔حتی الوسع جلسہ سالانہ کے سوا گھر سے باہر قدم نہیں رکھتے اور چاہیے بھی ایسا ہی، بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر خلیفہ صاحب کے لیے اسباب تعیش مہیا کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟

مریدوں نے دیکھا کہ جو کچھ ان کے پاس ہے، پہلے تو وہ چندوں کی صورت میں ہی لے لیا جاتا ہے پھر اگر کوئی شخص اس پر بھی کچھ پس انداز کرے تو وہ وصیت کے ذریعہ چھین لیا جاتا ہے تو انہوں نے بار بار قادیان جانا بند کردیا۔خلیفہ صاحب سٹ پٹائے اور سٹ پٹانا ہی چاہیے تھا، جو کچھ چندوں کے ذریعہ آتا ہے،اس میں بیسیوں حصہ دار اور ہیں اور ہر حصہ دار اس کا حساب معلوم کرنے کا آرزومند اور نذر و نیاز کی رقم تو تمام تر انہی کی جیب میں جاتی تھی، اس لیے آپ نے اس بڑھتے ہوئے خطرہ کے سیلاب کے سامنے الفاظ ذیل سے بند باندھا۔

''اس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے قادیان کو تمام دنیا کی بستیوں کی اُم قرار دیا ہے۔اس لیے اب وہی بستی پورے طور پر روحانی زندگی پائے گی جو اس کی

چھاتیوں سے دودھ پیئے گی۔'' دودھ ڈبوں (اخبارات) میں بند کر کے بھی بھیجا جاتا ہے مگر کجا تازہ دودھ اور کجا باسی۔ پس یہاں آ کر حقیقی نفع حاصل کرو، صرف جلسہ سالانہ پر آنا کافی نہیں۔

(حقیقۃ الرویاء صفحہ 45 طبع اوّل از مرزا بشیر الدین محمود)

لیکن خلیفہ صاحب کو خیال ہے کہ شاید میرے بعد خلافت میری اولاد میں سے کسی کو نہ ملے اور کسی دوسرے کے قبضہ میں چلی جائے اور ممکن ہے کہ وہ میرے اس قول سے فائدہ اٹھا کر مریدوں سے نذریں وصول کرے، اس لیے آپ نے یہ الفاظ اس پر اضافہ کر دیے۔

کیا مکہ اور مدینہ کی چھاتیوں سے یہ دودھ سوکھ گیا ہے کہ نہیں؟ اسی طرح وہ وقت بھی آئے گا جب قادیان کا یہ دودھ بھی سوکھ جائے گا۔

(حقیقت الرویا صفحہ 45و46 از مرزا بشیر الدین محمود)

خلیفہ صاحب کی یہ تحریر بدحواسیوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مکہ و مدینہ سے (معاذ اللہ) برکت اُٹھ گئی ہے۔ حالانکہ یہ بیان ارشاد خداوندی کے خلاف ہے۔ بہتر ہوتا کہ جہاں خلیفہ صاحب نے اتنی زحمت اٹھائی تھی، وہاں یہ بھی بتا دیتے کہ قادیان کا دودھ کب سوکھے گا۔ ہمارے خیال میں تو اس کے سوکھنے کا وقت یہی ہے کیونکہ بقول خلافت پناہی وہاں منافقین پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ پھر جب قادیان کے رہنے والے جو اس دودھ پر پل کر جواں ہوئے ہیں، اسے ہضم نہ کر سکے تو دوسروں کے معدے کہاں اس کی تاب لائیں گے۔ اس لیے یہ جس قدر جلد ہی سوکھ جائے، اچھا ہے۔

(زمیندار، 19 جون 1928ء)

دروغ بے فروغ

موسیو مرزا بشیر الدین محمود مشی فی النوم کے کابوسی فلسفہ کا درس دے سکتے ہیں، مہ جبیں مستورات کو دریائے بیاس کے ساحل پر چاند ماری کرا سکتے ہیں۔ دورِ جاہلیت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے دل پر جادو کے ڈورے ڈال سکتے ہیں، بہشتی مقبرہ کی ہڈیوں کی تجارت سے اپنی روپہلی اور سنہری ہمیانیاں بھر سکتے ہیں، غرض وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جو آپ کی کن فیکونی شان کا قادیانی

تقاضا ہے، لیکن سر میلکم ہیلی کو اس باب میں از راہ غایت شوخ چشمی کچھ یوں ہی سا شبہ ہوا تھا کہ آیا آپ اپنے ان گونا گوں اور بوقلموں روحانی کمالات پر دنیوی برکات کا اضافہ بھی فرما سکتے ہیں یا نہیں، یعنی مسلمانوں کو ہندوؤں سے لڑانے کا اجارہ بھی لے سکتے ہیں یا نہیں۔ جب تک سر میلکم ہیلی اس صوبہ کے گورنر رہے، اس شبہ کے ازالہ کی توفیق موسیو مرزا کو نہ ملی کیونکہ شملہ کی ایک ہی ڈانٹ آپ کی روح مقدس کو سلب کرنے کے لیے کافی تھی، لیکن اب کہ سر میلکم کا جلال مسند پنجاب پر جلوہ گر نہیں ہے، جناب موسیو جی کڑا کر کے اپنے بل سے برآمد ہوئے ہیں اور 16 اکتوبر کے ''الفضل'' میں یوں بنکارتے ہیں:

> ''میں پچھلے سال شملہ گیا تو وہاں سابق گورنر صاحب پنجاب نے مجھے بلوایا اور یہ سوال کیا کہ میں ایک مذہبی آدمی ہوں۔ مجھے دنیاوی امور میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ میں نے تمدنی تحریکات کیوں کیں۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ یہ بھی میرا ہی کام ہے کہ میں فیصلہ کروں کہ کون سا کام دنیوی ہے اور کون سا دینی۔ گورنر صاحب کا یہ کام نہیں کہ مجھے بتائیں کہ تمہاری فلاں تحریک دینی ہے اور فلاں دنیوی۔ وہ خود اپنے متعلق فیصلہ کر سکتے ہیں مگر میں اپنے متعلق خود ہی فیصلہ کروں گا۔ میں جس چیز کے متعلق سمجھوں گا کہ اُس کا اثر مذہب پر پڑے گا تو اس میں ضرور دخل دوں گا''۔

کاش موسیو مرزا نے اس ڈانٹ کا اعلان جو اُنہوں نے سر میلکم ہیلی کو اب پلائی ہے، اسی وقت فرما دیا ہوتا جب سر میلکم ہیلی یہاں موجود تھے اور ہمیں باور آجاتا کہ قادیاں میں ہیجڑوں کے گھر بھی بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اب تو یہی سمجھا جائے گا کہ آپ یوں ہی دون کی لے رہے ہیں اور آپ کی ان لن ترانیوں کی حقیقت ایک دروغ بے فروغ سے زیادہ نہیں۔

(زمیندار، 19 اکتوبر 1928ء)

منافقت

موسیو مرزا بشیر الدین محمود نے یہ دیکھ کر کہ جماعت مرزائیہ کے مرد چندہ دیتے دیتے تنگ آگئے ہیں، عورتوں کی جیبوں کی طرف توجۂ شرف مبذول فرمائی اور حکم دیا کہ عورتیں مردوں

سے لے کر نہیں بلکہ اپنے پاس سے چندہ دیں۔اس پر قادیانی خرافات کی پوٹ ''الفضل'' لکھتا ہے کہ ضلع جالندھر کی ایک خاتون اس اپیل سے اس درجہ متاثر ہوئی کہ اس نے خود چکی پیسنی شروع کر دی تا کہ آٹے کی پسپائی کی اُجرت سے خلافت پناہی کی مٹھی گرما دیا کرے۔ اس پر خلیفہ صاحب کی باچھیں کھلی جاتی ہیں لیکن اگر خلیفہ صاحب اپنی امت کی بیبیوں کو چکی پسنے پر مجبور کر رہے ہیں تو وہ سب سے پہلے اپنی ''امہات المومنین'' کو اسی قسم کی ''کفایت شعاری'' کی تعلیم کیوں نہیں دیتے۔اپنی بیویوں کو بیش قیمت انگریزی، ترکی، ایرانی اور ہندوستانی لباس پہنا کر ربڑ کی کشتیوں میں سیر کرانا اور چاند ماری سکھانا اور مریدوں کی بیویوں کو چکی پیسنے پر مجبور کرنا کہاں کی خلافت ہے؟ کاش یہی چیز عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے مرزائیوں کی آنکھوں سے غفلت کے پردے اٹھائے اور وہ سمجھیں کہ جس تحریک کا مقصد صرف جلب زر ہو، وہ کبھی دینی اور روحانی تحریک نہیں ہو سکتی۔

(زمیندار، یکم دسمبر **1928**ء)

قادیانی پازند

خدائے قادیان اپنے پوتے برخوردار بشیرالدین محمود کے سر پر مدتوں سایہ افگن رہے جس کے کن فیکونی اختیارات کے صدقہ میں عہد عتیق کی روایات جو صرف موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے دم سے زندہ تھیں، اس زمانہ میں بھی اپنی ایک آدھ جھلکی دکھا ہی جاتی ہیں اور گو پردۂ بصارت پر ان کی تصویر ہو بہو تو نہیں اترتی لیکن اس کا ایک دھندلا سا خاکہ ضرور آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔مثلاً توریت کے دور میں ایک فرعون بھی تھا، کچھ جادوگر بھی تھے جو دربار مصر میں رسیوں کو جیتا جاگتا سانپ بنا دیا کرتے تھے اور ان کے مقابلہ میں ایک کلیم اللہ بھی تھا جو اپنی لاٹھی کو دنگل میں پھینک کر اژدھا بنا دیتا تھا اور یہ اژدھا سارے سانپوں کو سموچا نگل جاتا تھا۔آج بھی سوجھ بوجھ رکھنے والوں کے لیے ایک فرعون موجود ہے، کچھ رسیوں کو سانپ بنانے والے ساحر موجود ہیں۔غرض وہ کئی ہزار سال پرانے ساز و سامان سب موجود ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی موسیٰ موجود نہیں جس کا عصا دیکھتے دیکھتے ''ثعبان مبین'' ہو جائے اور سارے استدراجی سانپوں اور سنپولوں کو چشم زدن میں چٹ کر جائے۔

مولوی محمد علی امیر قادیانی لاہوری جماعت نے قرآن مجید کا ترجمہ زبان انگریزی میں کیا ہے۔ سورۂ مریمؑ کی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے جب آپ اس مقام پر پہنچے ہیں جہاں حضرت مریم اپنے نوزائیدہ بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے آتی ہیں اور یہودیوں کی ناپاک تہمت سن کر بچے کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور بچہ پکار اٹھتا ہے:

قال انی عبداللّٰہ، اتنی الکتب و جعلنی نبیاً o وَجعلنی مبارکاً این ماکنت و اوصٰنی بالصلوٰۃ والزکوۃ مادمت حیاً o و براً بوالداتی ولم یجعلنی جباراً شقیا (مریم:30 تا32) تو آپ کا ستون ایمان بالغیب مرکز ثقل سے ہٹ جاتا ہے اور آپ اس سارے واقعہ کی تاویل اس انداز میں فرماتے ہیں کہ واصل ابن عطا کی روح بھی کنج اعتزال میں پھڑک اٹھتی ہے۔ ازبسکہ آپ کے نزدیک یہ بات خارج از فہم بشری ہے کہ ایک دودھ پیتا بچہ فلسفیوں کی سی باتیں کرنے لگ جائے، اس لیے آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت مریم کے بچے کو گود میں لانے سے مراد یہ ہے کہ جناب مسیح علیہ السلام اپنی پوری سی سالہ شان شباب کے ساتھ گدھے پر سوار تھے، ان کی والدہ ماجدہ ان کے ساتھ ساتھ تھیں اور یہودیوں کو انہوں نے بتائید عقل و بلوغ وہ دندان شکن جواب دیا جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ یہ تاویل جو علامہ ابن جریر اور علامہ فخر الدین رازی ایسے عبقری مفسرین کو بھی نہ سوجھ سکی، فقط آپ ہی کا حصہ ہے۔

مولوی محمد علی لاہوری میں ایک اور بڑا وصف یہ ہے کہ **1910**ء تک آپ مرزا غلام احمد قادیانی کو اسی قسم کا نبی سمجھتے ہیں جیسے آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم تک کے عہد کے انبیاء ہو گزرے ہیں لیکن آگے چل کر آپ نے بلا اس بات کا خیال کیے ہوئے کہ خدائے قادیان کے پوتے صاحب آپ کو کیا کہیں گے، آپ نے اپنے عقیدہ میں تبدیلی فرمالی اور اب مرزا صاحب آپ کے نزدیک ایک مجدد سے زیادہ نہیں۔ اس تبدیلی مشرب پر آپ مستحق تبریک و تحسین ہیں اور یہ آپ کے کمالات کی کلاہ کا ایک اور طرۂ امتیاز ہے۔

یہ حقیقت قادیان کے آسمانی گزٹ اعنی ''الفضل'' کی گزشتہ اشاعت ہی سے معلوم ہوئی کہ آپ فرعون کے دربار میں اپنے ساحرانہ کمالات بھی دکھا سکتے ہیں یعنی بھری سبھا میں اپنی جھولی سے کچھ نکال کر اسے جیتا جاگتا سانپ بھی بنا سکتے ہیں۔

پچھلے دنوں راولپنڈی میں مناظرہ کا ایک جلسہ ہوا جس میں مولوی محمد علی لاہوری کے چیلے چانٹے بھی قادیان کے قدوسیوں کی تضحیک و تحمیق اور تذلیل و تفضیح کے لیے لنگر لنگوٹ کس کر آن موجود ہوئے۔قادیانیوں نے اپنی بے پناہ منطق کے ایسے ایسے جوہر دکھائے کہ ''پیغامی'' مبہوت ہو کر رہ گئے اور جب ان سے کچھ نہ بن پڑا تو انہوں نے محفل میں لا کر ایک سانپ چھوڑ دیا۔اس پر محفل میں کھلبلی پڑ گئی اور سارا جلسہ درہم برہم ہو گیا۔

قادیانی گزٹ میں یہ تصریح نہیں کی گئی کہ جو سانپ پھنکاریں مارتا ہوا مجلس مناظرہ میں نمودار ہو گیا تھا، وہ حقیقت میں کوئی جیتا جاگتا سانپ تھا یا دراصل کوئی مونج کی رسی تھی جسے ساحر لاہور نے اپنے غیر مبائعانہ ہاتھوں سے بٹ کر جلسہ میں پھنکوا دیا تھا اور وہ **"ھی ثعبان مبین"** ہو گئی تھی لیکن سانپ خواہ اصلی ہو خواہ نقلی، گوشت اور خون کا ہو، خواہ مونج کے ریشوں کا، پھر بھی یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ خدائے قادیان کے اُس پوتے نے جو مسند کن فیکون پر جلوہ گر ہے، کیوں اپنے کلیم غلام رسول راجیکی کے ہاتھ میں اُسی قسم کا عصا نہ تھما دیا جو اژدھا بن کر فرعون کے جادوگروں کے سانپوں کو نگل گیا تھا اور کیوں آپ کی کن فیکونی امت کمال سراسیمگی کی حالت میں سر پر پاؤں رکھ کر دیکھتے دیکھتے ففرو ہو گئی۔کیا قادیان کا الہامی گزٹ اس مسئلہ پر کوئی روشنی ڈال سکے گا؟

(زمیندار، 11 دسمبر 1928ء)

قادیانی تحریف وتقلیب

خدائے قادیان کے بیٹے آنجہانی مرزا قادیانی جب ایسی احادیث کی تلاش میں تھے جنہیں وہ اپنے اوپر چپک سکیں تو ان کی نظر رجل فارس والی حدیث پر آ ٹھہری۔آپ نے جھٹ کہہ دیا کہ ہم مغل نہیں بلکہ ایرانی ہیں اور یہ حدیث سلمان فارسیؓ کے حق میں نہیں بلکہ ہماری شان میں ہے۔بعض مریدوں کو یہ غیر منطقیانہ دعویٰ غلط معلوم ہوا مگر انہوں نے اس لیے سکوت کیا کہ مولوی نورالدین، خواجہ کمال الدین اور مولوی محمد علی لاہوری جیسے پڑھے لکھے حضرات اسے صحیح مان رہے ہیں۔

مولوی عبدالکریم فاضل مدیر ''مباہلہ'' خلیفہ قادیان کے نہایت ہی مخلص اور جان نثار مرید اور قادیانیت کے سب سے بڑے مبلغ تھے۔آپ کو حال ہی میں قادیانیت کا طوق اپنے گلے

سے اتار کر پھینک دینے کی وجہ سے منافق کا خطاب بارگاہِ خلافت سے مرحمت ہوا ہے۔ آپ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مبلغ کی حیثیت سے مجھے ایک گاؤں میں جانا پڑا جہاں کے احمدی، خلیفہ صاحب کی رنگ رلیاں دیکھ کر کچھ بددل ہو رہے تھے۔ مولوی عبدالکریم صاحب کا بیان ہے کہ میرے پہنچنے پر جلسے کا انتظام کیا گیا۔ جب میں تقریر کے لیے کھڑا ہوا تو مجھ سے سوال کیا گیا کہ مرزا صاحب کا رجل فارس ہونا ثابت کیجیے۔ اتفاق سے وہ پیچدار دلائل جو مرزا صاحب نے اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے پیش کیے ہیں، مجھے مستحضر نہ تھے، اس لیے میں نے بیان کیا کہ قادیاں اصل میں ''کادیاں'' تھا اور یہ نام اسے مرزا صاحب کے بزرگوں کی وجہ سے حاصل ہوا تھا جو کادیانی نسل سے تھے۔ چونکہ پنجاب کے عوام قاف اور کاف کے تلفظ میں کچھ تمیز نہیں کرتے اور واؤ اور وال میں تجنیس خطی موجود ہے، اس لیے ''کادیاں'' بتدریج قادیاں بن گیا۔ گویا مرزا صاحب کی کادیانیت اسی شراریت کی سوتیلی بہن ہے جو تحریف وتقلب کے مہر کے ساتھ مولانا سراج گنجی کے عقد میں آئی۔

(زمیندار، 22 جنوری 1929ء)

قادیانی دشنام آرائی

فرقہ مرزائیہ کی دمشقی اور اندلسی یعنی قادیانی اور لاہوری شاخیں آپس میں کتنا ہی سخت اختلاف کیوں نہ رکھتی ہوں، لیکن دوسرے مسلمانوں یعنی احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں کے مقابلہ میں ملت واحدہ ہیں۔ مرزا صاحب کے البیلے بیٹے اعنیٰ موسیو بشیر الدین محمود کے قابل اعتراض مشاغل کے خلاف جب تک ہمارا قلم حرکت میں رہا، اس وقت تک یہ حضرات منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے، لیکن جونہی ہم نے مرزا قادیانی کے بعض اجتہادات کی ٹوڈیانہ نوعیت کو بے نقاب کرنا شروع کیا اور ان کے حُسن مقال کی حقیقت سے عوام کو آگاہ کیا تو قادیانی صحیفہ ''الفضل'' کے ساتھ ہی لاہوری مرزائیوں کے عقائد وافکار کے ترجمان ''پیغام صلح'' کی باسی کڑھی میں بھی اُبال آ گیا اور اس نے اُس بھونڈے اور پھسپھسے انداز میں ''زمیندار'' کے خلاف زہر اُگلنا شروع کر دیا جو ازل سے مرزائی جماعت کے مفسروں، مبلغوں، واعظوں، متکلموں، شاعروں اور اخبار نویسوں کے حصہ میں آیا ہے اور پیغام صلح کے بجائے دشمنی کا پیغام

ایسے انداز میں دینا شروع کیا کہ ہمیں آخر بادلِ ناخواستہ اس کی خرافات کے بعض حصوں کے جواب پر ملتفت ہوتے ہی بنی۔ چنانچہ ''زمیندار'' کی اشاعت مورخہ 10 اگست کا بہرہ فکاہات تمام تر اس کے جواب کے لیے وقف ہو گیا۔

''پیغام صلح'' کی تازہ ترین اشاعت کے افتتاحیہ کا عنوان ''مسلمانان ہند اور مسیح موعود'' ہے۔ یہ عنوان اپنے اندر کوئی جاذبیت نہ رکھتا تھا (کیونکہ مرزائیوں کے قلیل الانفار گروہ کے سوا باقی مسلمانانِ ہند، مسیح قادیان کے متعلق جو عقیدہ رکھتے ہیں، وہ ہم سے چھپا ہوا نہیں) اگر اس عنوان کے نیچے دو اور عنوانات پر ہماری نظر نہ پڑتی تو عین ممکن تھا کہ ہم ''پیغام صلح'' کے اس پرچہ کو پڑھے بغیر اُن اخبارات کے انبار میں شامل کر دیتے جن پر روزانہ اخبارات کے عدیم الفرصت مدیر صرف ایک پھسلتی سی نظر ڈال سکتے ہیں۔ جن دو عنوانات نے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لی، وہ یہ ہیں:

1- مولوی ظفر علی خاں صاحب کی باطل آرائی۔

2- علماء سوء کے متعلق مولوی ظفر علی خاں کی شیریں بیانی۔

ان عنوانات کے بعد افتتاحیہ کا آغاز مندرجہ ذیل الفاظ سے ہوتا ہے:

جن علماء کے متعلق مسیح موعود کی تحریرات میں سے دو ایک سخت فقرات پیش کیے جاتے ہیں، وہ کسی بہتر خطاب کے کہاں تک مستحق ہیں۔ یہ ان تازہ ترین مقالات سے معلوم ہوسکتا ہے جو ''زمیندار'' میں حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ مولوی ظفر علی خاں صاحب حضرت مسیح موعود پر لے دے کرنے سے پیشتر اپنی شیریں کلامی پر بھی نظر ثانی فرما لیتے۔

اس تلبیس آمیز فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ''زمیندار'' بعض ایسے اشخاص کی مذمت کیا کرتا ہے جو اس کے نزدیک شرار العلماء کے زمرہ میں شامل ہیں، اُسی طرح مرزا صاحب نے بھی صرف اُن علما کے خلاف زبانِ طعن دراز کی ہے جو خیار العماء کی مقدس جماعت سے خارج تھے۔ حالانکہ حقیقت حال بالکل اس کے برعکس ہے۔ اگر آج مرزا صاحب موجود نہیں جنھوں نے تمام علماء اسلام کو بلا استثناء احدے پیٹ بھر کر گالیاں دیں تو وہ کتابیں تو موجود ہیں جن میں یہ گالیاں درج ہیں اور ہمارا دعویٰ ہے کہ ان کتابوں کے مختلف اقتباسات کے مطالعہ سے ہر شخص ہماری طرح اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ قادیان کے مقدس نبی کی ان مقدس گالیوں کا نشانہ تمام علماء اسلام ہیں اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے تھا۔ مرزا صاحب کا ارشاد ہے کہ ہر وہ شخص جو اُن پر

ایمان نہ لائے، دائرہ اسلام سے خارج ہے اور از بسکہ علمائے اسلام عام اس سے کہ وہ افریقہ میں رہتے ہوں یا ہندوستان و چین میں، عرب کے ریگستان میں بستے ہوں یا سائبیریا کے برف زار میں، منطقہ حارہ میں سکونت پذیر ہوں یا منطقہ باردہ میں، یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مرزا قادیانی کی نبوت و مسیحیت و مہدویت کی بنیاد محض دجل وفریب کاری پر تھی، اس لیے اگر مرزا صاحب ان میں سے بعض کو سب دشتم کا نشانہ بناتے اور بعض کو گالیوں سے مستثنیٰ کر دیتے تو ان کے مریدوں ہی کو ان پر اعتراض کرنے کا موقع مل جاتا۔ اس لیے انہوں نے گالیاں دیں، تمام علماء کو دیں اور پیٹ بھر کر دیں اور چونکہ وہ مقصد جو ان کے پیش نظر تھا بجز اس کے حاصل ہو ہی نہ سکتا تھا کہ مسلمان تمام جماعت علماء کی طرف سے بدظن اور ان کے اتباع سے بے نیاز ہو کر نبی قادیان کے آستانِ جلال پر جبین نیاز خم کر دیں۔ اس لیے انہوں نے کسی ایک عالم دین کو بھی اپنی مغلظات سے مستثنیٰ نہیں کیا۔ پھر ''پیغام صلح'' کا یہ کہنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے کہ جن علماء پر مرزا صاحب نے گالیوں کی بوچھاڑ کی، وہ شرار العلماء تھے، خیار العلماء نہ تھے؟ کیا مدیر ''پیغام صلح'' یا امیر جماعت احمدیہ لاہور یا خواجہ کمال الدین یا کوئی دوسرے بزرگ بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سے علماء تھے جو ''اسے بدذات فرقہ، مولویاں'' کے خطاب عمومی یا ''**ذرية البغايا**'' کی ناپاک گالی کی ہمہ گیری سے مستثنیٰ تھے۔

اندریں حالات پیغام صلح کا مرزا صاحب کی دشنام آرائی پر پردہ ڈالنے اور ان کی سبّابی کو گھٹا کر دکھانے کے لیے ان کی جامع و مانع اور مغلظ و متعفن گالیوں کا مقابلہ اُن ہجو آمیز الفاظ سے کرتا جو ''زمیندار'' میں بعض علماء سُوء کے متعلق لکھے گئے، بجائے خود ایک بہت بڑا دجل ہے۔ ''زمیندار'' اگر چند علماء امت کو علماء سُوء سمجھتے ہوئے انہیں شرار شر کہتا ہے تو خیار العلماء کے احترام میں وہ کبھی کوتاہی نہیں کرتا اور انہیں وہ انبیاء کے علوم و اوصاف کا وارث سمجھتے ہوئے ان کے سامنے فرطِ تعظیم سے ہر وقت اپنی گردن جھکانے کے لیے تیار ہے لیکن مرزائیوں کے ہاں اس قسم کی کوئی تفریق موجود نہیں۔ ان کے عقیدہ میں تمام علماء اسلام شرار العلماء ہیں۔ باور نہ آئے تو خود ''پیغام صلح'' ہی کے مندرجہ ذیل الفاظ پڑھ لیجیے۔

> ''اگر علماء زمانہ کے دلوں میں شقاوت ازلی کی مہر نہ لگ چلی ہوتی تو وہ اپنی سب سے بڑی سعادت مرزا کے دامن سے وابستگی ہی میں سمجھتے کہ یہی حقیقت میں نور باطن حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھا''۔

جب بقول مدیر ''پیغام صلح'' تمام علماء زمانہ ہی شقی ازلی ہیں تو مرزا صاحب ان میں سے بعض کو مستحق دشنام اور بعض کو لائق ستائش کیونکر قرار دے سکتے تھے۔ اگر مدیر ''پیغام صلح'' اپنے مقالہ کے ابتدائی الفاظ کو اس معیار پر پرکھیں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے جو کچھ لکھا، وہ ایسا ہی استدلال ہے جیسا مرزائیوں کا ہوا کرتا ہے اور استدلال کا ایسا مکروہ نمونہ پیش کرنے کے بعد وہ اس قابل ہرگز نہیں رہے کہ کوئی پڑھا لکھا آدمی انہیں منہ لگانے اور اُن کی کسی تحریر کا جواب دینے کی ذلت گوارا کرے۔ تمہاری سعادت ازلی تمہی کو مبارک رہے۔ ہمارے علماء تمہارے کہنے سے شقی ازلی نہیں بن سکتے۔ یہ خطابات ہم 'عطائے تو بہ لقائے' تو کہہ کر واپس کرتے ہیں۔

(زمیندار، 15 اگست 1929ء)

بچہ سقہ اور قادیانی

چرخ شعبدہ باز کی دوں پرستی رنگ لائی، غازی امان اللہ خان کو جنہیں خدا نے افغانوں کی تہذیب و اصلاح کے لیے پیدا کیا ہے، یہ گوارا نہ ہوا کہ وہ ملت عزیز کے خون کے چھینٹوں سے وطن عزیز کے دامن کو رنگین کریں اور اس شمشیر جواہر وار کی برش کا امتحان اپنی ہی رعایا پر کریں جو اعدائے آزادی مشرق کے خون میں پیرنے کے لیے بنائی گئی ہے، چنانچہ وہ کابل سے قندھار تشریف لے گئے۔ پیروں نے بچہ سقہ کو عامی دین مبین کا خطاب دے کر تخت کابل پر بٹھا دیا اور بزعم خود یہ سمجھ لیا کہ اب افغانستان میں سیاہ وسفید کے مالک ہمیں ہوں گے۔ ہندوستان کے قدامت پرست علماء اور مریدوں کی دولت سے اپنے گھر بھرنے والوں نے بھی گھی کے چراغ جلا لیے اور تو اور وہ لوگ بھی جنہیں پیش بینی کا بہت بڑا دعویٰ ہے، بمبئی میں بانگ دہل یہ کہتے سنے گئے کہ بچہ سقہ اسلام کی تلوار ہے اور اس کی شان میں استخفاف آمیز کلمات استعمال کرنے والے اسلامیت سے قطعاً بے بہرہ ہیں۔ شور بازار اور دوسرے ملاؤں نے نہایت ذوق و شوق سے اسے ''حبیب اللہ خان غازی'' بنا کر اس کے نام کا خطبہ مسجد میں پڑھا اور کبیر جان جیسے ننگ اسلاف شاہزادوں نے وزارت کی طمع سے اس کے سامنے گردن اطاعت خم کر دی۔ یہ صورت حالات دیکھ کر اس کو خیال ہونے لگا کہ میں ایک فوق الانسان ہستی ہوں اور (تازہ ترین اطلاعات کے مطابق) اس نے نبوت ومہدویت کا دعویٰ کر دیا اور تمام ملاؤں اور پیروں کو حکم دیا کہ

ہر شہر اور ہر گاؤں میں اعلان کر دو کہ میں نبی مرسل اور مہدی آخر الزمان

ہوں اور دنیا بھر کے کفار کو نیست و نابود کرنے کے لیے مبعوث ہوا ہوں، میرے حکم سے سرتابی کرنے والا اور میرے نام کا کلمہ نہ پڑھنے والا ہرگز زندہ نہیں رہ سکتا۔

دیکھیے اب افغانستان کے علما اور پیر اور علی برادران (جو شاہ امان اللہ خان سے اس لیے ناراض تھے کہ انہوں نے یورپ جاتے وقت بابائے خلافت کو ایک حبہ بھی نذر نہ کیا اور جو بچہ سقہ سے لمبی چوڑی امیدیں لگائے بیٹھے تھے) اب کیا ارشاد فرماتے ہیں اور اس مسیلمہ عصر کے دعوے نبوت کو بھی اسی طرح تسلیم کر لیتے ہیں جس طرح اس کی امارت کو انہوں نے تسلیم کر لیا تھا یا اس سے انکار کر کے کشتنی و گردن زنی ٹھہرتے ہیں۔

موسیو مرزا بشیر الدین محمود کو بھی ہوشیار ہو جانا چاہیے کیونکہ اگر بچہ سقہ کو اپنے دعوٰی میں کامیابی ہوگئی تو قادیانی نبوت کی خیر نظر نہیں آتی۔ اس لیے کہ اس کی پشت پر صرف دوراز کار تاویلوں کا پلندہ ہے اور بچہ سقہ کی نبوت کا لوہا منوانے کے لیے تلوار موجود ہے۔ مرزا تو پیشگوئیاں کرنے میں خاص مہارت رکھتے تھے مگر ایک پیشگوئی ہم بھی کیے دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر بچہ سقہ نے اپنے محولہ فوق اعلان کے الفاظ کو عمل کا جامہ پہنایا تو کابل کے مرزائیوں کے دماغ سے مرزائیت کا خیال اسی طرح اڑ جائے گا جس طرح گدھے کے سر سے سینگ۔ یہ اور بات ہے کہ اسے اپنے لائحہ عمل پر کاربند ہونے کی فرصت ہی نہ ملے اور قادیانی بھیڑیں یوں ممیاتی ہوئی سنی جائیں کہ قادیانی مرزائیوں نے دم شمشیر پر بھی مسیح قادیان کا کلمہ پڑھا۔

(زمیندار 3 فروری 1929ء)

افیون نصف طب ہے

موسیو مرزا محمود نے ایک مرتبہ لکھا تھا:

افیون دواؤں میں اس کثرت سے استعمال ہوتی ہے کہ حضرت مسیح موعود (مرزا قادیانی) فرمایا کرتے تھے کہ <u>بعض اطبا کے نزدیک وہ نصف طب ہے</u>۔ پس دواؤں کے ساتھ افیون کا استعمال بطور دوا نہ کہ بطور نشہ کسی رنگ میں بھی قابل اعتراض نہیں۔ ہم میں سے ہر ایک شخص نے علم کے ساتھ یا بغیر علم کے ضرور کسی نہ کسی وقت افیون کا استعمال کیا ہوگا۔

حضرت مسیح موعود نے تریاق الٰہی دوا خدا تعالٰی کی ہدایت کے ماتحت بنائی اور اس کا

ایک بڑا اجزو افیون تھا اور یہ دوا کسی قدر اور افیون کی زیادتی کے بعد حضرت خلیفہ اوّل (حکیم نور الدین صاحب) کو حضور (مرزا قادیانی) چھ ماہ سے زائد تک دیتے رہے اور خود بھی وقتاً فوقتاً مختلف امراض کے دوروں کے وقت استعمال کرتے رہے۔

(مضمون میاں محمود احمد صاحب، خلیفہ قادیان، مندرجہ اخبار ''الفضل'' جلد 17 نمبر 6 صفحہ 2 مورخہ 19 جولائی 1929ء)

اس بلیغ فقرہ سے آپ کا مطلب غالبًا یہ ہوگا کہ تمام انسانی بیماریوں میں نصف ایسی ہیں جن کا علاج صرف افیون سے ہوسکتا ہے۔ دنیا آپ کے اس نظریہ کو صحیح سمجھے یا غلط، مگر معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ بہار کی حکومت اس کی صحت کی قائل ہے۔ چنانچہ اس نے ایک ایسی عمارت میں جہاں پہلے کارخانہ افیون تھا، جیل بنانے کا تہیہ کرلیا ہے تاکہ وہاں رہنے والے قیدیوں کی نصف بیماریوں کا علاج صرف افیون کے ان ذرات سے ہو جایا کرے جو اس عمارت میں موجود ہیں اور تنفس کے ساتھ اس کے مکینوں کے حلق سے نیچے اترتے رہتے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ موسیو مرزا اس واقعہ کو اپنے ابا کی نبوت کا نشان قرار دے کر اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لیے ''الفضل'' کا ایک خاص نمبر نکالیں۔

(زمیندار، یکم ستمبر 1930ء)

منشی اور پٹواری

یادش بخیر، منشی مرزا غلام احمد قادیانی کا کوئی اور کارنامہ قابل ذکر ہو یا نہ ہو لیکن ایک بات خصوصیت کے ساتھ امت مسلمہ کو دعوت نظارہ دے رہی ہے، وہ یہ کہ آپ کی ذات نے عامۃ المسلمین پر ادعائے نبوت و رسالت کے وہ تمام دروازے کھول دیے ہیں جن پر مفسرین عہد اولین و تبع تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ''خاتم المرسلین'' کی صحیح تفسیر کی مہر لگا رکھی تھی۔ مرزا کے دماغ میں کچھ کر دکھانے کی خواہش سے پیدا ہونے والے اضغاث و احلام نے جب یہ خیال بھر دیا کہ دنیا کے سامنے نبی اور رسول، مجدد اور امام، مسیح اور کرشن کا بہروپ بن کر پیش ہونا چاہیے تو ان کے مخصوص منطقیانہ استدلال نے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے معانی میں تحریف کر کے یہ مسلمہ قائم کر دیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انبیا و مرسلین کی انگشتری میں بحیثیت نگین ممتاز ہونا مسلم لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ آپ ﷺ (**بابی انت و اُمی یا رسول اللہ**) کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ نے اپنے کسی بندے کو نبوت و رسالت کی ظلی و بروزی خلعت سے نوازنا بند کر دیا

ہے۔ چنانچہ اس استدلال کی بنا پر مرزا نے اپنے نبی اور ملہم من اللہ ہونے کا دعویٰ کر دیا اور ہر قادیانی کے کان میں یہ بات پھونک دی کہ تم بھی کوشش کرو اور ہمت وجرأت سے کام لو تو نبی اور رسول بن سکتے ہو، تم پر بھی وحی کا نزول ہو سکتا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت و رسالت کا دعویٰ کر کے اللہ کے اور بھی بہت سے بندوں کے دماغوں کو اس امر کی جانب مبذول کر دیا کہ عہد حاضر میں نبی اور رسول بن جانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً اسی قسم کے مدعیان نبوت و رسالت کی خبریں سننے میں آتی رہتی ہیں۔ ان میں سے ایک منشی محمد عبداللہ سابق پٹواری بھی ہیں جو چند سال سے ''رجل یسعیٰ'' احمد ''پٹواری دین'' وغیرہ کے اسما سے پبلک کے سامنے اپنے دعوی رسالت کو پیش کر رہے ہیں۔

رجل ''یسعیٰ'' کا تازہ کارنامہ ہدایت للعلمین نمبر سوم کے نام سے ایک مطبوعہ پمفلٹ کی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے جس کی کتابت کسی خوش نویس کے قلم کی مرہون احسان نہیں ہوئی بلکہ انہی حضرت کی خوش خطی کا پتہ دے رہی ہے۔ اس پمفلٹ میں پٹواری صاحب کے الہامات اور عالم کشف و رویا کی واردات تاریخ وار درج کیے گئے ہیں جن کی ''تلاوت'' چند منٹ کے لیے تفریح وتفنن کا ایک نہایت اچھا سرمایہ مہیا کر سکتی ہے۔

پمفلٹ کے سرورق پر عنوان کے اوپر یہ لفظ لکھے ہیں:

2 فروری 1923ء کو رویا میں آواز۔ تیری خبریں امریکہ پہنچیں گی، یورپ پہنچیں گی، افریقہ پہنچیں گی، 8 فروری 1923ء مربع، موتی چک 62 / 21 ایل میں بعد نماز فجر دعا میں وحی **علےٰ مقام محموداً** اشارہ مشرق کے مربعوں کا جہاں واقعہ 26 فروری 1923ء کو 2 گھنٹے 5 منٹ رفقون میں ملاقات رب العلمین سے ہوئی۔

15 جون 1923ء رویا میں کئی بار زبان سے جاری ہوا، **عسعیٰ ان**۔ وقتاً فوقتاً محض اس لیے شائع کی جاتی رہی ہیں کہ یہ ادارہ علوم مشرقیہ کی خدمت میں مصروف ہے اور ہم اس کی امداد اپنا فریضہ تصور کرتے ہیں۔ لیکن اب متضاد و اضلارات مظہر ہیں کہ اس کے کارکنوں میں اختلاف واقع ہو گیا ہے۔

یبعثک مقام محموداً۔ (9 اپریل 1906ء): وحی کہ ایک وقت پر مرزا محمود، مرزا قادیانی کی جگہ لے گا۔

غرضیکہ سارے پمفلٹ میں اسی طرح کی خرافات اور عالم رویا کی واردات کا تذکرہ اسی انداز میں بھرا پڑا ہے اور مطلب ان تمام الہامات کا فقط یہ ہے کہ منشی محمد عبداللہ کے دماغ میں خلل ہے جس کے باعث وہ اپنے آپ کو مامور من اللہ سمجھ رہے ہیں اور یہ خلل قادیانی تعلیم اور مرزا قادیانی کے مندرجہ بالا نظریہ کو صحیح سمجھنے کے باعث پیدا ہوا ہے۔ جس طرح آسمانی کتابوں یعنی زبور، تورات، انجیل اور قرآن مجید میں مختلف سورتیں مختلف عنوانوں کے ساتھ معنون کی گئی ہیں، اسی طرح رجل ''یسعٰی'' کی کتاب ہدایت للعلمین نمبر سوم کی فصول حسب ذیل مطالب پر مشتمل ہیں۔

1۔ رسول: جس میں الہامات کے ذریعہ حقیقت رسالت پر بحث کر کے اپنے رسول ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔

2۔ دابت: دابۃ الارض کی تشریح کر کے اپنی رسالت کا ثبوت بہم پہنچایا گیا ہے۔

3۔ خلیفہ: جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ میں خلیفہ کل جہاں کا ہوں۔

4۔ پٹواری: جس میں دنیوی پٹوار سے عبرت کر کے دینی پٹوار کا کام سنبھالنے کا ذکر ہے۔

5۔ پٹوار باطل: علی ہذا

6۔ ڈوگرہ: اپنی قوم ڈوگر بتا کر سکھوں کی جنم ساکھی سے اپنے لیے ایک ثبوت بہم پہنچایا گیا ہے۔

7۔ رجل یسعٰی: اس فصل میں خود کو قرآن حکیم کے رجل ''یسعٰی'' کا مورد قرار دیا گیا ہے۔

8۔ کلنک: خود کو ہندوؤں کا کلنکل اوتار بتایا گیا ہے، اسی طرح حم فصل عبداللہ، فصل وارثان، فصل تعلیم، فصل شہدا، فصل آمد عیسیٰ وغیرہ میں اپنے دعویٰ ثبوت کا عجیب وغریب استدلال کیا گیا ہے۔

مختلف ادوار و اعصار میں اسلامی حکومتوں اور شرعی عدالتوں نے اس طرح کے سر پھرے لوگوں کو مختلف قسم کی سزائیں دی ہیں لیکن ایسے لوگوں کا جو علاج غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے تجویز کیا ہے، وہ عہد حاضر کی ضروریات کے عین مطابق ہے۔ چند سال کا ذکر ہے کہ قسطنطنیہ میں ایک شخص نے مرزا قادیانی یا چیچہ وطنی کے رجل یسعٰی پٹواری کی طرح نبوت کا دعویٰ کیا اور وہاں کی ایک جماعت کو اپنے گرد بھی جمع کر لیا۔ قسطنطنیہ کے حکام بہت پریشان ہوئے، انہوں

نے تار کے ذریعہ مصطفےٰ کمال پاشا کو صورت حال کی اطلاع دی اور پوچھا کہ اس بلا کا کیا علاج کیا جائے؟ غازی ممدوح نے جواب دیا کہ اسے پاگل خانہ میں بھیج دو تا کہ ڈاکٹر لوگ اس کے دماغ کا آپریشن کر کے اسے سیدھا سادہ مسلمان بنا دیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ نسخہ کارگر نہیں ہوسکتا کیونکہ یہاں کسی پاگل کو اس وقت تک پاگل خانہ میں داخل نہیں کیا جاتا جب تک کہ اس سے کسی کو جسمانی طور پر گزند پہنچنے کا احتمال نہ ہو۔

(زمیندار، 11 اکتوبر 1930ء)

گہے پشت حمار آید

قادیان کے مرزا صاحب سے ان کی مخصوصین ومطربین کو جو مریدانہ عقیدت ہے، اس کا مظاہرہ صحیفۂ قادیان کے اوراق پر اکثر ہوتا رہتا ہے۔ قادیان کا ہر قلمی مجاہد جو الٹی سیدھی دو چار سطریں لکھ سکتا ہے، جھٹ سنت قادیانیہ پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہے اور اپنی خرافات نویسی سے ارباب ذوق سلیم کو دعوت تفنن دینے لگتا ہے۔ چنانچہ آسمان قادیان کے الہامی صحیفہ ''الفضل'' نے اپنی قریبی اشاعت (4 اپریل 1931ء) میں مرزا قادیانی کی وفات کے تقریباً بیس سال بعد ''آمد حضرت مسیح موعود'' کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ بزبان فارسی درج کیا ہے۔ قصیدہ مدحیہ کے مصنف کوئی اکمل صاحب قادیانی ہیں جنہوں نے ذیل کے اشعار میں داد اکملیت دینے کی پوری پوری کوشش فرمائی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے

نگارے آمد از بیدا، زرویش نور حق پیدا
جہاں برحسن او شیدا تمشی کن تماشا کن

پھر فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں کہ

گہے پشتِ حمار آید گہے اشتر سوار آید
گہے تو سن بیار آید تمشی کن تماشا کن

''گہے پشت حمار آید'' سے جو بے ساختہ پن، اکھڑ پن، معنی آفرینی اور بلاغت کا ثبوت مل رہا ہے، اس کی داد نہ دینا یقیناً ظلم ہے۔ دیکھا! دریا کو کوزہ میں اس طرح بند کیا جاتا ہے:

''الفضل'' کی اسی اشاعت (4 اپریل 1931ء) میں ''وہ احمد، محمد نما بن کے آیا'' کے

عنوان سے بھی ایک نظم شائع ہوئی ہے جسے پڑھ کر ایک مسلمان کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی دینی غیرت کو مجروح ہوتا ہوا دیکھے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے۔ کس شوخ چشمی سے فرماتے ہیں:

رسول خدا مرزا بن کے آیا
جہاں کے لیے رہنما بن کے آیا

حالانکہ رسالت سے مرزا کو اس سے زیادہ بُعد ہے جتنا ایک ذرہ بے مقدار کو آفتاب سے ہوا کرتا ہے اور پھر یہ کس نے کہہ دیا کہ مرزا قادیانی ''جہاں کے لیے رہنما بن کے آئے تھے، جہاں تو درکنار، یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ قادیان کے رہنما تھے یا ان کی راہنمائی کے اثرات قصر خلافت قادیانیہ کی تنویر پاشیوں اور رنگیلی خلوتوں تک محدود تھے۔

مرزا قادیانی کی گمراہ امت کے نزدیک اس کے مہدی کے ہر فعل اور ہر قول سے پیغمبرانہ الہام اور پیش گوئی کا ثبوت ملتا ہے اور اس میں اس قدر کھینچا تانی اور استدلال سخیف سے کام لیا جاتا ہے کہ ہر صاحب بصیرت ان کی بوعقلی اور بے مغزی سے اظہار بیزاری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تلبیس کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے مگر قادیانیت کو سلیقہ سے تو خدا واسطے کی دشمنی ہے۔ وہ بھلا اس سے کیوں دوستی پیدا کرنے لگی!

''الفضل'' میں ڈاکٹر سید محمد اسمٰعیل صاحب سول سرجن نے ایک بے معنی مضمون لکھا ہے جس میں ''عمل جراحی'' سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرزا قادیانی نے اپنی زندگی میں جو پیش گوئیاں کی تھیں، وہ حرف حرف صحیح ثابت ہوئیں۔ ان پیش گوئیوں اور الہاموں میں زیادہ تعداد اس نوع کی پیش گوئیوں کی ہے کہ ''میں آج شب کو سوؤں گا، کھانا کھاؤں گا، باتیں کروں گا، قصرِ خلافت میں جاؤں گا، دل بہلاؤں گا، ہنسوں گا، ہنساؤں گا، کھل کھیلوں گا، چھیڑوں گا وغیرہ وغیرہ''۔ نہایت طمطراق سے یہ پیش گوئی برہان قاطع کے طور پر پیش کی گئی ہے۔

قادر کے کاروبار نمودار ہو گئے
کافر جو کہتے تھے وہ گرفتار ہو گئے

اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ یہ ''1900ء کا الہام ہے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ بہت

سے کافر کہنے والے علماء مثلاً محمود الحسن دیو بندی، مولوی کفایت اللہ، مولوی احمد سعید، مولوی نواب دین، مولوی نوردین لائل پوری، مولوی ظفر علی اور دیگر اکثر علماء جیل خانوں اور حوالاتوں کی سیر کر آئے۔ چہ خوب، سوال یہ ہے کہ اگر یہ **1900**ء کا الہام ہے تو ''گرفتار ہو گئے'' سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ **1900**ء سے پہلے گرفتار ہو چکے تھے حالانکہ ان علماء کی ایک بڑی اکثریت **1900**ء کے بعد گرفتار ہوئی اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مرزا صاحب نے اپنی الہامی زبان میں ماضی کو مستقبل قرار دے لیا تھا، پھر بھی کیا مرزا صاحب حقیقۃ الوحی میں لکھتے ہیں کہ شیطانی الہام اور پیش گوئیاں ہمیشہ مشتبہ رہتی ہیں۔ نہ معلوم اس پیش گوئی کے متعلق قادیان کے ارباب بست وکشاد کیا فتویٰ صادر فرمائیں گے، مرزا قادیانی کا ایک الہام ہے:

''وہ تین کو چار کرنے والا ہو گا۔'' (تذکرہ ص **110** طبع چہارم)

اس کے معنی کچھ سمجھ میں نہیں آتے۔ پھر فرماتے ہیں ''ربنا عاج'' ہمارا رب عاجی ہے، عاجی کے معنی ابھی تک معلوم نہیں ہوئے۔ ''**ایلی ایلی لما سبقتی**'' مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ اس الہام کا معنی ''ایلی ایلی'' باعث سرعت وردو مشتبہ رہا ہے اور نہ اس کے کچھ معنی کھلے ہیں۔'' کیا ان مشتبہ الہامات کو خود مرزا کے ارشاد کے مطابق شیطانی الہامات سمجھ لیا جائے۔ کیا فرماتی ہے امت قادیانیہ اس مسئلہ میں۔

ہم نہیں سمجھتے کہ خلیفہ قادیان موسیو مرزا محمود اتمام حجت ہی کی خاطر مباہلہ کے لیے کیوں تیار نہیں ہوئے اور اپنی صداقت کا کیوں ثبوت نہیں دیتے۔ اخبار ''مباہلہ'' انہیں مباہلہ کی بار بار دعوت دے چکا ہے مگر وہ یا ان کی امت اس کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ چند روز ہوئے جب خلیفہ قادیان نے اپنی طاقت صرف کر کے داعیان مباہلہ مولوی عبدالکریم صاحب اور ان کے رفقاء کو قادیان سے جلاوطن کر دیا۔ ان کے مکانات جلا دیے تو قادیانیوں کی رگ حمیت پھڑکی اور انہوں نے جھٹ لمبے لمبے پوسٹر شائع کر دیے کہ خلیفہ صاحب تو نہیں مگر مرید مباہلہ کرنے کو تیار ہیں۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ داعیان مباہلہ کی غیر حاضری اور پریشانی سے فائدہ اٹھا کر مباہلہ کا اعلان کر دیا جائے۔ اب ''مباہلہ'' کے مسلسل اعلانات کے باوجود خلیفہ صاحب اور ان کی امت خاموش کیوں ہے؟ وہ ''مباہلہ'' کی کھلی دعوت کیوں قبول نہیں کرتی؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی

صداقت ثابت کرنے سے یکسر قاصر ہے۔

(زمیندار 11 اپریل 1931ء)

قادیانی جلسے کا انجام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین ہزار معجزوں کے مقابلہ میں اپنے دس لاکھ ''معجزوں'' کا طاغوتی ڈھول پیٹنے والوں، حضور سرور کون و مکان ﷺ کی شان ختم المرسلینی کے حلّہٴ دیبائی میں جسے خدائے ذوالجلال نے خود اپنی نورانی انگلیوں سے بُنا ہے، ظلیت اور بروزیت کے عزازیلی ٹاٹ کا پیوند لگانے والوں نے مسلمانان امرتسر کو 'سیرۃ النبی' پر اپنا مسیلمائی وعظ سنانا چاہا، مگر اس ناپاک کوشش میں بری طرح منہ کی کھائی۔ اس پر قادیان میں ایک خفیہ جلسہ ہوا، تثلیث قادیان کے اقنوم کوچک اعنی موسیو بشیر الدین محمود سخت پریشان معلوم ہوتے تھے۔ ان کے سارے دربار کے ہاتھوں کے طوطے بھی اڑے ہوئے تھے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ امرتسر والی خفت جس نے قادیان کو زمانہ بھر میں رسوا کر دیا، کس طرح مٹائی جائے۔ موسیو محمود کو سر کھجانے کے لیے دفعتاً ایک تدبیر سوجھ گئی۔ اپنی اس داڑھی پر جس کے لیے کسی اللیلی متشورہ کے حنائی پوروں نے شبانہ کی خدمت انجام دی تھی، ہاتھ پھیر کر حواریوں سے فرمانے لگے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ''سیرۃ النبی'' کا پہلا جلسہ اگر ان بدبخت امرتسری 'مسلوں' کی دراندازی سے ناکام رہا تو کوئی وجہ نہیں ہم دوسرا جلسہ نہ کریں اور اس دفعہ اس اہتمام سے کریں کہ فرش سے لے کر عرش تک ہماری کامیابی کا غلغلہ بلند ہو جائے۔ سرکار برطانیہ جس پر ہماری چار پشتیں قربان ہو چکی ہیں، اس موقعہ پر یقیناً ہمارا ساتھ دے گی۔ اس کی پولیس ہمارے قدوسیوں کی حفاظت کو موجود ہو گی۔ مگر خدا اسی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرے۔ ہمارے لندنی پروردگار کی سنت جاریہ بھی یہی ہے۔ پس آج ہی امت کے تمام افراد کے نام مابدولت واقبال کی طرف سے بصیغہ اشد ضروری خفیہ ہدایات جاری کر دی جائیں کہ 22 نومبر کو امرتسر میں سیرۃ النبی کا دوسرا جلسہ ہو گا۔ کم از تین ہزار قدوسی جو لٹھوں اور تلواروں سے مسلح ہوں، اطراف واکناف پنجاب سے آ کر جمع ہو جائیں۔ جب ہماری یہ آسمانی فوج قطار در قطار امرتسر کے بازاروں میں سے گزرے گی تو تمام مسلمانوں کے دلوں میں ہیبت بیٹھ جائے گی اور ہمارے یہ دشمن ذلت و نامرادی کی جیتی جاگتی تصویر بن جائیں گے۔

اس تجویز کے سنتے ہی تمام اہل دربار کی باچھیں کھل گئیں۔ ناظر صیغہ خارجہ جھٹ قلم دوات لے کر بیٹھ گیا اور ایک گشتی فرمان کا مسودہ چٹکی بجاتے میں دھر گھسیٹا جو موسیو بشیر الدین محمود کو سنانے کے بعد امت مرزائیہ کے تمام سرخیلوں کے نام بھیج دیا گیا۔ مکتوب میں مسلمانان امرتسر کا مذاق اڑانے کے بعد آخر میں یہ عبارت درج تھی۔

''اب وہ خوش ہیں اور تالیاں بجا رہے ہیں کہ ہماری ناکامی کی ایک راہ ان کو مل گئی مگر ہم ان احمقوں پر ہنس رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی اس حرکت سے ہمارے لیے ایک بہت بہتر کامیابی کی راہ کھول دی۔ اگر انہوں نے تین چار سو آدمیوں کے جلسہ کو روکا تو ہم تین ہزار قدوسیوں کی جماعت کے ساتھ ایک عظیم الشان جلسہ کر کے نہایت وسیع اعلائے کلمۃ اللہ (یعنی اعلائے کلمۃ الشیطان۔ نقاش) کا دن منائیں گے......

حضرت خلیفۃ المسیح کا منشا ہے کہ ضلع امرتسر، سیالکوٹ، لاہور، گورداسپور، فیروز پور کے احمدی احباب امرتسر میں اس دن کثرت سے جمع ہوں۔ لہٰذا خصوصیت سے شمولیت نہ بھولیں اور اپنے دوستوں کو پکڑ پکڑ کر ساتھ لائیں۔

ناظر دعوت وتبلیغ قادیان 16 نومبر 1931ء''

امرتسر کے فرزندان توحید کی عزت کو خاک میں ملانے کا یہ خفیہ فیصلہ 16 نومبر 1931ء کو کیا گیا۔ 12 نومبر 1931ء کی رات کے بارہ بجے تک موسیو مرزا بشیر الدین محمود اور ہر وہ قادیانی جو آپ کا حاشیہ نشین تھا، اس خیال سے دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ کل آسمان قادیان کے تین ہزار قدوسیوں کے قدموں کی دھمک سے امرتسر کی زمین ہل جائے گی اور اس بدبخت بستی کے بدبخت تر مسلمان ایسے ذلیل ہوں گے کہ عمر بھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ اس خوشی کا اظہار ''الفضل'' کی اشاعت مورخہ 22 نومبر سے ہو رہا ہے جو 21 ہی کو چھپ چکا تھا۔ اس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

''22 نومبر بروز اتوار امرتسر میں زیر صدارت جناب میر محمد اسحٰق صاحب پروفیسر جامعہ احمدیہ سیرۃ النبی کے متعلق عظیم الشان جلسہ ہوگا۔''

22 نومبر کی تاریخ بھی گزر گئی اور اگلا دن بھی گزر گیا۔ میں بے تابی سے ''الفضل'' کی اشاعت مورخہ 24 نومبر کا انتظار کر رہا تھا کہ دیکھوں قادیان کے تین ہزار قدوسیوں کے عظیم الشان اجتماع کی کیا کیفیت اس میں درج ہے۔ امرتسر کے درو دیوار کے گونج اٹھنے کی نسبت کیا لکھا ہے۔ امرتسر کے ہنستے ہوئے ''احمقوں'' کو کس طرح رونی صورت بنا کر دکھایا گیا ہے اور شرمندگی کی کلونس کا وہ ٹیکا جس کی خبر بہشتی مقبرے کے مجاوروں نے دی تھی، امرتسر کے اسلامی ماتھے پر کس طور سے لگا ہے۔

خدا خدا کر کے آج 24 نومبر کو صبح کی ڈاک میں ''الفضل'' آیا۔ میں نے جلدی میں کھولا، سارے ورق اُلٹے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر امرتسر کے موعودہ جلسہ کی کوئی کیفیت نظر نہ آئی۔ میں حیران تھا کہ یا الٰہی! یہ کیا ماجرا ہے کہ قادیانی تو پر کا کوا، رائی کا پہاڑ، بات کا بتنگڑ بنانے میں جگت استاد واقع ہوئے ہیں۔ پھر یہ کیا ماجرا ہے کہ امرتسر پر اپنے تین ہزار قدوسیوں کی چڑھائی کو یوں پی گئے۔ گویا وہ بھی شہد کا کوئی گھونٹ ہے یا شیر مادر کا جرعہ۔

آخر امرتسر کے مسلمانوں نے میرے اس طلسم حیرت کو توڑا اور بتایا کہ قادیانی آئے تو تھے بڑے ٹھاٹھ سے۔ تلواریں بھی کمر میں تھیں، لٹھ بھی باندھے ہوئے تھے مگر امرتسر میں داخل ہوتے ہی فرزندان توحید کا رعب ان طواغیت کے قلب پر کچھ ایسا مستولی ہوا کہ سر پر پاؤں رکھ کر شہر سے بھاگ گئے اور شہر پناہ سے باہر ایک اصطبل میں بند ہو کر اپنا جلسہ کر لیا اور وہ بھی پولیس کی حفاظت میں۔ قادیانی قدوسیوں کے جلسہ کے لیے اصطبل سے زیادہ موزوں جگہ بھی نہ ہو سکتی تھی۔ خرِ عیسیٰ آخر جائے تو کہاں جائے اور ڈھینچوں ڈھینچوں کرے تو کہاں کرے۔

(زمیندار، 26 نومبر 1931ء)

قادیانی اخلاق

قادیانی خرافات کا تار و پود بکھیرتے ہوئے میں نے خیط الاسود اور خیط الابیض کے تفاوت کو اپنی ان آنکھوں سے سات ہزار بار دیکھا لیکن میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس ربع صدی میں میری زبان یا میرے قلم سے کسی قادیانی بلکہ خود اس فرقہ ضالہ ومضلہ کے بانی کے باب میں کبھی ''ولد الزنا'' یا ''ولد الحرام'' کی بازاری گالی نہیں نکلی۔ زیادہ سے زیادہ میں

نے یہی کیا کہ مرزائے آنجہانی کے ادعائے نبوت و مہدویت و مسیحیت و مجددیت کی قلعی کھولی۔ چودھویں صدی کے اس متنبّی کی متناقض و متہافت شطحیات کا مذاق ادب لطیف کے پیرایہ میں اڑایا۔ اس کے مضحکہ خیز الہامات پر بلہجہ تعریض تبصرہ کیا، اس کی اُن فحش گالیوں کو جو اس نے انبیائے علیہم السلام کو اور علماء امت کو عمر بھر دیں، مسلمانوں کے سامنے پیش کر کے ان سے کہا کہ ایسا سبّاب اکبر مامور من اللہ نہیں ہوسکتا۔

اسی سلسلہ میں، میں نے ''ذریۃ البغایا'' (حرام زادوں) کی اس ناپاک گالی کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی جو مرزائے آنجہانی نے ان فرزندان توحید کے حق میں تصنیف کی تھی جو آنجہانی کی شان مامور من اللّٰہی کے منکر ہوں۔ اس پر قادیانیت کی لاہوری شاخ کے سرخیل مولوی محمد علی نے اعلان کیا کہ ''حضرت مسیح موعودؑ'' کبھی کسی کلمہ گو کو محض اتنی سی خطا پر کہ وہ اُن کا ''مسیح موعودؑ'' ہونا تسلیم نہیں کرتا، ''حرام زادہ'' نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا کوئی بزرگ ایسی فحش گوئی کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔ میں نے اور میرے ساتھ مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا بہاء الحق قاسمی اور جماعت اہل حدیث میرٹھ اور دوسرے بزرگوں نے خود مرزائے آنجہانی کے دوسرے اقوال کی بنا پر ثابت کیا کہ مسلمانوں کو اور ان کے علماء کو ''ولد الحرام'' کہنا تو آنجہانی کا ایک نہایت ہی محبوب مشغلہ تھا۔

بجائے اس کے کہ مولوی محمد علی اس پر خاموش ہو جاتے، آپ نے اپنے اخبار ''پیغام صلح'' کی اشاعت مورخہ 3 دسمبر 1931ء میں اُن ''اخلاق عالیہ اسلامیہ'' کا ثبوت جو آپ کو ''حضرت مسیح موعودؑ'' سے ترکہ میں ملے ہیں، یوں دیا ہے۔

> ''مولوی ظفر علی خاں اور ان کے اعوان و انصار کو جن میں امرتسری منکر کا قدم سب سے آگے ہے، ولد الحرام بننے کا شوق ایسا چڑھا ہے کہ وہ اس بات کو ہرگز ماننے کے لیے تیار نہیں کہ حضرت مسیح موعود نے انہیں ان الفاظ سے نہیں پکارا...... جن مولویوں کا یہ حال ہو، انہیں ولد الحلال کہنا فی الواقع ایک ولد الحلال کے لیے موجب ذلت ہے...... جناب ''ظفر الملت'' کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی کا سیاہ ترین ورق ہے...... ایک وقت انگریزوں کا مدح خواں اور ہندوؤں کا دشمن تھا لیکن

ذرائع مفاد بدلنے کے ساتھ ہی انگریزوں کا دشمن اور ہندوؤں کا غلام ہو گیا اوراس غلامی میں اسلام کی عزت اور مسلمانوں کے خون بھی فروخت کر دیے۔ اگر ایسا شخص دشمن اسلام نہیں تو اور کون ہوسکتا ہے......ہمیں امید ہے کہ ''زمیندار'' کے کسی آئندہ نمبر میں جناب ظفر الملت کی نئی منطق کی بنا پر ان لوگوں کو فی الواقع والد الحلال قرار دیا جائے گا جو مسلمانوں کے پیشوا ہو کر اسلام اور نبی کریم صلعم کی مخالفت اور مقابلہ میں عیسائیت کو فتح یاب قرار دیں۔ کیونکہ مولوی آں نباشد کہ بند شود۔ امید ہے کہ اس کے ساتھ ان الفاظ کی بھی تشریح فرمائی جائے گی جن میں ''سیاست'' نے انہیں باپ سے حرامی کا مستحق نفرت ولعنت خطاب لینے والے قرار دیا ہے۔ ہم بادب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ فی الواقع انہیں اپنے والد ماجد سے کوئی اس قسم کا خطاب ملا تھا؟ اگر یہ صحیح ہے تو کیا وہی الفاظ جو ذریۃ البغایا کہنے پر حضرت مرزا صاحب کے متعلق انہوں نے استعمال کیے، اپنے والد مرحوم و مغفور پر لوٹا کر اپنے ''ولد الحلال'' ہونے کا ثبوت دیں گے؟''

یہ ہے محمد علی لاہوری کا قادیانی اخلاق اور یہ ہے ان کی قادیانی تہذیب۔ میرے ہاتھ میں بھی قلم ہے، میرے منہ میں بھی زبان ہے لیکن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا غلام ہوں۔ محمد علی لاہوری اپنے نبی کی سنت پر چل کر مجھے اور تمام علماء اسلام کو شوق سے ''حرام زادہ'' کہہ لیں۔ میری زبان سے یہ لفظ نہیں نکل سکتا۔ میں محمد علی لاہوری سے صرف اسی قدر عرض کروں گا کہ گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ ناک کی سیدھ شہر کو جایا کرتا ہے۔

(زمیندار، 6 دسمبر 1931ء)

قادیان بمقابلہ مکہ مکرمہ

مرزا غلام احمد آنجہانی نے جب قادیان میں منارۃ المسیح کا سنگِ بنیاد رکھ کر اعلان کیا ''بخرام کہ وقت تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں منار بلند تر محکم افتاد'' (تذکرہ مجموعہ وحی والہامات ص 77، طبع چہارم از مرزا قادیانی) تو اگرچہ انہیں غیب کی خبریں مل جایا کرتی تھیں مگر یہ بشارت نہ پاسکے کہ چند سال کے بعد ان کے صاحب زادۂ صفویوں کے اتباع میں اس مینارہ کی روشنی سے

چراغ کعبہ کی ضیا افشانیوں کا کام لیں گے۔ حج کے لیے کعبہ کا دور دراز سفر اختیار کرنے کے بجائے قادیان کی سالانہ زیارت کافی سمجھیں گے اور بہ بانگ دہل شریعت بہتیۂ محمودیہ کے اس اسلام افگن فیصلہ کا اعلان فرمادیں گے کہ:

- ''آج جلسہ کا پہلا دن ہے اور ہمارا جلسہ بھی حج کی طرح ہے۔ حج خدا تعالیٰ نے مومنوں کی ترقی کے لیے مقرر کیا تھا، آج احمدیوں کے لیے دینی لحاظ سے حج تو مفید ہے مگر اس سے جو اصل غرض یعنی قوم کی ترقی تھی، وہ انھیں حاصل نہیں ہوسکتی کیونکہ حج کا مقام ایسے لوگوں کے قبضہ میں ہے، جو احمدیوں کو قتل کر دینا بھی جائز سمجھتے ہیں۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے قادیان کو اس کام کے لیے مقرر کیا ہے۔ ہمارے آدمیوں میں سے جن کو خدا تعالیٰ توفیق دیتا ہے، حج کرتے ہیں مگر وہ فائدہ جو حج سے مقصود ہے، وہ سالانہ جلسہ پر ہی آ کر اٹھاتے ہیں۔''

(برکات خلافت صفحہ 5، طبع اوّل از مرزا بشیر الدین محمود)

معلوم ہوتا ہے کہ سیالکوٹ کے ایک دمشقی قادیانی نے ان ہی ''تعلیماتِ حُقّہ'' سے متاثر ہوکر ذیل کا مکتوب ''زمیندار والوں'' کے نام ارسال کیا ہے:

''زمیندار والو!

تمہاری علمی فضیلت اور سعادت مندی کی ہم داد دیتے ہیں لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم کیوں ابن سعود کی خوشامد کرتے ہو؟ مکّہ میں کیا دھرا ہے؟ آؤ قادیان کی طرف آؤ اور سعادت دارین حاصل کرو۔ تم نے اپنے آقا ولی نعمت کا حشر دیکھ لیا۔ اگر تمہیں اپنی عاقبت محمود ہو تو حضرت مرزا غلام احمد کی نبوت پر ایمان لے آؤ ورنہ تمہارے کفر میں کوئی شک نہیں''۔

کاش کوئی غیور مسلمان اٹھتا اور اس دریدہ دہن قادیانی کو بتا دیتا کہ مکہ اسلامیانِ عالم کو کس قدر عزیز ہے اور وہ ایسے ہزاروں قادیانیوں کو مکہ پر سے قربان کر سکتے ہیں، نہ معلوم اس خرد باختہ قادیانی کو ہماری نجات اخروی کی شبانہ روز فکر نے اس قدر کیوں بے چین کر رکھا ہے اور وہ ہمیں از راہ غایت دل سوزی اس نوع کی نصیحتیں کیوں کیا کرتا ہے؟ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ

خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت پر صدق دل سے اعتقاد رکھنے اور حضرت محمد مصطفیٰ **(بابی انت و أمي يا رسول الله)** کی ختم المرسلینی پر ایمان لانے کے باوجود اگر ہم مشرک ہیں تو یہ شرک تو ہماری گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ ہمیں مشرک ہی رہنے دو، تمہارا اسلام تو اس کارخانہ کی رونق برقرار رکھنے کے لیے موجود ہے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ گانٹھ کے پورے اور عقل کے اندھے قادیانی ہماری ''علمی فضیلت'' کی داد معتقدانہ انداز میں دینے کے بعد ہماری ''سعادت مندی'' سے یہ کیوں توقع کرتے ہیں کہ ہم سلسلہ عالیہ قادیانیہ کی صداقت کی شہادت دینے والوں میں سے ہو جائیں گے اور مرزا غلام احمد آنجہانی کی ماموریت من اللٰہی پر ایمان لے آئیں گے؟ آخر تمہیں ہماری نجات کی فکر کیوں ہے؟ قیامت کے روز جب ہم سے یہ سوال کیا جائیگا کہ ''زمیندار والو'' تم خدا اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لانے کے ساتھ مرزا قادیانی پر بھی کیوں ایمان نہ لائے تو ہمارے پاس یہ جواب موجود ہوگا کہ بارالہٰا تو خود فرما چکا ہے **اليوم اكملت لكم دينكم و اتممت عليكم نعمتي و رضيت لكم الاسلام دينا۔** (المائدہ:3)

پھر جب تیرا دین کامل و مکمل ہو چکا ہے اور تیری تمام نعمتیں مسلمانوں پر تمام ہو چکی ہیں اور اسی اکمال و اتمام کا نام اسلام ہے تو پھر تو ہم سے کس طرح توقع رکھ سکتا ہے کہ اس اسلام میں کوئی اور بھی گنجائش ڈھونڈیں اور اس جستجو میں قادیان کا سفر اختیار کریں۔

باقی رہا تمہارا یہ سوال کہ مکہ میں کیا دھرا ہے؟ اس کا جواب مسلمانوں کی غیرت و حمیت دے گی، انتظار کرو!

(زمیندار، 20 دسمبر 1931ء)

انگریز کی ڈانٹ

قادیان کے بروزی نبی منشی غلام احمد ہوں یا سابرمتی کا سنیاسی گاندھی، دونوں کو استعمار کی مشینری قیمہ قیمہ کر ڈالنے پر تلی رہتی ہے۔ منشی غلام احمد نے غلامی کا درس دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ شجر وفاداری کو پاتال تک پہنچانے میں اپنی تمام ظلیت اور بروزیت ختم کر دی جس پر ان کی وہ پچاس الماریاں آج بھی گواہ ہیں جو بہشتی مقبرہ اور قصر خلافت قادیانیہ کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ مرزا صاحب نے مسلمانوں کی یثربی روایات کو اپنی ماموریت من اللّٰہی کے صدقہ بہشتی مقبرہ میں

ہمیشہ کے لیے دفن کر دینے کے جو منصوبے باندھے، اس کا ایک چمکتا ہوا ثبوت تو خود موسیو مرزا بشیر الدین کی ذات ہے اور دوسرا ان کی چہیتی امت ہے جو حکومت برطانیہ کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالنے کو کلمہ کفر سمجھتی ہے اور مسلمانوں کے تمام مجاہدانہ اقدامات کا استخفاف کرنے پر ادھار کھائے بیٹھی ہے۔ منشی قادیان کی ان وفا پرستیوں اور کاسہ لیسیوں کے باوجود انہوں نے جب کسی آریہ کی موت کی پیش گوئی کی تو بارگاہ استعمار سے ان تمام ''خدماتِ جلیلہ'' کا صلہ انہیں یہ ملا کہ کارکنان قضا و قدر اعنی حکومت وقت نے ایک متحدیانہ ڈانٹ پلائی اور کہا کہ چپ چاپ منہ کو لگام دیے بیٹھے رہو۔ ورنہ ایک سال کے لیے نیک چلنی کی ضمانت داخل کرو، منشی بھی یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے اور علی السبیل تدرج یہ کہتے ہوئے دار البورا کو سدھار گئے۔

اگر صد سال گبر آتش فروزد

چو یک دم اندر او افتد بسوزد

منشی قادیان کے خلف الصدق موسیو مرزا بشیر الدین نے بھی درس وفاداری دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اپنے باوا کی اس خرافات کی تشہیر و تبلیغ میں جو پچاس الماریوں کے اندر بند ہے، اپنی تمام منتورانہ و متجددانہ صلاحتیں ختم کر دیں۔ اسلامیان کشمیر کو تسفل و تعبد کے غار میں دھکیلنے پر اپنی تمام کوششیں مرکوز کر دیں۔ اپنے آقایان شملہ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے رہے، ان کے اشارہ چشم و ابرو پر رقص کرتے رہے لیکن جب ایک قادیانی درندے نے مولوی محمد حسین بٹالوی کے پیٹ میں ابن صباح کا خنجر پیرا دیا تو موسیو مرزا نے ہزار کوشش کی، بہت چیخے چلائے کہ قانون کی گرفت سے بچ جائیں۔ ان کی ایک نہ سنی گئی بلکہ الٹا انہیں قصر استعمار سے یہ چونکا دینے والی تنبیہ ہوئی کہ تمہاری امت کی قانون شکن سرگرمیوں نے ایک اودھم مچا رکھا ہے۔ شریف انسانوں کی عزت و آبرو خطرے میں پڑ گئی ہے، تم اور تمہاری امت کو محتاط رہنا چاہیے، ورنہ سختی سے بازپرس کی جائے گی، چنانچہ موسیو مرزا اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور یہ کہتے سنے گئے۔

اگر صد سال گبر آتش فروزد

چو یک دم اندر او افتد بسوزد

(زمیندار، 13 جنوری 1932ء)

ملہم کی زبان

یہ سنت جاریہ ہے۔ خدائے بزرگ و برتر کی کہ جب وہ کسی بہت بڑے انسان کو بنی نوع بشر کی ہدایت کے منصب پر مامور کرتا ہے اور اسے پیغمبری اور نبوت کا درجہ عطا فرماتا ہے تو اس سے اسی زبان میں خطاب کرتا ہے جو ایسے مرسل یا مامور کی قوم کی زبان ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس قوم کی ہدایت کے لیے من جانب اللہ مامور ہوئے، اس کی زبان عبرانی تھی، اس لیے تورات عبرانی زبان میں نازل فرمائی گئی۔ یہی قول مسیح ابن مریم علیہما السلام پر صادق آتا ہے اور انجیل کی زبان بھی عبرانی تھی۔ اس کے بعد تمام انبیؑا کے سردار ﷺ جن پر نبوت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی، دنیا میں تشریف لائے اور خدا نے اپنے بندھے ہوئے قانون کے مطابق ان کی معرفت اپنا آخری پیغام لسان عربی مبین میں پہنچایا۔

نبوت کا منصب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر ختم ہو گیا لیکن منشی غلام احمد قادیانی آنجہانی اور ان کی ذریت قلیل الانفار کو اصرار ہے کہ سلسلۂ رسالت و نبوت حضرت محمد مصطفٰےؐ **(بابی انت و اُمی یا رسول اللہ)** کے وصال کے ساتھ ہی منقطع نہیں ہوا بلکہ برابر جاری ہے اور اس زمانہ کے نبی اور رسول جن کے ارشادات عالیہ کے ایک لفظ سے سرِ مو اختلاف کرنے کی پاداش میں ہر شخص معاً ''حرام زادہ'' بن جاتا ہے، آپ ہی ہیں۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ خدا کی پُرانی سنت کے مطابق آپ جس قوم سے اُٹھے، اسی کی زبان میں آپ خدا کا کلام اس تک پہنچاتے اور خدا اسی زبان میں آپ سے کلام کرتا یعنی آپ اپنے الہام کے موتی پنجابی میں بکھیرتے اور سید فضل شاہ اور سید وارث شاہ مرحوم کو چیلنج کرتے کہ اس ٹھیٹھ اور فصیح و بلیغ پنجابی کے مقابلہ میں کوئی چھند کبت، یا بولی پیش کریں لیکن آپ کو اس سے انکار ہے اور آپ نے مکالمات الٰہیہ کی زبان کے متعلق ایک نیا قانون وضع فرمایا ہے۔ وہ کلّیہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دنیاداری چھوڑ کر خادم دین ہو جائے اور اپنے آپ کو خدا کی راہ میں وقف کر دے اور اس راہ کی خاک میں مل جائے۔

> ''تو آخری نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ مکالمات الٰہیہ عربی فصیح و بلیغ میں اس سے شروع ہو جاتے ہیں اور وہ کلام لذیذ اور باشوکت ہوتا ہے جو خدا کی

طرف سے نازل ہوتا ہے۔ حدیث النفس نہیں ہوتا''۔

(چشمۂ معرفت صفحہ 300 مندرجہ روحانی خزائن جلد 23 ص 214 از مرزا قادیانی)

منشی غلام احمد کے متذکرہ صدر دعویٰ سے کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ منشی صاحب کو اپنے ہی بیان کردہ کلیہ کے علی الرغم فصیح و بلیغ عربی زبان کے بجائے غلط اور پھُسپھُسی اُردو، عجیب وغریب فارسی، مضحکہ خیز انگریزی اور لاطینی عربی میں الہام ہوئے اور منشی صاحب آنجہانی کے خدا نے اُن سے متعدد زبانوں میں گفتگو کی اور خود منشی صاحب کی عربی دانی کا یہ حال تھا کہ وہ مولوی کرم الدین بھیں والے کے بھائی کے اس قصیدہ کے معانی بیان کرنے سے قاصر رہے جو انہوں نے عربی زبان میں بصنعت غیر منقوط لکھا تھا۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا کے ساتھ مکالمہ کے دروازے بقول منشی صاحب ہر اس شخص پر کھل جاتے ہیں جو دنیاداری چھوڑ کر خادم دین ہو جائے اور اپنے آپ کو خدا کی راہ میں وقف کر دے اور اس راہ کی خاک میں مل جائے تو ایسے اشخاص جو متذکرہ صدر صفات رکھنے کے باوجود عربی زبان سے آشنا نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ عربی میں کس طرح مکالمہ کر سکیں گے، تیسرا سوال یہ ہے کہ خدائے قدیر جل شانہ نے بنی اسرائیل کے انبیائے کرام کے ساتھ عبرانی زبان میں جو گفتگو کی، آیا منشی صاحب کے نظریہ کے پیش نظر وہ الہامی گفتگو قرار دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

(زمیندار، 22 فروری 1933ء)

مکاتیب

مولانا ظفر علی خاں کا مکتوبِ مفتوح

بنام جارج پنجم شہنشاہ ہند، تاجدارِ انگلستان

1930ء کی تحریک کشمیر کے دوران قائم ہونے والی کشمیر کمیٹی میں قادیانی خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود کے صدر بن جانے کے باعث ہندوستانی سیاست میں قادیانی حضرات کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اس کے بعد اگرچہ علامہ اقبالؒ اور دیگر مسلم زعما کے کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کے اعلان کے بعد یہ کمیٹی اپنی وقعت کھو بیٹھی مگر قادیانی حضرات نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے اسی وقت تحریر و تقریر کے ذریعے قادیانیوں کا احتساب شروع کیا۔ اس جرم کی پاداش میں اس وقت کی مُربی قادیاں حکومت کی طرف سے زمیندار اور مولانا ظفر علی خاں پر نت نئے عتاب نازل ہونے شروع ہو گئے۔

ادھر **1932**ء میں سر فضل حسین نے اپنے قریبی ساتھی چودھری ظفر اللہ خاں کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں مسلمان نمائندے کی حیثیت سے لینے کی سفارش کر دی جس پر مولانا ظفر علی خاں اور انکے رفقاء نے ملک کے طول و عرض میں اس بات کی بدلائل وضاحت کی کہ ظفر اللہ خاں مسلمان نمائندہ نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا ظفر علی خاں نے روز و شب کام کیا اور انہی دنوں اس فتنہ کے استیصال کے لیے ایک تنظیم ''مجلس دعوت و ارشاد'' کے نام سے قائم کی جس کی شاخیں ملک کے کونے کونے میں پھیلا دی گئیں۔

قادیانی گروہ کے عقائد اور ان کے عزائم سے مسلمان عوام کو آگاہ کرنے اور سر ظفر اللہ کی بحیثیت مسلم نمائندہ تقرری اور اس کے مضمرات سے حکومت کو متنبہ کرنے کے لیے اس مجلس کے تحت ملک کے طول و عرض میں جلسے منعقد کیے گئے۔ جن کے نتیجہ میں حکومت وقت نے مولانا ظفر علی خاں اور ان کے رفقا، مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا لال حسینؒ اختر، مولانا عبدالحنان و دیگر علما کو گرفتار کر لیا۔ **4** مارچ **1933**ء کو مولانا ظفر علی خاں اور ان کے رفقا کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے عدالت کے روبرو مرزائیت سے متعلق امت مسلمہ کے عقیدہ کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے اس موقف کا اعلان کیا کہ ''میں اپنے

عقیدہ کے اعلان سے ایک منٹ یا ایک منٹ کے کروڑویں حصہ کے لیے بھی دست کش ہونے کو تیار نہیں ہوں۔(1)

مولانا ظفر علی خاں کی اس گرفتاری پر ملک کے طول وعرض میں احتجاج کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا اور علامہ انور شاہ کاشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور دیگر علمائے اسلام نے مولانا کی خدمات اور عدالت کے روبرو سرفروشانہ حق گوئی پر انہیں زبردست خراج تحسین پیش کیا۔(2)

اس واقعہ کے خلاف ملک بھر میں جو احتجاج کی لہر اٹھی، اس سے گھبرا کر حکومت یہ مقدمہ واپس لینے پر مجبور ہو گئی اور اس طرح اسیران تحفظ ختم نبوت کو رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے اپنی سرگرمیاں اور تیز کر دیں اور اکتوبر 1934ء میں قادیان میں ہونے والی احرار کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا اور سیاسی محاذ پر قادیانیت کے تعاقب واحتساب کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس جرم کی پاداش میں زمیندار سے اکتوبر 1934ء میں چار ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی گئی اور زمیندار کے متعدد خاص نمبر بحق سرکار ضبط کر لیے گئے۔ بعدازاں زمیندار کا اپنا مطبع منصور سٹیم پریس بھی ضبط کر لیا گیا لیکن مولانا ظفر علی خاں کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور وہ ہر ابتلا میں پڑنے کے بعد کندن ہو کر نکلے۔

ادھر وائسرائے نے مسلم عوام کے زبردست احتجاج کے باوجود ظفر اللہ خاں کا تقرر اپنی ایگزیکٹو کونسل میں بحیثیت مسلم نمائندہ کر دیا۔ مولانا ظفر علی خاں اور تمام اسلامیان ہند کے لیے یہ امر انتہائی پریشانی کا باعث تھا کہ ایسا شخص جو ان کے ایمان اور نظریات وعقائد میں ان سے متفق نہیں ہے، اسے ان کا نمائندہ بنا دیا جائے۔ ادھر حکومت برطانیہ پوری طاقت کے ساتھ زمیندار اور ظفر علی خاں کی بلائے بے درماں کو ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ان حالات میں جہاں مولانا ظفر علی خاں نے کمال استقامت کا مظاہرہ کیا، وہاں انہوں نے ملک معظم اور اس کے توسط سے پوری مسیحی دنیا کو ایک خط لکھا اور اس میں دلائل و براہین سے ثابت کیا کہ ظفر اللہ خاں اسلام اور مسلمانوں کے نمائندہ نہیں بلکہ وہ اپنے مخصوص قادیانی عقائد کے مبلغ ہیں۔ اس لیے ہم ان کی تقرری کی منسوخی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ طویل خط اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں زمیندار میں شائع کیا گیا۔(3)

''حضور والا! اس حیثیت سے کہ میں توحید کا ایک فرزند ہوں جس کے فرائض

میں مسائل سیاسیہ پر قلم اٹھانا داخل ہے اور اس حیثیت سے کہ مجھے ہندوستان کے ان آٹھ کروڑ مسلمانوں کے عمیق ترین مذہبی احساسات پر عبور ہے جو حضور کو اپنا فرماں روا تسلیم کرتے ہیں، مجھے اجازت دیجیے کہ ایسے نازک اور اہم مسئلہ کے متعلق جس نے آج کل مسلمانان ہند کو بے حد پریشان کر رکھا ہے، حضور کی خدمت میں کچھ گزارش کروں۔

آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم فرزندان اسلام جو قرآن مجید کو خدا کا آخری پیغام مانتے ہیں اور ان کتب سماوی پر بھی یقین رکھتے ہیں جو اس سے قبل نازل ہو چکی ہیں اور معتقدات مذہبی کے سلسلہ میں بہت سے امور ایسے ہیں جو ہمارے اور مسیحی اقوام کے درمیان قدر مشترک کا حکم رکھتے ہیں۔ مثلاً ہمارا یہ مذہبی عقیدہ ہے کہ بائبل بھی آسمانی کتاب ہے اور ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اسلام کے اولوالعزم پیغمبروں کی حیثیت سے بدرجہ غائت احترام کرتے ہیں۔ مسیحیوں کی طرح ہمارا بھی عقیدہ ہے کہ حضرت مریم صدیقہؓ کے بطن سے حضرت مسیح معجزانہ طور پر انسانی ابوت کے منت کش ہوئے بغیر پیدا ہوئے۔ مسیحیوں کی طرح ہمارا یہ مقدس فریضہ ہے کہ مریم صدیقہ کے جلیل القدر فرزند کی عزت کو ان تمام ناپاک دشمنان دین کے مفتریانہ اور کافرانہ حملوں سے بچائیں جو مریم صدیقہ پر فسق کی تہمت لگاتے ہیں اور مسیح ابن مریم کو ولدالزنا قرار دیتے ہیں۔ (نعوذ باللہ) حضرت مسیح اور حضرت مریم صدیقہ کی مقدس ومبارک شخصیتوں پر گندہ دہان کفار کا یہ قرنہا قرن حملہ ہمارے دلوں میں غصہ اور غضب کا ایک طوفان بپا کر دیتا ہے اور ان کفرہ فجرہ کے اور ہمارے درمیان لامتناہی نفرت کی ایک ایسی خلیج حائل ہو چکی ہے جس پر کوئی پل نہیں باندھا جا سکتا۔

مسلمانان ہند کی طرف سے میں ادب کے ساتھ حضور کی توجہ ایک ایسے شخص کے اہانت آفرین ہذیانات کی طرف منعطف کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جو ایک عامیانہ حیثیت سے تدریجی ترقی کرتا ہوا ناقابل رشک شدت کی بلندیوں پر پہنچ گیا اور جس نے قادیانیت کے نام سے ایک مبتدعانہ فرقہ کا پیشوا بن کر نہ صرف مسلمانوں بلکہ برعظیم ہند کی ساری آبادی کے مذہبی احساسات کو اپنی مغلّظ خرافات کا تختۂ مشق بنا کر ان سب کی روحانی جمعیت قلب میں ایک خلفشار عظیم پیدا کر دیا۔ اس شخص کا نام مرزا غلام احمد ہے جو صوبہ پنجاب کے ایک گاؤں قادیان میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ میں مسیح موعود ہوں اور اس زمانہ میں بحیثیت پیغمبر کے مبعوث ہوا

ہوں۔اس نے سادہ لوح اور سریع الاعتقاد مریدوں کی ایک جماعت اپنے گرد جمع کرلی جو اس کے ہر لفظ کو وحی آسمانی کا درجہ دیتی ہے اور از بسکہ بڑا ہی چالاک تھا۔اسی لیے غیر جانب دار سرکاری جرائم کی خفگی سے بچنے کے لیے اس نے تاج برطانیہ کی جان نثاری و وفاداری کے دعوے کو اپنی سپر بنالیا۔اس کے بعد اس نے کھلے بندوں اسلام، مسیحیت اور ہندو دھرم پر جگر خراش حملے ایسے اشتعال انگیز الفاظ میں کرنے شروع کردیئے جسے کوئی شریف آدمی جسے اپنے مذہبی جذبات کا ذرا سا بھی پاس ہو، ان کی ہرگز تاب نہیں لاسکتا۔مریم صدیقہ پر اس نے از راہ غایت دریدہ ذہنی زنا کا الزام لگایا اور مسیح ابن مریم کی تصویر پر اس نے سر سے لے کر پاؤں تک سیاہی کی کونچی پھیر دی اور یہی قادیاں کے اس جھوٹے نبی کا سب سے بڑا شاہکار ہے۔دنیائے اسلام نے بالاتفاق اسے اسلام کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا اور طول وعرض عالم کے علمائے کرام نے اسے دجال کا لقب دیا۔اس کے مرید جو پنجاب کی گزشتہ مردم شماری کے مطابق چھبیس ہزار نفوس ہیں، اس کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور اس کا موجودہ جانشین مرزا محمود احمد جو مذہب کی حدود سے نکل کر سیاسیات عالیہ کے دنگل میں آن کودا ہے اور پنجاب گورنمنٹ سے دست وگریباں ہو رہا ہے۔اسلام دشمنی اور مسیحی کی ان تمام روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہے جو اسے ترکہ میں ملی ہیں۔

مرزا غلام احمد نے اکثر کتابیں لکھی ہیں اور اس کی تمام تصانیف میں جا بجا اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ اسلام کے معتقدات کے ساتھ اس کی دشمنی سوچی اور سمجھی ہوئی ہے۔لیکن اس دشمنی کا سب سے نمایاں مظاہرہ وہ اس وقت کرتا ہے جب وہ حضرت مسیح علیہ السلام اور مریم صدیقہؓ پر حملہ آور ہوتا ہے۔مثلاً اپنی کتاب ''چشمہ مسیحی'' میں مرزا غلام احمد حسب ذیل کفر بکتا ہے:

❑ ''مریم کو ہیکل کی نذر کر دیا گیا تھا تا کہ وہ ہمیشہ بیت المقدس کی خادمہ ہو اور تمام عمر خاوند نہ کرے۔لیکن جب چھ سات مہینے کا حمل نمایاں ہوگیا تب حمل کی حالت میں ہی قوم کے بزرگوں نے مریم کا یوسف نام ایک نجار سے نکاح کر دیا اور اس کے گھر جاتے ہی ایک دو ماہ کے بعد مریم کو بیٹا پیدا ہوا۔'' (چشمہ مسیحی ص **26**، خزائن ج **20** ص **355،356**)

قرآن مجید کی صاف وصریح تعلیم کے خلاف مریم صدیقہ پر زنا کا کھلا ہوا الزام لگانے کے بعد مرزائے قادیاں حضرت مسیح علیہ السلام کی مقدس ذات پر جنہیں وہ ولد الزنا قرار دینے سے کبھی نہیں چوکتا، حسب ذیل اہانت آمیز حملہ کرتا ہے:

- ''ایسے ناپاک خیال اور متکبر اور راست بازوں کے دشمن کو ایک بھلا مانس آدمی بھی قرار نہیں دے سکتے تھے، چہ جائے کہ نبی قرار دیں۔''

(ضمیمہ انجام آتھم ص 9 حاشیہ، خزائن ج 11 ص 293)

- ''آپ کا خاندان بھی نہایت پاک اور مطہر ہے، تین دادیاں اور نانیاں آپ کی زنا کار اور کسبی عورتیں تھیں جن کے خون سے آپ کا وجود ظہور پذیر ہوا۔''

(حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم ص 7، خزائن ج 11 ص 291)

- ''عیسیٰؑ شراب پیا کرتے تھے۔'' (کشتی نوح ص 66 حاشیہ، خزائن ج 19 ص 71)

- ''آپ کو گالیاں دینے اور بدزبانی کی اکثر عادت تھی...... یہ بھی یاد رہے کہ آپ کو کسی قدر جھوٹ بولنے کی بھی عادت تھی۔'' (حاشیہ ضمیمہ آتھم ص 5 حاشیہ، خزائن ج 11 ص 289)

مریم صدیقہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر مرزا غلام احمد قادیانی کے ناپاک حملوں کی یہ صرف چند مثالیں ہیں جس کا قلم برداشتہ اقتباس اس کی فحش کتابوں سے مشتے نمونہ از خروارے کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں ہندوستان کے طول وعرض میں عمومی احتجاج کے علی الرغم کسی قسم کی روک ٹوک کے بغیر اشاعت پذیر ہو رہی ہیں۔ کلیسائے عیسوی نے آپ کو حامی دین کا لقب کیا ہے اور ایک مسیحی تاجدار ہونے کی حیثیت سے آپ کا فرض اوّلین ہے کہ مسیح اور مریم کی عزت کو اس قسم کے ناپاک حملوں سے بچائیں۔ مسلمانان ہند کو یقین ہے کہ حضور اپنے نائب السلطنت لارڈ ولنگڈن کو یہ شاہانہ ہدایات فرما کر کہ اس بارہ میں بعجلت تمام تر مؤثر انسدادی تدابیر اختیار کی جائیں۔ اپنی مسلمان رعایا کو بطور خود مسیح و مریم کی توہین کا سدباب کرنے کے قرآنی فریضہ سے سبکدوش ہوں گے۔

اس میں جناب کو ادب کے ساتھ اس واقعہ کی طرف متوجہ کرنا بھی میرا جسارت آمیز فرض ہے کہ جناب کے وزیر ہند سر سیموئیل میور نے حال ہی میں سر فضل حسین کی جگہ جو نائب السلطنت کشور ہند کی کونسل میں حضور کی مسلمان رعایا کے مفاد کے نگہبان تھے، ایک قادیانی مسٹر ظفر اللہ خان کو نامزد کر دیا گیا ہے۔ یہ تقرر مسلمانان ہند کے ہمہ گیر احتجاج کو جس کا سلسلہ بدستور جاری ہے، یکسر نظر انداز کر کے عمل میں لایا گیا ہے کہ حضور کی مسلمان رعایا اس تقرر کی اس بناء پر مخالفت کر رہی ہے کہ مسٹر ظفر اللہ خان حلقہ اسلام سے خارج ہیں اور ظاہر ہے کہ نامسلمان ہو کر وہ وائسرائے کی کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کا ہرگز ہرگز کوئی حق نہیں رکھتے۔ مسلمانوں

کے اس احتجاج کی توثیق کے لیے یہ واقعہ موجود ہے کہ فرقہ قادیانیہ کا بانی اپنی کتاب حقیقت الوحی میں لکھتا ہے کہ:

- ''جو مجھ پر ایمان نہیں لاتا، وہ کافر ہے۔''

(حقیقت الوحی ص 163، خزائن ج 22 ص 167 حاشیہ)

قادیانی عقائد کے ترجمان تشحیذ الاذہان ج 6 نمبر 8 میں قادیان کا جھوٹا نبی مسلمانوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی نوعیت ذیل کے واضح اور پرزور الفاظ میں بیان کرتا ہے:

- ''ان مدعیان اسلام سے ہمارا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ ان کے ساتھ ہمارے تعلقات کا انقطاع خود خدا کے احکام کے ماتحت عمل میں آیا ہے۔''

اپنی کتاب (آئینہ کمالات اسلام ص 547) پر مرزا غلام احمد قادیانی اپنی عادت کے مطابق نہ صرف مسلمانوں بلکہ کل بنی نوع انسان کی تواضع ذیل کے مغلّظات سے کرتا ہے:

- ''تمام وہ لوگ جو میری دعوت کو قبول نہیں کرتے، حرام زادے ہیں۔''

(آئینہ کمالات اسلام ص 547، خزائن ج 5 ص 547، 548)

قادیان کے اس جھوٹے نبی کا موجودہ خلیفہ مرزا محمود احمد اس ساری خرافات کی حرف بحرف تصدیق کرتا ہے اور اپنی کتاب آئینہ صداقت صفحہ 35 مندرجہ انوار العلوم جلد 6 صفحہ 110 میں لگی لپٹی رکھے بغیر صاف اور غیر مشتبہ الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ ''کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود (مرزا قادیانی) کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے، خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود (مرزا قادیانی) کا نام بھی نہیں سنا، وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے''۔ حضور پر اب واضح ہو گیا ہو گا کہ سر سیموئیل میور، مسٹر ظفر اللہ خان کے لیے مسلمانان ہند کی نمائندگی کا منصب تجویز کرنے میں ایک شدید غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ اس لیے مسلمان قوم کی مخلصانہ گزارش واستدعا ہے کہ مسلمانوں پر جو ظلم عظیم روا رکھا گیا ہے، اس کی تلافی شاہی فرمان کے امضا سے فرمائی جائے۔ دنیائے اسلام نے اپنے خفیف بین الجماعتی اختلاف کو بالائے طاق رکھ کر مرزا غلام احمد اور اس کے پیروؤں کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا ہے اور مسلمانان ہند کو اس لحاظ سے حضور کی رعایا ہونے کی حیثیت سے حق پہنچتا ہے کہ فرقہ قادیانیہ کو ایک جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے جس کو کسی حالت میں یہ اجازت نہ ہو کہ یہ برطانوی ہند کے شہری ہونے کی حیثیت سے اسلام کو اپنے دنیوی

مفاد کا ذریعہ بنائیں۔ بالآخر مسلمانان ہند کی طرف سے معروضات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

1...... حضور حامیٔ دین ہیں۔ اس لیے حضور کا مقدس فرض ہے کہ اس کی عزت کی حفاظت کریں جو بنی نوع انسان کا ایک بہت بڑا محسن اور ساری دنیا کے احترام کا مستحق ہے۔ قرآن مجید مریم صدیقہ اور مسیح کو صدیقہ اور کلمۃ اللہ کے القاب سے یاد کرتا ہے۔ ان کی نسبت بکواس کی تاب مسلمانان ہند نہیں لا سکتے۔ اس سلسلے میں جو تدابیر حضور عمل میں لائیں، مسلمان بجاں سپاس گزار ہوں گے۔

2...... ایک شاہی فرمان کے ذریعے ظفر اللہ خاں کے تقرر پر خط تنسیخ کھینچا جائے۔ اس لیے یہ شخص مجبور ہے کہ اپنے عقیدہ کی رو سے ساری دنیا کے مسلمانوں کو کافر سمجھے۔

3...... قادیانی ایک جداگانہ غیر مسلم فرقہ قرار دیا جائے۔

حضور کا نیاز مند

22 نومبر 1934ء خاکسار

ظفر علی خاں

مدیر و مالک روزنامہ زمیندار

......۞......

حواشی

1- روزنامہ زمیندار (خصوصی ضمیمہ) 7 مارچ 1933ء

2- امام العصر علامہ انور شاہ کاشمیریؒ نے دارالعلوم دیوبند میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

❑ ’’علمائے اسلام نے انفرادی حیثیت سے متواتر کوشش اس فتنہ کے استیصال کے لیے کیں لیکن دور حاضر میں جناب ظفر الملت والدین مولانا ظفر علی خاں کا اقدام یقیناً لطف الٰہیہ ہے۔ ان کی یہ جدوجہد اور ان کے رفقاء کی قربانی خدا کے نزدیک ان شاء اللہ مقبول ہوگی۔ دعا ہے کہ وہ خدا جس نے پیغمبر آخر الزمان ﷺ کے لائے ہوئے دین مبارک کے لیے قرآن حکیم میں **الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی** ارشاد فرمایا، ان کو ثواب دارین عطا

فرمائے۔ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

مولانا شبیر احمد عثمانی نے مولانا ظفر علی خاں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا:

- ''فتنہ قادیان کے استیصال میں مولانا ظفر علی خاں نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے، وہ زمانہ حال کے عین مناسب و مطابق ہے۔ ہمارے علما نے اس فتنہ کی ابتدا سے اب تک قادیانیت کے خلاف جو عظیم الشان کام کیے ہیں، وہ بھی قابل قدر ہیں مگر مولانا ظفر علی خاں نے چند سال میں اس فتنہ کی سرکوبی میں جو کامیابی حاصل کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔انہوں نے دیکھا کہ اب یہ فتنہ قیامت بن رہا ہے اور بحث و مناظرہ سے اب تک کوئی فائدہ نہیں ہوا تو انہوں نے وہ طرز عمل اختیار کیا جو نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں گھر کر گیا، اس میں انہیں اتنی کامیابی ہوئی جو علماء کی متفقہ جدوجہد سے نہیں ہوئی''۔(روزنامہ زمیندار 15 مارچ 1933ء)

3- اس وقت کی حکومت برطانیہ کی قادیاں نوازی کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ زمیندار کی اشاعت مورخہ 24 نومبر 1934ء جس میں یہ خط شائع ہوا تھا، بحق سرکار ضبط کر لی گئی اور اس مطالبہ کی وجہ سے زمیندار سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی گئی اور مزید تین ہزار روپے زمیندار سے اور ایک ہزار روپیہ زمیندار کے مطبع کریمی پریس لاہور سے بھی طلب کرلیا گیا۔

(ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی کتاب 'کلیاتِ نثر ظفر علی خاں' سے اخذ کردہ)

موہن داس کرم چند گاندھی کے نام

(1)

1925ء میں حکومت افغانستان نے اپنے ملک میں متعین ایک قادیانی مبلغ نعمت اللہ کو اس کی مذموم سرگرمیوں اور قادیانیت کے پس پردہ عزائم سے آگاہ ہونے پر تبلیغ ارتداد کے جرم میں سنگسار کروا دیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد ہندوستان میں قادیانی ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی اور اس فیصلہ کے خلاف سب وشتم کا طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ قادیانیوں کے خلیفہ ثانی مرزا بشیر الدین محمود نے اس واقعہ پر والئ افغانستان کے نام ایک طویل تر خط لکھا جو دعوۃ الامیر کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ اس کے بعد ہندوستان بھر کے اخبارات میں قتل مرتد کے مسئلہ پر ایک طویل بحث کا آغاز ہو گیا۔ مولانا ظفر علی خاں اور زمیندار، حکومت افغانستان کے اس شرعی فعل کی تائید کرنے والوں میں سب سے آگے تھے اور ان کی تائید دیوبند کے جید اور سر برآوردہ علما نے بھی کی، جن میں امام العصر علامہ انور شاہ کاشمیریؒ بھی شامل تھے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے انہی دنوں ایک معرکۃ الآرا رسالہ 'الشہاب' کے نام سے لکھا اور مولانا سیّد انور شاہ کاشمیریؒ نے بھی بدلائل اسلام میں مرتد کے قتل کا وجوب ثابت کیا۔ غرضیکہ مولانا ظفر علی خاں زمیندار اور علمائے دیوبند نے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو شریعت مطہرہ کی روشنی میں بکمال وتمام اجاگر کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اقوام جب اپنی آزادی کھو بیٹھتی ہیں تو ان کے مذہب، ان کے تشخص اور ان کی تہذیب میں ہر کس وناکس دیدہ دلیری سے مداخلت کرنے کو اپنا حق سمجھنے لگتا ہے۔ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ مشہور ہندو راہنما موہن داس کرم چند گاندھی نے اپنے اخبار ینگ انڈیا میں اسلام میں مرتد کی سزا پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا کہ:

"کسی بات کو محض اس لیے حجت قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ قرآن میں ہے بلکہ اسے پہلے حق وباطل کی کسوٹی پر پرکھنا ہو گا اور پھر اس کے جواز وعدم جواز کا فیصلہ ہو گا۔"

آگے چل کر مسٹر گاندھی نے مرتد کو قتل کر دینے کی سزا دینے کو ناجائز قرار دیا۔

مسٹر گاندھی کی یہ تصریحات صریحاً ایک شرعی حکم میں مداخلت تھیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے ان کے اس بیان پر فوراً گرفت کی اور مسٹر گاندھی کو ایک طویل الذیل خط لکھا:

اس خط کے ساتھ ذیل کا نوٹ بھی زمیندار میں شائع ہوا:

مرتد کی سنگساری پر مہاتما گاندھی کے خیالات، مولانا ظفر علی خاں کا جواب۔قرآن مجید ایک غیر متبدّل حقیقت ہے۔

مہاتما گاندھی نے ینگ انڈیا کی اشاعت مورخہ 26 فروری میں سزائے سنگساری پر جو مقالہ تحریر کیا، اس کا ترجمہ اشاعت دیروزہ میں شائع ہو چکا ہے۔مولانا ظفر علی خاں صاحب نے اس کے جواب میں مہاتما جی کو مندرجہ ذیل مکتوب ارسال فرمایا۔

محترم مہاتما جی!

آپ نے کابل کے واقعات سنگساری پر اپنے صحیفہ ''ینگ انڈیا'' کی تازہ اشاعت میں جو بیان شائع کیا ہے، اس کو پڑھ کر مجھے تعجب بھی ہوا اور تکلیف بھی ہوئی۔آپ فرماتے ہیں کہ اس ''خاص قسم کی تعزیر (رجم) کو مجرد اس بنا پر جائز نہیں قرار دیا جاسکتا کہ اس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔'' ساتھ ہی آپ نے یہ بھی اعلان فرمایا ہے کہ ''عقل و دانش کے اس دور میں اگر کسی مذہب کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوگا کہ اس کا کوئی اصول موضوعہ عالمگیر حیثیت سے تسلیم کرلیا جائے تو پہلے اسے عقل کی حق و باطل کو پرکھنے والی کسوٹی پر کسے جانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا پڑے گا''۔ آخر میں آپ نے دعویٰ کیا ہے کہ ''یہ ہمہ گیر کلیہ مستثنیات سے قطعاً پاک ہے۔غلطی ہر حالت میں غلطی ہے گو دنیا بھر کے آسمانی صحیفوں میں اس کی حمایت کی گئی ہو''۔

میں نے آپ کی عظمت کا نہایت کشادہ دلی سے اعتراف کیا ہے اور میں آج تک آپ کو ان چند انسانوں میں سے سمجھتا رہا ہوں جن کی شخصیتیں دور حاضر کی تاریخ مرتب کررہی ہیں لیکن اسلام کی حلقہ بگوشی نے جو فرائض مجھ پر عائد کیے ہیں، ان کی بجا آوری سے میں قاصر رہوں گا، اگر میں آپ کو یہ جتانہ دوں کہ قرآن مجید کو اپنے انداز پر اپنے معتقدین کی ہدایت کا پورا پورا حق حاصل ہے اور آپ نے اس حق کے خلاف آواز بلند کرکے اپنے کروڑوں مسلمان عقیدت مندوں کے اس عقیدہ کو متزلزل کردیا ہے کہ آپ میں ان کی راہنمائی کی قابلیت موجود ہے۔

آپ کو پورا اختیار حاصل ہے کہ آپ شریعت اسلامی کی سزائے سنگساری کی تائید میں اظہار خیالات فرمائیں یا اس کی مخالفت کریں لیکن آپ کا یہ کہنا کہ خود قرآن مجید کی کسی نص صریح میں رجم کا حکم موجود ہو تب بھی ایسے حکم کو غلط سمجھنا چاہیے، ایک ایسا استدلال ہے جو مسلمانوں کو کبھی مطمئن نہیں کرسکتا۔ جسے آپ غلطی کہتے ہیں وہ تو محض ایک اعتباری شے ہے اور مسلمانوں کے

پاس اس کی تعبیر و تاویل کا دوسرا ہی معیار ہے۔ان کے نزدیک قرآن مجید ایک غیر ممکن تغیر قانون الٰہی ہے جو انسانی ضعیف البیان کی آئے دن بدلنے والی عقلی حکمتوں اور آن کی آن میں کچھ سے کچھ ہو جانے والی مصلحتوں سے ورا الورا واقع ہوا ہے۔ ہندوستان کے سیاسی راہنما ہونے کی حیثیت سے آپ کے ذمے بے شمار سرگرمیاں عائد ہیں۔کاش آپ ان سرگرمیوں میں قرآن مجید کی تعلیمات پر مخالفانہ تنقید کرنے کے نازک کام کا اضافہ نہ فرماتے۔

خاکسار ظفر علی خاں (صدر مجلس خلافت پنجاب)

لاہور 28 فروری 1925ء

(زمیندار 5 مارچ 1925ء)

(2)

محترم مہاتما جی

آپ نے کابل کے بعض قادیانیوں کی سنگساری پر جو مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا، اس میں بعض متنازعہ فیہ نکات پیدا ہوتے تھے اور میں نے اپنے گزشتہ عریضہ میں وعدہ کیا تھا کہ ان نکات پر کسی قدر تفصیل سے اظہار خیالات کروں گا۔ چنانچہ آج اس وعدے کا ایفا کر رہا ہوں۔ میں نے آپ کا مقالہ بار بار پڑھا اور ہر دفعہ میرا یقین قوی تر ہوتا گیا کہ نیشنل کانگرس کی صدارت کے مرتبہ جلیلہ اور خود آپ کی ذاتی حیثیت کا انتقضا یہی تھا کہ آپ وہ مقالہ نہ لکھتے۔ میں اس مقالہ کے وہ اقتباسات ذیل میں نقل کرتا ہوں جو میرے نزدیک قابل اعتراض ہیں۔

''میں سمجھتا ہوں کہ صرف بعض حالات میں قرآن طریق سنگساری کا حکم دیتا ہے لیکن واقعات زیر بحث ان حالات سے خارج ہیں۔مگر ایک ایسے انسان کی حیثیت سے جو خشیت الٰہی میں زندگی بسر کرتا ہو، میں ہر حالت میں اس طریق کو اخلاقاً قابل اعتراض سمجھتا ہوں۔ پیغمبر صاحب (حضرت محمد ﷺ) کی زندگی اور اس زمانے میں خواہ کچھ بھی ضروری اور مباح کیوں نہ ہو،لیکن اس طریق سزا کی محض اس وجہ سے حمایت نہیں کی جا سکتی کہ اس کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ عقل و دانش کے اس دور میں اگر کسی مذہب کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوگا کہ اس کا کوئی اصول عالم گیر حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے تو پہلے اسے عقل کی حق و باطل کو پرکھنے والی کسوٹی پر کسے جانے

کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا پڑے گا۔ یہ ہمہ گیر کلیہ مستثنیات سے قطعاً پاک ہے۔ غلطی ہر حالت میں غلطی ہے۔ گو دنیا بھر کے آسمانی صحیفوں میں اس کی حمایت کی گئی ہو............سزا کا یہ طریقہ ایسا ہے جس سے انسانی ضمیر مجروح ہوتا ہے۔ خواہ کتنا ہی بڑا جرم کیوں نہ ہو، اس سزا سے نہ عقل اتفاق کرتی ہے نہ دل اس کی حمایت کرسکتا ہے''۔

مندرجہ بالا اقتباس کی ابتدائی سطور قابل تصیح ہیں۔ قرآن مجید نے کسی جرم کی سزا کے لیے طریق سنگساری تجویز نہیں کیا اور آپ نے غلطی سے ایک ایسی بات قرآن کی طرف منسوب کر دی ہے جو فی الحقیقت بالکل بے بنیاد ہے۔ لیکن یہ تو بالکل خفیف سا معاملہ ہے جس کے مقابلے میں آپ کی یہ روش بہت زیادہ قابل گرفت ہے کہ سزا کا کوئی طریق بھی جو آپ کے معیار اخلاق پر نا قابل تسلیم ہو، خلاف انسانیت اور مردود قرار دے دیا جائے، گو قرآن اور دنیا کے تمام دیگر صحائف آسمانی اس کی تائید و حمایت کرتے ہوں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر قرآن شریعت اسلامیہ کے ماخذ کی حیثیت سے زنا کی سزا تازیانہ اور سرقہ کی سزا قطع ید تجویز کر کے (بقول آپ کے) ''انسانی ضمیر کو مجروح'' کرتا ہے تو اسے غلطیوں کی ایک پوٹ قرار دے دیا جائے۔ اگر اس قسم کے غیر محتاط بیانات اسلام کے مشہور نکتہ چینیوں کے غیر ہمدرد قلم سے نکلے ہوتے تو مجھے اتنا خیال نہ ہوتا۔ لیکن آپ کی حیثیت تو بالکل جداگانہ ہے۔ نیشنل کانگرس کے صدر کی حیثیت سے آپ کو تیس کروڑ ہندوستانیوں کے سردار ہونے کا فخر حاصل ہے اور وہ ہندوستانی آپ سے توقع رکھتے ہیں کہ آپ ان کے عقائد کا احترام کریں گے۔ علاوہ بریں ''حامی خلافت مہاتما گاندھی'' کی حیثیت سے کروڑوں مسلمان آپ کو اپنا سیاسی راہنما، خیر خواہ اور مشیر خیال کرنے کے عادی ہیں۔ لہٰذا آپ کا شریعت کے قوانین تعزیری کی ایک خاص صورت کو اس ہمہ گیری کے ساتھ مطعون کرنا بالکل غیر متوقع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان جو اپنے دین کے بنیادی اصول و عقائد کے معاملات میں بے انتہا ذکی الحس واقع ہوئے ہیں، ایسے خیالات کے اظہار پر طبعاً کبیدہ خاطر ہوئے ہیں اور آپ کو ایک ایسے معاملے میں دخل در معقولات کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلام اپنے غلط کار اور شریعت کی خلاف ورزی کرنے والے معتقدین پر جس قسم کی تعزیرات عائد کرتا ہے، ان کے اخلاقی جواز یا عدم جواز کے متعلق آپ کو ذاتی طور پر اختیار حاصل ہے کہ جو رائے چاہیں، قائم کریں لیکن آپ نے تو گویا ایک مسلمان

فقیہہ کی طرح علی الاعلان شریعت کے معاملے میں عام رائے دے کر اپنی حیثیت کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور مجھے آپ کو اس انداز میں مخاطب کرنے کی ضرورت محض اس لیے پیش آئی ہے کہ میں دنیائے اسلام میں آپ کے وقار و اعتبار کو سلامت دیکھنا چاہتا ہوں۔ اب میں اصل مبحث پر آتا ہوں۔ قرآن نے بہ حیثیت ضابطہ تعزیرات محض چند جرائم کے لیے سزائیں مقرر کی ہیں اور وہ جرائم یہ ہیں۔ قتل عمد، زنا، سرقہ اور افک یعنی پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا۔ بقیہ جرائم کی سزاؤں کو رسول اللہ ﷺ کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے اور حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا تعامل، خلفائے راشدین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے وضع آئین و ترتیب ضوابط کی بنیاد و اساس ہے۔ جن حالات میں رسول اللہ ﷺ کے اقوال و اعمال سے راہنمائی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکے، وہاں قیاس سے کام لیا جاتا ہے۔ لہٰذا شریعت اسلام کا ایک جزو قرآن ہے جس کا حرف حرف منزل من اللہ ہے۔ دوسرا جزو حضرت محمد ﷺ کا عمل ہے جو بہ حیثیت حامل قرآن اس کتاب الٰہی کے سب سے پہلے مفسر تھے اور جن کی تفسیر میں غلطی اور خطا کا کوئی شائبہ نہیں ہو سکتا۔ تیسرا جزو دنیائے اسلام کا اجماع ہے اور ہر مسلمان کے نزدیک شریعت کی یہ حیثیت بہمہ وجوہ مسلم ہے۔

اب ارتداد کے مسئلہ کو لیجیے۔ شریعت میں ارتداد کی سزا قتل ہے اور اگرچہ قرآن اس باب میں خاموش ہے لیکن شریعت اسلامی کے دوسرے دو ماخذ یعنی سنت رسول ﷺ اور اجماع امت کا فیصلہ قطعی اور غیر مشتبہ ہے اور وہ یہ ہے کہ مرتد کو قتل کیا جائے۔ میں اس موضوع کے متعلق ''زمیندار'' میں ایک سلسلہ مضامین شائع کر رہا ہوں جس میں اس پر بسط و تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

جن لوگوں کی آنکھیں موجودہ دور کے سوفسطائی تشکک کی روشنی سے چندھیا گئی ہیں، ان کے نزدیک تو ارتداد کے ساتھ اسلام کا یہ سخت گیرانہ سلوک بنی آدم کی آزادی ضمیر پر ایک کھلا ہوا حملہ ہوگا، خواہ اس آزادی ضمیر کے معنی کچھ اور ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن ان بزرگواروں کو یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام محض اپنے پیروؤں کی ہدایت و راہبری کا ایک اخلاقی ضابطہ ہی نہیں ہے، بلکہ بجائے خود ایک ہیئت حاکمہ ہے جس کی اطاعت کی رسی اس کے حلقہ بگوشوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی ہے۔ برطانوی ہندوستان کا بسنے والا ایک شخص تعزیرات ہند کی دفعہ 121 کی خلاف ورزی کی پاداش میں پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے اور اس کا یہ بہ ظاہر معقول عذر اس کی جان نہیں بچا سکتا کہ

شاہ جارج کی اطاعت کا جوآ کندھے سے اتار پھینکنے میں اس کا ضمیر بالکل آزاد ہے۔ اگر اس شخص کی سزا یابی قرین عقل ہے اور منافی آزادی ضمیر بھی نہیں تو اسی طرح اگر ایک مسلمان بھی اسلام سے بغاوت کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس بغاوت کی پاداش میں اس کی جان نہ لی جائے۔

اب سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ مرتد کی اس انتہائی سزا کی شکل رجم ہو یا نہ ہو، اس بحث کا تصفیہ ایک جملے میں ہوا جاتا ہے۔ سزا کی نوعیت ہمیشہ اس قوم کے افراد کی دماغی نشو ونما کے تابع ہوتی ہے جسے سزا دینی چاہیے۔ ہر زمانے میں واضعان قوانین کو نفسیات کی اس ضرورت کے آگے سر جھکانا پڑا ہے۔ خود حکومت برطانیہ ہی کو دیکھ لیجیے جسے اپنی رحم دلی اور انسانیت کا بہت بڑا غرہ ہے کہ صوبہ سرحد شمال ومغربی میں قانون سرحدی جیسا رسوائے عالم ضابطہ جاری کیے بغیر نہ رہ سکی، حالانکہ ممالک متحدہ آگرہ داودھ میں اس قانون کے نفاذ کا اسے خیال تک نہیں آ سکتا۔ حکومت کابل نے اگر متعدد قادیانیوں کو جن پر اسلام کی دینی اور دنیوی طاقت کے خلاف علم سرکشی بلند کرنے کا الزام ثابت ہو چکا ہے، سنگسار کر دیا ہے تو قوانین فطرت کے اسی اقتضائے جاریہ کی متابعت کی ہے۔

خاکسار

ظفر علی خاں

لاہور 7 مارچ 1925ء (زمیندار 9 مارچ 1925ء)

خطبات

مذہبی میدان میں قادیانی سرگرم عمل تھے، متنبّی قادیان مرزا غلام احمد آنجہانی کے فرزند اور ''خلیفہ دوم'' مرزا بشیر الدین محمود نے علی گڑھ یونیورسٹی کو ''سپین'' سمجھ کر اور خلیفۂ اوّل حکیم نور الدین کے دو صاحبزادوں عبدالسلام اور عبدالمنان کو ''طارق'' بنا کر علی گڑھ اس مشن کے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ تبلیغ کے ذریعے مسلم یونیورسٹی کو خلافت قادیان کے لیے ''فتح'' کر لیں۔ اس زمانے میں قادیانی حضرات ہر جگہ ہر سال 21 اکتوبر کا دن ''یوم تبلیغ'' کے طور پر مناتے تھے۔

21 اکتوبر 1933ء کو عبدالسلام (قادیانی) تبلیغی مقاصد کے لیے لکھے گئے کچھ پمفلٹ اور ہینڈ بلز سے مسلح ہو کر آفتاب ہال کے ایک قدیم ہاسٹل ماریسن کورٹ پر ''حملہ آور'' ہوئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ ان کا پہلا ''وار'' کمرہ نمبر 21 پر ہوا۔ عبدالسلام (قادیانی) کی بدقسمتی سے تین نہایت خطرناک قسم کے دوست حافظ فضل الرحمٰن انصاری (متعلم بی۔اے پیرلوئیس) حافظ صدیق احمد صدیقی اور محمد شریف چشتی (فرسٹ ایئر) اسی کمرے کے سکونتی تھے۔ یہ تینوں دوست اگرچہ ملک کے مختلف دور دراز علاقوں سے علی گڑھ گئے تھے مگر دینی خانوادوں کے چشم و چراغ ہونے کے باعث اسلام کے شیدائی اور ہر دین دشمن تحریک کے مقابلے میں ڈٹ جانے والے لوگ تھے۔ فضل الرحمٰن انصاری (مرحوم) جو 1938ء میں علی گڑھ سے ایم۔اے، بی۔ٹی۔ایچ کر کے گئے، کچھ عرصہ بعد مشہور مبلغ اسلام مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی کے داماد اور مولانا شاہ احمد نورانی کے بہنوئی بن گئے۔ انصاری صاحب کو آغاز شعور ہی سے مذہبی تبلیغ اور تصنیف و تالیف کا شوق چلا آ رہا تھا۔ بی۔اے پاس کرنے تک متعدد انگریزی کتابچے مثلاً:

"Pseudo Prophet of Qadian", "Padre of Hong King", "Humanity Reborn"

وغیرہ لکھ کر چھپوا چکے تھے۔ شریف چشتی علی گڑھ میں آنے سے پہلے ایک ایسے دینی گھرانے اور حلقے کے تربیت یافتہ تھے جس میں ظفر علی خاں اور ''زمیندار'' بے حد مقبول تھے، لہٰذا انہیں قادیانی لٹریچر پر خاصا عبور تھا۔ صدیق احمد صدیقی مدرسۂ فرنگی محل لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہو کر علی گڑھ کے طالب علم بنے تھے۔ یہ اتحاد ثلاثہ ان تینوں کے شش سالہ قیام علی گڑھ کے دوران قائم رہا۔

جونہی عبدالسلام (قادیانی) پمفلٹ بدست جھومتے جھامتے "**السلام علٰی من اتبع الھدیٰ**" کہہ کر کمرے میں داخل ہوئے، تینوں دوست تاڑ گئے کہ جس نے "السلام علیکم" کے بجائے وہ سلام پیش کیا ہے جو غیر مسلموں کے لیے مخصوص ہے، خود بھی مسلمان نہیں، کچھ اور ہے۔ بہرحال ان کی تشریف آوری کا مقصد دریافت کیا گیا۔ جواب میں ایک لمبی تقریر، کلام پاک کی کچھ آیات، آیات کا مفہوم بہ پیرایہ تدلیس و تلبیس۔ حافظ انصاری (مرحوم) کا گورا چٹّا، حسین وجمیل، انتہائی نرم ونازک قسم کی مختصر سی ڈاڑھی والا چہرہ حمیّت دینی سے تمتما اٹھا۔ ایسا معلوم دیتا تھا کہ تہیہ طوفان کر چکے ہیں۔ صدیق احمد صدیقی دلآویز زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ عینک کے شیشوں سے پار ہوتی ہوئی دل میں اتر جانے والی نگاہ سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بقول چشتی بھائی اس خیال سے کہ کج بحثی قادیانیوں کی سرشت میں داخل ہے اور خواہ مخواہ قیمتی وقت ضائع ہوگا۔ عبدالسلام (قادیانی) کی طرف سے مرزا قادیانی کو "مسیح موعود" اور "ظلی نبی" مان لینے کی دعوت کے جواب میں چشتی صاحب نے صرف اتنا کہا کہ: "صاحب! ہم مرزا قادیانی کو نبی، مسیح اور جو کچھ آپ چاہیں گے، مان لیں گے۔ پہلے یہ تو ثابت کیجئے کہ مرزا قادیانی ایک شریف انسان بھی تھے۔"

عبدالسلام نے سٹ پٹا کر کہا: "توبہ توبہ، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" ان کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ کوئی شریف اور مہذب انسان دوسروں کو گالی نہیں دیتا مگر مرزا قادیانی نے تو نہ صرف عام مسلمانوں، بلکہ علماء، صلحاء، ائمہ کرام اور خود انبیاء کرام پر بھی، (معاذ اللہ) گالیوں کا جھاڑ باندھا ہے۔ ان کو مرزا قادیانی کی کتب سے حوالے دکھا کر بتایا گیا کہ مرزا قادیانی نے کس کی شان میں کس طرح کی مغلظات ایجاد فرمائی ہیں، نظر آ رہا تھا کہ مبلغ صاحب بے حد خفیف ہو رہے ہیں، مگر وہ قادیانی کیسا جو چاروں شانے چت گر کر بھی ہار مان لے۔

قادیانی تبلیغ کا یہ واقعہ تینوں دوستوں کے لیے مہمیز عمل ثابت ہوا۔ ان میں سے ہر ایک نے حتیٰ الوسع عبدالسلام اور عبدالمنان کا اکثر وبیشتر پیچھا کیا مگر یہ لوگ اپنی سرگرمیوں میں بے یارومددگار نہیں تھے۔ انہیں سٹاف کے اکّا دکّا قادیانی یا نیم قادیانی اساتذہ اور بعض سینئر قادیانی طلبا کے علاوہ یونیورسٹی کے طبیہ کالج کے پرنسپل عطاء اللہ بٹ کی مکمل پناہ اور ہر طرح کی اعانت بھی حاصل تھی۔ ان دنوں طبیہ کالج قادیانیوں کے خاصے مضبوط مورچے کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ یہ صورت حال منظّم جوابی اور دفاعی کوشش کا تقاضا کر رہی تھی۔

تیسرے اور مفاداتی گروہ کے بارے میں اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اس کے سامنے تعلیم کے بعد صرف اعلیٰ سرکاری عہدوں اور ملازمتوں کا حصول تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس گروہ کے لوگ انگریزوں، قادیانیوں اور کیمونسٹوں تک کے ہاتھوں میں کھلونا بننے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان کی یہ سرشت توجہ طلب اور قابل اصلاح تھی۔ رفع التباس کے لیے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یونیورسٹی کے طلبا کی غالب ترین اکثریت مذکورہ بالا تینوں قسم کے لوگوں کی شہ اور منفی سرگرمیوں سے بڑی حد تک بیگانہ ہونے کی وجہ سے تقریباً محفوظ تھی۔ لیکن اس خوش فہمی میں کہ فی الحال ''سب خیریت ہے'' ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا بھی درست نہ ہوتا۔

یہ تھے وہ حالات جن کے تحت مولانا ظفر علی خاں کو 1934ء اور 1936ء میں اور ایک بار مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو علی گڑھ کے دورے کی دعوت دی گئی۔

مولانا، علی گڑھ کالج کے قرن اوّل کے اولڈ بوائے تھے، جنہوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی چالیس سالہ بھرپور سیاسی زندگی میں ہر میدان اور ہر محاذ پر بڑے بڑے معرکے مارے تھے۔ بقول علامہ اقبالؒ مولانا کو قدرت نے وہ قلم عطا فرمایا تھا جس کی روانی دشمنان دین وملت کے فاسد مقاصد ومکائد کی کاٹ میں بڑے بڑے مجاہدین کی تلوار سے کم نہ تھی۔ جنگ بلقان، جنگ طرابلس، جنگ عظیم میں شکست کے نتیجے میں سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے، ترکان احرار کی مجاہدانہ عزیمت کے طفیل ایشائی ٹرکی کا دشمن کے پنجۂ خونیں سے بچ نکلنا، مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں یونان کی شکست فاش اور فتح سمرنا، سرزمین حجاز سے برطانوی جاسوس کرنل لارنس کے مرغ دست آموز شریف مکہ کا فرار اور آل سعود کی کامیابی، جنگ عظیم میں یورپی اتحادیوں کی عالم اسلام پر تاخت وتاراج 1919ء کا مارشل لاء اور امرتسر کے جلیانوالہ باغ کا حادثۂ فاجعہ، مسجد کانپور کی شہادت، تحریک خلافت کے دوران اور بعد میں برطانیہ اور مسلمانوں کے درمیان ہر قسم کی محاذ آرائی، مغلپورہ کالج کے انگریز پرنسپل کے خلاف ایجی ٹیشن، شدھی اور سنگھٹن کے فتنے، 1928ء، 1929ء میں غازی امان اللہ خان کے خلاف بچہ سقّہ کی بغاوت، اس میں جنرل نادر خاں کا کردار، کانگریس کی حمایت اور بعد میں مخالفت، تحریک شہید گنج وغیرہ وغیرہ حادثات وواقعات میں سے کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں جس میں مولانا نے مرکزی یا نمایاں طور پر مخلصانہ کردار ادا نہ کیا ہو۔ یہ سب کچھ باشعور اور بالغ نظر اساتذہ اور طلبائے مسلم یونیورسٹی کی

لوحِ دل و دماغ پر نقش تھا۔ وہ لوگ جو یونیورسٹی کے وقتی جمود و سکوت سے کچھ پریشان اور کبیدہ خاطر تھے، مولانا کے گزشتہ روشن کارناموں کی بناء پر ہی ان سے عقیدت و محبت نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی مجاہدانہ قیادت سے مستقبل کی توقعات بھی وابستہ کرتے تھے۔ سیاسی، فکری، علمی اور ادبی خدمات کے ساتھ خالص دینی خدمات میں بھی وہ مجاہدانہ عزیمت کے ساتھ قیادت کا حق ادا کر چکے تھے۔ فتنہ قادیاں کے استیصال کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو پوری طرح بیدار اور متحرک کر دینے میں علماء کرام کی مساعی کے ساتھ ساتھ مولانائے موصوف اور ان کے اخبار ''زمیندار'' کا جہادِ ختم نبوت کے تحفظ کی تاریخ کا ایک مستقل اور روشن باب ہے۔

مولانا کے ساتھ علی گڑھ والوں کی محبت و ارادت صرف ایک بزرگ ''اولڈ بوائے'' ہونے کے باعث ہی نہیں بلکہ ایک عظیم مجاہد اور بلند کردار قائد کی حیثیت سے بھی تھی۔ علی گڑھ کا حق تھا کہ مولانا اس کے نوجوان فرزندوں کی راہنمائی کریں۔ عام واقعاتی پس منظر کے علاوہ جو اوپر بیان کیا گیا ہے، کچھ ایسے فوری اسباب بھی پیدا ہو گئے تھے جن میں مولانا کو علی گڑھ کے دورے کی دعوت دینا ناگزیر ہو گیا تھا۔ سر ظفر اللہ خان نہ صرف یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے، بلکہ سر فضل حسین نے انہیں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن بھی بنوا دیا تھا، نتیجتاً یونیورسٹی کورٹ میں ان کا اثر و رسوخ بڑھ گیا تھا۔ اس نے علی گڑھ کے قادیانی اور قادیان نواز حلقوں کو اپنا مشن آگے بڑھانے کا ایک نیا حوصلہ دے دیا تھا۔ طبیہ کالج اور یونیورسٹی کے بعض ہاسٹلوں میں قادیانیوں کی سرگرمیاں خلافِ معمول زیادہ تیز ہوتی نظر آنے لگی تھیں۔ یہ سب کچھ اسلامی ذہن رکھنے والے طلباء اور اساتذہ کو گوارا نہ تھا۔ لہٰذا ہم خیال دوستوں نے کافی غور و خوض کے بعد طے کیا کہ اس صورتحال کی اصلاح کے لیے مولانا ظفر علی خاں کو یونیورسٹی یونین کی طرف سے مدعو کیا جائے۔ ان دنوں یونیورسٹی کا نظم و نسق انگریز پرو وائس چانسلر مسٹر رامزے بوتھم کے ہاتھ میں تھا جو ایک کٹر عیسائی اور یونیورسٹی حدود میں واقع گرجا میں ''سنڈے سروس'' (ہفتہ وار عبادت) کی قیادت کیا کرتا تھا۔ ایس ایس ہال کے پرووسٹ مسٹر ایم ایم شریف (مرحوم) ریڈر شعبہ فلسفہ، آفتاب ہال کے پرووومٹ پروفیسر محمد حبیب، صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات اور سی ہال (منٹو سرکل) کے پرووومٹ پروفیسر عبدالمجید قریشی تھے۔ یہ چاروں واجب الاحترام اربابِ اختیار اپنی افتادِ طبع اور قدرے مختلف سیاسی و فکری رجحانات کے پیشِ نظر سخت متفکر تھے کہ مولانا کی ہنگامہ پسند شخصیت کی

تشریف آوری یونیورسٹی کو کہیں کسی انتظامی مسئلے سے دوچار نہ کر دے۔ پرووائس چانسلر کی تحریری اجازت کے بغیر یونیورسٹی یونین کی طرف سے مولانا کو رسمی طور پر دعوت دینا بے حد نازک اور مشکل کام تھا۔لیکن یونین کے عہدیداروں اور اسلام کے شیدائی طلباء نے جرأت قلندرانہ سے کام لے کر مولانا کو ایک تحریری دعوت نامہ بھیج دیا اور ہر قسم کے عواقب ونتائج بھگت لینے کا تہیہ بھی کر لیا۔

یونیورسٹی کی انتظامیہ کی طرف سے مخالفت کا اندیشہ تو اپنی جگہ پر تھا، بڑی مشکل یہ آن پڑی تھی کہ عین انہی دنوں ''زمیندار'' مرزا غلام احمد قادیانی کی ''نبوت'' کا تار و پود بکھیرنے کے ''جرم'' میں معتوب تھا۔حکومت نے پریس ایمرجنسی پاورز ایکٹ کے تحت نہ صرف یہ کہ تین ہزار کی ضمانت طلب کر لی تھی بلکہ منصور سٹیم پریس جس میں یہ اخبار چھپتا تھا، ضبط بھی کر لیا تھا۔اس پریس کی مالیت اس سستے سمے بھی بیس ہزار روپے سے کم نہ تھی۔ پریس ایکٹ کے اس مہلک وار سے اخبار کو جانبر کرنے کے لیے مولانا کا لاہور میں موجود رہ کر تگ ودو کرنا ضروری تھا۔اگر ''زمیندار'' اس ابتلاء کا شکار نہ ہوتا تو بھی مولانا کی صحافتی، مجلسی اور سیاسی مصروفیتیں اتنی بے پناہ تھیں کہ بظاہر مولانا کی طرف سے علی گڑھ کے دورے کی دعوت قبول کر لینا محال نظر آ رہا تھا۔ اندریں حالات یونین کے عہدیدار کسی ایسے قاصد کی تلاش میں تھے جو مولانا کو اپنے ذاتی اثر ورسوخ سے علی گڑھ پہنچنے پر مائل ہی نہیں بلکہ مجبور بھی کر سکے۔مآل کار:

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

دعوتی خط لے کر راقم لاہور پہنچا۔الحمدللہ! کہ دو تین روز کی کوشش کے بعد مولانا نے علی گڑھ کا وعدہ فرما لیا۔ یہ وعدہ لے کر شاداں فرحاں راقم واپس علی گڑھ پہنچا ہی تھا کہ اگلے روز لاہور سے مولانا نے بذریعہ تار یہ مژدہ سنایا کہ وہ 24 نومبر (1934ء) کو ساڑھے دس بجے میل ٹرین سے علی گڑھ پہنچ رہے ہیں۔

علی گڑھ میں مولانا کا ورود مسعود، عدیم النظیر استقبال اور مختصر خطاب

علی گڑھ کالج نے یونیورسٹی بننے اور یونیورسٹی نے تقسیم ملک تک کم وبیش ساٹھ ستر سال کی مدت میں بے شمار بڑی بڑی ہستیوں کا استقبال کیا جن میں مختلف ممالک کے سربراہ، ہندوستان کے متعدد وائسرائے،صوبائی گورنرز، والیان ریاست، ملک گیر اور بین الاقوامی شہرت کے سیاسی لیڈر، شہرہ آفاق ارباب علم وہنر اور مختلف روحانی پیشوا شامل ہیں۔لیکن چشم فلک نے

صرف تین ایسے استقبال دیکھے ہیں جن میں ''سرخ کارپٹ'' کی جگہ دیدہ ودل فرش راہ کیے گئے۔ یہ عدیم النظیر استقبال صرف تین فرزندان ملت کو نصیب ہوا اور یہ تین اعلیٰ مرتبت ہستیاں ہیں (1) علامہ اقبال، (2) ظفر علی خاں اور (3) قائداعظم محمد علی جناح۔ حکیم الامت علامہ محمد اقبال جب وروود فرمائے علی گڑھ ہوئے تو ان کو ریلوے ٹرین سے زمین پر قدم نہیں رکھنے دیا گیا تھا۔ یونیورسٹی تک لے جانے کے لیے ان کے دیوانوں نے انہیں اپنے شانوں پر اٹھالیا تھا۔ قائد اعظم اور ان کی واجب الاحترام ہمشیرہ جب ریلوے ٹرین سے اتر کر اسٹیشن کے باہر چار گھوڑوں والی وکٹوریہ گاڑی میں فروکش ہوئیں تو گھوڑے کھول کر الگ کر دیئے گئے تھے اور گاڑی کو طلباء خود کھینچ کر ایک منظّم اور منضبط جلوس کی صورت میں قائداعظم کے لیے مخصوص قیام گاہ تک لے گئے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کو بھی اسی طرح ایک کھلی کار میں بٹھایا گیا تھا۔ کار کا انجن بند کر دیا گیا تھا، فرطِ عقیدت ومحبت میں ہزاروں طلباء نے کار کو خود دھکیل کر اولڈ بوائز لاج تک پہنچایا تھا۔

مولانا کی آمد کی خبر نہ صرف یونیورسٹی کی حدود میں بلکہ علی گڑھ شہر میں بھی ان کے پہنچنے سے ایک روز قبل آناً فاناً پھیل چکی تھی۔ درمیان میں صرف ایک رات تھی جو ''طول شب فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی'' دکھائی دے رہی تھی۔ یہ رات اکثر وبیشتر طلباء نے استقبالی کتبے اور نعرے تیار کرنے اور پھولوں کے ہار مہیا کرنے میں گزار دی تھی، انتظار کی گھڑیاں لمحہ لمحہ ختم ہو کر وہ صبح سعید طلوع ہوئی جو اپنی نورانی کرنوں کے فروغ کے ساتھ آفتاب ملت ظفر علی خاں کو لائی۔ وہ صبح عام صبح کاہے کو تھی، صبح عید تھی، یونیورسٹی کمپلیکس میں ہر طرف مسرت انگیز چہل پہل کا سماں تھا۔ طلبا اجلی وردیوں اور دمکتے چہروں کے ساتھ خوش رنگ پھولوں کے ہار لیے مختلف ٹولیوں میں پیدل اور سوار ریلوے اسٹیشن کی طرف رواں دواں تھے۔ دوسری جانب شہر کی طرف سے اسٹیشن پہنچنے والوں کا بھی یہی حال تھا۔ ٹرین کی آمد سے کوئی ایک گھنٹہ پیشتر ہی ریلوے اسٹیشن کا وسیع وعریض پلیٹ فارم طلبا سے اٹ چکا تھا۔ تاحد نگاہ ترکی ٹوپیاں، سیاہ شیروانیاں اور پھولوں کے ہاروں سے مزین ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ اسٹیشن کا عملہ اور آنے جانے والے مسافر حیران تھے کہ یہ کون خوش قسمت انسان ہے جس کے اعزاز میں رنگ ونور اور ذوق وشوق کا یہ طوفان امڈ رہا ہے۔

طلباء کے علاوہ شہر کے سیاسی کارکن اور معززین بھی جو پلیٹ فارم تک رسائی کے لیے زور بازو سے کام لے سکے، خاصی تعداد میں موجود تھے۔ استقبال کرنے والے اساتذہ اور طلبا

میں خواجہ غلام السیدین (المعروف کے .جی سیدین) پرنسپل ٹریننگ کالج حکیم عبداللہ خان نصر، حکیم عبداللطیف فلسفی، یونیورسٹی یونین کے نائب صدر جناب عثمان احمد انصاری، یونین کے سیکرٹری جناب عمران حسین، محمد شریف چشتی، قاری محمد انوار صمدانی، مولانا عبدالقادر، حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری، حافظ صدیق احمد صدیقی، فرحت اللہ، منظور احمد، سمیع اللہ خان، شفیع اللہ خان، مسٹر ایم۔ این۔ ایم بدیع الدین ایڈیٹر ''علی گڑھ میگزین'' (انگریزی سیکشن)، محمد امین کھوسو، ضیاء الدین ابرو، غلام نبی، عبدالعزیز فردوسی، شیخ نثار احمد، شیخ نذیر احمد، طبیہ کالج کے تقریباً تمام طلبا (چند قادیانیوں کو چھوڑ کر) مثلاً خاکسار (حکیم عنایت نسیم سوہدروی)، عطاء اللہ حبیب، خالد سوہدروی، مہر محمد یعقوب وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اکابرین شہر سے حافظ محمد عثمان، مولانا ابویحییٰ امام خان نوشہروی اور دیگر چیدہ چیدہ سیاسی کارکن شہر سے استقبال کے لیے آنے والوں کے جم غفیر کے ساتھ موجود تھے۔ جو لوگ ریلوے پلیٹ فارم تک رسائی نہ حاصل کر سکے، وہ اسٹیشن کی ڈیوڑھی کے باہر انبوہ در انبوہ معزز مہمان کے باہر برآمد ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

جونہی گاڑی پلیٹ فارم پر رکی، فضا نعرۂ تکبیر اور مولانا ظفر علی خاں زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی۔ ہر فرد کی تمنا اور کوشش تھی کہ اس کا لایا ہوا ہار کسی نہ کسی طرح مولانا کے زیب گلو ہو کر رہے۔ ہزاروں ہار بردار نوجوانوں کی دھکم پیل سے آخر نومبر کا قدرے خنک موسم جولائی اگست کا حبس پیدا کر رہا تھا۔ بہرحال سٹاف کے معزز ارکان، یونیورسٹی یونین کے نائب صدر اور سیکرٹری، کابینہ کے ارکان اور چیدہ چیدہ طالب علم جو استقبال کی تنظیم اور سلامت روی کے ذمہ دار تھے، پراکٹوریل عملے اور پولیس کی مدد سے مولانا کے کمپارٹمنٹ کے سامنے صف بستہ جمے ہوئے تھے۔ سٹاف اور یونین کے عہدیداروں نے راہنمائی کرتے ہوئے سب سے پہلے کمپارٹمنٹ کے اندر تشریف لے جا کر مولانا کو ہار پہنایا اور معانقہ و مصافحہ کے بعد مولانا کو کمپارٹمنٹ کے دروازے تک لے آئے۔ اس کے بعد پروفیسر کے.جی سیدین نے ہار پہنایا، مصافحہ کیا اور یونین کے نائب صدر، سیکرٹری، ارکان کابینہ اور دیگر چیدہ چیدہ طلبا نے یکے بعد دیگرے تقلید کی۔ مولانا سے ان حضرات کا تعارف کرایا گیا۔ ان میں سے اکثر سے معانقہ اور مصافحہ کے بعد مولانا کو پلیٹ فارم سے باہر لے جانے کی کوشش شروع ہوئی جو ایک معرکہ سے کم نہ تھی، گاڑی سے ڈیوڑھی تک کا چند گز کا فاصلہ کوئی آدھ گھنٹہ کی تھکا دینے والی

جدوجہد کے بعد طے ہوا۔

ڈیوڑھی کے دروازے کے ساتھ مولانا کی سواری کے لیے انتہائی سلیقے سے سجی ہوئی کار موجود تھی۔ کار کی چھت پر ایک کارڈ بورڈ پر خوش خط جلی حروف میں ''زمیندار'' کی پیشانی کی زینت بننے والا مولانا ہی کا مشہور شعر:

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

آویزاں تھا۔ ''زمیندار'' اور مولانا گزشتہ ربع صدی سے استخلاص دین ووطن کی جدوجہد کے جرم میں پے درپے جن مصائب ومشکلات کا نشانہ بنے ہوئے تھے، ان کے پس منظر میں کار کی چھت پر آویزاں یہ شعر باطل کے مقابل میں حق کے ثبات کی آوازِ غیب معلوم ہو رہا تھا۔

کار کے انجن کے سامنے گتے کی ایک اور تختی پر:

ملت اسلام کے نور نظر بددل نہ ہو
آج سارا عالم اسلام تیرے ساتھ ہے

یہ روح پرور شعر، طلباء ایک مسحور کن آواز میں مل کر گا رہے تھے۔ اسٹیشن سے باہر تشریف لا کر مولانا اپنی کار کے پائیدان پر کھڑے ہوگئے۔ ایک مختصر سی تقریر فرمائی۔ ''زمیندار'' کے نامہ نگار خصوصی متعینہ علی گڑھ کے قلم سے اس تقریر کا جو خلاصہ 9 دسمبر 1934ء کی اشاعت میں چھپا، بے حد ایمان افروز اور یقین پرور ہے:

''عزیزان محترم وبزرگان ملت! میں اسی مادر تعلیم کی آغوش میں پلا ہوں جس میں آپ تعلیم پا رہے ہیں۔ میری خاک کا ذرہ ذرہ خاک علی گڑھ سے اسی طرح متعلق ہے جس طرح جسم روح سے یا روح جسم سے۔ میں اسی چشمۂ حیات کا ایک قطرہ ہوں جو سرسید کی کوششوں سے آج سے پچاس سال قبل علی گڑھ کی زمیں سے ابلا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں اپنی افتاد طبع کی وجہ سے نگہ عتاب فرنگ کا معتوب رہتا ہوں اور یہی سبب ہے کہ آئے دن کی مشکلات، صحافتی اور دیگر گراں بار مصروفیتوں نے علی گڑھ نہ آنے دیا۔ مگر اس کا آسمان اور زمین، اس کا چاند اور سورج، اس کی ہوا اور فضا، اس کے درخت اور سبزہ، غرضیکہ اس کی خاک کا ذرّہ ذرّہ ہمیشہ مجھے اپنی طرف کھینچتا رہا ہے۔ یہی وہ کشش ہے جو مجھے آج آپ تک لے آئی ہے۔''

''عزیزان محترم! آپ کے ولولہ اور جوش کو دیکھ کر جو جذبات میرے دل میں پیدا ہوئے ہیں، ان کے اظہار سے میری زبان قاصر ہے۔ میں نے علی گڑھ سے متعلق بہت کچھ سنا تھا، موافق بھی اور مخالف بھی، لیکن اگر علی گڑھ یہی ہے جس کا ایک مظاہرہ آج میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ علی گڑھ سے عنقریب حیات نو کا چشمہ پھوٹے گا اور گلستان اسلام کو سیراب کر کے اسے نیا رنگ و آب بخشے گا۔''

''میرے عزیزو! اسلام اور ملت کی بہت سی امیدیں تم سے وابستہ ہیں، آئندہ قوم کی فلاح و بہبود اور اس کے احیاء و بقا کا بوجھ تمہارے کندھوں پر پڑنے والا ہے۔ اسلام اور وطن کو تم سے یہ توقع ہے کہ جب موقع آئے، تم لبیک کہنے کے لیے تیار رہو۔''

مندرجہ بالا تقریر کے دوران فضا اللہ اکبر اور ظفر علی خاں زندہ باد، زمیندار پائندہ باد کے نعروں سے مسلسل گونجتی رہی۔ تقریر کے بعد مولانا نے شہر سے آنے والی پبلک کا شکریہ ادا کیا اور طلباء کا جلوس کار کو دھکیلتا ہوا آہستہ آہستہ یونیورسٹی کی طرف رینگنے لگا۔ ڈیڑھ میل کا راستہ ایمان افروز نعروں اور نغموں سے گونجتا رہا۔ اسٹیشن سے اولڈ بوائز لاج کے مہمان خانے تک پہنچتے پہنچتے تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ جلوس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی مولانا کی قیام گاہ پر ممبران سٹاف کی ایک بہت بڑی تعداد اور طلبا کا ایک عظیم مجمع موجود تھا۔ یہاں بھی حاضرین کو معزز مہمان نے ایک مختصر مگر انتہائی بلیغ تقریر سے نوازا۔ آپ نے انہیں وہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا جو آقائے عرب و عجم ﷺ نے ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر عالم انسانی کو دیا تھا۔ اساتذہ اور طلباء کو علی گڑھ کی دیرینہ روایات اور مسلمانوں کے فرائض یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ حق کی راہ میں جو اذیت پہنچے، برداشت کر کے ثابت قدم رہنے میں کامیابی ہے۔ مولانا نے خطاب کے بعد حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ بیشتر حضرات رخصت ہو گئے مگر مغرب تک آنے جانے والے طلباء اور شہریوں کا تانتا بندھا رہا۔

یونیورسٹی یونین علی گڑھ میں خطاب

کم و بیش چالیس سال کی مدت کے بعد مولانا نے علی گڑھ کا یہ پہلا دورہ یونیورسٹی کی پر اصرار دعوت پر کیا تھا۔ لہٰذا اس دورہ کا مرکزی اجتماع اور حاصل کوئی دو گھنٹے کا وہ خطاب تھا جو

24 نومبر کی شام کے آٹھ بجے آپ نے یونین ہال میں کیا تھا۔تقریر کے آغاز سے کوئی گھنٹہ بھر پہلے ہی سارا ہال، گیلریاں اور برآمدے کھچا کھچ بھر چکے تھے۔ مولانا تقریر سے قبل ''ممتاز ہاؤس'' کی طرف سے کھانے پر مدعو تھے، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اپنے رفیق سفر مولانا عبدالحنان کے ساتھ یونین کے نائب صدر، سیکرٹری اور دیگر سرکردہ ارکان سٹاف وطلبہ کی معیّت میں ٹھیک آٹھ بجے یونین ہال میں رونق افروز ہوئے۔ گرم جوش تالیوں اور نعروں سے ہال گونج اٹھا، یہ حرارت بخش سلسلہ ختم ہوا تو نائب صدر جناب عثمان انصاری نے کرسئ صدارت کو زینت بخشی، پلول ضلع گوڑ گاواں کے مولانا عبدالقادر (متعلم بی.ٹی) نے اپنے لحن داؤدی میں تلاوت کلام پاک فرما کر سحر آگیں کیفیت طاری کردی۔ اس کے بعد ایسے مواقع پر اکثر کام آنے والے خوش گلو جناب عبدالرحیم نے برادر مکرم جناب محمد شریف چشتی کی لکھی ہوئی دلکش استقبالی نظم انتہائی پرسوز لہجے میں پڑھی۔ یہ نظم جو کئی سو کی تعداد میں چھپوالی گئی تھی، جلسہ کے آغاز پر مجمع میں تقسیم ہوچکی تھی۔ نظم کی شان نزول، لکھنے والے کے خلوص، پڑھنے والے کے ترنم، سننے والوں کے ذوق اور موقع و محل نے مل جل کر ایک سماں باندھ دیا تھا جو دیر تک لوگوں کو یاد رہا۔ نظم کی ایک مطبوعہ نقل سنہری فریم میں لگا کر ہدیہ عقیدت کے طور پر چشتی صاحب کی طرف سے مولانا کی خدمت میں پیش کی گئی جسے پرشور تالیوں کی گونج میں موصوف نے شرف قبولیت بخشا۔

اس کے بعد صدر جلسہ کی اجازت سے حکیم عبداللہ خان نصر صاحب نے ایک تعارفی تقریر میں مولانا کے زندگی بھر کے کارنامے اور قربانیاں گنانے میں ذرا طوالت اختیار کی تو مجمع بے تاب ہوگیا، شور مچ گیا، لوگ اپنے اور مولانا کے درمیان کسی اور کو دیر تک حائل دیکھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ سامعین کا یہ رنگ دیکھ کر مجبوراً حکیم صاحب بیٹھ گئے۔ حقیقتاً مولانا کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج بھی نہیں تھی، صاحب صدر نے موقع کی نزاکت بھانپ کر مولانا سے التجا کی کہ وہ خطاب فرمائیں۔

مولانا کی تقریر جو کوئی دو گھنٹے جاری رہی، جتنی پر جوش تھی، اتنی ہی مدلل اور بصیرت افروز بھی تھی، کامل سکوت، گہری عقیدت اور انتہائی دلچسپی سے سنی گئی۔ شریف چشتی کی استقبالی نظم میں مولانا کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا:

آ ہمیں دے جا رسول اللہ(ﷺ) کا کوئی پیام
ہم میں وقف جانکنی دے جا حیات نو کا جام

مولانا کی تقریر ''رسول اللہ ﷺ کا پیام'' بھی تھی اور ''حیات نو کا جام'' بھی۔ اس جامع ومانع تقریر میں اسلامیان ہند اور عالم اسلام کو درپیش اہم مسائل پر فکر انگیز روشنی ڈالی گئی تھی۔ امت مسلمہ کے ناگفتہ بہ حال کے خدوخال، روشن ماضی کے آئینہ میں دکھا کر صرف احساس زیاں ہی کو تیز تر نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک انتہائی تابناک مستقبل کی بشارت بھی دی گئی تھی۔ مولانا نے دوران خطاب واضح کیا کہ قرن اوّل کے مسلمان اگر انتہائی بے سروسامانی کے باوجود تھوڑی سی مدت میں آباد دنیا کے بہترین اور بیشتر حصے پر چھا گئے تھے تو اس کا راز دامن اسلام سے کامل وابستگی اور رسول اللہ ﷺ سے عشق تھا، آج بھی اگر ہم دنیا میں سربلند ہونا اور رہنا چاہتے ہیں تو اسی ایمان، اسی ولولے اور جذبے سے کام لینا پڑے گا جو ہمارے اسلاف کرام کا طرّہ امتیاز تھا۔

پھر مولانا نے ان خطرات کی طرف اشارہ فرمایا جو ملت اسلامیہ عموماً اور اس کے نوجوان طبقے کو خصوصاً درپیش ہیں۔ یہ خطرات گناتے ہوئے آپ نے سب سے پہلے انگریز پرستی اور انگریز کی ساختہ پرداختہ قادیانی نبوت اور قادیانی امت کا خصوصی ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ قادیانی نبوت اسی دور کا سب سے بڑا فتنہ ہے، انگریز نے یہ فتنہ اپنے اقتدار کو استحکام اور دوام بخشنے کے لیے برپا کیا ہے۔ اگر قادیانی اپنے بے بنیاد، لچر اور لاطائل دعاوی اور نظریات اپنے آپ تک ہی محدود رکھتے تو شاید ہم تعرض نہ کرتے مگر انگریز کی مربیانہ سرپرستی میں ان لوگوں نے اب کھلم کھلا مسلمانوں کی متاع دین وایمان پر ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ قادیانیوں کا ایمان ہے کہ انگریز کی اطاعت نہ کرنے والا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ (شیم شیم شیم کے آوازے) ان کے نبی (مرزا قادیانی) کا کہنا ہے کہ ہر وہ شخص جو اس کی (جھوٹی اور خود ساختہ) نبوت پر ایمان نہیں لاتا، خواہ وہ قطب شمالی میں رہتا ہے یا قطب جنوبی میں، مشرق میں جی رہا ہے یا مغرب میں، خواہ اس نے مرزا قادیانی کا نام سنا ہے یا نہیں سنا، حرام زادہ اور ''ذریۃ البغایا'' (بازاری عورتوں کی اولاد) ہے۔ (شیم شیم شیم کے آوازے)۔ مولانا نے فرمایا کہ جب قادیانیوں کے عقائد اصولی طور پر مسلمانوں کے معتقدات سے یکسر مختلف ہیں تو انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسی اسلامی درسگاہوں میں اسلام کا پرفریب لبادہ اوڑھ کر آئیں

اوراپنے ملحدانہ نظریات کے جراثیم کھلم کھلا پھیلاتے پھریں؟ (قہر میں ڈوبی ہوئیں آوازیں ''کوئی حق نہیں''، ''ہم ہرگز یہ گوارا نہیں کریں گے'') مولانا نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ قادیانی اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے سرکاری حلقوں میں اعتماد حاصل کرتے ہیں اور اپنی انگریز پرستی اور رجعت پسندی کے صلے میں تمام اعلیٰ سرکاری مناصب اور اسامیوں پر ہاتھ صاف کر کے مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کرتے ہیں۔

متنبّی قادیان کی تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے بتایا کہ انگریز کو اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے ضرورت تھی کہ مسلمان اپنے دل سے جہاد بالسیف کا عقیدہ نکال دیں۔ جب تک مسلمان کا قرآن پر ایمان اور اس کے دل میں قرآن لانے والے خدا کے آخری نبی کی محبت کا بے پناہ جذبہ موجود ہے، یہ کیوں کر ممکن ہے؟ انگریز نے ایک مغل زادے کی پیٹھ ٹھونک کر اس سے نبوت کا دعویٰ کرایا۔ اس (جھوٹے) نبی نے اپنی (نام نہاد) نبوت کا مقصد جہاد کو منسوخ کرنا بتایا۔ نبوت کے اس مدعی کو آسمان برطانیہ سے یہ ''وحی'' نازل ہوئی ہے ''**الیوم حرام علی المسلمین ان یحاربو الدین**'' اس تک بند ''نبی'' نے اس عربی وحی کا ترجمہ اپنے ایک اردو شعر میں خود یوں کیا کہ:

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ ص 26، خزائن ج 17 ص 77)

مولانا جب اس انداز میں قادیانی عقائد و تعلیمات کے بخیے ادھیڑتے جا رہے تھے تو چند قادیانی طلباء نے جو یونین ہال کی پچھلی اور بغلی نشستوں پر دبکے بیٹھے تھے، اکّا دکّا کھسکنا شروع کر دیا تو پہچانے گئے اور عام لعن طعن کے ریلے میں روپوش نہیں بلکہ فرار ہو گئے۔

اس مرحلے پر شعبہ فارسی کے پروفیسر محمد حاذق جو خود کٹر مسلمان اور انتہائی سلجھے ہوئے اساتذہ میں سے تھے، اٹھے اور مولانا سے باادب التجا کی کہ وہ یونیورسٹی یونین کی روایات جس کے بانیوں میں سے وہ (مولانا) خود بھی ہیں، احترام کریں اور ایسے اختلافی مسائل پر اظہار رائے سے احتراز فرمائیں جو یونیورسٹی میں زیر تعلیم مختلف فرقوں کے درمیان تلخی پیدا کر کے یونیورسٹی کی فضا کو مکدر کرنے کا باعث ہوں۔ لیکن ننانوے فیصد طلبا کا جوش و خروش اور بگڑتے تیور دیکھ کر

پروفیسر صاحب حرف مطلب پوری طرح ادا بھی نہ کر پائے تھے کہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ مولانا نے پروفیسر صاحب کو یقین دلایا کہ انہیں نہ صرف اس یونین کی روایات کا پورا پورا احترام ملحوظ ہے بلکہ وہ عقیدۃً مسلمانوں کے تمام فرقوں کے درمیان کامل یگانگت اور صلح وصفائی کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ عادتاً اس کے مبلغ بھی ہیں۔ لیکن یہ کیوں کر ممکن ہے کہ حضرت محمد عربی ﷺ کی ختم المرسلینی پر ایمان نہ رکھنے والے ایک باطل گروہ کو جس کا نبی الگ ہے، جس کی وفاداری کا مرکز قادیان کی راہ سے لندن ہے، جس کا شعار انبیاء کو گالیاں دینا اور جس کا جزو ایمان نصاریٰ کی غلامی ہے، ان کو صرف اس لیے معاف کر دیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ جناب پروفیسر صاحب! یاد رکھیے کہ مسلم یونیورسٹی ایک اسلامی ادارہ ہے۔ اگر اس کی آستین میں سانپ پلنے لگے تو نہ صرف یہ کہ اس ادارے کا اسلامی تشخص ہی ختم ہو جائے گا بلکہ اس کی اس یونین کی وہ روایات بھی بے معنی ہو کر رہ جائیں گی جن کا آپ کو اس قدر پاس ہے۔

مولانا نے اپنے موقف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ انگریز کو تو خوب معلوم ہے کہ قادیانی نبوت کیوں وجود میں لائی گئی ہے اور قادیانی امت کیا ہے؟ ماتم کا مقام یہ ہے کہ بھولے بھالے مسلمان اس نبوت اور اس نبوت کی حلقہ بگوش امت کے مقاصد سے آشنا نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ہاتھوں اپنی ہی تباہی و بربادی کو دعوت دے رہے ہیں، تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ سر ظفر اللہ خاں جو قادیانی ''نبی'' کے غالی پیروکاروں میں سے ہے، جو مسلمانوں کو کافر سمجھتا ہے، ''مسلمان'' کا لیبل اپنے ماتھے پر چسپاں کر کے خود مسلمانوں کی خود فراموشی کے طفیل وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں پہنچا ہے اور اس کونسل میں وہ مسلمانوں کی نہیں صرف قادیانیوں کی نمائندگی اور انگریزی استعمار کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے موجود ہے۔

قادیانیوں کے مذموم مقاصد اور طریق واردات کی سیر حاصل نقاب کشائی کے بعد آپ نے ''سوشلزم''، ''کمیونزم''، ''ایتھیزم'' (Atheism) اور اس قسم کے دیگر غیر اسلامی نظریات پر انتہائی فکر انگیز اور بصیرت افروز خیالات کا اظہار فرمایا۔ آپ نے وضاحت کی کہ یہ ساری ''ازمیں'' مغربی تہذیب اور طرز فکر کے شجر خبیث ہی کے برگ و بار ہیں اور صرف ان دلوں اور دماغوں میں راہ پاتی ہیں جن میں ایمان اور اسلام کی روشنی نے گھر نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر آج کے نوجوان نے اسلام اور قرآن کا بغور مطالعہ کیا ہوتا یا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی روشن

سیرت پر ایک نگاہ ڈالی ہوتی تو وہ اس قسم کی آوارہ خیالی میں ہرگز مبتلا نہ ہوتا۔آپ نے اس موضوع پر اپنے ارشادات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ جہاں لینن اور مارکس کے دعاوی صرف زبانی جمع خرچ ہیں، وہاں حضرت محمد عربی ﷺ نے جو کہا، کر دکھایا۔ جو تعلیم دی، وہ اوران کے صحابہؓ اس کا مکمل نمونہ تھے۔ آپ ﷺ کی تعلیم کی حقانیت اور سیرت طیبہ کا اعجاز یہ ہے کہ اسود واحمر ایک ہو گئے۔فساد بندہ وآ قامٹ گیا۔محمود وایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔ بلال حبشی اور سلمان فارسی ہم مرتبہ ٹھہرے، بڑائی کا معیار مال ودولت یا کوئی اور مادی برتری نہیں بلکہ صرف اور صرف خوف خدا اور عمل صالح قرار پایا۔''**ان اکرمکم عنداللّٰہ اتقکم**''مولانا اس موضوع پر خاصی دیر تک حقائق ومعارف کے دریا بہاتے رہے۔ ہر ہر نکتے پر باذوق سامعین ''واہ واہ'' اور سبحان اللہ! کہہ کر اپنی تائید وتحسین کا اظہار کرتے رہے۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دل کی آواز دلوں میں گھر کر رہی ہے۔علی گڑھ یونین نے یہ ایمان افروز سماں شاذ ہی دیکھا ہوگا۔

مولانا ظفر علی خاں کی تقریر کے بعد مولانا کے ہم سفر اور رفیق سیاست مولانا عبدالحنان تقریر کے لیے اٹھے۔ان صاحب کی تقریر اس غلط فہمی پر شروع ہوئی تھی کہ (خدانخواستہ) پروفیسر حاذق قادیانی ہیں یا قادیانی جماعت سے کوئی بالواسطہ یا بلا واسطہ تعلق رکھتے ہیں۔ یہ مفروضہ درست نہ تھا، بات صرف اتنی ہی تھی کہ موصوف عام پڑھے لکھے مسلمان کی طرح روایتی رواداری یا ''وسیع القلبی'' کا شکار تھے۔مولانا حنّان نے پروفیسر حاذق کو بطور خاص مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ قادیانی اپنے آپ کو مسلمان نہیں بلکہ ''احمدی'' کہتے ہیں اور جس ''احمد'' کی نسبت سے وہ ''احمدی'' بنتے ہیں، وہ ''وہ احمد'' نہیں جس کی نوید حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی بلکہ قادیان کا ''غلام احمد'' ہے جس نے ''غلام'' ہوتے ہوئے آقا کی مسند پر چھاپہ مارنے کی ناقابل معافی جسارت کر ڈالی ہے۔قادیانی تمام مسلمانوں کو ''حرام زادہ'' اوران کی ماؤں بہنوں کو سورنیاں اور کتیاں کہتے ہوئے نہیں جھجکتے۔ان کے ''پیغمبر'' کی انہیں یہی تعلیم وتلقین ہے۔مولانا نے پروفیسر حاذق سے سوال کیا کہ کیا آپ اس کے باوجود ان دریدہ دہن لوگوں کو جبراً کھینچ کھینچ کر دائرہ اسلام میں لانے اور اپنے سینے سے لگانے پر مصر ہیں؟ مولانا نے سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے حاذق صاحب کو بتایا کہ خود مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج میں ان دنوں کیا ہو رہا تھا؟ مولانا نے ایک انتہائی تکلیف دہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سامعین کو آگاہ کیا کہ طبیہ کالج کا ایک طالب علم اپنی کاپی

پر مولانا ظفر علی خاں کا مشہور شعر:

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

کلاس روم میں بیٹھا لکھ رہا تھا کہ پاس بیٹھے ایک قادیانی نے چیخ کر کہا ''خاک نور خدا پر''...... (نعوذ باللہ) اور اس شعر کے لکھنے والے پر...... یہ سن کر مسلمان طالب علم مشتعل ہو گیا۔ سخت الفاظ کے تبادلے کے بعد ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی۔ سوئے اتفاق سے کالج کا پرنسپل (ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ) غالی اور زہریلے قسم کا قادیانی ہے اور سٹاف کی اکثریت بھی اسی کی ہم مذہب تھی۔ قادیانی طالب علم دوڑا دوڑا پرنسپل کے پاس پہنچا اور مسلمان طالب علم کے خلاف جا بے جا شکایت کی۔ پرنسپل صاحب جو مسلمانوں کی تذلیل پر ہمیشہ ادھار کھائے بیٹھے رہتے تھے، اس سنہری موقع کو کیوں ہاتھ سے جانے دیتے۔ جھٹ غریب مسلمان طالب علم پر دس روپے جرمانہ کر دیا اور دوسرے غیر قادیانی طلباء پر سختیاں شروع کر دیں گئیں۔

اب حالت یہ ہے کہ کالج کے مسلمان طلبا پر عرصہ حیات تنگ ہے اور قادیانی کھلے بندوں ہر طرح انہیں تنگ کرتے رہتے ہیں۔ مولانا حنان نے پروفیسر حاذق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جناب! یہ آپ کی ''رواداری'' ہی کا نتیجہ ہے کہ ایک اسلامی ادارے میں بھی مسلمان بچوں کو چین اور اطمینان کی سانس لینا نصیب نہیں۔ مولانا نے اور بہت سی نئی اور مفید باتیں جن سے قادیانی اخلاق اور کردار پر روشنی پڑتی تھی، سامعین کو بتائیں اور کوئی دس بجے شب کے لگ بھگ دعا پر تقریر ختم ہوئی۔

آخر میں صاحب صدر نے پروفیسر حاذق ہی کو معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کرنے کو کہا۔ حاذق صاحب نے اٹھتے ہی سب سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا جو مولانا ظفر علی خاں کی تقریر کے دوران ان کی مداخلت سے پیدا ہو گئی تھی۔ پھر آپ نے نہایت ہی باوقار اور دلکش انداز میں مولانا کے قوم پر احسانات اور ملت و وطن کے لیے بے بہا قربانیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اساتذہ، طلبا اور عہدے داران یونین کی طرف سے مولانا کا شکریہ ادا کیا۔ جس کے بعد نعرہ ہائے تکبیر اور ظفر علی خاں زندہ باد کے درمیان، صاحب صدر نے جلسہ برخاست کیا۔

وقارالملک ہال میں خطاب

24 نومبر (1934ء) یونین کے جلسہ کے اختتام پر ہی اعلان ہو چکا تھا کہ 25 نومبر کو دس بجے قبل از دوپہر ''وقارالملک'' ہال میں مولانا تقریر ارشاد فرمائیں گے۔اس تقریر سے قبل ''آفتاب ہاسٹل'' کے طلبا کی استدعا پر مولانا نے ناشتہ پر تشریف لانا منظور فرما لیا۔ ہاسٹل کے وارڈن جناب ظہیر احسن اور شریف چشتی صاحب انہیں ان کی قیام گاہ سے لاکر ہاسٹل کے مین گیٹ پر پہنچے تو ہاسٹل کے تقریباً تمام طلبا نے آگے بڑھ کر پرتپاک استقبال کیا۔طلبا مولانا کے ساتھ اور مولانا طلبا کے ساتھ اس طرح بے تکلف اور شیر وشکر نظر آرہے تھے کہ گویا وہ علی گڑھ سے کبھی گئے ہی نہ تھے۔مولانا حقّہ کے رسیا تھے،ناشتہ کے بعد جب چشتی صاحب نے مولانا کا یہ شعر پڑھا:

حقّہ پیتا ہوں تو اڑ جاتے ہیں سکھوں کے دھوئیں
خالصہ جی کی قضا میری کرامات سے ہے

تو حسن طلب کے انداز میں مولانا کے چہرے پر ایک دلآویز مسکراہٹ کھیل گئی۔ ہاسٹل کے مغربی ونگ میں ایک منجھے ہوئے ''حقّہ باز'' جناب غلام حسین کشمیری کے کمرے میں حقّہ تازہ کر کے مولانا کے سامنے رکھ دیا گیا۔ یہاں کوئی نصف گھنٹہ طلبا اور مولانا کی نشست رہی۔دس بجے کے قریب مولانا ''وقارالملک ہال'' تشریف لے گئے۔یہ ہال جوسیٹر یچی ہال کے بعد یونیورسٹی کے تمام ہالز میں سب سے بڑا ہال ہے، گیلریوں سمیت کھچا کچھ بھرا ہوا تھا۔محترم مہمان کا استقبال اسی احترام اور گرم جوشی سے ہوا جس کا مظاہرہ گزشتہ شب یونیورسٹی یونین میں ہو چکا تھا۔ یہاں بھی طلبا کے علاوہ بہت سے ممبران سٹاف اور معززین شہر موجود تھے۔اساتذہ میں پروفیسر محمود احمد صاحب، پروفیسر عمرالدین، پروفیسر عبدالمجید قریشی پرووسٹ ''سی'' ہال اور مولانا محمد عقیل پروفیسر دینیات قابل ذکر ہیں۔مسٹر جمیل احمد صدر ''سی'' ہال کے ایما پر ایک قاری طالب علم نے تلاوت کلام پاک سے جلسہ کی کارروائی کا افتتاح کیا۔ پروفیسر محمود احمد نے تعارفی کلمات ادا کیے۔اس کے بعد صاحب صدر کی استدعا پر مولانا نعرۂ ہائے تکبیر کی گونج اور پرزور تالیوں کے شور میں تقریر کے لیے اٹھے۔

آپ نے خطبۂ مسنونہ کے بعد جلسہ گاہ کے نام کی مناسبت سے نواب وقارالملک مرحوم کا ذکر خیر کیا۔پھر سرسید اور اپنے استاذ مولانا شبلی نعمانیؒ کی خدمات جلیلہ کی تفصیل بیان کی۔

اس ضمن میں آپ نے علی گڑھ کالج کے قیام اور مسلم یونیورسٹی کے بلند مقاصد کی طرف طلبا کی توجہ مبذول فرماتے ہوئے جلسہ میں موجود فرزندان اسلام کو وہ پیمان یاد دلایا جو تمام انسانوں کی روحوں نے روز الست اپنے پروردگار سے باندھا تھا۔ پھر فرمایا کہ مسلمان اور غلامی دو متضاد چیزیں ہیں۔ مسلمان نہ صرف خود آزاد رہنے کے لیے پیدا ہوا ہے بلکہ پوری نوع انسانی کو غیر اللہ کی غلامی اور بندگی سے نجات دلانے کا بھی پابند ہے۔ جس طرح اس کا رسول ﷺ رحمت للعالمین ہے، مسلمان بھی بنی نوع انسان کے لیے رحمت بن کر آیا ہے۔ ہندوستان مسلمان سے چھینا گیا ہے۔ اس کو آزاد کرانے کا فرض بھی سب سے بڑھ کر اسی پر عائد ہوتا ہے۔ تقریر اتنی مؤثر اور دل نشیں تھی کہ لوگ جھوم رہے تھے۔ آپ نے آخر میں طلباء سے ہاتھ اٹھوا کر حلف لیا کہ وہ رب کعبہ کے سوا کسی اور کے آگے اپنی گردن خم نہیں کریں گے اور حرمت رسول ﷺ پر کٹ مرنے کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھیں گے۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے دعائے خیر پر مولانا کی تقریر ختم ہوئی۔ مسٹر جواہر بخش سیکرٹری ''سی'' ہال یونین نے معزز مہمان کا شکریہ ادا کیا اور صاحب صدر نے جلسہ برخاست ہونے کا اعلان کیا۔

جامع مسجد علی گڑھ شہر کا عظیم الشان جلسہ

شہر کے مسلمانوں کو حضرت مولانا کے ارشادات سننے کا کچھ کم اشتیاق نہ تھا۔ ان کی تو کوشش یہ تھی کہ مولانا پہلے شہر تشریف لے چلیں، مگر طلبا کا جوش اور والہانہ عقیدت انہیں پہلے یونیورسٹی لے گئی اور مولانا کے نزدیک بھی طلبا کا حق فائق تھا۔ مولانا کے علی گڑھ وارد ہوتے ہی شہر اور یونیورسٹی میں یہ اعلان ہو چکا تھا کہ 25 نومبر کو بعد از نماز عشاء شہر کی جامع مسجد میں ان کی تقریر ہوگی۔ نماز عشاء تک کم وبیش دس ہزار شہری مسجد کے اندر اور باہر جمع ہو چکے تھے۔ 9 بجے شب کے بعد طلبا یونیورسٹی کی حدود سے باہر نہ جا سکتے تھے، نہ رہ سکتے تھے، بایں ہمہ جلسہ گاہ میں طلبا بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ مقامی قومی کارکن حافظ محمد عثمان نے اتنے بڑے جلسہ کو کامیاب کرنے کے لیے ان تھک محنت کی تھی۔ اسٹیج کے چاروں طرف یونیورسٹی کے طلبا کا حلقہ تھا اور سامنے مسجد کے باہر کھلے چوک میں تا حد نظر شہر کے ہر حصے سے آنے والے ہزاروں سامعین مولانا کی ایک جھلک دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کے لیے جمع تھے۔

جلسہ کی کارروائی تلاوت کلام پاک سے شروع ہوئی۔ ایک صاحب نے مولانا کی مشہور نعت ''وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں'' دل کش ترنم سے پڑھ کر سامعین کا ایمان تازہ کیا۔ حافظ عثمان نے لوگوں کے اصرار پر محمد شریف چشتی کی لکھی ہوئی استقبالی نظم جو یونیورسٹی یونین کے اجتماع میں پڑھی گئی تھی، عبدالرحیم صاحب ہی سے دوبارہ سنوائی۔ یہ نظم یہاں بھی بے حد مقبول ہوئی۔ نعت اور نظم کے بعد صدر جلسہ نے مولانا عبدالحنّان سے تقریر کی استدعا کی۔ مولانا حنّان نے حاضرین کو اہم مسائل حاضرہ سے آگاہ کیا اور ان مشکلات وخطرات کے مقابلے کے لیے تیاری کی تلقین کی جو ملک وملت کے دشمنان دین وملت کی طرف سے پیش آسکتے تھے۔

مولانا حنّان کی تقریر کے بعد مولانا ظفر علی خاں کا خطاب شروع ہوا جو یونیورسٹی یونین کے مقابلے میں زیادہ آزاد فضاء کے لیے بہت زیادہ مناسب اور موزوں تھا۔ خطبۂ مسنونہ کے بعد فرمایا کہ میں اگرچہ مدت مدید کے بعد علی گڑھ آیا ہوں۔ لیکن علی گڑھ کی سدا بہار یاد میرے دل میں ہمیشہ تازہ رہی ہے۔ تعلیم تو میں نے اسی یونیورسٹی میں پائی ہے مگر میں اس شہر کے کوچے کوچے سے واقف ہوں۔ اس شہر سے مجھے اتنی ہی محبت ہے جتنی آپ میں سے کسی کو ہوسکتی ہے۔ علی گڑھ کو جو شہرت اور اہمیت حاصل ہے، وہ صرف اور صرف مسلم یونیورسٹی کی رہین منت ہے۔ یونیورسٹی کی عزت ہی سے آپ کے شہر اور شہر کے مسلمانوں کی عزت، یونیورسٹی پر کوئی آنچ آئے تو اس سے آپ کی عزت پر بھی حرف آتا ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ یونیورسٹی کے معاملات میں گہری دلچسپی لیں۔ آپ حضرات ہر ممکن حد تک اس بات کا خیال رکھیں کہ یونیورسٹی کورٹ یا دیگر شعبہ جات میں کوئی ایسا قانون پاس یا لاگو نہ ہو جس سے اسلام اور مسلمانوں کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مفاد پر بھی کوئی زد پڑتی ہو۔

تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے آیۂ استخلاف پڑھ کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ایمان اور عمل صالح کی شرط پر خلافت عطا فرمانے کا حتمی وعدہ کیا ہے۔ اگر آج کا مسلمان قرون اولیٰ کے مسلمان کے نقش قدم پر چل نکلے تو اقتدار اور حکومت خود بخود اس کے قدموں میں آجائے۔ اس مرحلے پر طلبا کی طرف سے چٹیں آنا شروع ہوگئیں جن میں استدعا کی گئی تھی کہ قادیانیت کے خطرے سے شہر کے مسلمانوں کو بھی خبردار کیا جائے۔ مولانا نے فرمایا،

میں اس طرف بھی آ رہا ہوں۔

مولانا نے نہایت بھرپور انداز میں قادیانی دجل وفریب کا پردہ چاک کیا۔آپ نے فرمایا کہ یہ باطل پرست اور گمراہ طائفہ اسلام کا جامہ اوڑھ کر اسلام ہی کی بیخ کنی کرنے نکلا ہے۔ قادیانیوں کے عقیدے میں ہر وہ مسلمان جو حضور نبی اکرم ﷺ کی ختم نبوت پر ایمان رکھتا اور مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت پر ایمان نہیں لاتا، وہ ''حرام زادہ'' اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ایک طرف تو ان کی بدزبانی اور سفلہ پن کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف وہ مسلمانوں کے غم خوار بھی بنے پھرتے ہیں۔اسلام کا لیبل لگا کر کونسلوں اور اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے جا پہنچتے ہیں۔ان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ ہر اسلامی ادارے میں گھس کر قادیانیت کے جراثیم پھیلائیں اور تو اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی جو عصری علوم وفنون کا واحد ملک گیر ادارہ ہے، قادیانیوں کی نقب زنی سے نہیں بچ سکا، اس پر بھی اب ان کی کھلم کھلا یورش ہو رہی ہے۔یونیورسٹی کا طبیہ کالج ان کی کمین گاہ بن چکا ہے۔اس میں مسلمان طلبہ پر میرا ایک شعر لکھنے پر دس دس روپے جرمانہ کر دیا جاتا ہے۔اگر اس ستم ناروا پر مظلوم طالب علم فریاد کرے تو اس کی سزا یونیورسٹی سے اخراج ٹھہرتی ہے۔ میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا علی گڑھ یونیورسٹی، قادیانی یونیورسٹی ہے؟ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو اس قادیان نوازی کا کیا سبب ہے؟ بات صرف یہ ہے کہ سر ظفر اللہ قادیانی جس کو خود مسلمان کی بے حمیّتی نے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل تک پہنچا دیا ہے، مرکزی حکومت اور اس کی وساطت سے صوبائی حکومتوں پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ارباب یونیورسٹی اس خدشے میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ اگر ہم نے قادیانیوں کو لگام دی تو ظفر اللہ برہم ہو گا۔اس کی برہمی انگریز کو ناراض کر دے گی اور یونیورسٹی کو جو برائے نام گرانٹ ملتی ہے، وہ کہیں کم یا بند نہ ہو جائے۔اگر یونیورسٹی کے مسلمان طلباء کی متاع دین وایماں کو داؤ پر لگا کر ہی یونیورسٹی کامیابی سے چل سکتی ہے تو ایسی سوچ رکھنے والے اسلام اور مسلمان بچوں پر ظلم کر رہے ہیں اور بے حد تباہ کن راستے پر پڑ لیے ہیں۔

پھر آپ نے آنجہانی مرزا قادیانی کی اس دریدہ ذہنی کا ذکر کیا جو اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم کے باب میں روا رکھی ہے۔اس مرحلے پر مولانا نے ''زمیندار'' کے سنڈے ایڈیشن میں شائع شدہ وہ مکتوب مفتوح پڑھ کر سنایا جو آپ نے بزبان انگریزی ملک

معظم جارج پنجم اوران کی وساطت سے ساری مسیحی دنیا کے نام لکھا تھا۔اس پر ایک قادیانی بلبلا اٹھا۔وہ جمے ہوئے جلسہ کو درہم برہم کرنے کی نیت سے اٹھا تھا مگر مسلمانوں کے جوش وخروش نے اسے خاموش کر کے فوراً بٹھا دیا۔مرزا آنجہانی کی بدکلامی کا حال سن کر چاروں طرف سے لعنت ونفرین کے آوازے بلند ہونا شروع ہوگئے۔ آخر میں مولانا نے مندرجہ ذیل مفہوم کے دو ریزولیوشن پیش کیے جو اتفاق رائے سے منظور ہوئے۔

اوّل: مسلم یونیورسٹی کے سٹاف سے تمام قادیانیوں کو نکال دیا جائے اور قادیانی طلبا کو یونیورسٹی میں مرزائے قادیاں کی خرافات پھیلانے کی اجازت نہ دی جائے۔

دوم: یونیورسٹی کورٹ سے ظفراللہ خان قادیانی کو نکال دیا جائے۔اس لیے کہ وہ تمام مسلمانوں کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہے۔اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ''کافروں'' کی درسگاہ کے معاملات میں کسی قسم کا دخل دے سکے۔ان قراردادوں پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ سرسید مرحوم نے علی گڑھ کالج کے لیے انتہائی جانفشانی سے ملک کے قریے قریے میں جاکر چندہ جمع کیا تھا۔ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ یہ کالج مسلمانوں کے تمام فرقوں کا مرکزی کالج ہو اوران کے فرقہ وارانہ مناقشات مٹانے میں اہم رول ادا کر سکے۔سرسید نے اسی نقطہ نظر کی پیروی میں تمام فرقوں سے چندہ لیا تھا اور سب فرقوں نے بطیّب خاطر چندہ دیا تھا۔مرحوم کو چندہ اکھٹا کرنے میں خاص مہارت حاصل تھی۔ وہ امیر اور غریب ہر مسلمان تک پہنچے تھے۔ان دنوں علی گڑھ میں ایک طوائف چندر بھا گا رہتی تھی، اس نے جب دیکھا کہ سید موصوف ایک انتہائی نیک اور بلند قوی مقصد کے لیے چندہ جمع کررہے ہیں تو اس کا دل پسیجا اور اس نے بھی اس مد میں پانچ سو روپے کی (اس زمانے میں ایک خطیر) رقم پیش کردی۔ چونکہ مذکورہ طوائف نے یہ رقم بڑے خلوص اور دلی عقیدت سے دی تھی، چنانچہ سرسید اسے قبول کرنے سے انکار نہ کرسکے۔ موصوف نے اس رقم سے پکی بارک کے سامنے بیت الخلا تعمیر کروا دیئے۔ بخلاف اس کے مرزا قادیانی کا کردار ملاحظہ ہو کہ انہیں جب ایک طوائف نے ''تبلیغی مقاصد'' کے لیے ایک رقم دی تو اس رقم سے آپ نے اپنا دسترخوان سجا کر اپنی شکم پری کا سامان کرلیا۔

چونکہ سرسید کی زندگی میں مرزا قادیانی نے اپنے آپ کو رتبہ نبوت پر فائز نہیں کیا تھا اور اس وقت تک محض ''مناظر و مبلغ'' اسلام کی حیثیت سے متعارف تھے۔سرسید چندہ حاصل کرنے

کی امید میں ان کے پاس بھی گئے اور کہا کہ آپ جو اس درجہ اسلام کی حمایت کا دم بھرتے ہیں، علی گڑھ کالج کے لیے کچھ امداد دیجیے۔ مرزائے آنجہانی نے سرسید کو جو جواب دیا، وہ مسلمانوں کو آج تک نہیں بھولا۔ اس نے کہا کہ ''میں اس مقصد کے لیے ایک کوڑی دینا بھی حرام سمجھتا ہوں'' سرسید نے کہا کہ بھئی ایک پائی ہی دے دو کہ نام تو ہو جائے اور علی گڑھ کالج پر تمام مسلمانوں کا کالج ہونے کا اطلاق ہو سکے۔ لیکن آفریں باد کہ مرزا قادیانی نے ایک پھوٹی کوڑی تک بھی نہ دی اور کیوں دیتے وہ تو کچھ عرصہ بعد تمام مسلمانوں کو ''کافر اور حرام زادہ'' قرار دینے والے تھے۔ مولانا نے یہ واقعہ بیان کر کے فرمایا کہ جب یہ حقیقت ہے کہ قادیانیوں کے ''نبی'' نے کالج کے لیے ایک کوڑی تک بھی نہیں دی تو انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے سٹاف میں اسلام کا لبادہ اوڑھ کر داخل ہوں اور ہزاروں روپے جو غریب مسلمانوں کی جیب سے نکلتے ہیں، ماہوار تنخواہ کے طور پر ہتھیا لیا کریں۔ ظفر اللہ کو کیا حق کہ وہ اس یونیورسٹی کی کورٹ کی ممبری کا لطف اٹھائے۔ اس ضمن میں آپ نے طبیہ کالج کے قادیانی پرنسپل کی ستم آرائیوں کا تذکرہ بھی کیا اور بتایا کہ ظالم، مسلمان لڑکوں پر ظلم بھی ڈھاتا ہے۔ مگر ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی کرتا ہے کہ:

نہ اف کیجیے اور نہ بٹ کیجیے

اس پر ایک معمّر بزرگ نے اٹھ کر کہا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ڈاکٹر بٹ کا مقاطعہ کریں۔ ان کو بغرض مشورہ وطبی امداد ہرگز اپنے گھروں پر نہ بلائیں اور نہ ہی ان کی فارمیسی سے دوائیں خریدیں۔ اس وقت جلسہ میں بے حد جوش وخروش کا عالم تھا اور نعرہ ہائے تکبیر مسلسل بلند ہو رہے تھے۔ آخر میں آپ نے مسلمانوں کو اپنی تجارتی بنیادیں استوار کر کے اقتصادی حالت بہتر بنانے کی بھی پرزور تلقین کی اور یہ مشورہ دیا کہ روپے میں کم از کم بارہ آنے کا مال غیر مسلم کی بجائے مسلمان سے خریدا جائے۔ مقصد ہندو کا مقاطعہ نہیں بلکہ مسلمان کی مالی حالت سدھارنے کے لیے قلیل المیعار ترجیحی سلوک کی ایک صورت ہے، رات کے بارہ بجے دعا پر جلسہ ختم ہوا۔

آفتاب ہاسٹل میں پرامن جلسہ

24 نومبر کو یونیورسٹی یونین میں مولانا کے خطاب کے بعد اعلان ہو چکا تھا کہ 26 نومبر (1934ء) کو بعد نماز مغرب ''آفتاب مجلس'' کے زیر اہتمام آفتاب ہاسٹل میں بھی مولانا کا لیکچر ہوگا۔ یاد رہے کہ ''آفتاب مجلس'' یونیورسٹی یونین کے بعد طلبا کا سب سے بڑا منتخب ادارہ تھا جو

''آفتاب ہال'' میں شامل تمام ہاسٹلوں (میکڈانلڈ ہاسٹل، وی.ایم ہاسٹل، ماریسن کورٹ، محمود انیکسی، ڈیوٹی ہاسٹل وغیرہ) کے ڈیڑھ دو ہزار اقامتی طلبا کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس مجلس کا نائب صدر اور ارکان کابینہ ہر سال سرگرم انتخابی مہم کے ذریعے منتخب ہوا کرتے تھے۔ البتہ صدر، ہال کا پرووسٹ بلحاظ عہدہ (Ex-Officio) ہوتا تھا۔ ان دنوں آفتاب ہال کے پرووسٹ محترم پروفیسر محمد حبیب صاحب تھے۔ حبیب صاحب، مرنجان مرنج، خلیق، شفیق اور ملنسار قسم کے اساتذہ میں ممتاز تھے۔ ان کی تنخواہ کا خاصا بڑا حصہ نادار مگر ہونہار اور باکردار طلبا کی مدد کی نذر ہو جاتا تھا۔ طبعاً ہنگاموں سے دور رہتے اور طلبا کو بھی ہمیشہ سلامت روی کا پابند رکھنے اور دیکھنے کے قائل تھے۔ موصوف 24 نومبر کے یونیورسٹی یونین کے پرخروش جلسے اور 25 نومبر والے شہر کے اجتماع کا حال سن چکے تھے۔ ان دونوں اجتماعات نے یونیورسٹی کے قادیانی اساتذہ اور طلبا کو انگاروں پر لوٹا رکھا تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ یونیورسٹی حدود میں کوئی اور جلسہ نہ ہونے پائے۔ یہ لوگ مسٹر رامزے بوتھم پرووائس چانسلر اور حبیب صاحب کے پاس پہنچے۔ دونوں کے سامنے بات کا بتنگڑ بنایا گیا اور امن و امان کا واسطہ دے دونوں کو اتنا بھڑکایا گیا کہ حبیب صاحب نے بلحاظ صدر آفتاب مجلس، اس مجلس کے زیر اہتمام 26 نومبر کے جلسے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ موصوف کا مؤقف یہ تھا کہ قادیانی جو کچھ بھی ہیں، بہر حال اقلیت میں ہیں۔ ان کی دلآزاری نہیں ہونی چاہیے۔ آفتاب ہال کے مسلمان طلبا کا ایک نمائندہ وفد بھی حبیب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وفد کے ارکان نے ان پر واضح کیا کہ آپ جو دو اور صرف دو قادیانیوں (عبدالسلام اور عبدالمنان) کی دلآزاری پسند نہیں فرماتے، مجوزہ جلسہ روک کر آفتاب ہال کے ڈیڑھ دو ہزار مسلمان طلبا کی دل آزاری اور دل شکنی کیونکر گوارا کر سکیں گے؟ بڑی بحث و تمحیص اور ردّ و کد کے باوجود حبیب صاحب نے جلسہ کی اجازت نہ دی۔ اس انکار نے آفتاب ہال ہی نہیں یونیورسٹی کے طول و عرض میں خفگی اور بے چینی کی لہر دوڑا دی۔ ہر طرف سے اصرار تھا کہ جلسہ ضرور ہونا چاہیے۔ آفتاب مجلس کے منتخب نائب صدر سے مطالبہ کیا کہ طلباء نے بذریعہ ووٹ ان پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے، اس کو ٹھیس پہنچا کر مجلس کے وقار کو برباد نہ کریں۔

یونیورسٹی کے طلبا کی غالب اکثریت جو جلسہ منعقد کرانے پر تلی ہوئی تھی، آفتاب ہال کے مرکزی بورڈنگ ہاؤس ''آفتاب ہاسٹل'' کے وسیع دالان میں جمع ہو چکی تھی۔ طلبا کا تہیہ تھا کہ

اگر آفتاب مجلس کے ہال میں جلسہ کرنے کی اجازت کسی صورت بھی نہ ملی تو کھلے میدان ہی میں مولانا کی تقریر ضرور ہوگی۔ مولانا کو جب اس صورتحال سے آگاہ کیا گیا تو انہیں حبیب صاحب کے روّیہ پر افسوس ہوا۔ آپ چار بجے کے قریب آفتاب ہاسٹل تشریف لے آئے۔ طلباء نے آپ کا والہانہ استقبال کیا اور آپ کو آفتاب ہاسٹل کی بالائی منزل پر مسجد میں لے گئے جہاں کے اجتماع نے ہر رسمی تکلف کے بغیر جلسہ کی صورت اختیار کر لی۔

مولانا نے خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا کہ میں ایک بڑی لمبی مدت کے بعد اپنی شدید قسم کی مشکلات اور مصروفیات کے باوجود یہاں کے مسلمان طلبہ کے پیہم اصرار پر علی گڑھ آیا ہوں۔ جو لوگ یہ کہتے یا سمجھتے ہیں کہ میں مسلمان اور قادیانی طلبا کو آپس میں لڑانا چاہتا ہوں، مجھے غلط سمجھے ہیں اور میرے ساتھ شدید ناانصافی کر رہے ہیں۔ میں تو فقط یہ چاہتا ہوں کہ جو مسلمان طالب علم ملک کے دور دراز گوشوں سے اس قومی درس گاہ میں علم و دانش حاصل کرنے آتے ہیں، یہاں سے سرمایہ دین وایمان لٹا کر واپس نہ جائیں۔ مسلمانوں کی متاع دین وایمان کو یونیورسٹی کے اسلام دشمن عناصر سے جو خطرات درپیش ہیں، ان سے مسلم طلبا کو خبردار اور محفوظ کرنا صرف میرا ہی نہیں، خداوند ان یونیورسٹی کا بھی مقدس فرض ہے۔ یہ کیسی مسلم یونیورسٹی ہے جہاں قادیانیوں، کیمونسٹوں، ملحدوں اور انگریز کے خوشامدیوں کو تو کھلی چھٹی ہے کہ ہر طرح کا شر پھیلاتے پھریں مگر مسلم طلبا کو جو بلحاظ تعداد ننانوے (99) فیصد ہیں، خاموش تماشائی بنے رہنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ یہ کیسی ''رواداری'' ہے کہ ''ختم نبوت'' اور دوسرے متفقہ دینی معتقدات کو پامال کرنے کی کوشش کو دیکھ کر بھی مسلمان اساتذہ اور طلبا ٹس سے مس نہ ہوں۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے مولانا نے انگریز کی حکمت عملی، قادیانیت کی بنیاد، مرزائے قادیاں کی تعلیمات، قادیانیوں کے عقائد، اندرون اور بیرون ملک ان کی سازشوں، شعائر دین میں رخنہ اندازیوں اور طرح طرح کی فتنہ پردازیوں پر جب روشنی ڈالنی شروع کر دی تو نبی قادیان کے خلیفہ اوّل حکیم نورالدین آنجہانی کا بڑا صاحبزادہ عبدالسلام عمر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ مولانا! مرزا قادیانی نے کب اور کہاں مسلمانوں کو ''حرام زادہ'' کہا ہے، ثابت کیجئے۔ ہماری کتابوں سے حوالے پیش کیجئے، آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، غلط ہے، غلط ہے۔ ایک اور کٹر قادیانی ڈاکٹر ابراہیم نے بھی جو یونیورسٹی طبیہ کالج کے سٹاف کا ممبر تھا، اٹھ کر اسی قسم کی رخنہ اندازی کی۔ اس نے کہا کہ مولانا اگر اس جلسہ کا

کوئی صدر ہے تو اس کی اجازت سے میں بھی کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے جواب میں فرمایا کہ یہ تقریر مسجد میں کر رہا ہوں، اس جلسہ کے صدر رسول اللہ ہیں اور نائب صدر میں ہوں، جو کچھ کہہ رہا ہوں، درست ہے اور اس کے ثبوت میں بے شمار حوالے مرزا قادیانی کی کتابوں، رسالوں اور اشتہاروں سے دیئے جاسکتے ہیں۔ آپ لوگ بیٹھ جایئے، جلسہ کی کارروائی میں رخنہ نہ ڈالیں۔ مگر ان قادیانیوں کو کسی حوالے وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی وہ تو آئے ہی اس غرض سے تھے کہ جلسہ نہ ہونے دیں۔ عبدالسلام عمر ایک بار پھر تلملا کر کھڑا ہو گیا اور چلّانے لگا کہ ہم یہ جلسہ ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔ دائیں بائیں بیٹھے مسلمان طلبا نے اسے بٹھانے کی کوشش کی مگر جب اس نے اپنا شور وشغب جاری رکھا تو لوگ مشتعل ہو کر دونوں قادیانی شر پسندوں پر پل پڑے۔ مولانا درمیان میں حائل ہو گئے تا کہ ان پر تشدد نہ ہو، لیکن یہ دونوں باز نہ آئے۔ مولانا کی کوشش تھی کہ ان قادیانیوں کو اپنے پاس ذاتی حفاظت میں بٹھالیں اور جلسہ جاری رہے۔ لیکن عبدالسلام تن کر مولانا کے سامنے کھڑا ہو گیا اور طرح طرح کی ہفوات بکنے لگا۔ اگر مولانا اس کو مشتعل ہجوم سے بچا کر الگ نہ کر دیتے تو علی گڑھ کے ''سپین'' کو فتح کرنے کا داعیہ لے کر آنے والا یہ مرزائی ''طارق'' اس روز بری طرح پٹ گیا ہوتا۔ مآل کار دونوں قادیانی ''گھس بیٹھے'' جلسہ چھوڑ کر چلے گئے تو مولانا نے اپنی نامکمل تقریر پوری کی۔ عصر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ مولانا نے خود اذان دی۔ مولانا عبدالحنان کی اقتداء میں سب شرکائے جلسہ نے نماز عصر ادا کی اور سرشار قسم کی دعائے خیر کے بعد سوا پانچ بجے جلسہ ختم ہوا۔

فکر ونظر، علم و ہنر، دین و دانش اور شعر و ادب کی دنیا میں بلند مقام شخصیتوں سے آٹوگراف حاصل کرنے کا ''مرض'' عام ہے جو بیشتر پڑھے لکھے نوجوانوں اور کالج کے طلبا میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ بڑے لوگ چھوٹوں کے لیے کم آمیز بھی ہوتے ہیں اور دیریاب بھی۔ خود مولانا جو بین الاقوامی شہرت کے سیاسی قائد ہونے کے علاوہ ''ممتاز اولڈ بوائے'' بھی تھے، کم وبیش چالیس برس کے بعد علی گڑھ والوں کے ہاتھ لگے تھے۔ ان سے آٹوگراف لینے کا شوق حسن ذوق کی دلیل تھا۔ مولانا نے جن درجن بھر طلبا کو آٹوگراف سے نوازا، ان میں شریف چشتی صاحب بھی شامل تھے۔ جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو طلبا میں سے ایک صاحب نے مولانا کے استقبال میں لکھی اور پڑھی گئی مقبول نظم کے حوالے سے کہا کہ چشتی صاحب کی قومی اور ملّی نظمیں خوب ہوتی ہیں۔

مولانا نے ازراہ شفقت فرمایا کہ: ’’بھئی کچھ ہمیں بھی سناؤ‘‘ چشتی صاحب جو ابھی نومشن طالب عالم تھے، ایک شہنشاہ سخن، ارتجال گو اور قادر الکلام شاعر کی اس فرمائش پر کچھ سمٹے سکڑے تو آپ نے ازراہ حوصلہ افزائی فرمایا کیوں جی! سناتے کیوں نہیں؟ الامر فوق الادب! جناب شریف چشتی کو تعمیل کرنی پڑی۔ دو تین نظمیں سنائی گئیں جو پسند کی گئیں۔ آخری نظم کا مقطع تھا۔

کچھ حمیّت ہے تو اس داغ غلامی کو مٹا
ڈیڑھ سو سال سے ہے جو تیری پیشانی پر

ساری نظم خصوصاً مقطع میں خود مولانا کا رنگ جھلک رہا تھا، نظم مکمل ہو چکی تو فرمایا کہ آپ ایک شعر تو بھول ہی گئے۔ چشتی صاحب نے کہا ’’قبلہ وہ کیا؟ برجستہ فرمایا:

نسب حضرت عیسیٰ پر اچھالا کیچڑ
زد یہ خود پڑتی ہے مرزائیوں کی نانی پر

یہ شعر سن کر ساری محفل کشت زعفران بن گئی۔

حضرت علامہ اقبالؒ کو مسلمان طالب علم سے شکایت تھی کہ وہ ’’کتاب خواں‘‘ ہے مگر ’’صاحب کتاب نہیں‘‘ اور دعا تھی کہ: ’’خدا اسے کسی طوفان سے آشنا کر دے کہ اس کے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں‘‘ (بتصرف قلیل) مولانا کے پہلے دورہ علی گڑھ کے اثرات ونتائج کے بارے میں یونیورسٹی کے مختلف حلقوں کے اندازے مختلف ہو سکتے ہیں۔ کیمونسٹ، سوشلسٹ، انگریز نواز اور خصوصاً قادیانی حضرات اگر اس دورے کو ناکام قرار دیں تو کوئی تعجب ہو سکتا ہے نہ افسوس! لیکن دیکھنے والی آنکھوں نے جن پر تعصب کی کوئی پٹی نہیں بندھی، دیکھا کہ مولانا کے دورے سے علی گڑھ کے ساکن دریا میں موج در موج تلاطم کی کیفیت ہی نہیں ہوئی بلکہ ایک مثبت انقلاب فکر ونظر بھی پیدا ہوا۔ مولانا کی ایمان افروز تقریروں نے جہاں لادین عناصر کے حوصلے پست کیے، وہاں نام نہاد اسلام کا نقاب اوڑھ کر اسلام کی بیخ کنی کرنے والے ایک منظّم گروہ کے سارے منصوبے بھی خاک میں ملا دیئے۔ طلبا کی غالب اکثریت میں دین وملت کے لیے مرنے جینے کی تڑپ پیدا ہو گئی۔ یونیورسٹی کے اندر پرورش پانے والے تمام فتنوں کا بڑی حد تک استیصال ہو گیا۔ قلب ماہیت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو گی کہ مولانا کی تقاریر سننے اور حقائق سے آشنا ہونے کے بعد یونیورسٹی میں قادیانیت کا طلسم ٹوٹ گیا اور اس شان سے کہ جب کسی بحث وتمحیص

میں ایک نوجوان دوسرے کی کج بحثی سے پریشان ہوجاتا تو کج بحث کو خاموش کرنے کے لیے طنزاً کہتا کہ: ''تم انسان ہو یا قادیانی؟'' یا زیادہ بے تکلفی کے انداز میں ''ہٹ بے قادیانی کہیں کے'' اس سے بھی بڑھ کر یہ رنگ دیکھا کہ کسی مجلس میں شامل کوئی فرد جب اٹھ کر قضائے حاجت کے لیے بیت الخلا جانے لگتا تو یہ کہہ کر جاتا کہ میں ابھی آیا، ذرا قادیان تک ہو آؤں۔''

نام نہاد ''ترقی پسند'' کیمونسٹ اور سوشلسٹ عناصر جو شعر وادب کی راہ سے لادینی اور آوارہ خیالی پھیلانے کے عادی تھے، اس دن سے بے وقار ہوگئے جب ''سی'' ہال کے ایک مشاعرے میں ایک نوجوان نے جوش ملیح آبادی کی ایک پوچ کفریہ نظم (خدا کے ساتھ ہم کھیلے ہوئے ہیں) سن کر جوش صاحب کی ٹوپی اتار لی اور دوسرے نے ان کی چمک دار چندیا کی تواضع تڑاخ پٹاخ چپتوں سے کر دی۔ مولانا کے ایک مختصر سے دورے کے بعد یہ انقلاب جس قدر حیرت انگیز تھا، اتنا ہی حوصلہ افزا بھی۔ طلبائے یونیورسٹی کا رخ مجموعاً ماسکو، لندن، قادیان اور واردھا سے کعبہ کی طرف پھر گیا تھا اور جبیں خاک حرم سے آشنا ہوگئی تھی۔

مولانا کے دورے کے بعد قادیانی مفسدین کو یونیورسٹی، طبیہ کالج یا کسی اور ادارے میں کھلم کھلا شر پھیلانے کی آئندہ جرأت نہ ہوئی۔ انتہاء یہ ہے کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے جب وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن سر ظفراللہ خان کو کچھ عرصہ بعد، علی گڑھ بلانے کا پروگرام بنایا تو سارے انتظامات مکمل ہوچکنے کے باوجود عین ایک دن پہلے بذریعہ تار یہ دورہ منسوخ کر دیا۔ اسی طرح قادیان سے آنے والے نام نہاد مرزائی ''طارق'' نے اپنی کشتیاں بھی جلائیں مگر علی گڑھ کا ''سپین'' فتح کرسکنے کی بجائے خود ذلیل ہوا۔''

(عنایت اللہ نسیم سوہدری کی کتاب مولانا ظفر علی خاں اور ان کا عہد سے ماخوذ)

شاعری

حمدِ ربِ اکبر

پہنچتا ہے ہر اک میکش کے آگے دورِ جام اُس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لطف عام اُس کا

گواہی دے رہی ہے اُس کی یکتائی پہ ذات اُس کی
دُوئی کے نقش سب جھوٹے ہے سچا ایک نام اُس کا

نظام اپنا لیے پھرتا ہے کیا خورشیدِ نور افشاں
کروڑوں ایسی دنیاؤں کو شامل ہے نظام اُس کا

میں اُس کو کعبہ و بُت خانہ میں کیوں ڈھونڈنے نکلوں
مرے ٹوٹے ہوئے دل ہی کے اندر ہے مقام اُس کا

سراپا معصیت میں ہوں سراپا مغفرت وہ ہے
خطا کوشی روش میری، خطا پوشی ہے کام اُس کا

ہوئی ختم اُس کی حجت اس زمیں کے بسنے والوں پر
کہ پہنچایا ہے اُن سب تک محمد ﷺ نے کلام اُس کا

نہ جا اُس کے تحمل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اُس کی
ڈر اُس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اُس کا

نعت

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھیں تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھیں تو ہو

پھوٹا جو سینہ شب تار الست سے
اس نور اولیں کا اجالا تمھیں تو ہو

سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایت اولیٰ تمھیں تو ہو

جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمھیں تو ہو

جو ماسوا کی حد سے بھی آگے گزر گیا
اے رہ نورد جادہ اسریٰ تمھیں تو ہو

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاجدار یثرب و بطحا تمھیں تو ہو

دنیا میں رحمت دو جہاں اور کون ہے؟
جس کی نہیں نظیر وہ تنہا تمھیں تو ہو

پپتا سنائیں جا کے تمہارے سوا کسے
ہم بے کسانِ ہند کے ملجا تمھیں تو ہو

نعت

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دُنیا کے درباروں میں

گر ارض و سما کی محفل میں **لولاک لما** کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں، یہ نور نہ ہو سیاروں میں

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی، کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکان فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

رحمت کی گھٹائیں پھیل گئیں افلاک کے گنبد گنبد پر
وحدت کی تجلی کوند گئی آفاق کے سینا زاروں میں

جس مہ کدہ کی ایک بوند سے بھی لب کج کلہوں کے تر نہ ہوئے
ہیں آج بھی ہم بے مایہ گدا اُس مہ کدہ کے سرشاروں میں

ہم حق کے علم برداروں کا ہے اب بھی نرالا ٹھاٹھ وہی
بادل کی گرج تکبیروں میں، بجلی کی تڑپ تلواروں میں

حضور سرورِ کون و مکاں ﷺ کا جشن میلاد 12 ربیع الاوّل

آدم کی نسل پر ہوئی حجت خدا کی ختم
دنیا میں آج دین کی تکمیل ہو گئی

اپنا جواب آپ تھی جو آخری دلیل
افلاک پر حوالہ جبریل ہو گئی

بطحا میں رحمت دو جہاں ﷺ کا ہوا ظہور
منشاء کردگار کی تعمیل ہو گئی

آ کر محمد عربی ﷺ نے لگائی مہر
اللہ کے قبالہ کی تسجیل ہو گئی

دنیا کی محفلوں کے دیے سارے بجھ گئے
روشن جب اُس کی بزم کی قندیل ہو گئی

مرزائیوں کا نام ذرا دیر میں مٹا
حق کے جلال سے یہی اک ڈھیل ہو گئی

میلاد خواجہ دوسرا ﷺ کا ہے آج جشن
اور اس کی مہتمم مری تخئیل ہو گئی

کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

زکوٰۃ اچھی حج اچھا روزہ اچھا اور نماز اچھی
مگر میں باوجود ان کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

(زمیندار 26 مئی 1929ء)

خواجۂ ما محمد عربی ﷺ است
لقبش خاتم النّبیین است
مذہب قادیاں بہ کیش حجاز
در خور صد ہزار نفرین است

قادیاں کا تھیٹر

قولِ فیصل

ان تسخروا منا فانا نسخر منکم کما تسخرون o فسوف تعلمون من یاتیه عذاب یخزیه و یحل علیه عذاب مقیم o (ھود 38،39)

ترجمہ: اگر تم ہمارا مضحکہ اڑاتے ہو تو ہم تمہاری ہی تضحیک تم پر لوٹ دیتے ہیں۔ تمہیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ رسوا کرنے والا اور ہمیشہ قائم رہنے والا عذاب کس پر نازل ہوتا ہے تم پر یا ہم پر۔

اے طبع رسا آج ترا رنگ جما دوں
اور شوخی تحریر کا اعجاز دکھا دوں

پہلے سبق حق تجھے قرآں سے پڑھا دوں
تنہا تجھے پھر لشکر باطل سے لڑا دوں

مسلم ہوں میں، طاقت ہے یہ میرے سراپا میں
رستہ میں ہمالہ ہو تو ٹھوکر سے ہٹا دوں

اسلام کی محفل میں اگر کفر ہو داخل
رستہ اُسے دروازہ کا انگلی سے بتا دوں

خاطر میں نہ لائے اس اشارے کو اگر وہ
میں کان پکڑ کر اُسے مجلس سے اٹھا دوں

اس پر بھی وہ اکڑے تو اڑنگے ہی پہ لا کر
دوں پٹخنی ایسی کہ ثریا ہی دکھا دوں

ہے جن کو محمدﷺ کی مساوات کا دعویٰ
مثواهُ جهنم کی وعید اُن کو سنا دوں

میں قائل الہام تو وہ مائل ایہام
کوثر میں پیوں آبِ حمیم اُن کو پلا دوں

اکملت لکم پڑھ کے زبان عربی میں
ظلی و بروزی کی نبوت کو مٹا دوں

کچھ فرق بروز اور تناسخ میں نہیں ہے
انکار ہو جن کو انہیں اقرار کرا دوں

جن کو نہ ہو کچھ پاس پیمبرﷺ کے ادب کا
چُن چُن کر میں اُس قوم کو مٹی میں ملا دوں

اسلام سے جس قوم کو ہے کچھ بھی محبت
میں اُس کے لیے راہ میں آنکھوں کو بچھا دوں

غصہ اگر آئے اُسے، آ جائے مجھے پیار
دُشنام وہ دے مجھ کو تو میں اُس کو دعا دوں

لیکن جنہیں اسلام کی تضحیک ہے منظور
کس طرح میں اُس قوم کی باتوں کو بھلا دوں

پھر کس لیے دریائے معانی نہ رواں ہو؟
جس میں انہیں مثل خس و خاشاک بہا دوں

انگشت شہادت ہے قضا لات و ہبل کی
منہ کے بل انہیں ایک اشارے سے گرا دوں

(یکم نومبر 1917ء)

اسرارِ دربارقادیاں

خدا شرمائے اس ظالم ثناءاللہ کو جس نے
نہ چھوڑا قبر میں بھی قادیانیت کے بانی کو

خدا نے عقد خود باندھا تھا جس کا اپنے باوا 1؎ سے
اُڑا کر لے گئے غیر اُس عروس آسمانی 2؎ کو

نشاط افروزیاں رود بیاس اور اُس کے ساحل کی
دو بالا آئے دن کرتی ہیں لطف زندگانی کو

دبستانوں میں درس مشیٔ فی النوم آج ملتا ہے
شبستانوں میں دہراتے ہیں اس رنگیں کہانی کو

’’وفاداری بشرط اُستواری اصل ایماں ہے‘‘
مرے گر کعبہ میں لندن میں گاڑو قادیانی کو

مری تخیل کی جولانیاں بھی دیکھتے جانا
اگر دیکھا تو کیا دیکھا سمندر کی روانی کو

(مدراس 15 جولائی 1931ء)

....

1- **انا منک وانت منی بمنزلة اولادی:** آنجہانی مرزا قادیانی کا الہام

2- محمدی بیگم جس کے متعلق مرزا قادیانی نے کہا تھا کہ میرا اس سے آسمان پر نکاح ہو چکا ہے۔

مینارۂ قادیاں

شایگاں گنجے کہ عمرِ رایگاں را حاصل است
قطرۂ خونِ امید استے کہ بہ نگاہش دل است

درحق ما ہر چہ گوید ازرہِ طعن ''انقلاب''
باطل اندر باطل اندر باطل اندر باطل است

....

دیدۂ مینارۂ برسر زمینِ قادیاں
آنکہ بنیادش زخشتِ اولینِ بابل است

باش نابینی کہ خاکش دوجہاں برباد رفت
قادیاں دنیائے سفلی ہست و خاکش سافل است

(20دسمبر1931ء)

الوہیت کا شعلہ اور نبوت کا دھواں

خامہ پر حمد میں جس وقت رواں ہوتا ہے
بال جبریلؑ کی جنبش کا گماں ہوتا ہے

جس نے ناموس پیمبرﷺ پہ کیا جاں کو نثار
اُس کی عزت کا خدا خود نگراں ہوتا ہے

کہہ دو جا کر یہ غریبوں سے کہ مایوس نہ ہوں
بے زبانوں کی خدا آپ زباں ہوتا ہے

قادیاں ہو کہ ہو لاہور بچو دونوں سے
اس طرف ہوتی ہے ایں اُس طرف آں ہوتا ہے

شعلہ اُٹھتا ہے اگر اُس سے الوہیت کا
تو بلند اس سے نبوت کا دھواں ہوتا ہے

ہیں خدا اُن کے نصاریٰ، یہ ہیں اُن کے بندے
وہیں ہوتے ہیں یہ انگریز جہاں ہوتا ہے

میرے اشعار پلٹ دیتے ہیں کایا دل کی
ان میں جب صرف مرا زور بیاں ہوتا ہے

(رنگون 26 اکتوبر 1933ء)

مرزا قادیانی کی بھے

سرور کونین ﷺ کے دربار سے
رات آیا قاصدِ فرخندہ پے

حجت حق کا سراپا تھا یہ پیک
مرحلے سارے کیے تھے جس نے طے

سن کے ذکرِ قادیاں کہنے لگا
یہ خرافات مغعن تا بکے

پڑ نہیں سکتی اب اس طبلہ پہ تھاپ
ٹوٹ جانے کو ہے یہ باطل کی نے

اُن گویوں کے گلے پڑ جائیں گے
وجد میں چرچل کو لائی جن کی لے

جب سنی میں نے یہ جاں پرور نوید
میں پکار اُٹھا ''غلام احمد کی بھَے''

(15فروری1934ء)

وہ بھاگتے ہیں اس طرح مباہلہ کے نام سے

وہ بھاگتے ہیں اس طرح مباہلہ کے نام سے
فرار کفر جس طرح ہو مسجد الحرام سے

پکار کر یہ کہہ رہا ہے زلزلہ بہار کا
نہ بچ سکے گا قادیاں خدا کے انتقام سے

مسیلمہ کے جانشیں گرہ کٹوں سے کم نہیں
کتر کے جیب لے گئے پیمبری کے نام سے

سنا بھی تو نے ہم نفس کہ مادیاں دمشق کی
ہوئی ہے جفت اندلس کے خنگ بدلگام سے

پٹی پٹی کے دوش پر سری نگر میں اُٹھ گیا
جناب ''ٹل مسیح'' کا جنازہ دھوم دھام سے

میں قادیاں سے کیا لڑوں کہ فرصت آج کل نہیں
رکوع سے سجود سے قعود سے قیام سے

(21فروری1934ء)

اطالوی حسینہ [1]

اے کشور اطالیہ کے باغ کی بہار
لاہور کا دمن ہے ترے فیض سے چمن
پیغمبر جمال تری دل رُبا ادا
پروردگار عشق ترا چُلبلا چلن
اُلجھے ہوئے ہیں دل تری زلف سیاہ میں
ہیں جس کے ایک تار سے وابستہ سوختن
پروردہ فسوں ہے تری آنکھ کا خمار
آوردہ جنوں ہے تری بوئے پیرہن
پیمانہ نشاط تری ساقِ صندلی
بیعانہ سرور ترا مرمری بدن
رونق ہے ہوٹلوں کی ترا حسن بے حجاب
جس پر فدا ہے شیخ تو لٹو ہے برہمن
جب قادیاں پہ تیری نشیلی نظر پڑی
سب نشہ، نبوتِ ظلی ہوا ہرن
میں بھی ہوں تیری چشم پُر افسوں کا معترف
جادو وہی ہے آج جو ہو قادیاں شکن

(8 مارچ 1934ء لاہور)

[1] ہوٹل سیسل کی ایک حسین و جمیل اطالوی منتظمہ جو ہوٹل میں قادیانی خلیفہ مرزا محمود کے ایک روزہ قیام کے بعد اچانک غائب ہوگئی اور دوسرے دن قادیان کی سرزمین میں دیکھی گئی۔

ہوٹل سیسل کی رونق عُریاں

عشاقِ شہر کا ہے ''زمیندار'' سے سوال
ہوٹل سیسل کی رونق عریاں کہاں گئی

اس کے جلو میں جاں گئی ایماں کے ساتھ ساتھ
کیا کیا نہ تھا جو لے کے وہ جان جہاں گئی

خوف خدائے پاک دلوں سے نکل گیا
آنکھوں سے شرمِ سرور کون و مکاںﷺ گئی

بن کر خروش حلقہ، رندان لم یزل
لے کر گئی وہ حشر کا ساماں جہاں گئی

رومہ سے ڈھل کے برق کے سانچے میں آئی تھی
اب کس حریم ناز میں وہ جان جاں گئی

یہ چیستاں سنی تو ''زمیندار'' نے کہا
اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ قادیاں گئی

(15مارچ1934ء)

اطالوی حسینہ مس روفو

تمہیں مشی فی النوم کی بھی خبر ہے
زمانے کے اے بے خبر فیلسوفو

ملے گا تمہیں یہ سبق قادیاں سے
جہاں چل کے سوتے میں آئی ہیں روفو

دبستاں میں جانا نہیں چاہتے ہو
تو پہنچو شبستاں میں اے بے وقوفو

بہار آ رہی ہے خزاں جا رہی ہے
ہنسو کھل کھلا کر دمشقی شگوفو

کرشن اور خورسند کیا اس کو سمجھیں
تمہیں داد دو اس کی عبدالرؤفو

جب اوقات موجود ہے قادیاں کی
کہاں مر رہی ہو تفو اور زوفو!

(13 مارچ 1934ء)

کرشن سے مراد مہاشے کرشن ایڈیٹر روزنامہ ''پرتاب'' لاہور اور خورسند سے لالہ خوشحال چند ایڈیٹر ''ملاپ'' لاہور ہیں۔ عبدالرؤفو سے مراد مسلمان۔ (نظیر)

حُسن آباد بیاس

آئی ہیں جب سے موٹریں رسم حجاب اٹھ گئی
اب نہ وہ پردہ والیاں اور نہ وہ ان کی ڈولیاں

شرع کی قید ہے کدھر آنکھ کی شرم ہے کہاں
بول رہی ہیں بلبلیں کن چمنوں کی بولیاں

رنگ ہے بُو نہیں مگر گل کدۂ فرنگ میں
جس سے ہماری مالنیں لائی ہیں بھر کے جھولیاں

جلوہ گہ بیاس کو لگ گئے چار چار چاند
بھیج رہا ہے قادیاں ماہ وشوں کی ٹولیاں

دل زدگان بے بصر جن سے لگا رہے ہیں دل
حور کی بچیاں نہیں، سانپ کی ہیں سنپولیاں

آپ کو کچھ خبر بھی ہے کہ کون ہیں یہ گورنسیں
دیکھنے کو ہیں رس بھری چکھنے میں ہیں نبولیاں

اُن کو بھی منہ بسور کر آج یہ ماننا پڑا
ہیں یہ اطالوی مِسیں زہر کی میٹھی گولیاں

(18مارچ1934ء)

متنبّی قادیاں کا ترانہ

مل گئے ہیں مجھے کچھ عقل کے اندھے ایسے
جن کی دولت سے مرا کیسہ زر انباشتہ ہے

دین کے پردے میں دنیا کو چھپایا میں نے
کہ اسی پردے میں اچھی یہ مری داشتہ ہے

لیکن اس دین کی ہے یہ شرطِ کہ خوش ہو انگریز
جس کا اقبال جہاں میں علم افراشتہ ہے

کھا رہا ہوں غم بے مہری آقائے فرنگ
سترہ سال سے یہ غم ہی مرا ناشتہ ہے

سوکھ جائے نہ کہیں میری نبوت کا درخت
یہ وہ پودا ہے جو سرکار کا خود کاشتہ ہے

قادیانی بگھوڑا

پکڑ فولاد سے بھی ہے مری سخت
میرا سینہ ہے چکلا اور چوڑا

غلام احمد مرا لوہا گیا مان
اٹھایا میں نے جب دیں کا ہتھوڑا

ہر اک میداں سے بھاگے قادیانی
کہ ان کا پیشوا بھی تھا بھگوڑا

بشیر الدین کا ٹٹو تھا مریل
لگے چابک نہ لیکن پھر بھی دوڑا

اگر منہ زور ہے باطل کا گھوڑا
تو میرے پاس بھی ہے حق کا کوڑا

نبوت لنگڑی اور اندھی خدائی
ملا ہے خوب ان دونوں کا جوڑا

یہی اس کی نبوت کی ہے پہچان
کہ مر کر بھی نہ منہ لندن سے موڑا

(رنگون۔یکم ستمبر 1936ء)

ٹیچی ٹیچی

نبوت مجھے بخشی انگریز نے
یہ پودا اسی کا ہے خود کاشتہ

پلومر 1 کی بھٹی سلامت رہے
ہے جس کی صبوحی مرا ناشتہ

کنھیا بھی ہوں اور مہدی بھی ہوں
ہے دونوں کی عزت مری داشتہ

دکھائے نہ توحید آنکھیں مجھے
کہ تثلیث ہے پرچم افراشتہ

یہ ہے ٹیچی ٹیچی 2 کی بر وقت پچ
جو ہے مری تھیلی زر انباشتہ

(رنگون۔5 ستمبر 1936ء)

---

1 ای پلومر۔ مال روڈ لاہور کی مشہور دکان جہاں ادویہ کے علاوہ اعلیٰ درجے کی غیر ملکی شرابیں فروخت ہوتی تھیں۔ آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی اور مرزا بشیر الدین محمود مدت العمر تک اس دکان سے شراب خریدتے رہے ہیں۔ شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

2 جھوٹے مدعی نبوت آنجہانی مرزا قادیانی کا فرشتہ خاص جو خاص مواقع پر آسمانِ قادیاں سے اتر کر اس کی جیب روپوں اور نوٹوں سے بھر دیا کرتا تھا۔

تابوت قادیاں میں آخری میخ

نبی ﷺ کی شرم نہ ہو خوف لا الٰہ نہ ہو
ہوس نہ جس کی ہو ایسا کوئی گناہ نہ ہو

اگر چھنے بھی تو گاڑھی چھنے یہود کے ساتھ
نہ ہو تو شرع نبی ﷺ ہی سے رسم و راہ نہ ہو

امان ہو وہی بخشے کلیسیا جس کو
پناہ ہو وہی کعبہ کی جو پناہ نہ ہو

نجات سے رہے محروم تا بہ شام ابد
وہ بد گہر جو نصاریٰ کا خیر خواہ نہ ہو

شراب آئے تو تثلیث کے خمستاں سے
نہ ہو تو بادہ توحید ہی کی چاہ نہ ہو

ٹیچی کی چُٹ پہ جو بارش ہو نقرہ زر کی
تو پھر خزانہ قاروں پہ بھی نگاہ نہ ہو

سواد عرش سے اترے محمدی بیگم
قیامت آئے اگر اس دلہن سے بیاہ نہ ہو

خدا کہے کہ **انا منک ایھا المرزا**
تو لنگ ہو وہ زباں جس پہ واہ واہ نہ ہو

کرے جو بعد میں مِنّی اصرار **انت مِنّی** پر
تو قدسیوں کو بھی یارائے اشتباہ نہ ہو

نہ لطف بیٹھ کے بجرے میں دے بیاس کی سیر
اگر بغل میں کوئی ماہِ نیم ماہ نہ ہو

غرض صحیفۂ اعمال پر پڑے جو نظر
نہ کوئی گوشہ بھی ایسا ہو جو سیاہ نہ ہو

جب اس میں جمع ہیں یہ سب جہنمی صفتیں
غضب ہے پھر بھی اگر قادیاں تباہ نہ ہو

(4 اگست 1937ء)

قادیاں کی مادیاں

پناہ اللہ کی مرزائیوں کے پیشواؤں سے
امام ان کا ہے گھڑ کترا، نبی ان کا لٹیرا ہے

وہ افعی بانبیاں ضحاک کے شانوں میں تھیں جن کے
بروز اس عہد میں ان کا غلام احمد سپیرا ہے

ہوئی ہے قادیاں کی مادیاں کی پرورش جس میں
بشیر الدین محمود اس طویلے کا بچھیرا ہے

مخالف لیگ کے تھے جس قدر اب وہ بھی کہتے ہیں
اگر تیری طلب صادق ہے پاکستان تیرا ہے

وہ نوزائیدہ دولت نام پاکستان ہے جس کا
فضائے ہند میں لہرا رہا اس کا پھریرا ہے

(لاہور 2 مارچ 1945ء)

کشمیر کمیٹی

باطل کا جنازہ تھا بڑی دھوم سے نکلا
قائم ہوئی جس دن نئی کشمیر کمیٹی

نابود ہوئے اندلسی اور دمشقی
دونوں نے بساط اپنی نحوست کی لپیٹی

مرزا کی نبوت کے لیے کھودی گئی قبر
گاڑی گئی جس میں یہ خرافات کی بیٹی

(9اگست1933ء)

مداری کی پٹاری

قسم ہے قادیاں کے گل رخوں کی گل عذاری کی
غلام احمد کی الماری پٹاری ہے مداری کی

پرستان کو نہ شرمائے بھلا قصر خلافت کیوں
کہ فصل گل ہے اور آمد ہے ابر نو بہاری کی

بشیرالدین اور کشمیر کی ہمدردیاں چھوڑے
نظر نخچیر سے تم پھیرتے ہو اک شکاری کی

جواب ''الفضل'' کا ترکی بہ ترکی دے تو دیں ہم بھی
اتاریں کیسے لیکن نقل اصواتِ حماری کی

مرے ہر شعر کی زد کاسہ سر پر ہی پڑتی ہے
نہ لائے گا کبھی محمود تاب اس ضرب کاری کی

یہ مانا بھول جائے قادیاں میرے تحائف کو
مگر کیا بھول سکتا ہے وہ سوغاتیں بخاری کی؟

(15اکتوبر1932ء)

قادیان کی نبوت

بروزی ہے نبوت قادیاں کی
برازی ہے خلافت قادیاں کی

عداوت حق سے، باطل سے محبت
ہے اتنی ہی حقیقت قادیاں کی

ہیں احمق جس قدر ہندوستاں میں
ہے آباد ان سے جنت قادیاں کی

نصاریٰ کی پرستش کے سب اسرار
سکھاتی ہے شریعت قادیاں کی

دمشق اور اندلس کے بھاگ جاگے [1]
بٹی جس وقت لعنت قادیاں کی

مسلمانوں کی آزادی ہو نابود
الم نشرح ہے نیت قادیاں کی

لگے رونے بشیرالدین محمود
بنائی میں نے وہ گت قادیاں کی

1- تاریخی قصہ خلافت کے حوالے سے مرزا قادیانی کے مرنے کے بعد لاہوری اور قادیانی گروہوں کی طرف اشارہ ہے۔

متنبیّ کی الماری

اے کہ ہے اپنی رواداری پہ تجھ کو فخر و ناز
قادیاں میں کافروں کی مومن آزاری بھی دیکھ

خواجہ اجمیر کی درگاہ دیکھ آیا ہے تو
اب بہشتی مقبرہ کی چار دیواری بھی دیکھ

ترمذی کو اور بخاری کو رٹا تو کیا ہوا
قادیاں جا اور غلام احمد کی الماری بھی دیکھ

تو نے اپنی فوج کی دیکھی قواعد مدتوں
اب نصاریٰ کے رضاکاروں کی تیاری بھی دیکھ

کاٹنا مقصود ہے جس سے شجر اسلام کا
قادیاں کے لندنی ہاتھوں میں وہ آری بھی دیکھ

مشی فی النوم اور اس کے فلسفہ پر کر نظر
قادیاں کے نازنینوں کی طرحداری بھی دیکھ

سن لے اپنے کان سے ''الفضل'' کی گالی گلوچ
لکھنو شرما گیا جس سے وہ بھٹیاری بھی دیکھ

آج آتا ہے نظر گر تجھ کو باطل سر بلند
اپنی آنکھوں سے کل اس کی ذلت و خواری بھی دیکھ

فتنۂ آخر زماں

اے قادیاں، اے قادیاں تیرے بڑے لنگور کو
لپٹا لیا کرتا ہے جو ہر شب نئی اک حور کو

جس نے ہنسایا ناچ کر کشمیر اور میسور کو
جس کی ترش روئی ملی نیبو کو اور اچور کو

لکھوں دمشقی گورخر یا اندلس کی مادیاں
اے قادیاں اے قادیاں اے فتنہ آخر زماں

پیسہ ترا ایمان ہے، گالی تری پہچان ہے
جنس نفاق و کفر سے چمکی تری دکان ہے

بہتاں خدا پر باندھنا تیرے نبی کی شان ہے
الہام جو بھی ہے ترا آوردہ شیطان ہے

یہ بھی خدا کا آخری اسلام پر احسان ہے
نقاش کی مٹھی میں گر پوشیدہ تیری جان ہے

اے قادیاں اے قادیاں اے دشمن اسلامیاں
اے فتنۂ آخر زماں

اپنا اپنا مقدر

قادیان پہلے تو پاپا کا بڑا بھائی بنا
پھر وہ انگریزوں کے گھر کا معتبر نائی بنا

مذہبی صرافے میں نرخ اس کا گرتا ہی گیا
پیسے سے دھیلا ہوا اور دھیلے سے پائی بنا

دیکھ لو جا کر بہشتی مقبرے والوں کا حال
کوئی بھتنا ہوگیا، کوئی پچھل پائی بنا

شرک ان پچکے ہوئے گالوں کا پوڈر ہوگیا
کفر کی اکڑی ہوئی گردن کی نکٹائی بنا

اک نیا کذاب جب پیدا ہوا پنجاب میں
قادیاں اس طفل ناہموار کی دائی بنا

اپنا اپنا ہے مقدر، اپنا اپنا ہے نصیب
ہو گیا کوئی مسلمان، کوئی مرزائی بنا

منکر ختم نبوت کا انجام

قادیانیت پہ کر سکتا ہے وہی انتقاد
منقل جاں میں ہے جس کی شعلہ زن جوش جہاد

جو رہا ہے عمر بھر زندانی زلف فرنگ
جس کو انگریزوں نے دی رہ رہ کے اس جذبے کی داد

جو رسول اللہ ﷺ کے ناموس پر قرباں ہوا
نامرادی میں بھی جو ثابت ہوا بامراد

جانتا ہے جو غلام احمد کی الماری کا بھید
پرزے پرزے کردیا مرزا کا جس نے اجتہاد

جان سکتا ہے وہی مرزائیوں کی عاقبت
جس کے ہے پیش نظر حشر ثمود انجام عاد

منکر ختم نبوت کے مقدر میں ہے درج
ذلت و خواری و رسوائی **الی یوم التناد**

خدا کی پناہ

نبی(ﷺ) کے بعد نبوت کا ادعا ہو جسے
ہر ایسے بطل خرافات سے خدا کی پناہ

ٹیچی ٹیچی ہے ادھر اور ادھر غلام احمد
ہزار بار ان آفات سے خدا کی پناہ

خدا بچائے ہمیں ان کے ساتھ ملنے سے
منافقوں کی موالات سے خدا کی پناہ

جو بن کے بوعلی آئے حکیم نور الدین
تو بوعلی کی اشارات سے خدا کی پناہ

کسی خدا کا تو قائل ہے قادیاں بھی ضرور
جو مانگتا ہے فکاہات سے خدا کی پناہ

بنے جو باپ خدا کا اور اس کی بیوی بھی
ہر ایسے مسخرے کی ذات سے خدا کی پناہ

ان ابلہانہ حکایات پر نبی ﷺ کی سنوار
ان احمقانہ روایات سے خدا کی پناہ

قادیاں لندن میں

عناد اور بغض کی تصویر بن کر
گئے لندن بشیر الدین محمود

یہ مقصد آپ کا ہے اس سفر سے
کہ سرحد پر بچھا دی جائے بارود

دکھائے یورپ آ کر اس کو بتی
جہنم کی لپٹ جس میں ہو موجود

یہ ساری سرزمیں پھر بھک سے اڑ جائے
اور افغانوں کی جمعیت ہو نابود

کوئی اس دین کے دشمن کو سمجھائے
کہ ساری کوششیں تیری ہیں بے سود

بھلا برطانیہ کو کیا پڑی ہے
کہ دوزخ میں تری خاطر پڑے کود

ہے تو بھی کیا کسی کرنل کی میم
بھگا کر لے گئے ہوں جس کو مسعود

(1925ء)

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

اگر چندے کی حاجت ہے تو کر دعویٰ رسالت کا
بغیر اس ڈھونگ کے چندہ مہیا ہو نہیں سکتا

سنا ہے قادیاں میں بانسری بجتی ہے گوکل کی
مگر ہر بانسری والا کنہیا ہو نہیں سکتا

مجدد الف ثانیؒ سے غلام احمد کو کیا نسبت
ثریٰ کتنا بھی اونچا ہو ثریا ہو نہیں سکتا

اگر مکہ سے بھی کرتا وہ ڈھیچوں ڈھیچوں ہو آئے
یہ ظاہر ہے خر عیسیٰ گویّا ہو نہیں سکتا

برادر خواندگی کی شرط اگر ہو مرزائیت
قیامت تک بھی ہم سے یہ تو بھیا ہو نہیں سکتا

سرشتِ مردِ مومن کا بدلنا غیر ممکن ہے
چنبیلی کا یہ پودا بھٹ کٹیا ہو نہیں سکتا

جسے اسلام کی عزت پہ کٹ مرنا نہ آتا ہو
مسلمانوں کے بیڑے کا کھویا ہو نہیں سکتا

(27مارچ1934ء)

ارمغانِ قادیاں

تم کو گر منظور ہے سیرِ جہانِ قادیاں
اے مسلمانو! خریدو ''ارمغانِ قادیاں''

جی کو بہلاؤ گے کیونکر گر نہ لو گے یہ کتاب
کیونکہ مٹ جانے کو ہے نام و نشانِ قادیاں

اس بجھارت کو نہ بوجھا آج تک کوئی ادیب
میں نے ہی آخر کو حل کی چیستانِ قادیاں

میرے ہی خامے کی رنگینی تھی جس کے فیض سے
ہو گئی سننے کے قابل داستانِ قادیاں

میں نے دی اس کو لگام اور ہو گیا اس پر سوار
ورنہ کس کو مانتی تھی مادیانِ قادیاں

کس طرح ممکن ہے، دل پر ہو کسی کو اختیار
جب ہوں دل کے چھیننے والے بتانِ قادیاں

مجھ سے پوچھو، کیوں فدا ہے قادیاں کشمیر پر
مجھ سے بڑھ کر کون ہو گا رازدانِ قادیاں

جو مجاور ہیں بہشتی مقبرے کے آج کل
بیچتے پھرتے ہیں گھر گھر استخوانِ قادیاں

صرف غائب نحو عنقا اور سلاست ناپدید
ان سب اجزا سے مرکب ہے زبانِ قادیاں

''اک برہنہ سے نہ یہ ہو گا کہ تا باندھے ازار''
یہ کہ ''تا'' ہے شاہکار شاعرانِ قادیاں

لوگ حیراں تھے کہ جب پھیکا ہے پکوان اس قدر
ہو گئی پھر اتنی اونچی کیوں دکانِ قادیاں

جو فروشی کے لیے گندم نمائی شرط تھی
تھا بڑا ہی کائیاں بازارگانِ قادیاں

کیا سلوک ان سے روا رکھتے ہیں منکر اور نکیر
قبر میں خود دیکھ لیں گے منکرانِ قادیاں

(لاہور۔11اپریل1934ء)

خنجر قادیاں

’’حاجی محمد حسین سر عسکر رضا کاران اسلام بٹالہ ضلع گورداسپور ایک مخلص اور پر جوش مسلمان نوجوان تھے جنہیں 23 اپریل 1930ء کو ایک قادیانی محمد علی نے خنجر مار کر شہید کر دیا۔ موسیو مرزا بشیر الدین محمود نے قاتل کو غازی کا خطاب دیا۔ مسلمان، پریوی کونسل تک اس کے لیے لڑے۔ آخر قاتل کیفر کردار کو پہنچا اور پھانسی پر لٹکایا گیا۔ مرزا محمود نے اس کے جنازے کو کندھا دیا، اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اسے ’’بہشتی مقبرہ‘‘ 1 میں دفنایا۔ نظم اسی واقعے کی یادگار ہے۔‘‘

شہیدوں کا خوں رنگ لایا کرے گا
نشاں ظالموں کا مٹایا کرے گا

کہاں تک مسلماں کے قاتل کو شیطاں
خدا کے غضب سے بچایا کرے گا

بٹالہ میں اسلام کا زور بازو
حریفوں کے چھکے چھڑایا کرے گا

دکھایا کرے گا جلال محمد ﷺ
علم قادیاں کا جھکایا کرے گا

رہ حق میں او مٹنے والے ترا غم
ہمیں خوں کے آنسو رلایا کرے گا

-1 آنجہانی مرزا قادیانی نے ’’مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع‘‘ کے جواب میں قادیاں میں ’’بہشتی مقبرہ‘‘ بنایا تھا۔ وہاں پر دفن ہونے والوں سے بڑی بڑی رقوم وصول کی جاتی ہیں اور انہیں بہشتی ہونے کی سندیں دی جاتی ہیں۔

الحذر

تم اپنے جبر پہ نازاں ہو وقت سے پہلے
ہمارے صبر کی افتاد ناگہاں سے بچو

بچا لیا تمہیں توپوں نے اور تفنگوں نے
مزا تو جب ہے کہ مظلوم کی فغاں سے بچو

خدا نے تم کو بصیرت اگر عطا کی ہے
تو قادیانیوں کے تیر بے کماں سے بچو

دمشقیوں سے خطرناک تر ہیں اندلسی
گر اِن کی ''ایں'' سے بچے ہو تو اُن کی ''آں'' سے بچو

جو بات بات پہ تم کو حرام زادہ کہے
ہر ایسے سفلۂ بد اصل و بد زباں سے بچو

نہیں ہے خون شہید اس لئے کہ مفت بہے
خدا کے واسطے ایثار رائیگاں سے بچو

نبی ﷺ کی غصے میں ڈوبی ہوئی نگہ سے ڈرو
عتاب حضرت آقائے دوجہاں ﷺ سے بچو

حدیثِ قادیاں

(رواہ بخاری)

حقیقت قادیاں کی پوچھ لیجیے ابن جوزی سے
نکوکاری کے پردے میں سیہ کاری کا حیلہ ہے

یہ وہ تلبیس ہے ابلیس کو خود ناز ہے جس پر
مسلمانوں کو اس رندے نے اچھی طرح چھیلا ہے

پلی ہے مغربی تہذیب کے آغوش عشرت میں
نبوت بھی رسیلی ہے پیمبر بھی رسیلا ہے

نصاریٰ کی رضا جوئی ہے مقصد اس نبوت کا
اور ابطال جہاد انجاحِ مقصد کا وسیلہ ہے

بیاس اور اس کی موجیں آئے دن کرتی ہیں غمازی
کہ پوتا قادیاں کے رب اکبر کا رنگیلا ہے

(17 جون 1929ء)

پیغمبر قادیاں کا برزخی ترانہ

تکمیل عمر بھر مرے القاب کی نہ ہو
ان پر اگر اضافہ سی آئی ڈی نہ ہو

ہنسنا ہے میرے حال پہ ظالم ابوالوفا
ڈرتا ہوں میں کہیں یہ قضا کی ہنسی نہ ہو

میری بلا سے، مکہ لٹے کربلا لٹے
چندے سے ہے غرض مجھے اس میں کمی نہ ہو

یہ کس کتاب میں ہے کہ خیر البشرﷺ کے بعد
ہرگز کسی کو دعویٰ پیغمبری نہ ہو

کیا مصطفٰےﷺ کے بعد نہ آیا مسیلمہ
پھر قادیاں میں کس لیے مجھ سا نبی نہ ہو

اس **اخرجوا الیھود** کا قائل نہیں ہوں میں
برطانیہ سے جس کی سند مل چکی نہ ہو

جس کے ثمر مرے لیے اس درجہ تلخ ہوں
اسلام کی وہ شاخ خدایا ہری نہ ہو

(22 جولائی 1920ء)

دور جاہلیت کی یاد

بتان قادیاں اس واسطے مجھ پر بگڑتے ہیں
کہ دور جاہلیت میں مرا دل ان پہ مائل تھا

زکوٰۃ حسن دینے میں ذرا وہ بخل کرتے تھے
مگر میں بے لیے ٹلتا نہ تھا، ایسا ہی سائل تھا

پیمبر زادگی ان کی مرے آڑے تو آتی تھی
مگر میں اس نبوت کا نہ قائل ہوں نہ قائل تھا

میں رند لم یزل ہوں اس کی کچھ پروا نہ تھی مجھ کو
کہ ان کے اور میرے درمیاں اسلام حائل تھا

وہ ٹھکراتے رہے اپنے سرِ پا سے مجھے لیکن
مرا ہاتھ ان کی نور افروز گردن میں حمائل تھا

نگاہ رشک سے دیکھا مجھے ''الفضل'' نے برسوں
میں ان کے ابروئے خمدار کے خنجر کا گھائل تھا

انہیں ہے قادیاں میں آج کل دعویٰ خدائی کا
بتوں کی اس خدائی کا میں پہلے ہی سے قائل تھا

(14 جولائی 1920ء)

قادیانی ذوقِ ابلیسی

غلام احمد بھلا کیا جان سکتا ہے کہ دیں کیا ہے
رموز علم الاسما چہ داند ذوق ابلیسی
ادھر توحید کی باتیں ادھر تثلیث کی گھاتیں
مری فطرت حجازی ہے سرشت اس کی ہے انگلیسی
یہ کہہ کر حق جتا دوں گا محمد ﷺ کی شفاعت پر
کہ آقا تیری خاطر میں نے چکی جیل میں پیسی
ہوا جب علم کا چرچا دیا فتویٰ یہ مرزا نے
ہمارا علم ہے دریا کہ نام اس کا ہے سائیسی
ہے امرتسر سے مغرب کی طرف مینارہ مرزا 1
یہ نکتہ حل کریں مرقد سے اٹھ کر آج ادریسی 2

(فروری 1934ء)

-1 ’’قادیان جو ضلع گورداسپور پنجاب میں ہے جو لاہور سے گوشہ مغرب اور جنوب میں واقع ہے‘‘۔(ضمیمہ خطبہ الہامیہ ص 22،23 مندرجہ روحانی خزائن جلد 16، صفحہ 22،23)

پنجاب کا ہر باشندہ جانتا ہے کہ قادیان ضلع گورداسپور میں واقع ہے اور گورداسپور لاہور سے شمال مشرق کو ہے مگر مرزا قادیانی اس کو مغرب میں لکھتا ہے۔ جب یہ حوالہ قادیانیوں کو سنایا جاتا ہے تو وہ بے حد شرمندہ ہوتے ہیں اور دل میں سوچتے ہیں ہمارے مرزا قادیانی کا کمال علمی کیسا تھا کہ اسے مشرق و مغرب کی بھی خبر نہ تھی۔

-2 مشہور جغرافیہ دان۔

متفرقات

دوں نام کیا کیا قادیاں تیرے صلیبی کعبہ کو
روما کہوں، برلن کہوں، پیرس کہوں، لندن کہوں

میرزا جی کا خدا بھی خوب ہے جس نے انہیں
پہلے پیغمبر بنایا پھر لٹیرا کردیا

انہیں ڈھب چندہ لینے کے ہیں یاد اتنے کہ میں سمجھا
یہ چندہ مانگنے والا یقیناً قادیانی ہے

لندن سے جو بچا تھا وہ شملے میں لٹ گیا
اور اس پہ مستزاد ہوئی قادیان کی لوٹ

بک چکیں گی جب بہشتی مقبرے کی ہڈیاں
ٹیکس لگ جائے گا میش قادیاں کی اون پر

طوق استعمار مغرب خود کیا زیب گلو
اور گواہ اس پر ہیں مرزا کی پچاس الماریاں

''وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے''
مرے گر کعبے میں لندن میں گاڑو قادیانی کو

قادیاں کو غرض اسلام کی تبلیغ سے کیا
یہ تگ ودو ہے فقط پیٹ کے دھندے کے لیے
اب بھی کیا دیجیے گا چندہ بشیرالدین کو
شیرمال اور کباب اور پسندے کے لیے

سر کٹاتا ہوں میں ناموسِ مساجد کے لیے
آبِ خنجر سے طہارت بھی کیا کرتا ہوں
قادیاں لرزہ بر اندام مرے نام سے ہے
کہ میں ویراں یہ عمارت بھی کیا کرتا ہوں

کبھی حج ہوگیا ساقط کبھی قید جہاد اٹھی
شریعت قادیاں کی ہے رضا جوئی نصاریٰ کی
یہ فتنہ بڑھ چلا ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو
نہیں اے عالمان دین، میں تم سے بے سبب شاکی

جن پچاس الماریوں پر تھا غلام احمد کو ناز
حشر ان کا کاتب تقدیر کے دفتر میں ہے
موسیو ''الفضل'' کی ڈھولک بجا لے شوق سے
خیر کی رونق کا ساماں ہی ہجوم شہر میں ہے

منافقوں کی یہ ہے نشانی، زبان پہ دیں ہو تو کفر دل میں
اسی نشانی سے قادیانی تعارف اپنا کرا رہے ہیں
پڑا ہے چندے کا جب سے پھندا گلے میں ان قادیانیوں کے
ہمارے ہی گھر سے بھک لے کر ہمی کو آنکھیں دکھا رہے ہیں

کان والو **انکر الاصوات** ہے **صوت الحمیر**
گر یہ ڈھچوں ڈھچوں سننی ہو تو جاؤ قادیاں
عیسیٰ مریمؑ کو گالی قادیاں دے لے مگر
یاد رکھے اس کی بھی ہیں نانیاں اور دادیاں

ہم مسلماں ہیں ازل سے شرک ہے جن کا حریف
قادیاں کا اس میں ہیکل ہو کہ ہو متھرا کا دیر
بولہب کی شان ہو یا ہو غلام احمد کی آن
ملت بیضا کے ساتھ ان کا ہے پہلے دن سے بیر

ایمان کی دولت ہے ادھر اور ہے ادھر کفر
ہے ایک طرف زہر تو ایک طرف قند
مرزائیوں سے قطع تعلق ہے مرا دیں
اس طائفہ سے کام نہیں رکھتے خرد مند

نکل آیا زمیندار آج انگریزی زباں میں بھی
یہ جنس یثربی پہنچی ہے مغرب کی دکاں میں بھی
پڑا ہے اک نئی آفت سے استعمار کو پالا
پڑی ہے کھلبلی آتے ہی جس کے قادیاں میں بھی

کفر کیا ہے؟ قادیانیت کی رسوائی کی لاش
منہ پہ جس نے ڈال رکھا ہے نقاب زندگی
زندگی کا لطف اسی میں ہے کہ ہم آزاد ہوں
غیر کا محکوم ہونا ہے عذاب زندگی

محمد ﷺ کی غلامی کا شرف جس کو ہوا حاصل
سکندر کا وہ ہمتا ہے سلیمانؑ کا وہ ثانی ہے
کٹایا جس نے راہ حق میں سر جنت میں جا پہنچا
بشارت یہ سنی میں نے بزرگوں کی زبانی ہے

نکلیں گے مرے دل کے سب ارماں بھی اسی طرح
جس طرح یہود ارض فلسطین سے نکلے
مرزائیوں کے جہل مرکب کے سبھی ڈھنگ
ان کے متنبّی کی ''براہین'' سے نکلے

امت مرزا جھاڑ کی صورت لپٹی ہے دین کے دامن سے
برق کلیسا کھیل رہی ہے یثربیوں کے خرمن سے
جو نہ ہوئی مکہ میں میسر اور نہ مدینے ہی میں ملی!
آئے بہشتی مقبرے والے لے کے وہ عزت لندن سے

تلوار کا شکوہ ہے نہ جزیہ کی شکایت
کافر کو مسلماں سے گلہ اور ہی کچھ ہے
تم کہتے ہو ہرگز نہیں مرتد کی سزا قتل
ہم نے تو شریعت سے سنا اور ہی کچھ ہے

قادیاں جس سے ہوا زیر سسل ہوٹل میں
اس کو اٹلی کی وہ سفّاک حسینہ کہیے
گاندھوی رنگ میں اسلام کی کیجیے تعبیر
یعنی اس کو ہوس نان شبینہ کہیے

ہے مسیلمہ کی دولت جو ملی ہے میرزا کو
یہ غراب آخریں ہے جو وہ تھا کلاغ پہلا
وہ اگر عرب کی ضد تھا تو یہ قادیاں کی ہٹ ہے
یہ الاغ دوئی میں ہے جو وہ تھا الاغ پہلا

بنائے وحدت اسلام ہے اگر منظور
تو قادیاں کی نبوت کی روک تھام کرو
محمد عربی(ﷺ) رحمت دو عالم ہیں
تم امت ان کی ہو اس مرحمت کو عام کرو

باپ لندن، شملہ بیٹا، قادیاں روح القدس
اے مسلمانو! یہی تفسیر ہے والتین کی
آج وہ جاہل بھی کہلاتے ہیں''سلطان القلم''
چھین لی صحت زبان نے جن سے قاف اور شین کی
کل بنے پھرتے تھے جو اپنے زمانے کے نبی
آج چادر ان کے مرقد پر چڑھی سجین کی

بخاری کی زبان سے گر حدیث قادیاں سن لو
عجب کیا ہے تمہاری عاقبت ''محمود'' ہو جائے
خدا کی شان ہے اک ریزہ چیں خوان نصاریٰ کا
گدائی کرتے کرتے مہدی موعود ہو جائے
نکالا جائے گر کشمیر سے ہر قادیانی کو
تو باب فتنہ اپنے آپ ہی مسدود ہو جائے

مرزائیوں کے حق میں قیامت ہے بٹالہ
کافر کا جنازہ اسی بستی نے نکالا
ہر بچہ بٹالہ کا ہے مرد مجاہد
جو سوئی یہاں کی ہے وہ بن جاتی ہے بھالا

میں رنگ و نسل کی لعنت کا پہلے دن سے دشمن ہوں
مسلمان زادہ ہوں میری یہ شان امتیازی ہے
نہیں قائل ہوا میں آج تک ان کی شریعت کا
خدا جن کا بروزی ہے نبی جن کا برازی ہے

ہے مذہب حجاز کی ضد دین قادیاں
اس سے مجھ لگاؤ ہے اور اس سے لاگ ہے
منہ زور ہو رہی ہے خلافت کی مادیاں
ملتانیوں کے ہاتھ میں آج اس کی باگ ہے
گل موسیو بشیر کے گھر کا ہوا چراغ
آج ان کی نو عروس کا لٹتا سہاگ ہے

کہاں پنجاب میں اسلام! تیری اٹھ گئی غیرت
بٹھایا کفر کو لا کر نبی ﷺ کے ہم نشینوں میں
حدیث **اسمہ احمد** غلام احمد پہ چسپاں ہو؟
پڑے خاک اس سلیقے پر، لگے آگ ان قرینوں میں
کھلونا قادیاں کا بن گئی وہ سطوت کبریٰ
ہے اب تک شور جس کا آسمانوں اور زمینوں میں

آشکارا کر دیا جمعیت اسلام نے
قادیانیت کی روز افزوں پریشانی کا راز
منکر ختم نبوت ہو رہا ہے قادیان
آگیا وقت جہاد ایمان کا خنجر نکال
کہہ دو مرزا سے کہ خاک کعبہ اڑ سکتی نہیں
اپنے دل سے یہ تمنائے جنون پرور نکال

جھوٹی پیمبری نے سہارا دیا جنہیں
کیوں لڑکھڑا نہ جائیں ان اوہام کے قدم
فتنے نئے نئے ہوئے پیدا جہاں گئے
پنجاب میں نئی بد انجام کے قدم

معنی **لیس کمثلہ** آپ ہیں
یعنی آپ اللہ میاں کے باپ ہیں
عرش کو جس نے کیا ہے بے سپر
آپ اسی گھوڑے کی برقی ٹاپ ہیں
جو سبق بھی دے دیا طاغوت نے
موسیو محمود دیتے چھاپ ہیں
قادیاں ہے چشمہ آبِ حمیم
باپ پانی تھے تو بیٹے بھاپ ہیں
فَاتبِعُوُہ کی انگیٹھی گرم ہے
آگ اس کی آپ لیتے تاپ ہیں
دیکھیے ملتی ہے کب ان سے نجات
اور کب کٹتے ہمارے پاپ ہیں

شمع کابل کی بجھ گئی جس رات
قادیاں میں چراغ گھی کے جلے
موسیو مرزا بشیر الدین
سجدہ کرنے کلیسیا کو چلے
مغربیت ہے آپ کی انّا
دودھ پی پی کے جس کا آپ پلے

زندہ کیوں رہ گیا امان اللہ
موسیو اس سوال سے نہ ٹلے
جاں بچا کر نکل گیا اسلام
کفِ افسوس کفر کیوں نہ ملے

مرزائے قادیانی مر گیا
قادیانی فرقے کا بانی مر گیا
ہو گیا اسلام کا اک رخنہ بند
سنتے ہیں دجّال ثانی مر گیا
لے کے اپنے دل کے اندر سینکڑوں
آرزو ہائے جوانی مر گیا
کرتے ہیں مرزائی تاویلیں عبث
آئی مرگِ ناگہانی مر گیا

تحفظ ناموس رسالت ﷺ

مولانا ظفر علی خاںؒ اپنی شاعری میں بار بار اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ مسلمان وہ ہے جو اپنی جان خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی عزت و ناموس پر بخوشی قربان کردے۔ وہ اسے دین و دنیا کی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ملت اسلامیہ کی دنیوی اور اُخروی نجات صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ہر مسلمان جانِ ملت ﷺ کے نام نامی پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے پر تیار ہو:

جس نے ناموسِ پیمبر ﷺ پہ کیا جاں کو نثار
اس کی عزت کا خدا خود نگراں ہوتا ہے

مسلمانوں کے سر پہ کیوں نہ ہو اللہ کا سایہ
کہ ناموس محمد ﷺ پر کٹا دیتے ہیں وہ سر بھی

تم مسلمانوں کو کیا سمجھے ہو وقت آنے تو دو
بچہ بچہ سر کٹا دے گا نبی ﷺ کی آن پر

جان ناموس محمد ﷺ پہ تصدق ہو مری
بخشتا ہے تو خدا بخشے یہ انعام مجھے

مبارک ہیں وہ، ناموس نبی ﷺ پر
جنھوں نے پونجیاں اپنی لٹائیں

مر مٹتے ہیں یہ نامِ رسولِ عربی ﷺ پر
اس نام کی توہین کی لاتے یہ نہیں تاب

دبا اب تک نہیں ہے جذبہ ان میں قرن اول کا
کٹا سکتے ہیں ناموس نبی ﷺ پر بند بند اب بھی

محمد ﷺ کے ناموس پر کٹ مریں ہم
فدا اُن ﷺ کی عزت پہ دل بھی ہے جاں بھی

مرنا ہے تو مر جادۂ شاہِ دوسرا ﷺ میں
ڈرنا ہے تو ڈر ایک محمد ﷺ کے خدا سے

مسلماں لاکھ بودے ہوں مگر نامِ محمد ﷺ پر
خوشی سے اب بھی حاضر ہیں وہ اپنا سر کٹانے کو

کی رسول اللہ ﷺ پر قربان اپنی جان جب
زینت اورنگ قسطنطنیہ عثمانی ہوئے

عزت کا تاج کفر کے سر سے اتار کر
ناموس خواجۂ دوسرا ﷺ پر نثار کر

سر سے کفن لپیٹ لو اور اپنی جان کو
ناموسِ شرع مصطفوی ﷺ پر فدا کرو

غلامی کر محمد مصطفیٰ ﷺ کی
گدائی چھوڑ دے سلطان ہو جا

جو مسلم ہے تو جاں ناموس ملت پر فدا کر دے
خدا کا فرض اور اس کے نبی ﷺ کا قرض ادا کر دے

رسول اللہ ﷺ کے ناموس پر قربان ہو جاؤ
مسلمانو! بلالؓ و بوذرؓ و سلمانؓ ہو جاؤ

رکھتا ہے لاکھ سر بھی اگر اپنے دوش پر
نام محمد عربی ﷺ پر کٹائے جا

وہی ہو انداز بسملی کا جو شیوۂ ترک نیم جاں ہے
اگر کٹانا پڑے محمد ﷺ کے نام پر بند بند تجھ کو

جو رسول اللہ ﷺ کے ناموس پر قرباں ہوا
نامرادی میں بھی جو ثابت ہوا ہے بامراد

قادیاں جس سے ہوا زیر سیسل ہوٹل میں
اس کو اِٹلی کی وہ سفاک حسینہ کہیے

(مولانا ظفر علی خانؒ کے شعری مجموعوں، نگارستان، چمنستان، بہارستان، حبسیات اور ارمغان قادیان سے انتخاب)

مشاہیر، مولانا ظفر علی خاں اور قادیانیت

ظفر علی خاں کو ڈھونڈتا ہوں

عصا بدستوں کے لاؤ لشکر میں روح ایماں کو ڈھونڈتا ہوں
بتان اسلام کے جزیرے میں نور قرآں کو ڈھونڈتا ہوں
قلم کے پُر جوش معرکوں میں ظفر علی خاں کو ڈھونڈتا ہوں
ظفر علی خاں کو ڈھونڈتا ہوں

ظفر علی خاں کو ڈھونڈتا ہوں کہ ان عماموں کے پیچ کھولے
دنی نہادوں پہ طنز توڑے غلط مقاموں کے پیچ کھولے
یہ دیدہ و دل کی آرزو ہے کہ ان غلاموں کے پیچ کھولے
ظفر علی خاں کو ڈھونڈتا ہوں

یہ داڑھیوں کے سیاہ پھندے کہ ان پہ تقدیس نوحہ گر ہے
یہ پیٹ کے نابکار بندے کہ ان کا مسلک ہی سیم و زر ہے
انہیں زمیں دوز کر کے چھوڑے مرے وطن میں کوئی بشر ہے؟
ظفر علی خاں کو ڈھونڈتا ہوں

دلوں سے جوش جہاد غائب، رہا نہ ذوق جنوں سروں میں
قبا بدوشوں، عمامہ پوشوں، حرم فروشوں، صنم گروں میں
شراب خانہ کے **مغبچوں** میں، قمار خانہ کے دلبروں میں
ظفر علی خاں کو ڈھونڈتا ہوں

زبانِ اردو شریر لہجے کی مار پر مار کھا رہی ہے
فریب کو پر لگے ہوئے ہیں قضا کھڑی مسکرا رہی ہے
بڑے دنوں سے دل شکستہ میں آرزو لہلہا رہی ہے
ظفر علی خاں کو ڈھونڈتا ہوں

حنائی داڑھی، سفید کرتا، دراز چوغا، عجیب مضموں
حدیث لیلیٰ، فریب محمل، سراب ناقہ، جدید مجنوں
نگاہیں جو کچھ بھی دیکھتی ہیں یہ جی میں آتا ہے صاف کہہ دوں
ظفر علی خاں کو ڈھونڈتا ہوں

یہ چلتے پھرتے سفید گنبد کہ جیسے دنیا و دیں کا لاشا
یہ لفظ و معنی کا دوغلا پن کہ جیسے بازار میں تماشا
خدا مری سادگی کو سمجھے عجیب تر ہے یہ میری آشا
ظفر علی خاں کو ڈھونڈتا ہوں

وہ سامنے دو قدم پہ حوروں کے شوہروں کی برات نکلی
کہ ہم جسے دن سمجھ رہے تھے، وہ ایک تاریک رات نکلی
خدا مرے ولولوں کا حافظ مری زباں سے یہ بات نکلی
ظفر علی خاں کو ڈھونڈتا ہوں

کہاں کے درویش میر و سلطاں کی چوکھٹوں کے غلام ہیں یہ
بقول اقبال تیغ جن میں کوئی نہیں وہ نیام ہیں یہ

نفس کے ہتھے چڑھے ہوئے ہیں رہ مشیخت میں خام ہیں یہ
ظفر علی خاں کو ڈھونڈتا ہوں

مری صدا ہے کہ ان کے محلوں کے بیخ و بن بھی اکھاڑ ڈالے
مری دعا ہے کہ تیغ اسلام ان کے قبوں کو پھاڑ ڈالے
مری تمنا ہے ان فقیہوں کو دور حاضر پچھاڑ ڈالے
ظفر علی خاں کو ڈھونڈتا ہوں

جناب شورش یہ واعظوں کا نگر ہے انساں نہیں ملے گا
ذرا سنبھل کر قدم اٹھانا کہیں بھی ایماں نہیں ملے گا
قلم کی تلوار لے کے نکلو ظفر علی خاں نہیں ملے گا
ظفر علی خاں کو ڈھونڈتا ہوں

(شورش کاشمیری)

شورش کاشمیری

صحافت کا وقار

مولانا ظفر علی خاں کئی خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ بالفاظ دیگر وہ مختلف صفات کے جامع انسان تھے۔قدرت نے انہیں حسن وکمال کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ یہ کہنا تو غلط نہ ہوگا کہ ان کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی سرزمین یا مسلمانوں کی ملّی زندگی ظفر علی خاں سے محروم ہے۔ بڑے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں، پیدا ہوتے رہیں گے لیکن بعض شخصیتیں بارگاہ ایزدی سے جو خصوصیات لے کر پیدا ہوتی ہیں، وہ خصائص ان کا سفر حیات پورا ہوتے ہی ان کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہیں اور اس طرح ایک خلا واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں آج نئی پود کے لیے شاید تاریخ کے بعض مدھم حصوں کی آواز ہو کے رہ گئے ہیں۔ان کے وہ خصائص وکمالات اس زمانہ کے حافظہ سے بالکل نکل چکے ہیں جو کبھی برعظیم کے مسلمانوں کی آزادی سے متعلق جدوجہد کا طغرائے امتیاز تھے اور مولانا ان گنے چنے راہنماؤں میں سرفہرست تھے جو برطانوی استعمار کے خلاف مسلمانوں کی مفاہمت پسند لیڈر شپ کے رد میں نمایاں ہو کر اُبھرے تھے اور مسلمانوں نے انہیں اپنے اندرونی اضطراب کا اجتماعی مظہر خیال کیا تھا۔

مولانا ظفر علی خاں ایک تاریخ تھے۔ ایک ادارہ تھے، ایک تحریک تھے، ایک جماعت تھے، ان کی بدولت طورخم سے دہلی تک اور ادھر لاہور سے کراچی تک ایک خاص ولولہ پیدا ہوا۔ وہ نفع وضرر کے آدمی نہیں تھے اور نہ سود وزیاں کو عمومی سیاست دانوں کی طرح محفوظ رکھتے۔ وہ جہد وعمل کے انسان تھے اور سود وزیاں سے بے نیاز عشق مقصد کو ملحوظ رکھتے اور اسی کے لیے معرکے اٹھاتے اور استیلاء سے لڑ جاتے تھے۔اس کا بھرپور اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ان کے زمانۂ جہد میں زندہ تھے یا جن کے سامنے ان کے سفرِ زندگی کی ان تصویروں کا پورا البم ہے۔ وہ کوئی کہانی نہ تھے کہ ہم الفاظ کے سہارے اس میں رنگ وروغن پیدا کریں اور زبان کے بل

پر ان کی شخصیت کو قدر آور بنائیں۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔ ان میں سوانح وافکار دونوں تھے۔ وہ برعظیم کے مسلمانوں بالخصوص دہلی سے اس طرف پاکستانی علاقوں کے مسلمانوں کی راہنما شخصیت تھے۔ انہوں نے ان کڑے وقتوں میں برطانوی سامراج کو جھنجھوڑنا شروع کیا، جب پنجاب پشتینی وفاداری کا نگر تھا۔ سرحد سرزمین بے آئین تھا۔ سندھ کے استعماری حلقے بہت مضبوط تھے اور بلوچستان جمود کے حصار میں تھا۔ مسلمانوں کی حد تک ان میں کوئی مرکزی لیڈر نہ تھا کہ انہیں غلامی کے خلاف انگڑائی لینے کا احساس دلائے اور وہ مسلمان جو کبھی برعظیم کے وارث تھے، اس احساس سے جاگ اٹھیں کہ برطانوی استعمار کی زنجیریں توڑنا ان کا فرض ہے اور یہ ملک کبھی ان کا تھا۔

مولانا نے زمیندار کی عنانِ ادارت سنبھالی تو اس وقت زمیندار پنجاب کے زمینداروں کی ایک آواز تھا۔ مولانا کے والد اپنے گاؤں کرم آباد سے ہفتہ وار نکالتے اور دیہی زمینوں کے عمومی مسائل پر لکھتے لکھاتے تھے۔ مولانا حیدر آباد سے سبکدوش ہو کر اکتوبر 1909ء میں واپس آئے تو دسمبر 1909ء میں ان کے والد انتقال کر گئے۔ یکم جنوری 1910ء سے ''زمیندار'' مولانا کی تحویل میں آ گیا، پہلا پرچہ ان کے قلم کی جولانیاں لے کر شائع ہوا، کچھ عرصہ تو ہفتہ وار زمیندار کرم آباد ہی سے نکلتا رہا، پھر چودھری شہاب الدین کی تحریک پر مولانا لاہور آ گئے تو زمیندار لاہور سے نکلنے لگا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہفتہ وار سے روزانہ ہو گیا۔ جنگِ بلقان چھڑی تو آناً فاناً زمیندار کی کایا پلٹ گئی۔ ان کے علاوہ جو اخبار لاہور سے نکلتے تھے، وہ ماند پڑ گئے۔ ایک تو ان کے پاس ظفر علی خاں کا قلم نہ تھا، دوسرے وہ اس تیزی اور ترشی سے قلم اٹھانے کے عادی نہ تھے جو مولانا کے اسلوبِ نگارش کا شیوۂ خاص تھا۔ مولانا نے جنگِ بلقان کے دنوں میں ایک ایسا طرز پیدا کیا کہ شعر وانشاء کے سانچے بدل گئے۔ مسلمانوں نے جلد قبول کر لیا کہ مولانا ان کے اجتماعی ضمیر کی آواز کو الفاظ کی لڑی میں پرو کر مطالب کے موتیوں سے سجاتے اور ان کے دلوں کی دھڑکنوں کو رشحاتِ قلم میں ڈھالتے ہیں۔ مولانا کو اس کے لیے ایک مختصر مدت ہی میں ابتلاء کا سامنا کرنا پڑا اور سر مائیکل اڈوائر نے جو حیدر آباد دکن سے مولانا کی بیدخلی کا باعث ہوئے تھے اور اب پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر ہو گئے تھے، اولاً زمیندار پر وار کیا۔ پہلے دس ہزار روپے کی ضمانت طلب کی پھر ضبط کر لی۔ ادھر پریس کو سرکاری قبضہ میں لے لیا اور آخر کار حضرو کی ایک

تقریر کے جرم میں مولانا کو پھانس کر پانچ سال کے لیے قید کر ڈالا۔ مولانا نے یہ قید منٹگمری سنٹرل جیل میں گزاری جوان دنوں پنجاب میں کالا پانی کے نام سے معروف تھی اور جہاں چن چن کر عادی مجرم رکھے جاتے تھے۔

مولانا کی زندگی کا ابتدائی خاکہ یہ ہے کہ ان کا نام سالِ ہجری کے مطابق تاریخی ہے۔ **1290** ھ بمطابق **1873** عیسوی سالِ ولادت تھا۔ **27** نومبر **1956** ءکو اپنے گاؤں ہی میں بیماری اور بڑھاپے کی ایک طویل کشاکش کے بعد رحلت کر گئے۔ **83** برس کی عمر پائی، وہ اتنی پاکیزہ زندگی رکھتے تھے کہ ان کی عمر بہت لمبی ہوتی لیکن ایک عقیدت مند حکیم نے کسی وقتی عارضہ کو دور کرنے کے لیے ایسا کشتہ دیا جوان کی علالت کا طول ہوگیا اور سال ڈیڑھ سال بعد اس کے باعث ہمیشہ کے لیے رحلت کر گئے۔

وہ سیالکوٹ کے ایک گاؤں مہرتھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادکرم الٰہی نے وزیرآباد سے سیالکوٹ کی طرف ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ایک گاؤں آباد کیا جو انہی کے نام پر کرم آباد کہلاتا تھا۔ مولانا نے وزیرآباد مشن ہائی سکول سے مڈل کیا، پھر اپنے پھوپھا مولوی محمد عبداللہ خان کے پاس پٹیالہ چلے گئے۔ مولوی صاحب مہندرا کالج پٹیالہ میں عربی کے پروفیسر تھے۔ وہاں اپنے پھوپھا کی نگرانی میں میٹرک کیا اور علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں **1892** ء میں ایف اے کیا تو والد نے جوان دنوں سری نگر میں ڈاک اور تار کے محکمہ میں ایک بڑے آفیسر تھے، اپنے پاس بلوالیا اور اپنے محکمہ میں ملازم کرا دیا۔ لیکن مولانا کی طبیعت کا دھارا مختلف تھا، وہ قدرت سے دوسری خصوصیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ وہاں ایک سال بھی نہ رہے، نو دس مہینے ہی میں لوٹ گئے اور علی گڑھ میں دوبارہ داخلہ لے لیا۔ **1894** ء میں بی۔ اے کیا تو مولانا شبلی کی سفارش پر نواب محسن الملک کے سیکرٹری ہو کر بمبئی چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ کام کیا تو ان کی سفارش پر حیدرآباد دکن چلے گئے۔ وہاں نواب افسر الملک سپہ سالار کے ماتحت فوج سے منسلک ہو گئے۔ مولوی عزیز احمد ان دنوں ہوم سیکرٹری تھے۔ انہوں نے طبیعت کے جوہر دیکھ کر اپنے ساتھ منسلک کر لیا۔ تھوڑے عرصہ میں **لیجسلیٹو کونسل** کے رجسٹرار ہو گئے۔ پھر دارالترجمہ میں چلے گئے۔ میر عثمان علی خان جو حیدرآباد دکن کے آخری نظام تھے، کے اتالیق مقرر ہوئے، اس سے فارغ ہو کر اسسٹنٹ ہوم

سیکرٹری ہو گئے۔ پھر کسی اختلاف کی بنا پر میر محفوظ علی بدایونی کے ساتھ بمبئی چلے گئے اور وہاں امپورٹ ایکسپورٹ کی غرض سے اور ینٹل کمرشل ایجنسی قائم کی لیکن دونوں ادیب تھے۔ بھاری پتھر تھا، اٹھ نہ سکا، چوم کر چھوڑ دیا۔ میر محفوظ علی تو اپنے گھر چلے گئے۔ مولانا نے بمبئی سے دکن ریویو نکالا، پھر پرچہ لے کر حیدرآباد دکن چلے گئے۔ ملازمت سے دوبارہ منسلک ہو گئے۔ لیکن اب طبیعت کی اُڑان ہی دوسری ہو چکی تھی۔ المختصر کلمۃ الحق کی پاداش میں، لیکن اس الزام کے ساتھ کہ میر عثمان علی خان کو انگریزوں سے بدظن کرتے ہیں، مولانا عبدالحلیم شرر، جناب صفی الدین اور مولوی عزیز مرزا کے ساتھ حیدرآباد بدر کیے گئے اور یہ چاروں حضرات اپنے اپنے وطن چلے گئے۔ مولانا نے کرم آباد پہنچ کر زمیندار کا سفر شروع کیا۔ یہ تھا ان کے کمالات ومحاسن کا افتتاح و آغاز کہ زمیندار ان کی بدولت مسلمانوں کی جدوجہد کے ابتدائی لشکر کا حدی خواں اور مولانا اس کارواں کے سالار ہو گئے۔

وہ اپنی ہی طرز کے شاعر تھے کہ ہر صبح ان کے اشعار لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتے اور دلوں کو جگا دیتے۔ فی الجملہ وہ اخباری شاعری کے بانی تھے۔ انہوں نے نظم میں طنز وتنقید کی ایک ایسی خوبو پیدا کی جس کا چلن ذاتیات کا نہیں، اجتماعیات کا تھا۔ وہ اخبار نویسی میں نئی اقدار کے بانی تھے۔ انہوں نے زبانِ اردو کو سینکڑوں نئے الفاظ، بیشمار ترکیبیں اور ان گنت اصطلاحیں دیں کہ اُردو لغت کا سرمایہ بڑھتا ہی گیا۔ پھر انگریزی سے اُردو ترجمہ میں اصلیت کا بانکپن پیدا کیا۔ اُن کے ترجموں پر یہ قیاس کرنا مشکل تھا کہ طبع زاد ہیں یا ترجمہ ہے۔ ان ترجموں کی خوبی تھی کہ علامہ شبلی نے حددرجہ تحسین وتبریک کی۔ داغ دہلوی کے قلم سے خیابان فارس سے متعلق نثر کا سب سے بڑا ٹکڑا نکلا اور آج تک اُن کی سب سے بڑی نثری چیز سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے مولانا کی زبان وبیان پر اپنی عظیم خوشنودی کا اظہار کیا۔ الغرض مولانا انشاپرداز طبیعت کے صحافی تھے۔ ان کی انشاپردازی کا رنگ انتہائی دلفریب تھا۔ لوگ پڑھتے اور سر دھنتے تھے۔ ایک ادیب، ایک شاعر اور ایک راہنما کے علاوہ مولانا کی دینی نگاہیں اتنی وسیع تھیں کہ جس دینی مسئلہ پر قلم اٹھایا، اس مبحث کا ہر گوشہ معمور کیا۔ کوئی سی تشنگی محسوس نہ ہوئی۔ ان کے متعلق وقت کے جید علماء میں یہ احساس تھا کہ وہ ان کی ٹہنی ہی کا پھول ہیں۔ ان کے سر پر کسی بھی دینی مدرسہ کی دستارِ فضیلت نہ تھی

لیکن دین کا علم ان کے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی تھا۔ان کے محاسن وکمالات کا احاطہ کرنا مشکل ہے اور نہ اس مختصر نشریہ میں اس کی تصویر کھنچ سکتی ہے،لیکن ان کے دور کی معاصر شخصیتوں نے ان سے متعلق جو کچھ کہا، وہ ان کے سوانحی خطوط کی نشاندہی کرتا ہے۔مثلاً قائداعظمؒ نے ان کے متعلق اپنے سیاسی سفر کی ابتداء میں شاہی مسجد کے ایک جلسہ میں کہا تھا:

''مجھے پنجاب میں ظفرعلی خاں کی رفاقت حاصل ہوتو میرے سفر کی ہر مشکل رفع ہو جاتی ہے۔وہ پنجاب کے مسلمانوں کی ایک متحرک تصویر ہیں۔''

علامہ اقبالؒ نے روزنامہ ''احسان'' کے ظفرعلی خاں نمبر میں 29 جنوری 1932ء کو پیغام دیا کہ:

''ظفرعلی خاں غیر معمولی دل ودماغ کے آدمی ہیں۔ان کا قلم اپنی روانی میں دنیا کے بڑے بڑے مجاہدین کی تلوار سے کم نہیں۔''

سرسید نے نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھا تھا:

''میں اس نوجوان میں ایک روشن مستقبل کے آثار دیکھ رہا ہوں۔''

نواب محسن الملک نے نواب افسر الملک کو تحریر کیا کہ:

''ظفرعلی خاں ایک ایسا نوجوان ہے جس سے اس خیال میں پختگی پیدا ہوتی ہے کہ نئی پود میں علم وقلم کے جوہر کی کمی نہیں ہے۔''

داغ دہلوی کا خیال تھا کہ:

''پنجاب نے ظفرعلی خاں اور اقبال پیدا کرکے اپنے ماضی کی تلافی کردی ہے۔''

علامہ شبلی نے فرمایا:

''ظفرعلی خاں کا نام اور کام محو ہونے کی چیز نہیں ہیں۔''

مولانا محمد علی جوہر نے کہا تھا:

''ظفرعلی خاں کے کلام میں جو تلخی ہے، وہ سیاست کی ہے اور جو چاشنی ہے، وہ ادب کی ہے۔''

سیّد سلیمان ندوی نے انہیں اُردو کے تین کامل الفن شاعروں میں سے ایک قرار دیا۔

محمد رفیع سودا، اکبرالٰہ آبادی اور ظفر علی خاں نے اپنے متعلق قلم کے معرکوں کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

قلم سے کام تیغ کا اگر کبھی لیا نہ ہو
تو مجھ سے سیکھ لے یہ فن اور اس میں بے مثال بن

مولانا ظفر علی خاں نے مغربی پاکستان میں احتجاج و انقلاب کے پودے کو جس طرح سینچا، یہ ان کے کمالات کی ایک ایسی تصویر ہے کہ بحالاتِ موجود اس کے غائب ہونے پر حیرت ہوتی ہے۔ 26 دسمبر 1909ء کو ان کے والد مولوی سراج دین احمد نے داعیٔ اجل کو لبیک کہی، زمیندار ان کی متاع تھا اور یہ ورثہ مولانا ظفر علی خاں کے حصہ میں آیا۔ یکم جنوری 1910ء کو زمیندار کی آٹھویں جلد کا پہلا شمارہ مولانا کی ادارت میں شائع ہوا۔ اب ذرا اس زمانہ پر نظر ڈالیے، برطانوی عملداری کا آفتاب نصف النہار پر ہے۔ مولانا ہی کے الفاظ میں راس کماری سے لے کر سری نگر تک اور سلہٹ سے لے کر خیبر تک، زبانوں پر استبداد و استعمار کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ سفید فام آقاؤں کا دبدبہ اپنے اوج پر ہے۔ پنجاب جو مولانا کے نزدیک ''ترس گیا تھا کسی مرد راہ داں کے لیے'' ملک معظم کی سلطنت کا بازوئے شمشیر زن تھا اور یہاں کسی رخ سے بھی کلمۂ حریت کا پیدا ہونا محال تھا۔ سرحد سرزمین بے آئین اور سندھ اس لحاظ سے ایک ریگ زار تھا۔ ان زمینوں کو انگریزوں نے بہمہ وجوہ، سیاسی لحاظ سے بنجر رکھا اور بہت دنوں تک بلکہ انگریزی سلطنت کی جانکنی کے زمانہ میں بھی قومی تحریکوں کا اجتماعی مزاج یہاں تک خشک ہی رہا۔ بہر حال احتجاج و انقلاب کا ایک انداز جو طبعی طور پر پرورش پا رہا تھا، ان صوبوں کا بھی احاطہ کر گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس تنقید کی بنیادیں اکبرالٰہ آبادی نے اٹھائی تھیں اور جو حرفِ پہلو دار علامہ شبلی کے ہاں تھا یا جس اضطراب کی ہلکی ہلکی آنچ ہمیں مولانا کے ہاں ملتی ہے، یہ سب قدرت کے غیبی ہاتھ کی بدولت پنجاب کو منتقل ہوتا رہا۔ اقبال کی شخصیت میں فکر بن کر چمکا اور ظفر علی خاں کی فکر میں احتجاج!

مولانا جب تک جوان رہے پامردرہے بلکہ عمر ڈھلنے پر بھی ان کا قلم جوان رہا۔ زمیندار

ققنس کی طرح اپنی خاکستر سے پیدا ہوتا تھا۔قید و بند نے پکارا، لبیک کہی، ضبطیٔ ضمانت نے للکارا، صاد کیا۔قرقی آ گئی، احسنت مرحبا کہا۔غرض آزمائش وامتحان کے مختلف مرحلوں سے زمیندار اور مولانا جرأت مندی کے ساتھ گزرتے چلے گئے۔

……۞……

مولانا انسان ہی تھے، کوئی فرشتہ نہ تھے۔ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوئیں، وہ جوڑ توڑ کے سیاست دان نہ تھے، ان کا سراپا ایک جذباتی مسلمان کا سراپا تھا۔ان کی نفسیات کے بارے میں صحیح روشنی ایک ماہر نفسیات ہی ڈال سکتا ہے۔لیکن بنیادی طور پر وہ ایک شاعر تھے۔شاعری کے مزاج میں جو رنگارنگی ہوتی ہے، وہ ان کی طبیعت کا جزو لاینفک تھا۔وہ سیاسیات میں دوڑنے کے عادی تھے۔انہوں نے چلنا تو سیکھا ہی نہ تھا اور بیٹھ جانا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔انہوں نے سیاسی ہیجان پیدا کیا۔جس تنظیم میں گئے، وارفتہ مزاج ہو کر گئے۔اپنا بہت کچھ کھویا لیکن لوٹے تو تماشا تھے۔تمام عمر دماغ کے بجائے دل سے سوچتے رہے۔

……۞……

ان کی سب سے بڑی کوتاہی یا خوبی یہ تھی کہ وہ سیاسیات میں بھی شاعری کرتے تھے۔

……۞……

ان کے افکار میں غزل کے مضامین کا تنوع تھا۔

……۞……

اُردو کے عوامی مقرروں میں مولانا کا پایہ بہت بلند تھا۔وہ نہ تو ابوالکلام کی طرح خطیب تھے اور نہ سید عطاء اللہ بخاری کی طرح لسان، وہ ایک مقرر تھے، جنہیں زبان و بیان دونوں پر قابو تھا۔ایک مقرر میں جو خصائص ہونے چاہئیں، وہ ان میں کماحقہ موجود تھے۔ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ روزمرہ اور محاورہ میں ٹھوکر نہیں کھاتے تھے۔ایک نو آموز مقرر ان کے الفاظ کا تعاقب کرنے سے اپنے الفاظ میں صحت پیدا کر لیتا۔ان کی تقریروں میں الفاظ کا حرف حرف نکھرتا چلا جاتا تھا۔وہ بدیہہ گو شاعر، بدیہہ گو ادیب ہی نہیں، بلکہ بدیہہ گو مقرر بھی تھے۔

……۞……

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں جو عشق تھا، وہ ان کی شاعری کی جان

ہے۔ان کی نصف شاعری عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھری پڑی ہے۔ جو عقیدت انہیں اس نام اوراس ذات سے رہی، یہ نعتیں اس کا والہانہ اظہار ہیں۔ ایسی خوبصورت نعتیں شاذ ہی ملتی ہیں۔ خدائے لایزال نے جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا اور قرآن وحدیث کے اوراق، سیرتِ طیبہ کے جو نقوش پیش کرتے ہیں، مولانا کی نعتیں اس کی ہو بہو تصویر ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بیشتر نعتیں مسلسل ہیں اور ہر نعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپا ڈھلتا چلا گیا ہے۔

مولانا کی شاعری کا سارا مدار اس پر ہے کہ ان کے ہاں خیالات کی گہرائی کے بجائے جذبات کی گہرائی ہے۔ وہ سیاسی معاملہ بندی میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ کوئی واقعہ پیش آ گیا، تصویر کھینچ لی۔ کوئی سانحہ دیکھا، عکس لے لیا۔ کسی سے بگاڑ ہوا، اس کا حلیہ بگاڑ ڈالا۔ کسی سے لگاؤ پیدا ہوا تو اس کو سجا دیا۔ اِدھر سے اُدھر، یہاں سے وہاں، میمنہ ومیسرہ سے بے نیاز۔ ہراول دستہ کی طرح حریفوں کو للکارتے ہوئے بڑھتے چلے جاتے ہیں یا پھر عشقِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکایتیں ہیں کہ اعتراف کہیے یا اظہار، لیکن کس خوبصورتی سے کیا ہے:

ہوتا ہے جن میں نامِ رسولِ(ﷺ) خدا بلند
ان محفلوں کا مجھ کو نمائندہ کر دیا
سردارِ دو جہاں(ﷺ) کا بنا کر مجھے غلام
میرا بھی نام تا بہ ابد زندہ کر دیا

ان کی تقریروں میں خطابت کے جلال سے زیادہ انشاء پردازی کا جمال ہوتا تھا۔ وہ الفاظ کے زیر وبم کو مطالب کی گہرائی پر فوقیت دیتے اور دمِ تقریر اس قسم کے استعارے، تشبیہیں، تمثیلیں اور کنایے استعمال کرتے تھے کہ سامعین جھوم اٹھتے۔ ان میں تفکر سے زیادہ جذبہ اور گہرائی سے زیادہ رعنائی تھی۔ ان کی تقریروں کو بڑے بڑے مقررین بھی غور سے آویزہ گوش بناتے، اس لیے کہ پنجابی نژاد ہونے کے باوجود ان کے لب ولہجہ سے دہلی ولکھنؤ کے بانکپن اور حیدر آباد وعلی گڑھ کی نزاکتوں کا اظہار ہوتا تھا۔ تلفظ کی صحت کے علاوہ ان کے صحیح مخرج کا پتا چلتا تھا۔ وہ اپنے دور کے ایک نمائندہ مقرر تھے، ان سے شیوہ بیانی، زبان دانی اور طلاقتِ لسانی کے

محاسن نمایاں ہوتے تھے۔

مولانا اس پنجاب میں نہ ہوتے تو یہ ایک سیاسی ویرانہ، دینی مرگھٹ اور ادبی عزاخانہ ہوتا......!

ان کی نثر میں علم ہوتا تو ابوالکلام ہوتے، شاعری میں فکر ہوتا تو اقبال ہوتے، خطابت میں تنوع ہوتا تو عطاء اللہ شاہ کو پیچھے چھوڑ جاتے، لیکن وہ ان میں سے کسی کے بھی تابع نہ تھے۔ ان کا اپنا رنگ اور اپنا پیرایہ تھا۔ اقلیمِ انشاء کے شہنشاہ، میدانِ شعر کے شہسوار اور عرصۂ خطابت کے ساونت۔

آج علم وفکر کی راہیں بہت وسیع ہوگئی ہیں اور شعور وآگہی کے راستے بھی مختلف سے مختلف ہیں۔ لیکن جس زمانہ میں ظفر علی خاں نے پنجاب میں صورِ حریت پھونکا، ان دنوں بڑے بڑے انقلابی خاندان انگریز کی دہلیز پر ناصیہ فرسائی کرتے ہوئے تھکتے نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ظفر علی خاں کے گوناگوں ملی احسانات کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ وہ ایک تاریخ تھے، عظیم تاریخ۔

آج کے اخبار اشاعت کے معاملہ میں بازی لے گئے ہیں۔ زمانہ بھی نصف صدی آگے نکل چکا ہے اور تعلیم ومحنت کی وسعتیں بھی کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہیں۔ لیکن انگریزوں کے زمانۂ استبداد میں، جب سر مائیکل اڈوائر پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر تھا اور بڑے بڑے خاندان اس کے پاؤں پر اس طرح جھکتے تھے جس طرح کٹا ہوا پتنگ کسی کوٹھے پر جا گرتا ہے، ظفر علی خاں نے جلیانوالہ باغ کے اس مجرم سے ٹکر لے کر اپنا سب کچھ گنوا لیا۔ ہم نے ظفر علی خاں کا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے کہ وہ سردیوں میں مسلسل دس برس تک گرم اچکن سے محروم رہے۔ ایک سویٹر کے ساتھ ٹھنڈی اچکن پہن کر آتے جاتے۔ زمیندار کئی دفعہ ضبط ہوا۔ پریس تین دفعہ۔ مولانا بار ہا جیل گئے لیکن ان کی گردن نہ جھکی۔

جب کبھی مولانا ظفر علی خاں کی بولتی چالتی تصویر سامنے آتی ہے تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ انہیں اللہ کو پیارے ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں، محسوس یہی ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور یہ تھوڑی دیر پہلے نقدِ حیات چھوڑ کر کہیں دور چلے گئے ہیں۔ تذکروں میں ہمیشہ لذت ہوتی ہے۔ ان سے سیرتِ انسانی کی تصویریں ابھرتی ہیں تو فکر و نظر کی بہت سی راہیں کھل جاتی ہیں۔ ایک عہد تازہ ہو جاتا ہے۔ ایک دور کھلنے لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ولولہ تازہ پیدا ہو گیا ہے، جس سے دماغ و دل کی رونقیں دوبالا ہو رہی ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں بلاشبہ ایک ایسے ہی انسان تھے جو اپنے ساتھ بہت سی رونقیں رکھتے تھے۔ ان کی ذات میں کئی انجمنیں سما گئی تھیں۔ وہ محض ذات ہی نہیں، ایک مدرسہ تھے، ایک مکتب تھے، ایک ادارہ تھے۔ زندگی میں سبھی طرح نشیب و فراز آتے ہیں۔ زمانہ یکساں نہیں رہتا۔ اُتار چڑھاؤ ہوتے ہی رہتے ہیں پھر انسان جب تک انسان ہے، اس کے ساتھ بشری کمزوریاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ بے عیب اللہ کی ذات ہے۔ آدمی غلطیوں کا پتلا ہے۔ ضروری نہیں کہ کسی شخصیت کے بارے میں ہر شخص کا پیمانۂ فکر و نظر یکساں ہی ہو۔ تاہم انسانی کمالات کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ اختلاف اس خاص سرحد پر آ کر رک جاتے ہیں۔ پھر وہ لوگ آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں جنہیں ضد ہو اور جو تل گئے ہوں کہ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے بھی بیشتر چیزوں سے اختلاف کیا اور ان سے بیسیوں افراد کو اختلاف رہا لیکن ایک چیز جس نے ان کی شخصیت کے حسن کو چمکا دیا اور ایک مدت تک ہمارے درمیان گونجتے گرجتے اور چمکتے دمکتے رہے، ان کی زندگی میں کئی خوبیوں کا جمع ہونا تھا۔ الفاظ کے معاملہ میں انسان بڑا فیاض واقع ہوا ہے۔ اہلِ قلم کے ہاں الفاظ عام ہوتے ہیں، انہیں لٹاتے وقت انہیں کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بہت سے الفاظ بول لیتے ہیں اور انہیں محض حسنِ اظہار یا حسنِ بیان سمجھتے ہیں۔

اہلِ قلم کی یہ ایک ایسی عادت ہے کہ نہ انہیں اس سے مفر ہے اور نہ ہم اس عادت کو کوئی خاص نام دے سکتے ہیں۔ بہر حال الفاظ کے اس اسراف و تبذیر سے انکار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم کسی شخصیت یا ادارہ کے ذکر و اذکار میں الفاظ کے طلسم خانہ کی راہ لیتے ہیں تو کچھ

دیر کے لیے قلم رک جاتا ہے۔ الفاظ بہر حال الفاظ ہیں اور یہ نگینے ہر انگوٹھی میں جڑ لیے جاتے ہیں۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ کانوں سے زیادہ آنکھوں پر بھروسہ کرتی ہے۔ فیصلہ وہی ہوتا ہے جس کی تصدیق دل سے ہو، دماغ اسے قبول کر لیں اور آنکھیں اپنے بے آواز لہجہ میں پکارتی رہیں کہ یہ حسن ہے۔

مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں یہ جو عرض کیا ہے کہ ان کی زندگی میں کئی خوبیاں جمع ہوگئی تھیں تو یہ محض الفاظ ہی نہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ ان الفاظ کا استعمال بہت سوں کے لیے ہو چکا اور بے شمار دفعہ ہو چکا ہے لیکن مولانا کے معاملے میں یہ الفاظ ناپ تول کر کہے گئے ہیں۔ بے وزن نہیں ان کا وزن ہے۔ اکثر روشن چہرے تھوڑے سے وقت کے لیے کجلا جاتے ہیں۔ تاریخ کی بعض سچائیاں کچھ دنوں کے لیے دھندلا بھی جاتی ہیں۔ بہت سی چیزیں ہوں گی جن کے لیے زمانہ ناموافق رہا۔ لیکن بادل چھٹ گئے تو ہر چیز صاف ہوگئی۔ ممکن ہے اس وقت نئی پود کے سامنے ہر رخ سے مولانا ظفر علی خاں کی تصویر نہ ہو۔ جب پاکستان بنا تو وہ گور کنارے تھے۔ جب پاکستان جوان ہوا تو وہ اس فانی دنیا سے رختِ سفر باندھ چکے تھے۔۔

1949ء کے شروع میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی اردو کانفرنس کے اجلاسِ عام کو اپنی کانپتی ہوئی آواز میں خطاب کیا۔ ان کی پاٹ دار آواز میں رعشہ آ گیا تھا۔ جن ہونٹوں سے کبھی استعمار کانپا کرتا تھا، اب وہ خود کانپ رہے تھے، قد دوہرا ہو گیا تھا، چہرے پر جھریاں اس طرح پھیل گئی تھیں جیسے کوئی پرانا لہریا دوپٹا ہو، آنکھوں میں اب بھی چمک تھی لیکن احساس یہ ہوتا تھا کہ حسرتوں نے کاجل لگا دیا ہے، فرمایا:

''ہمارا قافلہ منزلِ مقصود تک پہنچ چکا ہے۔ اس کے بعد تمنائے راہ پیمائی تو ہے مگر قوتِ راہ پیمائی نہیں، کبھی ہم تماشائی تھے اور دنیا تماشا۔ اب ہم تماشا ہیں اور دنیا تماشائی۔ جہاں چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا ہوتی ہو، وہاں ڈوبتے ہوئے آفتاب کو کون پوچھتا ہے اور ہم تو ڈوبتے ہوئے تاروں کی طرح دنیا پر نظر ڈال رہے ہیں۔''

مولانا ظفر علی خاں نے تیس برس تک برصغیر کے بتکدے میں نعرہ ہائے رستا خیز بلند کیے۔ ابر بہار کی طرح چھا جانا ان کا وصف تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک ادیب اور شاعر تھے۔ نثر و نظم

کے میدانوں میں ان کا قلم فراٹے بھرتا رہا۔ جس سمت چلے گئے، یہ احساس تازہ ہوتا گیا کہ کوئی شہسوار آ رہا ہے۔ سنِ آغاز ہی میں انہوں نے اپنے استاد داغ دہلوی سے منوالیا کہ ان کی ذات میں قدرت نے ایک عظیم شاعر کی صلاحیتیں رکھ دی ہیں۔ علامہ شبلی نعمانیؔ سے انہوں نے علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں خصوصی فیض پایا تھا۔ فرماتے ہیں:

یہ فیضِ صحبتِ علامہ شبلی کا صدقہ ہے
کہ دنیائے ادب میں دھوم ہے میرے مقالوں کی

حالیؔ نے ان کے لیے دعائیں کیں، یورپ سے واپس آئے تو قصیدہ لکھا، اکبر الٰہ آبادی کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا لیکن ستارۂ صبح، پنجاب ریویو اور دکن ریویو کو اپنے رشحاتِ قلم سے کبھی خالی نہ رکھا۔ لکھتے ہی رہے اور نوجوان ظفر علی خاں کے قلم سے جتنی نظمیں نکلتی رہیں، ان پر طبیعت کی خوشنودی کا اظہار کیا۔ ظفر علی خاں سیکنڈ ایئر میں تھے، کالج میں کوئی تقریب تھی، سرسید خود صدر تھے، انہیں مخاطب کر کے فارسی میں ایک طویل نظم پڑھی۔ سرسید نے بے اختیار ہو کر گلے لگا لیا۔ بہت سی دعائیں دیں، علی گڑھ سے نکلے تو سجاد انصاری کے ساتھ بمبئی چلے گئے۔ وہاں خواجہ غلام الثقلین کی جگہ نواب وقار الملک کے پرائیویٹ سیکرٹری ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد نواب صاحب نے سفارتی خط دے کر حیدر آباد دکن بھجوایا، وہاں عزیز مرزا کی قدردانی سے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری ہو گئے۔ میر عثمان علی خان کے اتالیق رہے۔ غور کیجیے اس زمانہ میں علی گڑھ کیسا تھا اور حیدر آباد کا کیا حال ہوگا۔ علی گڑھ نئی نسل کو نیا خون دے رہا تھا، حیدر آباد شرفا گردی کے بعد مسلمانوں کی لٹی پٹی عظمت کا واحد سہارا رہ گیا تھا۔ ظفر علی خاں نے اسی علی گڑھ اور اسی حیدر آباد میں نشوونما حاصل کیا۔ ادبی ہو کر گئے تھے۔ سیاسی ہو کر نکلے، لیکن اس حال میں بھی قلم پر انہوں نے حکمرانی کی۔ بیان ان کا مرکب رہا، زبان ان کی لونڈی، الفاظ خانہ زاد، مطالب دست بستہ، ان کی شاعری انہی سے شروع ہو کر شاید انہی پر ختم ہو گئی۔ ان کے طرزِ تحریر سے یہ زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے لیکن جس طرح ہمیں مغل قلعوں کے دیوانِ خاص اور دیوانِ عام کی ہیبت سے ایک خاص قسم کی قوت کا احساس ہوتا ہے اور ہماری نگاہیں ان کی پرشکوہ دیواروں پر رک جاتی ہیں، اس طرح مولانا کا اسلوبِ نگارش، یعنی الفاظ کا جمال اور مطالب کا جلال پرسش کے بجائے پرستش کی طرف لے جاتا ہے۔

ان کے چمنستانِ افکار میں سیاسیات کے بیل بوٹے بہت ہیں۔ ظاہر ہے کہ جہاں پھول ہوں گے، وہاں کانٹے بھی ہوں گے۔ ان کے دور کی یہ خصوصیت تھی کہ حسنِ یار کے مقابلہ میں رسن و دار کا چرچا ہو رہا تھا اور یہ وادی ہی ایسی ہے کہ آبلہ پائی کے مزے خار مغیلاں کے بغیر ادھورے رہ جاتے ہیں۔ مولانا نے اس وادی میں سفر کیا۔ مسافر سے میرِ کارواں ہو گئے۔ سفر طویل ہو تو حکایت کے ساتھ شکایت بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن جب سفر ختم ہو جاتا ہے تو صرف حکایت رہ جاتی ہے۔ اب شکایت ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ داستان گو ہی نہیں جو یہ حکایت سنا سکیں اور ماتم اس کا ہے کہ قدرت نے وہ سانچا ہی توڑ دیا ہے جس میں اس قسم کے لوگ ڈھلا کرتے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں بہر حال انسان ہی تھے۔ انسان سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن ان کے بعض وصف اتنے نمایاں تھے کہ بسا اوقات ان کے وجود پر معجزاتی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ مولانا میں کوئی عیب تو ایک طرف رہا، عیب کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ معصیت کی ہر آلودگی سے پاک تھے۔ شاعر تھے لیکن ان کی پوری زندگی خرابات کے خروش سے محفوظ رہی۔ جوانی پر آنچ نہ آنے دی۔ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ شاعری کے راستہ میں نفس کی رسوائیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان کے نزدیک داغ کی ہم صحبتی اور دکنی امراء کی ہم نشینی کے باوجود، شاعری ملک و قوم کی نقاشی اور جہاد و جنگ کی عکاسی کا نام تھا۔ انہوں نے شاعروں کے روایتی محبوب کو کبھی لائق اعتنا نہ سمجھا۔ اس کے قد و قامت کی تصویر کھینچی، نہ اس کے ہجر و وصال پر قلم اٹھایا جیسے ان کے ہاں یہ چیزیں گوشت پوست کی دنیا سے متروک ہو چکی ہیں۔

حالیؔ جیسے زاہد خشک کے ہاں بھی عشق کی آنچ ملتی ہے۔ جانے کس نے لکھا ہے کہ حالیؔ تھے تو انسان لیکن فرشتہ۔ انہیں دیکھ کر اور ساتھ رہ کر محسوس ہوتا تھا کہ ایک سچا اور سُچا انسان موجود ہے لیکن ان کے کلام میں جوانی چنانکہ افتد دانی کا نوک نقشہ مل جاتا ہے۔ شبلیؔ کے علو مرتبت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ وہ دامنِ عشق نچوڑ کے نکلے تھے۔ اکبر الٰہ آبادی مسلمانوں کے زوال پر ابرِ بہار کی طرح روئے ہیں لیکن عشق سے پنڈ چھڑانا ان کے لیے مشکل ہو گیا۔ ان کے سینہ میں بھی کم بخت جوانی ناگن کی طرح لہراتی رہی۔ رہ گئے داغؔ تو وہ عمر کے ہر حصہ میں آنکھ مچولی کرتے رہے،

لیکن ظفر علی خاں جو شبلی و داغ کے شاگرد، حالؔی و اکبرؔ سے فیضیاب اور اقبالؔ و حسرتؔ کے معاصر تھے، کہیں بھی اپنے کلام میں عشقِ مجازی کی شاہراہ پر ٹہلتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ مسجد میں آنکھ کھولتے، میناروں پر اذان دیتے، رزمگاہوں میں ڈنڑ پیلتے، کوئی بت کدہ راستہ میں نظر پڑے تو اس پر لاحول پڑھتے ہوئے آتے ہیں۔

……۞……

مولانا ظفر علی خاں ایک تصویری انسان تھے۔ جس طرح ایک تصویر کے بہت سے رنگ اور خطوط ہوتے ہیں، اسی طرح مولانا بھی بہت سی خوبیوں کی تصویر تھے۔ ایک انسان کی حیثیت سے ان میں خوبیاں بھی تھیں اور کمزوریوں پر ان کی خوبیوں نے غلبہ پا لیا تھا۔ یار لوگوں نے انہیں اکثر و بیشتر تنقید کی سان پر کھینچا۔ اس کی وجہ ان کی طبیعت کا تضاد تھا۔ زمانہ بھر سے لڑائی باندھ رکھی تھی۔ چونکہ لڑنے میں انہیں لطف آتا تھا۔ شخص یا جماعت جو قلم کی زد پر آ گیا، زخم کھاتا رہا، بسا اوقات لہولہان ہو گیا۔ اڑنگا لگا کر پٹخنی دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا، جس عہد کے وہ راہنما تھے، وہ عہد ہی کچھ ایسا تھا کہ احتجاج و انقلاب کی راہیں تخریب ہی سے نکلتی تھیں۔ انہوں نے بیشمار افراد کو تختۂ مشق بنایا۔ بہت سی تحریکوں کا جامہ اتارا۔ اکثر جماعتوں پر اس شدت سے قلم و زبان کی چٹانوں پر کھڑے ہو کر پتھراؤ کیا کہ ان کے لیے راہِ فرار کے سوا کوئی چارہ نہ رہا لیکن ان کی اس ''تخریبی مدافعت'' کے بیشمار تعمیری پہلو بھی تھے۔ مثلاً ان کے قلم نے برطانوی استعمار کے سیاسی فرزندوں کا طلسم توڑا اور انہیں اس بری طرح رگیدا کہ اس طلسم کے ٹوٹنے پر ہی قومی تحریکوں کے نشو و بلوغ کا انحصار تھا اور اس بھرپور وار ہی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں خصوصیت سے ایک ایسی جماعت ابھری جس کا تعلق درمیانے طبقے سے تھا جس نے سیاسی تحریکوں میں مسلمانوں کی راہنمائی کا بیڑا اٹھایا اور مسلمانوں کو سیاسی عوارض اور عمرانی امراض کے اس حصار سے نکالا جو انگریز حکومت کی ملوکانہ مخلوق نے مخصوص مفادات کے تحت کھڑا کر رکھا تھا۔

مولانا کی زندگی کے اس پہلو پر شرح و بسط کے ساتھ گفتگو ہو سکتی ہے لیکن اس کا جائزہ لینے کے لیے بہت سی باتوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ مثلاً ہم اس وقت تک مولانا کے سیاسی کردار اور اس کردار کی بوقلمونیوں کا جائزہ نہیں لے سکتے اور نہ ہی اس پر کوئی فیصلہ دے سکتے ہیں جب تک ہمارے سامنے اس زمانہ کا سیاسی معاشرہ نہ ہو اور ہم اس بات کو کماحقہ سمجھتے نہ ہوں کہ

اس دور کے حالات کا نقشہ کیا تھا اور اس نقشہ کے تقاضے کیا تھے۔

مولانا قدرت سے جو دل و دماغ لے کر آئے تھے، اس کے کئی خانے تھے۔ مثلاً وہ سیاسی راہنما تھے، ایک بلند پایہ انشاء پرداز تھے۔ ایک عالی مرتبت صحافی تھے۔ ایک قادر الکلام شاعر تھے، ایک شعلہ بیان مقرر تھے۔ غرض علماء، ادباء، شعراء اور زعماء میں ان کا ایک خاص درجہ تھا اور ان تمام محفلوں میں انہیں ادب و احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ اب ان سب کا جائزہ لینا بھی کوئی سہل نہیں۔ موازنہ بھی مشکل ہے کہ وہ کس اعتبار سے زیادہ نمایاں تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان تمام صفوں میں ان کا نام اور کام چمکتا اور دمکتا رہا۔ امتدادِ زمانہ سے ہر چیز کو لونی لگ جاتی ہے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں ابھی قومی زندگی نمایاں نہیں ہوئی۔ تذکرہ و تاریخ دونوں تشنہ ہیں، جن لوگوں نے واقعتہً قومی زندگی کے مختلف دوائر کو متاثر کیا، انہیں بہمہ وجوہ تغافل کا شکار ہونا پڑا ہے اور جن لوگوں کے ہاں حسرتِ تعمیر کے سوا کچھ نہ تھا، ایک خاص حادثہ کے زیر اثر کھینچ تان کر قد آور کیے جا رہے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں حالات کی خیرہ چشمی کا شکار ہیں، جس فراخدلی کے ساتھ ان کے سوانح و افکار کا جائزہ لینا چاہیے تھا، یہی نہیں کہ انہیں اس سے محروم رکھا گیا ہے بلکہ بعض کوتاہ قامتوں نے ان پر دراز دستیاں بھی کی ہیں۔ جس مشتِ خاک کا ہم ذکر کر رہے ہیں اور جو اس وقت کرم آباد کے ایک تودۂ خاک تلے ابدی نیند سو رہا ہے، اس نے ان بت کدوں میں حوصلہ اور یقین کے ساتھ اذانیں دی تھیں کہ چاروں طرف قربانی و ایثار کا ولولہ جاگ اٹھا تھا۔ اب ہماری نئی پود یہ جانتی ہی نہیں کہ وہ کیا تھا؟ کہاں سے اٹھا، کیا لایا، کیا دے گیا اور کیا لے گیا؟ ہمارے سامنے یہاں کیسے کیسے کارواں نکل گئے۔ مسلمانوں نے شاذ ہی ان لوگوں کے کارناموں کو سراہا ہے جو عمر بھر انہی کے ہو رہے ہیں، ان کی خاطر جیے اور مرے، قربانی و استقامت کا چولہا روشن رکھا۔ آخر قوم ہی کے ہاتھوں ایک چراغِ رہگزر کی طرح بجھ گئے اور پھر ان کی یادیں اس طرح رہ گئیں جیسے کسی قبر پر کوئی چراغ جلتا ہو یا تنہائی میں کسی بیوہ کا آنسو مٹی میں مل گیا ہو۔

مولانا ظفر علی خاں نے اردو صحافت کو جس طرح سر سبز کیا، ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اس مختصر سی صحبت میں اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ زمیندار اصل میں ان کے

والد مولوی سراج دین احمد کی ادارت میں کوئی سات برس سے نکل رہا تھا۔ 6 دسمبر 1909ء کو مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا تو ان کی وصیت یا خواہش کے مطابق مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر ہوئے۔ ان کی ادارت میں آٹھویں سال کا پہلا شمارہ یکم جنوری 1910ء کو نکلا۔ یہ ادارتی سفر ان کے لیے دشوار تھا نہ اجنبی۔ وہ ان راہوں سے بخوبی آشنا تھے۔......زمیندار کا بوجھ اٹھایا تو طبیعت کی ادبی صلاحیتیں کام آئیں۔ دیکھتی آنکھوں زمیندار کہیں سے کہیں نکل گیا۔ اب تک اُردو اخبار نویسی کا رنگ پھیکا ہی تھا، اس میں نہ ولولہ تھا نہ حوصلہ، اخبار نویسی ایک طرح کی پرچہ نویسی تھی اور اس طرح کے علاقے خاص طور پر اس کا شکار تھے۔ لاہور کے کئی ہفتہ وار نکلتے تھے، مثلاً مولوی محبوب عالم کا ''انتخاب لاجواب'' اور ''پیسہ اخبار'' مولوی انشاء اللہ خاں کا ''وطن'' پنڈت گوپی چند کا ''اخبارِ عام'' لالہ دینا ناتھ کا ''ہندوستان'' اور منشی محمد دین فوق کا ''کشمیری میگزین''۔ یہ تمام پرچے ایک خاص مذاق کے پابند تھے۔ حکومت اور اس کے اعوان و انصار سے چھیڑ چھاڑ ان کا مسلک نہ تھا۔ مولانا نے زمیندار کی مسندِ ادارت پر فروکش ہوتے ہی ایک ایسا انقلاب پیدا کیا کہ اخبار نویسی کی راہیں کچھ سے کچھ ہو گئیں۔ اخبار بینی کا ذوق یکسر پلٹ گیا۔ معاصرین کے حسبِ حال نہ تھا، لہٰذا بعض نے چٹکی لینا چاہی اور مصرع طرح بھی اٹھایا۔ لیکن ایک ہی اڑنگے سے پٹکی کھا کر چت ہو گئے۔ پیسہ اخبار نے لکھا: زمیندار کی تیز رفتاری قوم کے لیے مفید نہیں۔ مولانا نے جواب دیا، پیسہ اخبار کی ٹکے گز والی چال کا زمانہ بھی بدل چکا ہے۔ غرض جس نے سر اٹھایا، پٹ گیا۔ جو خم ٹھونک کر نکلا، ڈھیر ہو گیا۔ زمیندار امتدادِ زمانہ کی نذر ہو گیا، لیکن جب 1910ء کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو کتنی ہی حقیقتیں اُبھر اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔ یہ مولانا کے قلم کا اعجاز تھا کہ انہوں نے بحیثیت صحافی جو خدمات انجام دیں، انہیں نہ تو کوئی شخص جسارت کر کے بھلا سکتا اور نہ وہ بھول جانے والی چیز ہیں۔ ان کی خدمات کا ایک سرسری جائزہ یہ ہے کہ:

1- ان سے پہلے اردو صحافت کا انحصار منشیانہ تحریروں پر تھا۔ ان کے دم قدم سے ادیبانہ تحریروں کا راستہ کھلا اور یہ سفر اپنے برگ و بار پیدا کر کے انہی پر ختم ہو گیا۔

2- ان سے پہلے اردو صحافت میں ادارتی عملہ رکھنے کا چنداں رواج نہ تھا۔ یہ شرف بھی انہی کو حاصل ہوا کہ انہوں نے اپنے گرد و پیش ملک کے نامور اہلِ قلم جمع کیے۔ حتیٰ کہ

زمیندار کو دبستانِ صحافت کا درجہ حاصل ہو گیا۔

3- اردو کے دامن کو بے شمار نوادرات سے مالا مال کیا۔ سینکڑوں الفاظ اور بیسیوں ترکیبیں ان کے قلم سے وضع ہوئیں۔

4- ان سے پہلے مغربی پاکستان کے موجود علاقوں میں اُردو کا اثر و رسوخ اونچے گھرانوں تک محدود تھا۔ انہوں نے اُردو کو خواص سے نکال کر عام کیا حتیٰ کہ لاہور اردو کی ترویج و اشاعت کا تیسرا مرکز ہو گیا۔

5- پہلے اردو صحافت پر سطحیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا، انہوں نے وجاہت پیدا کی۔

6- اخبار کی معنوی آبرو میں شعر و ادب کی چاشنی سے اضافہ کیا جس سے ایک خاص قسم کا تنوع پیدا ہو گیا۔

7- اخباری شاعری کی بنیاد ڈالی جو واقعہ نگاری اور تبصرہ نگاری سے نکلتی ہوئی ہجو نویسی اور طنز نویسی تک چلی گئی۔

8- اُردو صحافت کو ایک ایسے مقام پر لے گئے جہاں سے قومی تحریکیں اور سیاسی راہیں نکلتی ہیں۔ ''زمیندار'' انہی کی بدولت ایک ایسا انسٹی ٹیوشن ہو گیا کہ اس کا اعتراف کیے بغیر اُردو صحافت اور اسلامی سیاست کا تذکرہ ادھورا رہ جاتا ہے۔

9- زمیندار اور مولانا لازم و ملزوم تھے۔ زمیندار ان کا عکس تھا۔ آج اردو اخبار نویسی جس معراج پر نظر آتی ہے، اس کا سہرا لازماً انہی کے سر ہے۔ اس عظیم الشان عمارت کی بنیادیں بھی انہی کی بھری ہوئی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس قصرِ رفیع کا صدر دروازہ بھی انہی کا بنایا ہوا ہے۔

افسوس آج وہ ہم میں نہیں۔ موت ہر شخص کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے ایک دن مر جاتا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے زندگی کسی عظیم مقصد کے لیے بسر کی ہوتی ہے، وہ مر کر بھی جیتے ہیں۔ ظفر علی خاں ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔ یہ بات ہماری اور آپ کی نہیں، علامہ اقبال کی زبان سے نکلی ہوئی ہے کہ:

''مصطفیٰ کمال کی تلوار نے ترکوں کو جگانے کے لیے جو کام کیا، ٹھیک وہی کام ظفر علی

خاں کے قلم نے اپنے ہاں کے مسلمانوں کو جھنجوڑنے کے لیے کیا ہے۔‘‘

اور یہ ہے ظفر علی خاں کی صحافتی فتح مندیوں کا چہرہ نما۔

……۞……

ظفر علی خاں ……کون ہیں؟ یقیناً جدید پود ان سے کما حقہ، واقف نہیں……ان کے اخبار کا افتتاح ضمانتوں سے ہوتا اور تمت بالخیر زنجیروں سے……آج اگر وہ طاقِ نسیاں کا گلدستہ ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ یہ زمانہ ہی ہے جو بدلتا رہتا ہے، کبھی ان کا زمانہ تھا۔

اٹھے تو بجلی پناہ مانگے، گرے تو خانہ خراب کر دے

مولانا محشرِ خیال تھے۔

انگلیاں سرو اٹھاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

انھوں نے ہر وادی کو اپنے نعرہ ہائے رستخیز سے گونجایا۔ جدھر گئے:

موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

سیاست کی شاہراہ پر چلتے تو مرحبا و احسنت کی آوازیں بلند ہوتیں:

آمد خدا کے شیر کی آنکھوں میں پھر گئی

ادب کے چمنستان میں قدم رکھا تو گردو پیش بول اٹھے۔

خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

شعر و سخن کی راہ لی تو بڑے بڑوں نے لوہا مانا۔

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

لیکن آج

اک موج تھی کہ دوشِ صبا پہ گزر گئی

……۞……

مولانا ظفر علی خاں پچھلے کئی سال سے ایک گمشدہ ورق تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ان کی جامع الصفات شخصیت ابھرا بھر کر سامنے آ رہی ہے اور ہماری قومی و ادبی زندگی میں ان کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو انہیں بھول گئے تھے، اب یاد کرنے لگے ہیں۔ اس بھول کا سبب یہ تھا کہ مولانا جیتے جی اپنی قومی اور ادبی زندگی سے دستبردار ہو گئے

تھے۔اس سبکدوشی میں ان کے بڑھاپے سے پیدا شدہ عوارض کا ہاتھ تھا۔ یہ زمانہ اتنا طویل تھا کہ ان کی پیری ہی میں دو نسلیں جوان ہو گئی تھیں اور ان دونسلوں کے لیے ظفر علی خاں زیادہ سے زیادہ ایک ایسی یادگار تھے جس کی عظمتیں، اقتدار زمانہ کے ہاتھوں پس منظر میں جا چکی تھیں اور جو اپنے وجود کے اعتبار سے طاقِ نسیاں کا ایک چراغ ہو کر رہ گئے تھے۔

مولانا بلاشبہ رنگا رنگ خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ وہ مجموعۂ اضداد بھی تھے اور مجموعۂ اوصاف بھی۔ ایک زندگی میں کئی زندگیاں جمع ہو گئیں تھیں ...... ادیب، شاعر، خطیب، صحافی اور سیاستدان......ان کی زندگی میں یہ خصائص اس طرح گھل مل گئے تھے کہ ان کا وجود قدرت کے انعامات کا ایک معجزہ معلوم ہوتا تھا۔ پھر یہی معجزہ رفتہ رفتہ قومی زندگی کے بیشتر عنوانوں میں سے ایک عنوان بن گیا۔ ہر چند اس تاریخ میں ایک عجیب سا تضاد ہے اور ظفر علی خاں اس تضاد کا شدید مظہر تھے مگر زمانہ کے احوال وظروف کی ترازو میں جب ہم ان کی شخصیت کو تولتے ہیں تو اس تضاد میں بھی ایک دلکشی نظر آتی ہے جس میں ادب کی فرزانگی بھی ہے اور سیاست کی دیوانگی بھی......ان کا ادب ان کی زندگی کا عکس اور ان کی زندگی ان کی سیاست کا المیہ اور ان دونوں ہی کے امتزاج کا نام ظفر علی خاں تھا۔ گویا تمام انسانوں کی طرح وہ عناصر اربعہ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے انسان تھے لیکن ان کی تصویر میں مصوری کم اور سنگ تراشی زیادہ تھی۔ وہ سرتاپا ہنگامہ تھے اور ظاہر ہے کہ ہنگامے میں حکایتیں شاذ اور شکایتیں وافر ہوتی ہیں۔ ان کی سیاسیات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور یہ خیال اصرار وشدت کیساتھ پیش کیا جاتا ہے اور سیاسیات میں ان کی چھاپ کا رنگ گہرا نہ تھا۔ اپنے طور پر یہ بات درست ہے لیکن جس عہد اور فضا میں ظفر علی خاں نے جنم لیا اور اپنی طبیعت کا بانکپن لے کر قومی زندگی میں داخل ہوئے، اس عہد اور فضا کا نقشہ، اس عہد اور فضا کے نقشے سے مختلف تھا۔ اگر ہم بہار کو خزاں کے پیمانے سے ناپیں اور خزاں کو بہار کی میزان میں تولیں یا مرثیے کو قصیدے کے زاویئے سے دیکھیں اور قصیدے کو مرثیے کی نگاہ سے پرکھیں تو ظاہر ہے کہ ہم نقد ونظر کے معیار سے انصاف نہیں کر پائیں گے۔ بلکہ یہ ایک تنقیدی المیہ ہوگا، جس کو ہم فکر ونظر کی آوارگی بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات قریب قریب طے شدہ ہے کہ عصری شخصیات کا مطالعہ ان کے ماحول کی روشنی ہی میں ہوسکتا ہے۔ ظفر علی خاں بھی بالطبع اپنے ماحول کی پیداوار تھے اور اپنے عہد کا مظہر، جس زمانے میں انہوں نے سیاسیات کی وادی

میں قدم رکھا وہ فوجی اور سیاسی تحریکوں کا احتجاجی اور نراجی دور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا سیاسیات میں اس بہتے دریا کی طرح تھے جو طغیانی میں بے قابو ہو جاتا ہے۔ جس کی مار دھاڑ کرتی ہوئی موجیں بسا اوقات گرد و پیش کی زمینوں کو چاٹ جاتی ہیں اور جن کا سیرابی میلان، سیلابی ہیجان کے مقابلہ میں کمتر ہوتا ہے۔

انہوں نے سیاسیات میں ٹھیک ٹھیک وہی رول ادا کیا جو ان کے زمانے کا تاریخی تقاضا تھا۔ رہا ان کی ادبیات کا سوال تو اس لحاظ سے وہ کمالات کا ایک مرقع تھے۔ شاعروں میں شاعر، ادیبوں میں ادیب، نثاروں میں نثار، مدیروں میں مدیر، مترجموں میں مترجم......غرض کہ ہر محاذِ قلم پر صف بستہ ان کی نکھری ستھری آوازیں ہر صنفِ سخن میں طنطنے کے ساتھ سنائی دیتی ہیں۔ کوئی سی ادبی بزم جس میں سیاسی رزم کی آواز گونج رہی ہو، ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ بظاہر انہوں نے ایک زمانہ سے لڑائی باندھ رکھی تھی، مگر ہر محفل میں ان کے چراغ لو دے رہے تھے۔ شاعری میں وہ بقول سید سلیمان ندوی کامل الفن استاد تھے۔ الفاظ ان کی جیبی گھڑی اور ہاتھ کی چھڑی تھے، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بندھی اور لپٹی ہوئی چیز خود بخود کھلتی اور بکھرتی چلی جارہی ہے۔ ان کی شاعری کے ذخیرۂ وافر میں ان کی نعتیں اتنی شگفتہ ہیں کہ ہر لحاظ سے عربی و فارسی کے نعتیہ کلام کی صف اول میں جگہ پاسکتی ہیں۔

یہ ایک افسوسناک پہلو ہے کہ ان کے تمام تر نثری کارنامے محفوظ نہیں رہ سکے لیکن نثر کا جو انداز انہوں نے پیدا کیا اور ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے جو قلم انہوں نے لگائے، ان کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ ایک چوتھائی صدی تک ہمارے اہلِ قلم کی نامور جماعت نے اس کا تاثر قبول کیا۔ نثر میں ان کا اسلوب ایک حدی خواں کا اسلوب ہے جو ناقہ کی مہار تھامے، نعرہ ہائے رستا خیز بلند کرتا ہوا منزل کی طرف قدم اٹھاتا چلا جاتا ہے۔ انگریزی سے اُردو میں جن کتابوں کا ترجمہ ان کے بہار آفریں قلم سے نکلا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ترجمے نہیں، ان کی طبع زاد تصنیفات ہیں۔ فی الجملہ اس باب میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ کسی لفظ پر ترجمے کا شبہ نہ ہوتا تھا۔ روزمرہ ان کی باندی تھا اور محاورہ خانہ زاد......لکھنؤ دلی کی زبان اسی طرح بولتے تھے جیسے مٹیا محل اور قلعہ معلیٰ نے اپنی زبان کا تمام لوچ ان کے پاس رہن رکھ دیا ہو یا اس گنج شائیگاں پر ان کا قبضہ و تصرف ہے۔

ایک خطیب کی حیثیت سے ان کا کمال یہ تھا کہ وہ لفظوں کو موقع و محل کے مطابق استعمال کرتے اور فقروں کو ان کی نوک پلک سنوار کر بولتے تھے، بیسیوں ایسے مقرر تھے جو ان کے طرز بیان سے اپنا اندازِ خطابت نکھارتے تھے۔ اردو کے ایک نامور خطیب نے ان کی بابت کہا تھا:

''ظفر علی خاں کی تقریر میں تحریر اور تحریر میں تقریر ہوتی ہے۔ وہ نظم میں بات چیت کی زبان لکھتے اور نثر میں نظم کا انداز اپناتے ہیں۔''

بطور صحافی ان کا انداز انہی سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہو گیا۔ وہ اس میدان میں یگانہ تھے۔ اتنی سی بات کو افسانہ کر دینا اور افسانہ کو داستان بنا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ اب نہ وہ دور باقی رہا اور نہ ظفر علی خاں ہم میں موجود ہیں لیکن جب تک ظفر علی خاں ہی کے الفاظ میں اس فلکِ کج رفتار کی پیشانی پر سورج کا جھومر چمک رہا ہے اور افق کے سینہ پر تاروں کی جھالریں قندیلوں کی طرح روشن ہیں، پاکستان کی قومی، ادبی، سیاسی اور تہذیبی تاریخ کے لیے ظفر علی خاں کے ان کارناموں کو بھلانا محال ہے جن سے متعلق یہ بات بے خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ یہ کارنامے ہماری نشاۃِ ثانیہ کا طغرائے امتیاز ہیں۔

افسوس کہ اس پائے کے لوگ بھی اب ختم ہو گئے۔ نہ وہ دور رہا، نہ احتجاج کی رونقیں، نہ استبداد کی ترنگیں رہیں، نہ انقلاب کی اُمنگیں، کیا دن تھے، اور کیا تھے وہ لوگ کہ چراغِ جستجو لے کر نکلیں تو بھی ہم انہیں اندھیری رات کے وحشی غاروں سے واپس نہیں لا سکتے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ او لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

27 نومبر 1956ء کو مسلمانوں کا وہ بطل جلیل بھی اٹھ گیا جو ربع صدی تک ہماری قومی زندگی کے مطلع پر آفتاب کی طرح چمکتا رہا۔ جس کا وجود ایک تحریک اور جس کا سراپا ایک دعوت تھا۔ اب کچھ دنوں ان کی یادیں نوک زبان ہوں گی۔ پھر کہانیاں بنیں گی، حتیٰ کہ تاریخ انہیں اپنے دامن میں محفوظ کر لے گی۔

آج کی پود ظفر علی خاں کو جانتی پہچانتی نہیں لیکن ایک زمانہ میں ظفر علی خاں پوری تاریخ

تھے۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔ ان میں ایک نہیں بیسیوں خوبیاں اور سینکڑوں کمالات جمع ہو گئے تھے۔ وہ ایک ایسا مرقع تھے کہ ایک پورے دور کی تاریخ ان سے وابستہ نظر آتی ہے مثلاً:

1- وہ ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے ان اکابر ثلاثہ میں سے تھے جنہوں نے اس برصغیر کے مسلمانوں کو مختلف میدانوں میں حرکت و عمل کے نئے خطوط مہیا کیے۔

2- وہ مغربی پاکستان کے مسلمانوں میں عوامی بیداری کے داعئ اول تھے۔ ان سے پہلے پنجاب، سرحد، سندھ کے علاقے سیاسی اور ملی اعتبار سے ایک ویرانہ آباد تھے۔ یہاں کی خاک سے عجیب الخلقت لوگ پیدا ہوتے تھے۔ ظفر علی خاں نے غیر ملکی سامراج اور ملکی رجعت پسندوں کے خلاف اجتماعی احتجاج کا ذہن پیدا کیا۔

3- ان کی بدولت ان علاقوں میں مسلمانوں کو قومی اور سیاسی کارکنوں کی ایک نامور کھیپ ہاتھ آ گئی جو مسلمانوں کو قومی اور سیاسی جدوجہد کی راہ پر لے گئے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض افراد مسلمانوں میں نامور سے نامور ہوتے چلے گئے اور سیاسی اعتبار سے ان کا وجود تاریخ کا ایک موڑ بن گیا۔

4- مولانا نے اردو صحافت میں ایک نئے مدرسۂ انشا و انتقاد کی بنیاد رکھی اور پاکستان میں صحافت کے مذاق کو اپنے اجتہاد سے نہ صرف عام کیا بلکہ بیسیوں نامور قلم کار (مدیر و شاعر و ادیب) پیدا کیے۔

5- ان کی بدولت صحافت و سیاست میں اُردو کی نئی نئی تحریکیں، اصطلاحیں، استعارے اور تشبیہیں معرضِ وجود میں آئیں اور دیکھتی آنکھوں سینکڑوں الفاظ جو اس سے پہلے لغات میں ناپید تھے، قبول عام کی سند حاصل کر گئے۔

6- وہ شاعری میں ایک ایسے مکتبِ اظہار کے بانی تھے جس کی بدولت شاعری میں للکار نے راہ پائی۔ کسی شخص کی شاعری نے ایک خاص دور کے عوام کو ان سے زیادہ متاثر نہیں کیا، ان کی شاعری قومی و سیاسی تحریکوں میں برقی لہر کا کام دیتی رہی ہے۔

7- ان کے بعض ادبی، سیاسی اور دینی کارنامے ہمیشہ کے لیے یادگار ہیں مثلاً

الف۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قادیانی تحریک کے سامراجی اسباب و علل پر روشنی ڈالی اور

مسلمانوں کو اس کے اندرونی ضمیر سے خبردار کر کے اسے ایک مشتبہ جنس بنا ڈالا۔

ب۔ انہوں نے پنجاب کے ان جغادری خاندانوں کا طلسم توڑا جو مسلمانوں کے سروں پر دیوتاؤں کی صورت میں مسلط تھے، ان کے علاوہ جعلی پیروں، نقلی صوفیوں اور گمراہ عالموں کی عمارتوں پر پے در پے حملے کیے، غرض وہ:

''توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب''

کے سرعسکر تھے۔

ج۔ انہوں نے اس پائے کی نعتیں لکھی ہیں کہ ان میں غلو کا نام تک نہیں، بہ قول خواجہ حسن نظامی ان کی نجات کے لیے یہی توشہ کافی ہے۔

-8 اقبال فکر تھے۔ ظفر علی خاں عمل۔ قدرت نے انہیں رجز خواں کا لہجہ، بانکے پھکیت کا حوصلہ اور تلوار کا وار عطا کیا تھا۔

اور آج ان کی موت سے تاریخ کا ایک پورا باب ختم ہو گیا۔ وہ ان لوگوں سے جا ملے جو خلد آشیانی ہیں۔ حیات تھے تو ان سے بیسیوں ہنگامہ ہائے رستا خیز برپا تھے۔ غرض جس رخ سے غور کریں، ان کی یگانۂ عصر شخصیت کے نقش اُبھرتے اور پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کو پوری وجاہت سے بسر کیا۔

ہمارے فرمانراؤں میں سے بیشتر ان کے پاؤں کی دھول بھی نہیں۔ جس وقت ظفر علی خاں اسلامی ہندوستان کی روح رواں تھے، اس وقت ان لوگوں کو ماں کی گود کا سکون بھی حاصل نہیں تھا۔ یعنی ابھی کتم عدم سے منصۂ شہود پر نہیں آئے تھے اور جب ظفر علی انگریزی ملوکیت کے خلاف نبرد آزما ہو کر قید و بند کی صعوبتیں سہہ رہے تھے، ان میں کئی انگریز کے بوٹوں کے تسمہ سے بندھے ہوئے تھے۔

ان فرزندان رجعت نے مولانا کی زندگی اور موت سے جس سرد مہری کا برتاؤ کیا ہے وہ تاریخ کا ایک سنگین سانحہ ہے۔ بہر حال ظفر علی خاں آج ہم میں نہیں لیکن وہ لوگ ہم میں ہیں جو زندگی میں ان پر اعتراض کرتے رہے ہیں، اب وہ انہیں یاد کر کر کے رویا کریں گے اور جہاں حکمرانوں کا حرف آخر ہوتا ہے، وہاں سے مولانا کی شہرت و عظمت کا آغاز۔

اللہ تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے کہ وہ ہماری ملی تاریخ کا ایک باعظمت صفحہ تھے۔

وہ اک عظیم شخص تھا اور باکمال تھا
اس کی مثال ہو تو کہاں، بے مثال تھا
اس کا قلم تھا کاٹ میں شمشیرِ اصفہاں
اسلوب اس کا تیغ نگارش کی ڈھال تھا
تحریر اس کی ذوقِ نگارش کا منتہیٰ!
تقریر اس کی منبعِ حسن و کمال تھا
اس سر زمیں میں سطوتِ اسلام کا جمال
اس مملکت میں لشکرِ دیں کا جلال تھا
نقشہ کھینچا ہوا تھا ابوذرؓ کے فقر کا
عشقِ اویس قرنیؒ و روحِ بلالؓ تھا
چالیس سال اس کی اذاں گونجتی رہی
جب اس زمیں میں خوفِ خدا پائمال تھا
پیران تسمہ پا و فقیہان بادہ کش
اسلام ان کے ظلم و ستم سے نڈھال تھا
دل دادگان دعوت و تذکیر تھے خموش
آشفتگانِ مہر و وفا پر زوال تھا
اس عہدِ ناروا کے پرایوں کا ذکر کیا؟
ان سے کہیں ذلیل خود اپنوں کا حال تھا
ازبسکہ اس نے جادو جگا کر بدل دیا
ہندوستان کو، جس کا سنبھلنا محال تھا
شورشؔ! ظفر علی پہ خدا کی ہوں رحمتیں
وہ اس مہیب رات میں سحرِ ہلال تھا

نام اس کا ملّتِ بیضا کے پروانوں میں تھا
وہ بہر صورت عظیم الشان انسانوں میں تھا
ولولہ اسلاف کا اس کے رگ و پے میں رواں
خواجہ بطحا(ﷺ) کی عزت کے نگہبانوں میں تھا
تذکرہ اس کا ادب کے تذکروں کی آبرو
غلغلہ اس کا سیاست کے دبستانوں میں تھا
رحمۃ للعالمین(ﷺ) کی خوشہ چینی کے سبب
بادۂ توحید و سنت اس کے پیمانوں میں تھا

شورش کاشمیری

مولانا ظفر علی خاں اور قادیانیت کا سیاسی احتساب

مولانا ظفر علی خاں نے قادیانیت کے سیاسی اور عوامی محاسبہ کی نیو اٹھائی۔ آپ نظام دکن کی ملازمت سے علیحدہ ہو کر پنجاب آئے تو یہاں آپ کے والد ماجد مولوی سراج الدین احمد سخت علیل تھے۔ ان کا 6 دسمبر 1909ء کو انتقال ہو گیا۔ آپ نے یکم جنوری 1910ء سے ''زمیندار'' کی ادارت سنبھالی۔ ان دنوں مرزا غلام احمد قادیانی کے فتنہ کا شہرہ صرف پنجاب میں تھا یا پھر ایک طرف دہلی اور دوسری طرف پشاور کے دینی حلقوں میں ذکر اذکار تھا۔ مرزا قادیانی 26 مئی 1908ء کو جہنم واصل ہوا۔ حکیم نور الدین خلیفہ اول قرار پائے۔ وہ 3 مارچ 1914ء کو وفات پا گئے۔ مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ ثانی بنے، وہ مرزا غلام احمد کے فرزند ضرور تھے لیکن کسی دینی بصیرت کے مالک نہ تھے۔ انہوں نے اپنے گرد ایک ایسا مذہبی گروہ جمع کیا جو عیار و ہوشیار تھا اور ان کے حسب منشا قادیانیت کے ملہمانہ سانچے تیار کرتا۔ مرزا محمود خلقتاً سیاسی ذہن کے انسان تھے۔ انہوں نے اپنی جماعت کے بعض سیاسی شاطروں سے تربیت حاصل کی پھر راسپوٹین کی حیثیت سے نشو و نما پا کر کرنل لارنس کا بروز ہو گئے۔ انہیں خلافت پر فائز ہوتے ہی ایک ایسا زمانہ ملا کہ پہلی جنگ عظیم کا سر آغاز تھا۔ انگریزوں کو خلافت عثمانیہ کے خلاف اس قسم کے ''مسلمان'' درکار تھے جو ترکوں اور عربوں میں ان کے حسب منشا کام کریں اور وہ کسی تذبذب کا شکار نہ ہوں۔ انہیں یہ خیال نہ ہو کہ وہ کسی مسلمان ملک یا کسی مقدس خطہ میں ایک نصرانی طاقت کے آلہ کار ہیں۔ مرزا بشیر الدین اس غرض سے موزوں آدمی تھے۔ ایک تو وہ عقیدۃً تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے، دوسرے انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ برطانوی حکومت ان کے نزدیک انعامِ الٰہی ہے اور جو اس کا بدخواہ ہے، حلال زادہ نہیں۔ مرزا محمود نے اپنے معتمدوں کی ایک ٹیم انگریزوں کے حوالے کی جو ترکی کے علاوہ جزیرۃ العرب کے مختلف ملکوں میں برطانوی سلطنت کی آلہ کار ہو گئی۔ اس طرح

مرزا بشیر الدین محمود کو اپنی خلافت کے لیے ایک اچھا موقع مل گیا۔ انہیں ایک چھوٹا سا اختلاف پیش آیا کہ مولوی محمد علی نے ان سے علیحدہ ہو کر لاہوری جماعت قائم کی اور مرزا غلام احمد کے متعلق اعلان کیا کہ ان کا دعویٰ نبی ہونے کا نہیں تھا، وہ مجدد تھے۔ مولوی محمد علی کی ناراضی کا اصل سبب یہ کہ وہ حکیم نور الدین کے بعد خلیفہ ہونے کے متمنی تھے۔ مرزا بشیر الدین محمود کا خلیفہ ہونا ان کے لیے المیہ تھا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر الگ ہو گئے اور لاہور آ کر انجمن احمدیہ کی بنا ڈالی۔ لیکن ان کا باہمی تنازعہ انگریزوں کے لیے کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ دونوں ان کے جیبی سکے تھے۔ مرزا محمود نے پہلی جنگ عظیم 1914ء تا 1918ء کے دوران میں یہ فائدہ اٹھایا کہ ان سے متعلق منبر و محراب کا احتساب ڈھیلا پڑ گیا۔ عامتہ المسلمین قادیانیت کے سیاسی مضمرات سے ناآشنا تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو ملک کے سیاسی حالات عدم تعاون اور ترک موالات کی طرف چلے گئے۔ قادیانیت کا محاسبہ کیوں کر ہوتا؟ اس بارے میں کسی نے غور ہی نہ کیا۔ تحریک عدم تعاون کا شعلہ کچلا گیا تو انگریزوں کی مہرہ بازی نے ہندو مسلم فسادات پیدا کیے جن عناصر نے ان کی نیو اٹھانے میں باطنی حصہ لیا، ان میں مرزا بشیر الدین محمود پیش پیش تھا۔

فسادات مدھم پڑ گئے تو لاہور کانگریس (1929ء) تک فرقہ وار حقوق کا مسئلہ بھڑکتا رہا اور یہ قادیانی امت کے لیے عافیت کا حصار تھا۔ اس سے متعلق نہ کوئی عوامی تحریک تھی اور نہ عامتہ المسلمین اس کی مختلف مضرتوں سے آگاہ تھے۔ کانگریس نے 1930ء میں نمک ستیہ گرہ شروع کیا تو قادیانی مسلمانوں کے اجتماعی احتساب سے محفوظ تھے۔ مرزا بشیر الدین محمود مسلمانوں کو اسلام سے خارج قرار دے کر اپنے والد کے پیروؤں کو مسلمان گردانتے تھے لیکن جب انگریزی حکومت کا اشارہ ہوتا تو ہندوستانی مسلمانوں کی آواز ہو کر بولتے اور انہیں مختلف سیاسی خطروں سے ڈراتے۔ گو مسلمانوں میں قادیانیت کے خلاف ایک احتسابی ذہن ابھر چکا تھا لیکن مسلمانوں کی تعلیم یافتہ جماعت کے مغربی ذہن میں قادیانیوں سے متعلق اس قسم کے جذبات تھے کہ وہ مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ ہیں اور ان کے متعلق علما کا احتساب مسلمانوں کی باہمدگر آویزشوں کا حصہ ہے۔ ایک بڑا گروہ رواداری کا ناد پھونکتا اور قادیانی بزرجمہروں سے بہمہ وجوہ مرعوب تھا۔ تحریکِ کشمیر 1932ء تک عام مسلمان اسی نہج پر رہے۔ علامہ اقبال نے 1933ء میں کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دیا۔ آپ کی تحریک پر انجمن حمایت اسلام نے اپنی عاملہ عامہ سے

قادیانیوں کو خارج کیا۔ پھر 1935ء میں آپ نے مرزائیت کے قلعہ پر ضرب لگا کر قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا تو قادیانیت کا مسئلہ ہر گروہ میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ مغرب زدہ مسلمان جو اس مسئلہ کے مطالعہ سے محروم تھے اور نہیں جانتے تھے کہ ایک امت کیونکر تیار ہوتی ہے اور کن رخنوں سے اس کی وحدت ٹوٹتی ہے؟ انہیں بھی معلوم ہوگیا کہ قادیانی امت کیا ہے؟ اس کی تشکیل کیونکر ہوئی ہے اور اس کی سوانح عمری کیا ہے؟ اور وہ ہندوستانی مسلمانوں میں رہ کر کیا کرتی اور کیا پاتی ہے؟ اگر پہلی جنگ عظیم نہ ہوتی اور اس کے بعد انگریزی استعمار کی مختلف ضرورتیں ہندوستان میں فرقہ وار مسئلہ کی آلائشوں کو ہوا نہ دیتیں تو ممکن تھا مرزا بشیر الدین محمود کے زمانہ خلافت ہی میں قادیانی بیل منڈھے نہ چڑھتی اور اس کا بتدریج یا بعجلت خاتمہ ہو جاتا، لیکن برطانوی استعمار نے قادیانی امت کو اپنی سیاسی ضرورتوں کے تابع سہارا دیا اور وہ عوامی اعتبار سے لائقِ اعتنا نہ ہونے کے باوجود ملی اعتبار سے مسلمانوں کے لیے ایک پرابلم ہوگئی۔ مرزا غلام احمد قادیانی سے لے کر حکیم نور الدین کے زمانہ تک جماعت کے تبلیغی دروازے کھلے تھے اور اِدھر اُدھر سے کئی ضعیف الاعتقاد لوگ دام تزویر میں پھنس جاتے تھے۔ یا پھر مرزا بشیر الدین نے پہلی جنگ عظیم سے فائدہ اٹھا کر بعض خاندانوں اور ان کے متعلقین کو شکار کیا۔ غرض 1917ء میں کل 55 ہزار نفوس سرکاری مردم شماری کے مطابق قادیانی تھے۔ ممکن تھا تعداد سامنے نہ آتی لیکن انگریزوں نے خلیفہ کو زور دے کر مردم شماری کرائی تا کہ انہیں معلوم ہو کہ ان کے خود کاشتہ پودے کی عددی حیثیت کیا ہے؟ اور وہ کس حد تک اس سے فائدہ اٹھا سکتے اور اس کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ اس مردم شماری کے بعد قادیانیوں کو اپنی عددی طاقت ظاہر کرنے کا پھر کبھی حوصلہ نہ ہوا، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ دینی احتساب کی ہمہ گیری کے باعث کسی مسلمان کا مرزائی ہونا ممکن نہیں رہا۔ صرف ترغیب و تحریص سے کوئی ٹاواں ٹاواں مسلمان مرزائی ہوتا۔ مرزا محمود نے تعداد بڑھانے کے لیے افزائش اولاد کی تحریک چلائی اور اپنے پیروؤں پر زور دیا کہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کریں یا پھر احمدی خواتین کو سیاسی و معاشی اعتبار سے بعض بڑے آدمیوں سے بیاہ کرنے اور سرکاری افسروں سے شادیاں رچانے کی شہ دی لیکن کسی مرحلہ میں مردم شماری پر راضی نہ ہوئے۔ مسلمانوں نے بہت زور دیا۔ انگریزوں سے کہا۔ حتیٰ کہ پاکستان بن جانے کے بعد کئی ایک جماعتوں نے اصرار کیا، مگر مرزائی سربراہ اس غرض سے کبھی تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے ہر

حکومت میں ایک ایسا رسوخ پیدا کرلیا کہ سرکار کے اعضائے رئیسہ نے اس سوال پر غور ہی نہ کیا۔ ان کے نزدیک قادیانی مسلمان تھے اور کوئی دوسرا پہلو اس مسئلہ میں لائق اعتنا نہ تھا۔ تماشا یہ تھا کہ قادیانی ملت اسلامیہ کو عقیدۃً کافر سمجھتے لیکن سیاستہً ان کے حقوق سے فائدہ اٹھاتے۔ مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کی ادارت سنبھالی تو مرزا قادیانی کی وفات کو صرف ایک سال اور سات ماہ ہوئے تھے، ان کا دینی احتساب منبر ومحراب کی محدود ومخصوص فضا میں تھا یا پھر دو چار تبلیغی رسائل قرآن وحدیث کے تحت فقہی خامہ فرسائی کرتے لیکن ان کے مباحث عوام کی ذہنی رسائی سے خارج تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء کی پرزور مزاحمت نے مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے جانشینوں کو شرعی اعتبار سے چت کر دیا تھا اور عام مسلمان ان کے شکار نہیں ہو رہے تھے لیکن علما وفات مسیح، ظہور مہدی، آثار قیامت اور خروج دجال وغیرہ کے مسائل پر گفتگو کرتے یا پھر ختم نبوت کے معانی پر قرآن وحدیث کی رو سے وعظ کرتے۔ ان کے سامنے یہ سوال ہی نہ تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی استعماری ضرورت کی پیداوار ہیں اور برطانوی شہنشاہیت نے کن سیاسی مقاصد کے تحت انہیں جنم دیا ہے۔ اس وقت یہ سوال مسلمانوں کے ذہن میں تھا ہی نہیں کیونکہ سیاسی جرأت کا زمانہ نہیں تھا اور برطانوی استبداد اپنی کسی کھیپ سے متعلق سیاسی چہرہ کشائی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ ایک مہر بلب دور تھا۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرووں کو مسلمانوں میں صرف اس لیے جگہ ملی اور وہ منبر ومحراب کے احتساب کی عوامی پکڑ سے محفوظ رہے کہ اس زمانہ میں علما نے تکفیر کے بہت سے یدھ رچائے تھے۔ ایک فرقہ دوسرے فرقہ پر کافر ہونے کا طعن توڑ رہا تھا۔ سرسید احمد خاں بھی اس تلوار کے زخم سہہ چکے تھے، اسی باعث جدید تعلیم یافتہ لوگ توجہ نہ دیتے اور اس سے لاتعلق رہتے۔ ہوا یہ کہ اصل کفر کو بھی پناہ رفقا مل گئی اور اس نے ڈھونگ رچالیا لیکن اس کا پروان چڑھنا برطانوی حکومت کا مرہون تھا۔

مولانا ظفر علی خاں نے پہلی جنگ عظیم کے آغاز تک زمیندار میں مرزائیت سے چٹکیاں لیں، گو موضوع ومضمون علما ہی کے انداز میں تھے لیکن لب ولہجہ ادبی وفکاہی تھا۔ مولانا کبھی کسی نظم میں طنز کر جاتے اور کبھی نثر میں اکثر علمی بحث کے چہرے پر ایک آدھ پہلودار فقرے سے رونق پیدا کرتے۔ مولانا کے نزدیک مرزا غلام احمد کا سلطان القلم کہلانا اضحوکہ خطاب تھا۔ ان کے

مجموعہ کلام دُرِ ثمین کے متعلق اس دور کے زمیندار میں لکھا کہ شاعری نہیں قلم کی متلی ہے۔

زمیندار طرابلس اور بلقان کی جنگ کے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا روزنامہ ہوگیا۔اس کی اشاعت دنوں ہی میں بیس ہزار ہوگئی۔ یہ ان دنوں ایک عظیم اشاعت تھی، گو خواندگی کا تناسب حقیر تھا لیکن مسلمانوں کے شوق کا یہ حال تھا کہ وہ دو دو پیسے میں زمیندار خریدتے اور ایک آنہ اس کی پڑھائی پر خرچ کرتے۔ سر مائیکل پنجاب کا گورنر تھا۔ وہ اس سے پہلے حیدرآباد میں ریذیڈنٹ رہا اور وہاں سے مولانا کے نکلوانے کا باعث ہوا تھا۔اس کے دل میں مولانا کے خلاف میل تھی۔ مولانا انگلستان میں پریس ایکٹ کے خلاف آواز اٹھا کر 20 ستمبر 1914ء کو واپس آئے تو پندرہ دن بعد 7 اکتوبر 1914ء کو انہیں کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ ادھر زمیندار 1913ء ہی میں ضمانت طلبیوں اور ضمانت ضبطیوں کا ہدف ہو چکا تھا۔ کسی نہ کسی طرح دسمبر 1915ء تک چلتا رہا، لیکن بالآخر سر مائیکل اڈوائر نے اس کو سیندور کھلا دیا۔اس کے بعد مارچ 1916ء میں روزنامہ ''لمحات'' جاری کیا، وہ بھی کچھ دنوں بعد بند ہوگیا۔اسی سال دسمبر میں مولانا کو اپنے گاؤں کرم آباد سے اس شرط پر ہفتہ وار ''ستارہ صبح'' نکالنے کی اجازت ملی کہ علمی و ادبی ہوگا۔ پہلا پرچہ جنوری 1917ء میں نکلا۔ کوئی چھ سات ماہ بعد ستارہ صبح لاہور منتقل ہو کر 27 اگست 1917ء کو روزنامہ ہوگیا۔ جنگ کا زمانہ تھا، مولانا نے ستارہ صبح میں قادیانیت کا محاسبہ شروع کیا لیکن اہل طریقت سے بھی الجھ گئے۔ پیروں نے مشترکہ دستخطوں سے سر مائیکل اڈوائر کو ان کے خلاف عرضداشت روانہ کی، حتیٰ کہ لاہور میں اجتماعی جلسہ منعقد کیا۔ سر مائیکل مولانا کے پہلے ہی خلاف تھا، ان حالات میں مولانا لاہور چھوڑ کر حیدرآباد دکن چلے گئے۔ لیکن انہوں نے پیچھا نہ چھوڑا، آخر وہاں سے بھی ریاست بدر ہو کر لوٹ آئے۔ جنگ عظیم ختم ہوتے ہی زمیندار کا ڈیکلریشن بحال ہوگیا اور 20 اپریل 1920ء سے از سر نو نکلنے لگا لیکن ابتلاء و آزمائش کی صعوبتیں زمیندار اور مولانا کے ہمرکاب رہیں۔ مولانا حضرو ضلع کیمل پور کی ایک تقریر کے خلافِ قانون ہونے کی پاداش میں گرفتار کیے گئے اور زیر دفعہ 24 الف کے تحت پانچ برس اور زیر دفعہ 53 الف کے تحت دو برس قید کی سزا دی گئی۔ آپ نے قید کا پورا زمانہ سنٹرل جیل منٹگمری میں گزارا جو ان دنوں پنجاب کی جیلوں میں کالا پانی کہلاتا تھا۔ جہاں تک زمیندار کا تعلق تھا، وہ سرکاری عتاب کا نشانہ بنا رہا۔ مولانا ظفر علی خاں کی اس خوبی کا جواب نہ تھا کہ وہ کسی تحریک کو لے کر اٹھتے

تو برسوں کی منزلیں مہینوں میں طے کر لیتے۔انہوں نے قادیانی امت کے خدوخال ''ستارہ صبح'' میں اس طرح واضح کیے کہ مسلمانوں میں نظری اعتبار سے ایک تحریک پیدا ہوگئی۔اس تحریک ہی نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں عملی احتساب کی مختلف شکلیں پیدا کیں جن سے برعظیم کے مسلمانوں میں قادیانی امت کے سیاسی وعمرانی مقاطعہ کا آغاز ہوگیا۔

قادیانی امت کو پہلی جنگ عظیم کے دوران اوراس سے کئی سال بعد تک چھیڑنا آسان نہ تھا کیونکہ برطانوی حکومت کی استعماری مصلحتیں گوارا ہی نہ کرتی تھیں،لیکن مولانا ظفر علی خاں نے ستارہ صبح میں مصرع طرح اٹھایا اور قادیانی امت کے استعماری وجود کو ولولہ دین سے پسپا کرنا شروع کیا۔مولانا کے ہاتھ میں دو ہتھیار تھے ایک نثر کا ہتھیار تھا دوسرا نظم کا۔مولانا نے اپنی شگفتہ نثر میں قادیانی عقائد کا تجزیہ کیا۔موضوع و بحث علمی ہوتے لیکن گرفت اس پیرایہ میں کرتے کہ خواص و عام متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔جو لکھتے دل میں کھب جاتا۔خواص قائل معقول ہوتے۔عوام میں احتجاج وتنصر کی روح پیدا ہوتی مثلاً اس زمانہ میں مولانا نے ایک مقالہ لکھا ''احمد کون ہے،حضور سرورِ کون ومکاں یا مرزائے قادیاں؟؟''اس عنوان سے چونک گئے اور قادیانیت کا گھونگھٹ اتر گیا۔ اس کے علاوہ بعض مضامین ایسے ہیں جن میں طنز کا انداز نمایاں ہے۔مثلاً متنبّی قادیاں کی ناک، قادیاں اور سید امیر علی مرحوم، ملنگ بہ اشتیاق گولے کے، الولد سرّ لابیہ، متنبّی قادیاں اوراس کا لاہوری طنبورہ۔''ستارہ صبح'' میں کئی ایک فکاہی مضامین چھپتے رہے۔مرزا بشیر الدین محمود نے ان سے بدحواس ہو کر سر مائیکل اڈوائر کو بصیغہِ راز امداد کی درخواست کی اوراسے مولانا کے خلاف بھڑکایا۔ادھر اہل طریقت بھی زمیندار کی نکتہ چینی سے برہم تھے۔انہوں نے زمیندار کے خلاف درخواست گزاری اور مولانا کے خلاف اڈوائر کو مشتعل کیا۔یہ چیز مرزا بشیر الدین کی بالواسطہ مددگار ہوگئی۔اڈوائر بھی پرتول رہا تھا کہ مولانا حیدرآباد لوٹ گئے اور ستارہ صبح دسمبر 1917ء کے آخری دنوں میں بند ہوگیا لیکن ظفر علی خاں کے قلم کی بدولت مسلمانوں میں یہ ذہن پیدا ہو چکا تھا کہ مرزائی نہ صرف حضور ﷺ کی ختم المرسلینی کے غاصب ہیں بلکہ ملت اسلامیہ کی شہ رگ پر استعمار کی چھری ہیں۔القصہ مولانا قادیانیت کے خلاف احتساب کی پہلی آواز تھے جس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی اور مسلمانوں کو اس خطرہ سے چوکنّا کیا اور انہیں قادیانیت سے متعلق یقین ہوگیا کہ مسلمانوں کی یثربی وحدت کو دولخت کرنے کے لیے برطانوی استعمار کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔

سید عطا اللہ شاہ بخاری 1952ء کی تحریک ختم نبوت شروع ہونے سے چند دن پہلے لاہور کے ایک جلسہ عام میں تقریر کر رہے تھے کہ مولانا ظفر علی خاں اپنے فرزند اختر علی خاں کے ساتھ اچانک جلسہ گاہ میں آئے۔ مولانا انتہائی ضعیف ہو چکے اور بیمار تھے۔ آپ کا نطق کمزور پڑ چکا تھا، نہایت مدھم بولتے لیکن الفاظ ٹوٹتے تھے، شاہ جی نے مولانا کی آمد پر ان کے دونوں گالوں کو تھپتھپایا اور بولے ''ظفر علی خاں! تیرے ستارہ صبح نے میرے جگر میں آگ لگا دی تھی۔''

شاہ جی فرماتے کہ ستارہ صبح نے مجھے قادیانیت کے زہر آب سے آگاہ کیا۔ حضرت سید مہر علی شاہؒ نے وصیت کی کہ اس فتنہ کی سر کوبی کرنا۔ علامہ انور شاہ کاشمیری نے مجھے اس محاذ پر کھڑا کیا۔ المختصر اہل قلم کی جدید کھیپ میں قادیانیت کے محاسبہ کی امنگ مولانا نے ستارہ صبح کی معرفت پیدا کی اور اس لحاظ سے مسلمانوں کے سیاسی محاذ پر ظفر علی خاں پہلے حدی خواں تھے۔

مولانا ظفر علی خاں اور زمیندار برطانوی اقتدار کے خلاف نبرد آزما تھے لیکن ان کے قلم سے وہ عناصر بھی زک اٹھاتے تھے جو برطانوی اقتدار کے کاسہ لیس اور اسلام سے مجرمانہ بغاوت کے مرتکب تھے۔ مولانا نے قید سے رہائی کے بعد قادیانیت کا محاسبہ اپنے قلم وزبان کا نصب العین بنایا اور اس شدت سے احتساب کیا کہ اس کے لیے جینا دوبھر ہو گیا۔ مولانا نے 1920ء سے پاکستان بن جانے تک اور زمیندار نے پاکستان میں 1952ء کی تحریک تک قادیانیت کو اپنے قلم وزبان کی زد میں رکھا۔ مولانا قید وبند سے باہر ہوتے تو قادیانیت کا محاسبہ جاری رکھتے۔ کسی قومی تحریک کے پھیلاؤ میں یہ تو ہوتا کہ محاسبہ کی رفتار ذرا مدہم ہو جاتی لیکن یہ کبھی نہ ہوتا کہ قادیانیت سے کسی مدت کے لیے چشم پوشی کرتے۔ کانگریس میں رہ کر بھی قادیانیت کے شب و روز پر نگاہ رکھتے اور اپنی تقریر و تحریر کو اس سے غافل نہ ہونے دیتے۔ 1931ء میں کانگریس نے نمکین ستیہ گرہ کی تو دہلی، پنجاب اور سرحد کے بڑے بڑے لیڈر گجرات سپیشل جیل میں مقید تھے۔ وہاں مشاعرے ہوتے۔ مولانا مصرع طرح پر نظم کہتے تو اس میں قادیانیت سے متعلق بھی طبع آزمائی کرتے۔ مولانا کی بعض اشارتی نظمیں قادیانیت سے متعلق ہیں، اس کے بعد تحریک کشمیر اور مسجد شہید گنج کے زمانہ میں مولانا نے اپنی بیشتر نظموں میں قادیانیت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ تحریک خلافت 1919ء سے مولانا محض ایڈیٹر ہی نہ تھے بلکہ مسلمانوں کے ایک نامور لیڈر بھی تھے اور قلم کے علاوہ ان کی زبان کا بھی شہرہ تھا۔ وہ صحافت کے دھنی اور خطابت کے غنی تھے، ان کی تقاریر کے

لوگ شیدائی تھے، مولانا نے زمیندار کے صفحوں اور صوبہ کے میدانوں میں قادیانیت کو للکارنا اور پچھاڑنا شروع کیا اور ایک مختصر سی مدت میں مسلمانوں کے تمام دروازے اس پر بند کر دیے۔ مولانا نے 1933ء میں قادیانیت کے عوامی احتساب کے لیے ایک جماعت بنائی۔ اس جماعت نے تقریباً ہر روز پبلک جلسے منعقد کرنا شروع کر دیے۔ حکومت نے قادیانی امت کی پشت پناہی کے لیے اندیشہ نقض امن کی آڑ لے کر 4 مارچ 1933ء کو مولانا ظفر علی خاں اور ان کے رفقاء مولانا احمد علیؒ، مولانا حبیب الرحمٰنؒ، مولانا عبدالحنان، مولانا لال حسین اختر، مولانا محمد بخش مسلم اور خان احمد یار رزمی کو گرفتار کر لیا۔ یہ پہلا مقدمہ تھا جو سیاسی پس منظر کے تحت مرزائیت کی حمایت میں حکومت نے پہلی دفعہ مسلمان زعما کے خلاف تیار کیا۔ ٹھاکر کیسر سنگھ مجسٹریٹ درجہ اول نے حفظ امن کے لیے ضمانت طلب کی۔ مولانا احمد علی، مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا محمد بخش مسلم کے عقیدت مندوں نے ضمانتیں حاصل کر دیں لیکن مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالحنان، مولانا لال حسین اختر اور احمد یار خاں نے انکار کر دیا۔ عدالت نے وہ نوٹس پڑھ کر سنایا جو اس مقدمہ کی بنیاد تھا کہ:

''تمہارے اور احمدی جماعت کے درمیان اختلاف ہے۔ تم نے اس کے عقائد اور اس کے مذہبی پیشوا پر حملے کیے ہیں جس سے نقض امن کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ وجہ بیان کرو کہ تم سے کیوں نہ نیک چلنی کی ضمانت طلب کی جائے۔''

مولانا نے عدالت کو جواب دیتے ہوئے کہا:

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں مرزائیوں کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے گا۔ لیکن جہاں تک مرزا غلام احمد قادیانی کا تعلق ہے، ہم اس کو ایک بار نہیں ہزار بار دجال کہیں گے۔ اس نے حضور ﷺ کی ختم المرسلینی میں اپنی نبوت کا ناپاک پیوند جوڑ کر ناموس رسالت ﷺ پر کھلم کھلا حملہ کیا ہے۔ اپنے اس عقیدے سے میں ایک منٹ کے کروڑویں حصے کے لیے بھی دست کش ہونے کو تیار نہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مرزا قادیانی دجال تھا، دجال تھا، دجال تھا۔ میں اس سلسلہ میں قانون انگریزی کا پابند نہیں، میں قانون محمدی ﷺ کا پابند ہوں۔''

مولانا نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے ارتجالاً ایک نظم کہی۔ اس میں ایک شعر تھا:

باپ لندن، شملہ بیٹا، قادیاں روح القدس
اے مسلمانو، یہی تصویر ہے والتین کی

اور یہی قادیانیت کا لب لباب تھا۔

مولانا نے قادیانیت کے قلعہ پر وہ ضربیں لگائیں کہ تمام ملک میں ایک زبردست تحریک پیدا ہوگئی۔ مولانا قادیانیت کو مباہلے یا مناظرے کی چیز نہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک قادیانیت طعن وطنز کے لائق ایک استعماری ناٹک تھا۔ وہ اس کی بھد اُڑاتے اور 1920ء سے ان نکتہ پر زور دیتے کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی امت برطانوی اقتدار کی سیاسی ضرورتوں کا مولود ہے۔ اس کا مذہب کاسہ لیسی کی روایات پر ہے۔ تمام دنیائے اسلام میں قادیانی برطانیہ کے لیے جاسوسی کرتے اور ہندوستان میں آزادی کی تحریکوں کو حکومت کی منشاء کے مطابق سبوتاژ کرتے ہیں۔ مولانا مختلف قومی و اسلامی تحریکوں میں اس کا تجربہ کر چکے تھے اور انہیں مطالعاتی بنیادوں پر معلوم تھا کہ مرزائی مختلف اداروں میں کیا کرتے ہیں۔ ان کے خلاف ایک عوامی سٹیج پر جہاد کرنے کے لیے جس سٹیج کی ضرورت تھی، مولانا نے پیدا کیا اور جس زبان کی ضرورت تھی، اس کو استعمال کیا۔

مولانا کو حضور نبی کریم ﷺ سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ ختم نبوت کے سارق کو برداشت ہی نہ کر سکتے تھے۔ ان کے سامنے سوال یہ نہ تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ نبوت کی تغلیط کے لیے اسلامیات کی زبان استعمال کریں۔ ان کے نزدیک مرزا صاحب طنزیات کا مضمون تھے اور ان کی نبوت کا جواب قلم و زباں کے وہ کچوکے تھے جو عوام میں بسرعت تمام ایک تحریک بنتے گئے۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں مرزائیت کی اس طرح چھتاڑ کی کہ اس کے لیے سانس لینا مشکل ہوگیا۔ نثر میں مضمون لکھے تو متانت کو بھی ملحوظ رکھا اور ظرافت کو بھی، مسئلہ سنجیدہ ہوتا تو استدلال سے قلم اٹھاتے، مسئلہ تواضع کا ہوتا تو قلم سے نشتر چبھوتے اور قادیانیت کی فصد کھولتے۔ نظم میں ژالہ باری کرتے اور قادیانیت کا ٹینٹوا دباتے۔ مرزا بشیر الدین سخت پریشان اور ہراساں تھے۔ انگریزوں کا وہ دور نہ رہا تھا کہ مرزائیت کے مخالفوں کا گلا گھونٹ دیتے۔ وہ خود سیاسی تحریکوں کی عوامی زد میں تھے اور ان کا اقتدار ذہنی اعتبار سے ہٹتا جا رہا تھا۔

زمیندار نے مرزائیت کا بری طرح ناطقہ بند کر دیا تو حکومت نے مرزا بشیر الدین محمود کی الحاح وزاری پر توجہ کی اور اس بہانے کہ زمیندار نے پولیس پر تنقید کی ہے، دو ہزار ضمانت ضبط کرلی۔ مزید چار ہزار مانگا، وہ ادا کیا گیا۔ زمیندار اس آب و تاب سے نکلتا رہا اور مرزائیت کا

محاسبہ تیز سے تیز ہوتا گیا۔ حکومت نے مارچ 1933ء میں مولانا کو اندیشہ نقض امن میں گرفتار کرلیا کہ ان کی تقاریر سے مرزائیت اپنے تئیں محفوظ خیال نہیں کرتی، لیکن مولانا کی گرفتاری سے ملک بھر میں احتجاج کی فضا پیدا ہوگئی اور مرزائیت کے خلاف مسلمانوں میں احتساب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس سلسلہ میں علامہ سیّد محمد انور شاہ کاشمیریؒ نے دارالعلوم دیوبند کے ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''غلام احمد قادیانی بلاشبہ مردود ازلی ہے۔ اس کو شیطان سے زیادہ لعین سمجھنا جزو ایمان ہے۔ شیطان نے ایک ہی نبی کا مقابلہ کیا تھا۔ اس خبیث اور بدباطن نے جمیع انبیاعلیہم السلام پر افترا پردازی کی ہے...... مولانا ظفر علی خاں کا اقدام یقیناً لطیفہ الٰہیّہ ہے۔ ان کی جدوجہد اور قربانی اللہ و رسول ﷺ کے نزدیک ان شاء اللہ قبول ہوگی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے جامع اسلامیہ ڈابھیل ضلع سوات میں جلسہ عام کی صدارت کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں کو خراج عقیدت ادا کیا اور فرمایا کہ ''وہ ایک سیاسی مدبر ہی نہیں، ایک مذہبی قائد بھی ہیں۔ انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں سہہ سہہ کر ملت اسلامیہ اور دین حقہ کی بے نظیر خدمات انجام دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا بڑا اجر ہے''۔ سید مرتضیٰ بہادر ممبر مرکزی اسمبلی کی صدارت میں مسلمانانِ دہلی کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا کی گرفتاری پر حکومت پنجاب کی مذمت کی گئی اور اس کے اقدام کو مداخلت فی الدین قرار دے کر مطالبہ کیا کہ مولانا کو فی الفور رہا کردیا جائے۔ حکومت نے احتجاج کے پھیلاؤ کو دیکھ کر مولانا کو رہا کردیا۔ مولانا نے رہا ہوتے ہی محاسبہ تیز کردیا اور احتسابی جلسوں میں بلافصل جانے لگے۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں گورنر نے مسلمانوں کی لیڈر شپ کے بحران کا ذکر کیا اور ملفوف الفاظ میں قادیانیت کی حمایت کی کیونکہ وائسرائے نے مسلمانوں کے زبردست احتجاج کی پروانہ کرتے ہوئے ظفر اللہ خاں کو ایگزیکٹو کونسل میں لیا تھا۔ زمیندار اس احتجاج کا علمبردار تھا۔ گورنر کو اندازہ تھا کہ مسلمان اس سلسلہ میں خفا ہیں۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر قادیانیت کی حمایت کی لیکن اسی روز دوسرے اجلاس میں قادیانیت مردہ باد کے نعرے گونج اٹھے۔ ظفر اللہ خاں قادیانی کی مذمت کی گئی۔ انجمن کے عہدیداروں نے بہتیرا چاہا کہ احتجاج نہ ہو لیکن عوام مولانا ظفر علی خاں کو بلوانے پر مصر تھے۔ چنانچہ انجمن کے عہدیدار مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں بلا کر لائے۔ مولانا نے اجلاس سے خطاب کیا اور اس امر کی قرارداد منظور کرائی کہ مرزائی ایک جداگانہ اقلیت ہیں۔ ان کا مسلمانوں سے کوئی

تعلق نہیں اور نہ اپنے کفر کی وجہ سے وہ انجمن حمایتِ اسلام میں رہ سکتے ہیں۔ اس احتجاج نے ہندوستان بھر کے مسلمان اداروں سے مرزائیت کے انخلاء کی تحریک پیدا کر دی۔ انہی دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج میں مرزائی اساتذہ کا غلبہ تھا۔ خود پرنسپل ڈاکٹر بٹ قادیانی تھا اور چن چن کر مرزائی جمع کر رہا تھا۔ حکیم نورالدین کا بیٹا، حکیم عبدالسلام عمر بھی وہاں تھا۔ اس کے متعلق الفضل میں لکھا گیا کہ وہ علی گڑھ کو اس طرح فتح کرے گا جس طرح طارق نے ہسپانیہ پر قبضہ کیا تھا۔ مولانا کی تحریک علی گڑھ میں پہنچ چکی تھی، ان دنوں طلبہ کی روح رواں شریف چشتی، انوار صمدانی، نسیم سوہدروی، سردار وکیل خاں، عمران القادری اور بعض دوسرے نوجوان تھے، انہوں نے مولانا کو لاہور سے بلوانے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض سے یونین کا سیکرٹری دعوت نامہ لے کر لاہور پہنچا۔ مولانا 26 نومبر 1934ء کو علی گڑھ تشریف لے گئے۔ ان کا ریلوے سٹیشن پر زبردست استقبال کیا گیا۔ اسی رات یونیورسٹی ہال میں جلسہ ہوا، مولانا نے قادیانیت کا پول کھولا اور ارباب بست وکشاد کو طبیہ کالج میں مرزائی غلبہ کی دھاندلی پر لتاڑا۔ اگلے روز آپ نے وقار الملک ہال میں تقریر کی۔ ادھر طلبہ نے آفتاب ہال میں ایک اور تقریر کا انتظام کیا، اس کا اعلان ہو چکا تھا کہ انگریز پروائس چانسلر اور پروفیسر حبیب نے اجازت دینے سے انکار کر دیا لیکن طلبہ نے ایک نہ سنی۔ مولانا کی تقریر ہوئی اور قادیانیت کے پرخچے اڑائے گئے، حکیم نوردین کے فرزند حکیم عبدالسلام عمر نے مداخلت کرنی چاہی لیکن طلبہ پل پڑے۔ مولانا نے طلبہ کو روک کر اس کی جان بچائی۔ مولانا کی ان تقاریر کا یہ اثر ہوا کہ یونیورسٹی کے ارباب کار فتنہ مرزائیت سے واقف ہو گئے۔ قادیانیوں کی آئندہ بھرتی روک دی اور علی گڑھ کے طلبہ میں قادیانی ایک گالی ہو گئے۔ اس دورہ کے بعد مولانا ہر سال علی گڑھ جاتے رہے۔ طلبہ نے آپ کو فاتح قادیانیت کا خطاب دیا، جب بھی علی گڑھ جاتے تو وہ نعرہ ضرور گونجتا۔ اس کے بعد ہی آپ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر منتخب کیے گئے۔ ادھر انگریز حکام علی گڑھ کی اس فضا سے پریشان تھے۔ وائسرائے کی ہدایت پر گورنر نے سر ظفر اللہ خاں سے کانووکیشن ایڈریس پڑھوانے پر یونیورسٹی کے ارباب اقتدار کو تیار کیا لیکن طلبہ نے فی الفور احتجاج کیا اور منسوخ کرا ڈالا۔ مولانا کا واحد کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے قادیانی امت اور اُس کے اکابر کو مسلمانوں کی اجتماعی گرفت میں لا کر ایک ایسا طائفہ بنا دیا کہ وہ مسلمانوں کی عمرانی وسیاسی اور تہذیبی وتعلیمی مجالس سے خارج ہوتے گئے۔

مولانا کی شبانہ روز مساعی ہی کا نتیجہ تھا کہ ان کی تحریک ہندوستان بھر میں پھیل گئی۔آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں سرظفراللہ خاں کے زیر صدارت منعقد کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن مسلمانانِ دہلی کے اس احتجاج کی نذر ہو گیا کہ ظفراللہ خاں جب مسلمان ہی نہیں تو مسلم لیگ کی صدارت کیسے کر رہا ہے؟ علامہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام سے مرزائیوں کو نکلوا دیا اور ان کی شدت کا یہ حال تھا کہ انجمن کے اجلاس عامہ کی صدارت کرنے کے لیے تشریف لائے تو ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ جو انجمن کے ممبر تھے، اس اجلاس میں موجود تھے۔علامہ نے ڈانٹ کر انہیں حکم دیا کہ اجلاس سے چلے جائیں، وہ مسلمان ہی نہیں۔ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ اس ڈپٹ سے بھونچکا ہو گئے۔ان پر اسی دن فالج کا حملہ ہوا اور اگلے روز انتقال کر گئے۔مرزا بشیرالدین نے کشمیر کمیٹی کی آڑ میں مسلمانوں میں شامل ہو کر رسوخ پیدا کرنا چاہا۔انگریزی حکام کی تحریک پر بعض سرکاری مسلمان بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے لیکن علامہ اقبالؒ نے اس طلسم کو توڑ دیا۔مرزا بشیرالدین صدارت سے الگ کیے گئے۔اس کے بعد علامہ نے وہ تاریخی بیان جاری کیا جو مرزائیت کے لیے ضرب کاری تھے اور وہ تہذیبی مسلمان جو مرزائیوں کے متعلق روادار تھے، ان کی حقیقت سے باخبر ہو گئے۔مرزا سرظفر علی خاں لاہور ہائی کورٹ کے جج تھے۔انہوں نے بھی مرزائیت کا مدلل محاسبہ کیا، اس سلسلہ میں عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ معاشیات پروفیسر محمد الیاس برنی نے 1932ء میں ''قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ'' ایک نہایت ثقہ کتاب لکھی۔اس کتاب کے بہت سے ایڈیشن نکلتے رہے، مندرجات میں ہر دفعہ اضافہ ہوتا رہا۔اس طرح ملک کے مختلف حصوں سے کئی ایک جید علماء نے اس موضوع پر کتابیں شائع کیں۔جنگ عظیم دوم کے آغاز (ستمبر 1939ء) تک زمیندار نے بہت سے قادیانی ایڈیشن شائع کیے۔حکومت مختلف واسطوں سے بعض ایڈیشن ضبط کرتی رہی، مولانا کے قادیانیت سے متعلق بعض مضامین نظم و نثر کا مجموعہ 'ارمغانِ قادیان' 1936ء میں شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ادھر 1935ء میں مرزائیت کے خلاف علامہ انور شاہؒ کا ایک فتویٰ اور مقالہ شائع کرنے پر زمیندار کی ضمانت چار ہزار روپے ضبط کی گئی اور پانچ ہزار مزید طلب کی گئی تھی لیکن ابتلا و آزمائش کے یہ معرکے مولانا کے عشقِ رسالت ﷺ کو جوان کرتے رہے۔انہوں نے مرزائیت کا قلع قمع اپنا نصب العین بنائے رکھا اور قلم و زبان کا الاؤ مدھم نہ ہونے دیا۔احرار کے زعماء بعض سیاسی وجوہ کے باعث مولانا سے الگ ہو گئے۔بالخصوص تحریک شہید گنج

میں جانبین کا اختلاف تصادم تک چلا گیا لیکن قادیانیت سے متعلق اپنے سیاسی تجربے اور دینی مطالعے کی بنیاد پر صف آرا رہے حتیٰ کہ ایک مختصر سی مدت میں قادیانیت کے خلاف عوامی احتساب کی بے پناہ فضا پیدا کر دی، چونکہ پنجاب ہی قادیانیت کا مولد تھا، اس لیے پنجاب ہی اس کے کاسۂ سر پر گرز البرز شکن ہوگیا۔ غرض مولانا کے زبان و قلم کی بدولت قادیانیت کے چہرے سے ہر نقاب اتر گئی۔ مولانا ہی کی شبانہ روز مساعی کا نتیجہ تھا کہ:

1- مرزائیت کا مسئلہ ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔

2- مولانا سے پہلے مرزائیت کے تبلیغی دروازے سیدنا مہر علی شاہ نور اللہ مرقدہ اور بعض دوسرے اکابر کی بدولت بند ہو چکے تھے لیکن مولانا نے مرزائیت کے چور دروازوں پر قفل چڑھا دیا اور تبلیغی اعتبار سے ناکارکر دیا۔

3- مولانا نے مرزائیت کے سیاسی وجود کے استعماری آب و گل کا تجزیہ کیا اور یہ پہلا مرحلہ تھا کہ لوگوں کو مرزائیت کی حقیقت کا پتہ چلا کہ وہ کوئی مذہب نہیں بلکہ برطانوی عملداری کی ہندوستان میں تنسیخ جہاد سے متعلق استعماری ضرورت کا ناٹک ہے اور دنیائے اسلام میں انگریزوں کی خاطر اس نے جاسوسی کے پراسرار کارنامے انجام دیے ہیں۔

4- مولانا نے مسلمان عوام میں مرزائیت کے شرمناک وجود کو ننگا کر دیا اور حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ مرزائیت ملک کی آزادی کے راستہ میں ایک زبردست روک ہے۔

5- اس سے پہلے مغربی تعلیم یافتہ مسلمان رواداری برتتے اور انہیں مسلمانوں کی تقریبوں میں مدعو کر لیتے تھے۔ مولانا نے ایسی فضا پیدا کی کہ مسلمانوں میں ان کے لیے کوئی جگہ نہ رہی اور وہ لوگ جو اپنی سیاسی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر انہیں ساتھ رکھتے تھے، وہ بھی چاروناچار دست کش ہوگئے اور کسی میں ان سے میل ملاپ کا حوصلہ نہ رہا۔

6- وہ مسلمان جو جدید تعلیم سے بہرہ مند تھے اور ختم نبوت کے مسئلہ میں مذہب کی بنیادی معلومات سے ناواقف تھے، بعض سیاسی افراد کو چھوڑ کر مرزائیت سے بیزار ہوگئے۔

7- قادیانیت سے متعلق اہل قلم کی ایک ڈار پیدا ہوگئی اور مقرروں کی ایک ایسی جماعت سامنے آئی جس نے مذہب کے علاوہ سیاست کی بنیادوں پر مرزائیت کا محاسبہ شروع کیا حتیٰ کہ لیگ اور کانگریس کے حلقوں میں بھی یہ بات راسخ ہوگئی کہ مرزائی ان کی جدوجہد کے خلاف

استعماری خواہشوں کے آلہ کار اور برطانوی عملداری کے ایجنٹ ہیں۔

8- مسلمانوں میں یہ مطالبہ قومی ہو گیا کہ مرزائی امت کو دائرہ اسلام سے خارج کر کے ایک جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے۔ علامہ اقبالؒ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں قادیانیت سے متعلق جو معرکہ آرا تاریخی مضمون لکھا، اس نے مرزائی امت کو الگ اقلیت قرار دینے کے مطالبہ کو پروان چڑھایا۔ سیاسی غرض مندوں اور سرکاری دانشوروں کو چھوڑ کر تمام مسلمان اس سے متفق تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یورپ سے واپسی پر اپنے رفقاء سے بیان کیا کہ مرزائی برطانوی گماشتہ ہیں۔ اس روایت کو خود مرزا بشیر الدین محمود نے ڈاکٹر سید محمد کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ غرض مولانا ظفر علی خاں جس تحریک کے سب سے پہلے راہ نما تھے، وہ رنگ لائی اور مرزائیت بالآخر مسلمانوں سے الگ ایک شاخ قرار پا گئی۔ مولانا نے قادیانیت سے متعلق مختلف نظموں کی صورت میں تقریباً تین ہزار اشعار لکھے اور نثر میں بے شمار مقالات سپرد قلم کیے، ان سب کا شمار مشکل ہے لیکن مولانا کے تمام رشحات بہشتی مقبرے کے لیے صبح قیامت کا محاسبہ تھے۔

چراغ حسن حسرت

قادیانیت اور مولانا ظفر علی خاں

اسلام میں فتنوں کا ظہور قرونِ اولیٰ سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ مسیلمہ کذاب کا فتنہ اپنی قسم کا پہلا فتنہ تھا اور مرزا غلام احمد قادیانی کا ادعائے نبوت صدر اول کے اسی فتنہ کی ایک ترقی یافتہ صورت معلوم ہوتا ہے۔ ...... مرزا قادیانی نے جب اپنی تحریک کا آغاز کیا تو اس کی نشو ونما کے لیے بے حد مساعد حالات اور سازگار فضا مہیا ہو چکی تھی۔ ابتدا میں وہ ایک اسلامی (1) مبلغ کی حیثیت سے روشناس خلق ہوئے۔ پھر انہوں نے اپنے آپ کو چودھویں صدی کا مجدّد کہنا شروع کیا اور اس دعوے کے لیے انہیں کوئی تردد نہیں کرنا پڑا کیونکہ لوگوں کے کان تجدیدِ دین کے دعوے سے پہلے ہی آشنا ہو چکے تھے اور خود اُس زمانے میں ایک سے زیادہ مدعیانِ تجدید موجود تھے۔ ہاں اُن لوگوں کو الہام کا دعویٰ نہیں تھا۔ مرزا صاحب نے الہام کا دعویٰ بھی کیا اور اس خیال سے کہ یہ دعویٰ الہام لوگوں کو برہم نہ کرے اور وہ کہیں بے قابو نہ ہو جائیں، انہوں نے اپنے اس ادّعا کو آریہ سماجیوں اور عیسائیوں کے مقابلے میں اسلام کی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کیا۔ یہ تدبیر بہت کارگر ثابت ہوئی۔ اکثر مسلمان علما یہ سمجھ کر خاموش رہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے ادّعائے الہام سے انکار کرنا گویا اپنے آپ کو اسلام کی صداقت کی ایک عمدہ دلیل سے محروم کر دینا ہوگا۔ اب مرزا صاحب نے آگے قدم بڑھایا یعنی مہدویت کا دعویٰ کر دیا...... مسلمان عیسائیوں کے غلبہ کو دجال کے خروج کی نشانی سمجھتے تھے بلکہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ دجال سے انگریز مراد ہیں۔ مرزا نے اس عام خیال سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں کو دجال کہنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے مسیحیت کا دعویٰ کیا اور اپنے آپ کو ظلّی و بروزی نبی کہنے لگے۔ جب وہ اچھی خاصی جماعت فراہم کر چکے تو ''ظلّی نبی'' کے بجائے اپنے لیے ''نبی'' کی اصطلاح آزادانہ استعمال کرنے لگے۔ وہ خدا کے تجسم و تشبہ کے بھی قائل معلوم ہوتے ہیں۔ خدا کا یعقوب سے کشتی لڑنا

اور حضرت ابراہیم کا خدا کو مرے کے بلوطوں میں دیکھنا یہود کے عام معتقدات میں سے ہے۔مرزا صاحب کا عقیدہ بھی توحید وتنزیہہ کے اسلامی عقیدہ کے بجائے یہود کے اس عقیدہ تجسم سے ملتا جلتا ہے، چنانچہ انہوں نے ایک مرتبہ خدا کو تیندوے کی صورت میں اور دوسری جگہ ہاتھی دانت کی شکل میں پایا۔اس کے علاوہ انہوں نے اسے بیداری کی حالت میں کاغذات پر دستخط کرتے بھی دیکھا۔چنانچہ کلک قدرت کی روشنائی سے مرزا کے کپڑے داغدار ہو گئے۔

مرزا غلام احمد کے عقائد پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں جتنے باطل تصورات پیدا ہوئے، وہ سب اپنی ایک ترقی یافتہ صورت میں مرزا صاحب کے ہاں موجود ہیں۔وہ سرے سے جہاد بالسیف کے منکر ہیں اور انگریزی حکومت کو واجب الاطاعت سمجھتے ہیں۔وہ اپنے منکروں کو کافر کہتے ہیں اور اپنے مخالفین کو بے دریغ گالیاں دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے،انہوں نے تصوف کے صرف انہیں عقائد کو قبول کر لیا جو مجوسی عقائد کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے ہیں اور جنہیں اسلامی تصوف سے کوئی تعلق نہیں یعنی ظل و بروز، ان پر بابی (2) تحریک کا بھی کافی اثر پڑا ہے۔چنانچہ چند مسائل کو مستثنیٰ کر دیجیے تو اُن کے اور محمد علی باب (ایران کے جھوٹے مدعی نبوت) کے دعویٰ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔وفات مسیح کا عقیدہ جس پر ان کے دعویٰ کی عمارت استوار ہے،انہوں نے سر سید احمد خاں سے لیا ہے،اسلامی عقائد کی نئی تعبیر وتفسیر اور علوم جدیدہ سے ان کی تطبیق کے باب میں بھی وہ سر سید کے متبع ہیں لیکن ان کی تحریک میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے، وہ تنسیخ جہاد اور انگریزوں کی خلافت الٰہیہ کے مسائل ہیں۔ان کی کتابوں میں کوئی دوسرا مسئلہ ایسا نہیں جس کا ذکر انہوں نے اس جوش وخلوص کے ساتھ بار بار کیا ہو۔ان کے خیالات میں تضاد وتبائن بے حد ہے۔وہ خود اپنے دعاوی کے متعلق ایسی متضاد باتیں کہتے ہیں کہ پڑھنے والا پریشان ہو جاتا ہے لیکن تنسیخ جہاد اور حکومتِ انگریزی کی اطاعت کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہر قسم کے ابہام وتضاد سے پاک ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل کو اصل کی حیثیت حاصل ہے اور دوسرے تمام مسائل حتیٰ کہ ان کا دعویٰ مہدویت بھی فرع کی حیثیت رکھتا ہے۔

علما نے مرزا غلام احمد قادیانی کی پرزور مخالفت کی لیکن وہ وفات مسیح،ظہور مہدی، علامات قیامت،نزول مہدی،خروج دجال وغیرہ مسائل میں الجھ کر رہ گئے اور قادیانی تحریک کے

سیاسی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں علما کا مشغلہ تکفیر پورے شباب پر تھا۔ ایک فرقہ کے لوگ دوسرے فرقہ کے لوگوں کو کافر کہتے تھے۔ سر سید احمد خاں مرحوم بھی اسی تلوار سے چور نگ ہو چکے تھے۔ نئے تعلیم یافتہ لوگوں نے مرزا غلام احمد کی مخالفت اور کفر کے فتوؤں کو علما کی اسی عادت تکفیر کا نتیجہ سمجھا اور اس کی پروانہ کی۔ دراصل قادیانیوں کی کامیاب مخالفت کی سعادت قدرت نے ایک ایسے شخص کے لیے مخصوص کر رکھی تھی جو خود بھی مسلمانوں کے اسی وسیع المشرب تعلیم یافتہ گروہ سے تعلق رکھتا تھا جس کی ساری کائنات یورپ کی نافہمانہ اور کورانہ تقلید تھی۔ لیکن وہ جاذبہ توفیق الٰہی کے سہارے آگے بڑھا اور مجاہدین حق کی صف اول میں جا کھڑا ہوا۔

کامل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

مولانا ظفر علی خاں نے اگرچہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ اس لیے وہ ابتدا میں کسی قدر سر سید کی تعلیمی تحریک سے بھی متاثر ہوئے۔ لیکن درحقیقت ان کا تعلق سر سید سے زیادہ انیسویں صدی کی ایک عظیم الشان اصلاحی تحریک سے ہے جس کے بانی سید جمال الدین اسد آبادی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ سید مرحوم کا وجود گرامی تمام عالم اسلام کے لیے ایک حیرت انگیز موہبت الٰہی تھا۔ اسلامی ملکوں میں گزشتہ نصف صدی کے اندر جتنی سیاسی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں، اُن سب نے بلاواسطہ یا بالواسطہ سید جمال الدین سے اثر قبول کیا ہے۔ دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح انہوں نے ہندوستان پر بھی گہرا اثر ڈالا اور مجاہدین حق کی ایک جماعت پیدا کر دی جو سب کے سب سید اسد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی فرزند ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں کا تعلق بھی اسی گروہ سے ہے۔ سید جمال الدین کی تحریک اپنے اصول دمبانی کے اعتبار سے قادیانی تحریک کا بالکل اُلٹ ہے۔ یعنی قادیانی تحریک کا مقصد یہ ہے کہ سارے عالم اسلام کی گردنیں برطانیہ کے آستانہ عظمت پر جھکا دی جائیں اور سید مرحوم یورپ کے ارباب استعمار کے خلاف مسلمانوں میں ایک روح بغاوت پیدا کرنا چاہتے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں نے قادیانی تحریک کی طرف توجہ دی تو انہوں نے سب سے پہلے اس تحریک کے سیاسی پہلو کی جانب توجہ کی جسے علماء نے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ختم نبوت کے مسئلہ کی اہمیت کی جانب لوگوں کو توجہ دلائی۔ قادیانی تحریک کے عقائد کا

تجزیہ کیا۔ ان عناصر وعوامل کے چہرے سے نقاب الٹ دیا جو اس تحریک کو بروئے کار لے آئے ہیں۔ انہوں نے نہایت ناساز گار اور غیر مساعد حالات میں اس مسئلہ کی جانب توجہ کی جن دنوں انہوں نے پہلے پہل اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ قادیانیوں کی تبلیغی سرگرمیوں خصوصاً ولایت کے تبلیغی مشن نے مسلمانوں میں ان کے متعلق ایک گونہ حسن ظن پیدا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ خود مسلمانوں کے اکابر بھی اسی راہ وفا کے جاں سپار بن چکے تھے جسے طے کرنے میں قادیانی جماعت عرصے سے مصروف تھی۔ اس لیے مسلمانوں نے اس تحریک کی سیاسی مضرتوں کی جانب زیادہ توجہ نہ کی لیکن مولانا کے پائے ثبات وعزم کو لغزش نہ ہوئی اور وہ پورے تیس سال تک صبر واستقامت سے اس کام میں مصروف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ملک کے گوشہ گوشہ میں قادیانی جماعت کے خدع ومکر کا جو احساس پیدا ہو گیا ہے، وہ مولانا ہی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔

افسوس ہے کہ مولانا نے قادیانیوں کے متعلق جو مضامین لکھے، وہ سب کے سب محفوظ نہیں رہے۔ اخبار کے بعض فائل جن میں یہ مضامین چھپے تھے، مولانا کی قید اور نظر بندی کے زمانے میں گم ہو گئے تھے۔ اس لیے جب پچھلے سال بعض احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر مولانا نے انہیں کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا تو بعض مضامین جو انہوں نے بڑی کاوش سے لکھے تھے، نہ مل سکے۔ لیکن جو مضامین ''زمیندار'' اور ''ستارہ صبح'' کی فائلوں میں ملے، وہ بھی اس قدر زیادہ تھے کہ انہیں ایک جلد میں شائع کرنا ناممکن تھا۔ آخر یہ طے پایا کہ فی الحال ان مضامین کا ایک مختصر سا انتخاب شائع کر دیا جائے۔ لیکن اسی زمانے میں ''زمیندار'' کے پریس کی ضبطی کا واقعہ پیش آیا اور اخبار سے ضمانت طلب کر لی گئی۔ ابھی اس مصیبت سے رہائی نہیں ہوئی تھی کہ مولانا کو کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ارمغانِ قادیاں جسے اعلان کے مطابق 1935ء کے آغاز میں شائع ہو جانا چاہیے تھا، 1936ء میں شائع ہو رہی ہے۔

ارمغانِ قادیاں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، حصہ نظم اور حصہ نثر: حصہ نظم میں آپ کو بعض نظمیں ایسی ملیں گی جن میں قادیانیوں کے متعلق صرف ایک آدھ شعر آ گیا ہے۔ بعض نظمیں ایسی ہیں جن میں سنجیدگی سے قادیانی عقائد پر بحث کی گئی ہے لیکن بیشتر نظموں میں طنز وہجو کا انداز غالب ہے۔ مولانا کی شاعری پر اس زمانے کے بعض نقادوں کو سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ وہ انوری وخاقانی کی طرح یا تو قصیدہ اچھا لکھ سکتے ہیں یا ہجو میں خوب چمکتے ہیں۔ لیکن

دراصل یہ خیال مشرقی شاعری کے سطحی مطالعہ اور کم نظری پر مبنی ہے۔ اگر مولانا ظفر علی خاں کو انوری اور خاقانی کی طرح محض مدح طراز اور ہجو گو کہا جا سکتا ہے تو اردو اور فارسی کا کوئی شاعر اس اعتراض سے نہیں بچتا۔ ہمارے **متغزلین** کو لیجیے ان کی شاعری کے بھی یہی دو عنصر ہیں یعنی وہ محبوب کی تعریف کرتے ہیں اور رقیب، واعظ، شیخ، زاہد، ناصح محتسب کی ہجو اور اس معاملہ میں وہ انوری اور خاقانی سے کم نہیں۔ اگر ہجو کا عنصر غزلوں سے خارج کر دیا جائے تو ان میں کیا رہ جاتا ہے۔

لیکن مولانا اس معاملہ میں بھی تمام قدیم شعرا پر تفوق رکھتے ہیں۔ قصیدہ نگار شعرا کے نزدیک مدح سلاطین و امرا کے تقرب کا وسیلہ اور معاش کا ذریعہ تھی۔ ہجو سے وہ لوگوں کو مرعوب کر کے کچھ نہ کچھ لے مرتے تھے یا پھر ممسک اور بخیل امرا کو گالیاں دے کر اپنا جی خوش کر لیا کرتے تھے۔ اسی طرح غزلوں میں بھی رقیب، شیخ اور ناصح کی ہجو محض ایک رسمی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ دوسری جانب مولانا کے ہجو یہ کلام کو دیکھیے کہ اس میں ایک بلند مقصد نظر آتا ہے۔ وہ قادیانیوں کی ہجو اس لیے نہیں کرتے کہ اس جماعت سے کوئی ذاتی کاوش ہے یا کسی پرانی رسم کی پابندی مقصود ہے بلکہ وہ اس جماعت کے وجود کو ساری کائنات انسانی کے لیے مضر سمجھتے ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی مولانا ظفر علی خاں کی عقیدت کا حقیقی مرجع ہے۔ ان کی نعتوں میں جس قسم کا جوش و خلوص پایا جاتا ہے، اس سے تقریباً تمام نعت گویوں کا کلام خالی نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری کے متغزلانہ اوصاف انہیں نعتوں میں نمایاں ہوتے ہیں اور ارباب تغزل کی طرح ان کے قلم سے بھی کہیں کہیں ایک آدھ ہجو یہ شعر نکل جاتا ہے۔ انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کو ہجو و طنز کا ہدف بننے کے لیے منتخب کیا ہے جو حضور خاتم النبیین ﷺ کی ہمسری کے مدعی اور ایک نعت گو شاعر کا نشانہ غیظ بننے کے لیے بے حد موزوں ہیں۔

ان کے کلام پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ مرزا بشیر الدین محمود کی زندگی کے بعض خاص مشاغل کا ذکر نہایت بے باکی سے کرتے ہیں۔ اس مجموعہ کی بعض دلآویز نظمیں مثلاً اطالوی حسینہ، مس روفو، حسن آباد بیاس وغیرہ اسی قسم کے واقعات سے متعلق ہیں۔ میرے خیال میں مرزا جیسے صاحب ادعا لوگوں کے معاملہ میں یہ طریقہ اختیار کرنا ہرگز معیوب نہیں۔ وہ مدعی الہام ہیں۔ اپنے آپ کو دنیا کا مقدس ترین انسان اور اپنی جماعت کو مقدس ترین گروہ سمجھتے ہیں۔ ان کے دعاوی کی صداقت کو جانچنے کا سب سے زیادہ آسان طریقہ یہ ہے کہ ان کے اعمال کو اخلاق کے

مسلمہ معیار پر پرکھا جائے۔ اگر وہ اوران کے رفقا جنہیں مسیح موعود کے صحبت یافتہ ہونے کا دعوے ہے، باعتبار مکارم اخلاق عام لوگوں سے بہتر نہیں، تو یہ نتیجہ نکال لینا نہایت سہل ہے کہ مرزا غلام احمد اپنے دعوؤں میں سچے نہیں تھے۔

میں نے بعض لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کی شاعری ہنگامی ہے۔ اس لیے ان کا کلام زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکے گا۔ میں اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ اس کا فیصلہ تو مستقبل کرے گا کہ مولانا کی شاعری زندہ رہتی ہے یا مٹ جاتی ہے۔ تاہم انہیں اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ بعض ہنگامی مسائل محض شاعر کے زور قلم کی بدولت حیات دوام حاصل کر لیتے ہیں۔ کتنے ہی غیر معروف اشخاص ایسے ہیں جنہیں تاریخ نے فراموش کر دیا لیکن شاعری نے انہیں یاد رکھا اور آج محض شعرا کے طفیل ان کے نام بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ اور کتنے ہی معمولی واقعات جن پر صدیوں کی طویل مدت گزر چکی ہے محض شعرا کی مسیحائی کے باعث آج تک زندہ ہیں۔ اس کے لیے زیادہ تلاش اور محنت کی ضرورت نہیں۔ انگریزی شاعری میں آپ کو اس قسم کی ہزاروں مثالیں مل سکتی ہیں۔ بہرحال یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا فیصلہ ہم اور آپ نہیں کر سکتے۔ اسے مستقبل کے حوالے کر دینا چاہیے جو اس قسم کے مسائل کا بہتر جج ہے۔

''ارمغان قادیاں'' میں جو نظمیں شامل ہیں وہ مولانا کے پورے کلام کا عشر عشیر بھی نہیں اور اس لیے صرف انہیں نظموں کو پیش نظر رکھ کر ان کی شاعرانہ عظمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال اس مجموعہ میں ان کی بعض بہترین نظمیں شامل ہیں جن کے ہر شعر سے ان کی قدرت کلام ظاہر ہے۔ میں یہاں نمونے کے طور پر ان کے اشعار نقل نہیں کرنا چاہتا کیونکہ ان میں اکثر مسلسل نظمیں ہیں جنہیں تمام وکمال پڑھنے سے ان کی خوبیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ درحقیقت اپنے عہد کے بہترین شاعر ہیں اور جہاں تک قدرت کلام کا تعلق ہے ہندوستان میں ان کا کوئی مدمقابل نہیں۔ شاعری کے تمام اجزا و عناصر کو پیش نظر رکھا جائے تو علامہ اقبال کے بعد زبان قلم پر انہی کا نام آتا ہے اور طنزیہ شاعری میں لسان العصر اکبر کے بعد انہی کا درجہ ہے لیکن مجھے ان کی جس خصوصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، وہ بداہت وارتجال ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ میں بعض ایسی نظمیں بھی ہیں جو پانچ یا سات منٹ میں لکھی گئی ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ کسی شخص نے ان سے شعر کہنے کی فرمائش کی اور انہوں نے نہایت بے تکلفی سے اس طرح شعر لکھوانے

شروع کر دیے گویا پوری نظم انہوں نے پہلے ہی لکھ رکھی تھی۔

نظم کی طرح وہ نثر میں بھی صاحب طرز استاد ہیں۔ فارسی زبان کی پُرشکوہ ترکیبوں، نادر استعاروں اور تشبیہوں سے وہ الفاظ کا ایسا طلسم باندھتے ہیں جس سے سامعہ بے اختیار مرعوب ہو جاتا ہے۔ اردو کے محاورات پر انہیں بے حد قدرت ہے اور ان کی زبان کی صحت ان لوگوں کے نزدیک بھی مسلم ہے جو پنجاب کے کسی ادیب یا شاعر کو شائستہ التفات نہیں سمجھتے۔ غرض مولانا ظفر علی خاں نظم و نثر کے جامع ہیں اور اگر ان کی قومی و ملی خدمات سے قطع نظر کر کے بھی دیکھا جائے جب بھی محض کمالات شعر و ادب کے اعتبار سے ان کا وجود ملک کے لیے ایک گراں بہا نعمت ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میرا قلم مولانا ظفر علی خاں کے کارناموں سے پوری طرح انصاف نہیں کر سکا۔ لیکن زمانے نے ان سے انصاف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کی عظمت کا یہ اعتراف کیا کم ہے کہ قادیانیوں کے متعلق انہوں نے جو تحریک شروع کر رکھی تھی، اس سے آج سارا ہندوستان گونج رہا ہے اور وہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ؎

مئے کہ تلخی آنست در گلوئے دو کون
کمینہ جرعہ تہِ بادہ ہائے دوش من است

....

حواشی

(1) راقم الحروف کے نزدیک مرزا قادیانی کا ذوق تبلیغ بھی سیاسی مصالح کی پیداوار ہے۔ انگریزی حکومت کے استحکام کے لیے یہ ضروری تھا کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کو آپس میں لڑا دیا جائے اور مرزا غلام احمد قادیانی اور سوامی دیانند نے یہ خدمت جس خوش اسلوبی سے انجام دی اور ہمیشہ ان کے لیے شرمندگی کا باعث رہے گی۔

(2) جدید تحقیق سے ثابت ہو گیا ہے کہ بابی تحریک روس کے سیاسی مصالح کی مخلوق تھی۔

نسیم عنایت اللہ سوہدروی

مولانا ظفر علی خاں اور فتنہ قادیانیت

مولانا ظفر علی خاں، برصغیر ہندو پاک کے وہ پہلے راہنما ہیں جنہوں نے برطانوی استعمار و ملوکیت کی بیخ کنی کے ساتھ ہی ساتھ انگریز کے خود کاشتہ پودے یعنی مرزائیت کی پوری شدومد سے مخالفت کی اور ساری عمر اس کے خلاف مصروف جدوجہد رہے۔ اسی لیے نام نہاد روشن خیال و ترقی پسند گروہ جسے دین حنیف کی روایات سے ذرا لگاؤ نہیں اور اشترا کی حضرات جنہیں مذہب کے نام سے چڑ ہے، ظفر علی خاں کو رجعت پسند، تنگ نظر ملّا جیسے خطابات سے نوازتے رہے۔ جہاں تک اندازہ ہوتا ہے، مولانا کے نزدیک اس فتنۂ ضالہ کی مخالفت کی وجوہ حسب ذیل تھیں:

1...... اوّل یہ کہ وہ اسلام کی حقانیت وصداقت پر اور حضور ﷺ کی ختم المرسلینی پر سچے دل سے ایمان رکھتے تھے اور ملت کی چہاردہ سالہ پوری تاریخ پر نظر رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ پوری ملت اسلامیہ اس امر پر متحد ہے کہ سرکار دوعالم تاجدار مدینہ ﷺ پر ہر قسم کی نبوت ختم ہوگئی۔ اب اس کے بعد ظلی و بروزی نبوت کا ڈھونگ حضور ﷺ کی شان میں گستاخی ہے بلکہ صریحاً کفر ہے۔ چنانچہ ایک جگہ انہوں نے اس کا اظہار یوں کیا ہے:

آدم کی نسل پر ہوئی حجت خدا کی ختم — دنیا میں آج دین کی تکمیل ہوگئی
اپنی مثال آپ تھی جو آخری نوید — آفاق پر حوالۂ جبرئیل ہوگئی

2...... ان کی مخالفت کی دوسری وجہ افرنگ دشمنی تھی۔ مولانا انگریز کے ازلی حریف ومخالف تھے۔ ان کا اس امر پر یقین تھا کہ انگریز ہی نے پوری دنیائے اسلام میں سازشوں کا جال بن رکھا ہے تاکہ ملت اسلامیہ بیدار ہو کر اپنے اصلی مقام سے آشنا نہ ہوجائے۔ بنابریں وہ خوب سمجھتے تھے کہ مرزائیت انگریز کا خود کاشتہ پودا ہے جس کا مقصد اپنے اغراض کے استعماری مقاصد کے لیے

مسلمانوں کے دلوں سے جذبۂ جہاد کو ختم کر کے انہیں انگریزی حکومت کی اطاعت ووفاداری پر تیار کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مرزا بشیر الدین محمود قادیانی (جسے مولانا نے ''موسیو'' کا خطاب دے رکھا تھا اور ان کے ابّا مرزا غلام احمد قادیانی کو جو انگریزی حکومت کی وفاداری کو جز وایمان سمجھتے اور اس لیے آیۂ رحمت قرار دیتے تھے کہ اس کے سایہ میں ان کا کاروبار فروغ پا سکے) کو تحریک آزادیٔ ہند کی راہ میں زبردست روڑا سمجھتے تھے۔ لہٰذا اس کے فریب کارانہ عزائم سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا اپنا ملّی فریضہ سمجھتے اور اس کی گوشمالی جز وایمان تصور فرماتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جب سے مولانا ظفر علی خاں نے ''زمیندار'' سنبھالا اور سیاسی زندگی میں قدم رکھا، تحریر وتقریر اور نظم ونثر کے ذریعے عمر بھر اس فتنۂ ضالہ کے خلاف مصروف جہاد رہے۔ اپنے ہفت روزہ اخبار ''ستارہ صبح'' میں دلائل وشواہد عملی وعقلی سے ''احمد کون ہے''، ''**الولد سرّ لابیه**''، ''**القادیان ماالقادیان**'' جیسے معرکہ آرا مضامین لکھے۔ نظم میں اس پر مولانا نے جو کچھ لکھا، اسے اہل علم خوب جانتے ہیں۔

گزشتہ جنگ عظیم اوّل (**1914**ء تا **1918**ء) میں ''فتح بغداد'' یعنی جب برطانیہ اس پر ''قابض'' ہوگیا تو قادیان میں چراغاں کیا گیا۔ پھر ترکیہ کی شکست پر قادیان میں جشن مسرّت منایا گیا۔ اس پر مولانا ظفر علی خاں شعلہ بدامن ہوگئے اور اس فرقۂ ضالہ کے خلاف اور زیادہ شدت سے میدان میں اترے۔ اس دور میں ''الفضل'' نے **13** اکتوبر **1917**ء کے پرچہ میں ''زمیندار'' اور ''ستارہ صبح'' کے زور دار مضامین سے بوکھلا کر ایک اپیل ''صلح'' شائع کی تو مولانا نے شرائط متارکہ کے طور پر جواب دیا کہ مرزائی حضرات:

☆...... ''مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی قرار دینا چھوڑ دیں۔

☆...... لسان شرح مبین میں چوں کہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا لقب انبیائے ذی شان کی طرح حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لیے اسی طرح مخصوص ہے جس طرح بادشاہوں کے لیے ہز میجسٹی۔ لہٰذا آئندہ مرزا غلام احمد کو ''علیہ الصلوٰۃ والسلام'' نہ کہیں۔ ایسے ہی ازواج مطہرات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی طرح مرزائی، مرزا قادیانی کی بیویوں کو ''ام المؤمنین'' کہہ کر اس مقدس نسبت کی توہین نہ کریں۔

☆...... اپنے کافرانہ اور انوکھے عقائد صرف اپنے اور اپنی جماعت تک محدود رکھیں۔ مسلمانوں

میں اس کی قطعاً تبلیغ نہ فرمائیں۔ لیکن اگر آپ مرزائیوں کو یہ شرائط نامنظور ہیں تو پھر ناموس رسالت ﷺ وشریعت مطہرہ کا تقاضا ہوگا کہ ہمارا قلم حرکت میں آئے اور پردۂ ضلالت چاک کرتا جائے۔" (ستارہ صبح یکم نومبر **1917**ء)

چنانچہ اس پر مولانا نے: "**القادیان ماالقادیان وما ادراک ماالقادیان**" کے عنوان سے مندرجہ بالا شرائط پیش کیں، مگر جب وہ باز نہ آئے تو پھر علماء کو مخاطب کر کے یوں ارشاد فرمایا:

یہ فتنہ بڑھ چلا ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو
نہیں اے عالمان دیں میں تم سے بے سبب شاکی
بشیرالدین محمود آج پھیلاتا ہے بے کھٹکے
فرنگستان میں جاکر خرافات اپنے باوا کی

اور مسلمانوں سے یوں خطاب کیا:

کہاں پنجاب میں اسلام! تیری اٹھ گئی غیرت
بٹھایا کفر کو لا کر نبی ﷺ کے ہم نشینوں میں
حدیث **اسمه احمد** غلام احمد پہ چسپاں ہو؟
پڑے خاک اس سلیقے پر، لگے آگ ان قرینوں میں
کھلونا قادیاں کا بن گئی وہ سطوت کبریٰ
ہے اب تک شور جس کا آسمانوں اور زمینوں میں

(ستارہ صبح **24** جنوری **1918**ء)

اس سے قبل "قادیان کا تھیٹر" اور "قول فیصل" کے عنوان سے مولانا نے ایک معرکۃ الآراء نظم لکھی جو ستارۂ صبح یکم نومبر **1917**ء کی اشاعت میں شائع ہوئی جس کے آخری دو تین شعر یہ ہیں:

اکملت لکم پڑھ کر زبان عربی میں
ظلی و بروزی کی نبوت کو مٹا دوں
ہے جن کو محمد ﷺ کی مساوات کا دعویٰ
مثواهُ جهنم کی وعید اُن کو سنا دوں

کچھ فرق بروز اور تناسخ میں نہیں ہے
انکار ہو جن کو انہیں اقرار کرا دوں
اسلام سے جس قوم کو ہے کچھ بھی محبت
میں اُس کے لیے راہ میں آنکھوں کو بچھا دوں

بلکہ اب مولانا کھلم کھلا اس خیال کا اظہار کرنے لگے کہ مذہبی مباحثوں اور مناظروں کے بجائے اس فتنہ کی اصل سیاسی و مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کو آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس فرقۂ ضالہ کے مقاصد، عزائم وافکار اس کے بانی کی تحریروں سے پیش کر کے ملت اسلامیہ کو ان ناپاک مقاصد سے آگاہ کیا اور دلائل سے ثابت کیا کہ اس استعماری ناپاک سازش کو کن وجوہ سے جامۂ عمل پہنایا جا رہا ہے۔

اسی دوران جنگ عظیم کے خاتمہ کے کچھ دیر بعد مولانا حضرو ضلع اٹک میں ایک تقریر کی بناء پر پانچ سال کے لیے نذر زنداں ہوگئے۔ رہائی کے بعد ملک میں متعدد اہم مسائل پیدا ہوگئے۔ مثلاً فتنۂ شدھی و سنگھٹن جیسی اسلام دشمن تحریکیں اور فتنۂ راجپال وارتمان۔ ادھر حجاز میں سلطان عبدالعزیز ابن سعودؒ کے برسر اقتدار آنے پر برعظیم ہندوپاک کے دو گروہوں میں جنگ برپا تھی۔ مولانا ابن سعود کے حامیوں میں تھے۔ ادھر کابل میں حکومت افغانستان نے دو مرزائیوں کو مرتد قرار دے کر قتل کرا دیا تھا جس پر بشیرالدین محمود بے حد برہم ہوئے۔ چنانچہ اسی غرض کے لیے لندن بھی گئے تاکہ حکومت برطانیہ کو حکومت افغانستان کے خلاف ابھارا جائے۔ مولانا نے اس پر ''زمیندار'' میں لکھا:

عناد اور بغض کی تصویر بن کر
گئے لندن بشیر الدین محمود
یہ مقصد آپ کا ہے اس سفر سے
کہ سرحد پر بچھا دی جائے بارود
دکھائے یورپ آ کر اس کو بتی
جہنم کی لپٹ جس میں ہو موجود

یہ ساری سرزمیں پھر بھک سے اڑ جائے
اور افغانوں کی جمعیت ہو نابود
کوئی اس دین کے دشمن کو سمجھائے
کہ ساری کوششیں تیری ہیں بے سود
بھلا برطانیہ کو کیا پڑی ہے
کہ دوزخ میں تری خاطر پڑے کود
ہے تو بھی کیا کسی کرنل کی میم
بھگا کر لے گئے ہوں جس کو مسعود

مولانا نے اس دور میں حکومت افغانستان کے اس اقدام کی پوری حمایت کی۔قتل مرتد کی تائید میں ''زمیندار'' میں متواتر دو ہفتہ تک مقالات لکھے۔مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا آزاد اس مسئلہ میں دوسری رائے رکھتے تھے جس پر مولانا ظفر علی خاں اور ان کے درمیان خاصی بحث ہوئی، تا آں کہ **1931**ء تا **1932**ء میں قادیانیت کے فتنہ نے پوری شدت اختیار کر لی۔مثال کے طور پر، تحریک آزادی کشمیر کے دوران جب کشمیر کمیٹی بنائی گئی تو اس میں نہ صرف یہ کہ قادیانیوں کو شریک کیا گیا بلکہ مرزا بشیر الدین محمود صدر بنا لیے گئے۔مولانا نے اس خطرہ کو پوری طرح بھانپ لیا اور اندازہ لگایا کہ اب یہ یہودیت کی طرح خطرناک تحریک بننے والی ہے۔چنانچہ انہوں نے ''زمیندار'' میں سلسلۂ مضامین شروع کیا۔ادھر ظفر اللہ خان قادیانی کی وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں شرکت کا مسئلہ تھا جسے مولانا، بطور مسلمانوں کے نمائندہ کے قبول کرنے پر قطعاً تیار نہ تھے۔چنانچہ ان کی تحریک پر پورے (متحدہ) ہندوستان میں ظفر اللہ خان قادیانی کے تقرر کے خلاف احتجاج شروع کیا گیا جس پر (برطانوی) حکومت ہند کے کان کھڑے ہو گئے مگر سر فضل حسین کی کوششوں سے ظفر اللہ خان کو حکومت ہند کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن نامزد کر لیا گیا۔مولانا نے اس پر شدید احتجاج ہی نہیں کیا بلکہ سر فضل حسین کی بھی خبر لے ڈالی۔بس پھر کیا تھا، اس جرم حق گوئی میں کسی مضمون کی آڑ لے کر ''زمیندار'' کی ایک ہزار روپیہ کی ضمانت ضبط کر لی اور مزید چار ہزار روپیہ طلب کر لیا گیا جسے مولانا نے جلد ہی ادا کر دیا اور ''زمیندار'' اپنی روایتی شان

سے بدستور میدان عمل میں گامزن ہوگیا اور اعلان کیا:

سن لے جسے بخشی گئی ہو سننے کی توفیق
ہو گی نہ کبھی بند ''زمیندار'' کی آواز

اسی سال انجمن ''حمایت اسلام'' کے سالانہ کھلے اجلاس میں مولانا نے ارباب انجمن کی مرضی کے خلاف اس مضمون کی قرارداد منظور کرادی کہ ظفر اللہ خاں قادیانی مسلمانوں کا نمائندہ ہرگز نہیں۔ نہ اس پر مسلمان عوام کو کوئی اعتماد ہے۔ اگر حکومت اسے ایگزیکٹو کونسل میں ضرور رکھنا چاہتی ہے تو قادیانی فرقہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر اسے ان کا نمائندہ سمجھا جائے۔ مسلمان اسے اپنا ترجمان کبھی تسلیم نہ کریں گے۔ اس طرح غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کی قرارداد سب سے پہلے مولانا نے اس اجلاس میں پیش کی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ظفر اللہ خان قادیانی بھی ان دنوں اسی حق میں تھے کہ انہیں جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے، میں ان کی نمائندگی کروں گا۔ نیز مولانا نے تقریر و تحریر کے ذریعے ملت اسلامیہ کو ان خدشات سے آگاہ کیا جو قادیانیوں کو مسلمانوں کا نمائندہ بنائے جانے سے لاحق ہو سکتے تھے مگر سر فضل حسین، ظفر اللہ خان کے مؤید بن کے سامنے آ گئے اور پوری قوت سے حکومت میں اس کی پشت پناہی کی جس پر مولانا نے ''زمیندار'' میں یوں لکھا:

قادیاں خوش ہو کہ فرماتے ہیں سر فضل حسین
جناب میرزا غلام احمد ہیں سرکاری نبی
غرق بیڑا کمتریں کا ہو گیا پنجاب میں
گرچہ یہ فدوی ہے انگریزوں کا درباری نبی

یہ وہ دن تھے کہ ''زمیندار'' مسلسل اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے خم ٹھونک کر سامنے آ چکا تھا۔ 1932ء میں اسی ''جرم'' کی وجہ سے پولیس پر تنقید کے بہانے ''زمیندار'' کی ضمانت کا دو ہزار روپیہ ضبط کر کے مزید چار ہزار روپیہ طلب کر لیا گیا۔ پندرہ دن کی بندش کے بعد ''زمیندار'' ضمانت ادا کر کے 14 جنوری 1933ء کو پھر آن موجود ہوا اور صفحہ اوّل پر مولانا یوں گویا ہوئے:

ملت بیضا کی عزت کا طلب گار آ گیا
سطوت کبریٰ کی شوکت کا علم دار آ گیا

جس نے ہر میدان میں باطل کو شکست فاش دی
شکر حق کا وہ شیر افگن علم دار آ گیا
خم کے خم جس نے مئے یثرب کے خالی کر دیئے
آج پھر محفل میں وہ رند قدح خوار آ گیا
جس نے سیکھا موت سے راز حیات جاوداں
اپنی قسمت کا وہ ہو کر آپ مختار آ گیا
امر حق کے واشگاف اعلان کا خمیازہ کش
ہر مصیبت کے لیے پھر ہو کے تیار آ گیا
پندرہ دن بند رہ کر پھر کھلی میری زباں
پھر نوا سنج فغاں ہوکے ''زمیندار'' آ گیا

اگرچہ ضمانت کی ضبطی اور طلبی میں میرزائیت کے خلاف تحریروں اور تقریروں کو بظاہر بہانہ نہیں بنایا گیا تاہم مولانا اور ''زمیندار'' کے قارئین جانتے تھے کہ اصل جرم کیا ہے۔ اسی لیے مولانا نے محسوس کیا کہ وقت آ گیا ہے کہ قوم کے ذہین و ہونہار طبقہ کو مرزائیت کے ہولناک نتائج سے آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے مولانا نے ایک مستقل تنظیم ''مجلس دعوت وارشاد'' کے قائم کرنے کی داغ بیل ڈالی۔

''مجلس دعوت وارشاد'' کے قیام کے بعد جامع مسجد مبارک اہل حدیث لاہور میں باقاعدہ جلسوں کا پروگرام بنالیا گیا جس میں ہر مکتبہ فکر کے علماء وقائدین شریک تھے۔ مولانا احمد علیؒ امیر انجمن خدام الدین لاہور، مولانا محمد بخش مسلم، مولانا حبیب اللہ، مولانا لال حسین اختر مرحوم، مولانا عبدالحنان مرحوم اور خان احمد یار خان مرحوم جیسے لوگوں کے نام قابل ذکر ہیں۔ لیکن انگریزی حکومت کیسے برداشت کرسکتی تھی کہ ملّت کا ذہین و ہونہار طبقہ اس فرقۂ ضالہ کے گمراہ کن وایمان سوز عزائم سے آگاہ ہوجائے۔ چنانچہ مارچ 1933ء میں حکومت نے ان جملہ حضرات کو ''اندیشۂ نقض امن'' کے سلسلہ میں گرفتار کرلیا۔ گویا قادیانی خلافت کے دجل کا پردہ چاک کرنا اندیشۂ نقض امن کے ذیل میں آتا ہے جس پر مسلمان عوام بے حد مشتعل ہوئے مگر رہنمایان کرام کے ارشاد کے تحت پرامن رہے۔

4 مارچ 1933ء کو مولانا اور ان کے رفقاء کو ایک اعلیٰ مجسٹریٹ کی عدالت میں لایا گیا جس کی روداد ''زمیندار'' 7 مارچ 1933ء کے ضمیمہ میں یوں درج ہے: ''مجاہدین دین حق مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالحنان، مولانا لال حسین اختر، خان احمد یار خان جیل میں پرستاران رب کعبہ کو متنبیّ قادیان اور اس کی امت کے دجل و آزار سے بچانے کی سزا میں ایک منٹ کے کروڑویں حصہ کے لیے اعلان حق سے باز رہنے کو تیار نہیں۔''

''میں قانون محمدی ﷺ کا پابند ہوں، جیل کے درو دیوار بھی یہی صدا دیں گے کہ مرزا قادیانی دجال ہے۔'' ''اعلائے کلمۃ الحق سے باز رہنے اور نیک چلنی کی ضمانت دینے سے صاف انکار۔''

کمرۂ عدالت میں مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ فاتح قادیان اور مولانا داؤد غزنوی مرحوم بھی موجود تھے۔ مولانا احمد علی مرحوم، مولانا محمد بخش مسلم اور مولانا حبیب اللہ نے ضمانت داخل کرادی مگر دوسرے چاروں حضرات نے انکار کر دیا اور یوں مولانا ظفر علی خاں اور ان کے رفقاء سب سے اوّل مرزائیت کے خلاف نذر زنداں ہوئے۔ (مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی گرفتاری 2 جون 1933ء کو اس کے بعد عمل میں آئی)

لاہور 4 مارچ 1933ء آج مولانا ظفر علی خاں اور ان کے رفقاء مولانا عبدالحنان، مولانا احمد علی، مولانا لال حسین اختر، مولانا حبیب اللہ، مولانا محمد بخش مسلم اور خان احمد یار خان کے خلاف زیر دفعہ 107۔الف ضابطہ فوجداری سماعت کی تاریخ تھی۔ ٹھاکر کیسر سنگھ مجسٹریٹ درجہ اوّل کی عدالت کے باہر مسلمانوں کا زبردست اجتماع تھا۔ صبح ہی سے مسلمان جوق در جوق آ رہے تھے۔ ہر طرف ایک عجیب جوش و خروش تھا۔ کہا جاتا ہے کہ گورا فوج بھی موجود تھی جو حفظ ماتقدم کے طور پر ضلع کچہری میں لا کھڑی کر دی گئی تھی۔ پولیس کا کافی پہرہ تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی۔ سیڈلی، حسین شاہ کوتوال شہر، آغا عبدالرشید سب انسپکٹر، مہتہ ایشر داس نیز پولیس کے دوسرے افسر اور سپاہی موجود تھے۔ عدالت میں اسیران کے علاوہ مولانا داؤد غزنوی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری فاتح قادیان، چودھری غلام حیدر خان اور دیگر حضرات موجود تھے۔ مولانا ظفر علی خاں جونہی کمرۂ عدالت کے سامنے آئے۔ فضا اللہ اکبر، اسلام زندہ باد اور مولانا ظفر علی خاں زندہ باد، مولانا

عبدالحنان زندہ باد، مولانا لال حسین اختر زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی۔ اس موقع پر مولانا داؤد غزنوی کو ایک سپاہی نے پیچھے دھکیلنا چاہا اور گستاخی سے پیش آیا۔ مگر لیڈروں کے تدبر سے معاملہ رفع دفع ہوگیا، ورنہ حالات نازک ہو جاتے۔''

ٹھیک گیارہ بجے ٹھاکر کیسر سنگھ مجسٹریٹ درجہ اوّل کی عدالت میں سماعت شروع ہوئی۔ سب سے اوّل زعمائے اسلام مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عبدالحنان وغیرہ کو ریڈر نے اس نوٹس کی عبارت پڑھ کر سنائی کہ چونکہ تمہارے اور قادیانی جماعت کے درمیان اختلاف ہے۔ تم نے ان کے عقائد اور ان کے مذہبی پیشواء پر اپنے جلسوں میں حملے کیے ہیں جس سے نقض امن کا اندیشہ ہے، اس لیے وجہ بیان کرو کہ تم سے کیوں نہ نیک چلنی کی ضمانت طلب کی جائے۔ ادھر کمرۂ عدالت سے باہر مسلمان نعرہ تکبیر بلند کر رہے تھے جس سے عدالت کی کارروائی میں خلل واقع ہو رہا تھا۔ اس پر پولیس نے مولانا ظفر علی خاں سے درخواست کی کہ وہ مجمع کو خاموش رہنے کی تلقین کریں۔ چنانچہ مولانا نے کمرۂ عدالت سے باہر نکل کر مسلمانوں کو امن و اسلام کا واسطہ دے کر (جو اسلام کا مقصد حقیقی ہے) اپیل کی کہ وہ خاموشی سے عدالت کے سائبان سے نکل جائیں۔ چنانچہ مجمع نے مولانا کے اس حکم کی تعمیل کی اور خاموش ہوگیا۔ استغاثہ کی طرف سے رائے بہادر ایشر داس ڈی۔ ایس۔ پی اور ملزموں کی طرف سے خواجہ فیروز الدین بار ایٹ لاء، مسٹر فرخ حسین، خلیفہ شجاع الدین، میاں احمد دین اور دیگر سرکردہ وکلاء موجود تھے۔ نوٹس سنائے جانے کے بعد عدالت نے تمام ملزموں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''تا فیصلہ مقدمہ زیر دفعہ 107 ضابطہ فوجداری تا سماعت مقدمہ حفظ امن کے طور پر دو ہزار کی ضمانت اور پانچ صد روپیہ حاضری دیں۔ اس دوران جب تک مقدمہ کی سماعت جاری ہے، کسی قسم کا جلسہ یا کارروائی ایسی نہ کریں جس سے امن میں خلل واقع ہو۔'' اس پر مولانا ظفر علی خاں نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ اس مقدمہ کا جلد از جلد فیصلہ کیا جائے تاکہ عدالت کا وقت ضائع نہ ہو۔ البتہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں مرزائیوں کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے گا۔ البتہ ہم یہ حق محفوظ رکھتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو ایک بار نہیں، ہزار بار دجال کہیں گے، جس نے حضور نبی کریم ﷺ کی ختم المرسلینی میں اپنی نبوت کا ناپاک پیوند

جوڑ دیا۔ ناموس رسالت ﷺ پر کھلم کھلا حملہ کیا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ پر رسالت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ جو شخص اسے نہ مانے، وہ دجال ہے۔ میں اپنے عقیدہ کے اعلان سے ایک منٹ یا ایک منٹ کے کروڑویں حصہ کے لیے بھی دست کش ہونے کو تیار نہیں۔''

مجسٹریٹ نے جواب دیا: ''میں قانون کا پابند ہوں، یہ ضمانت عارضی ہے۔ دوران مقدمہ عدالت کو حق حاصل ہے کہ اسے منسوخ کر دے۔ مولانا نے مخصوص انداز میں فرمایا: ''آپ انگریزی قانون کے پابند ہیں، میں محمدی قانون کا پابند۔ اس حق آزادی کے پیش نظر میں ایسی ضمانت پر جو تحریر و تقریر پر پابندی عائد کرے، جیل کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ اصول کا سوال ہے۔'' مزید فرمایا کہ: ''میں مسلمان ہوں اور مرزا قادیانی کو دجال کہنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں۔ جیل کے در و دیوار یہی صدا سنیں گے کہ مرزا دجال تھا، دجال تھا، دجال تھا۔''

اس پر عدالت نے دوسرے ملزموں سے استفسار کیا۔ مولانا احمد علی، مولانا محمد بخش مسلم اور مولانا حبیب اللہ نے نیک چلنی کی درخواست داخل کر دی۔ دوسرے چاروں نے انکار کر دیا۔ خلیفہ شجاع الدین ثالث بالخیر بن کر مولانا کو سمجھانے گئے مگر انہوں نے تسلیم نہ کیا۔ مولانا اور ان کے تینوں رفقاء (مولانا لال حسین اختر، مولانا عبدالحنان اور خان احمد یار خان) جیل چلے گئے۔ مولانا اور ان کے رفقاء کی روانگی پر مجمع کثیر ہو گیا اور دیر تک زندہ باد کے نعرے گونجتے رہے۔

کمرہ عدالت سے باہر آ کر مولانا نے حسب ذیل تاریخی پیغام دیا ''ہم آج تک اپنا مذہبی اور دینی فرض سمجھ کر وطن و ملت کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے آئے ہیں۔ آج ہم خالصتاً دین اور ناموس رسول ﷺ کی خاطر جیل جا رہے ہیں۔ ہم ایک منٹ کے کروڑویں حصہ کے لیے بھی یہ ضمانت دینے کو تیار نہیں کہ میرزا غلام احمد قادیانی کے کفر و ارتداد اور دجل کے اعلان سے باز آئیں گے۔ جیل کے در و دیوار بھی میری یہی صدا سنیں گے کہ مرزا دجال تھا اور اس کے کفر و ارتداد میں ایک لمحہ کے لیے بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ ہم نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر اس فریضہ کو سرانجام دے رہے ہیں۔ میں اس امر کی تصریح کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میرے اور میرے رفقاء کے جیل جانے کے بعد ان مسلمانوں کے کیا فرائض ہونے چاہئیں جو آقا مدنی ﷺ کی ختم المرسلینی پر ایمان رکھتے ہیں اور ساڑھے تیرہ سو سال سے یہ ان پر روشن ہے۔''

اس کے ساتھ ''زمیندار'' میں ''صور اسرافیل'' (زمیندار 7 مارچ 1933ء) کے عنوان

سے ایک زوردار مقالہ سپرد قلم فرمایا۔

چنانچہ مولانا کی گرفتاری اور اس بیان اور مقالہ کے بعد پورے براعظم میں آگ لگ گئی اور جابجا ''دعوت وارشاد'' کی شاخیں قائم ہوگئیں۔ جن کی بعض تفصیلات درج ذیل ہیں:

☆...... باغ بیرون موچی دروازہ میں مسلمانان لاہور کا ایک عظیم الشان اجتماع ہوا جس میں اعلان کیا گیا کہ جن مقاصد کی خاطر مولانا اوران کے رفقاء جیل میں گئے، ہم ان سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گے اور فتنہ قادیانیت کی سرکوبی کے لیے پوری قوم جسد واحد کی طرح سینہ سپر رہے گی۔ جلسہ سے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولانا داؤد غزنویؒ اور دیگر اکابر نے خطاب کیا۔

☆...... یاد رہے کہ گرفتاری سے قبل باغ بیرون موچی دروازہ میں ایک جلسہ عام میں مولانا نے گرفتاری پر ضمانت نہ دینے کا فیصلہ کیا تھا جس پر مسلمانان لاہور نے صاد اور مولانا کو خراج تحسین ادا کیا تھا۔

☆...... **10** مارچ **1933**ء کو دارالعلوم دیوبند میں بعد نماز جمعہ عظیم الشان اجتماع ہوا جس میں حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کاشمیریؒ نے انتہائی رقت آمیز الفاظ میں ارشاد فرمایا: ''آٹھ یوم سے متواتر بواسیر کا خون بدن سے خارج ہورہا ہے۔ ضعف ونقاہت مانع تقریر ہے اور دو وقت سے فاقہ بھی ہے۔ لیکن دجال قادیان کے ہذیانات اور خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ کی حقیقی محبت نے آپ حضرات کے سامنے چندگزارشات پیش کرنے کے لیے منبر پر بیٹھنے کی جرأت دلا دی۔ منشی غلام احمد قادیانی بلاشبہ مردود ازلی ہے۔ اس کے کفر میں احتمال کبھی پیدا نہ کرنی چاہیے۔ اس کو شیطان سے زیادہ لعین سمجھنا جزو ایمان ہے کیونکہ شیطان نے صرف ایک نبی کا مقابلہ کیا اور اس خبیث وبدباطن نے جمیع انبیاءؑ پر افتراء پردازی کی اور ان کی توہین پر لب کشائی کر کے فی النّار والسقر ہوگیا۔ جو لوگ اب تک میرزا اور اس کے متبعین کو کافر سمجھنے میں متأمل ہیں، ان کا علم صحیح نہیں ہے۔ شرعی نکتہ نظر سے ایک وجہ بھی ایسی نہیں نکل سکتی جس سے اس فرقۂ شیطانیہ کا اسلام ثابت ہوسکے۔''

''علمائے اسلام نے انفرادی حیثیت سے متواتر کوششیں اس فتنہ کے استیصال کے لیے کیں۔ لیکن دور حاضر میں جناب ظفر الملّت والدّین مولانا ظفر علی خاں کا اقدام یقیناً لطف الٰہیہ ہے۔ ان کی یہ جدوجہد اور ان کے رفقاء کی قربانی خدا کے نزدیک ان شاءاللہ مقبول ہوگی۔ دعاء ہے کہ وہ خدا جس نے پیغمبر آخر الزمان ﷺ کے لائے ہوئے دین مبارک کے لیے قرآن

حکیم میں **الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی** ارشاد فرمایا، ان کو ثواب دارین عطا فرمائے:

این دعا از من وا ز جملہ جہاں آمین باد

قادیانیوں کے مقابلہ میں یہ جنگ خالصتاً لوجہ اللہ کی جارہی ہے۔ یہ مذہبی اور سیاسی دونوں حیثیتیں رکھتی ہے۔ میں سیاسی پہلو کو بہت اچھا سمجھتا ہوں۔ اگرچہ کمزوریٔ اعضاء کی وجہ سے جیل جانے کی سکت نہیں مگر ان حضرات سے جنہوں نے مجھ سے حدیث کا سبق پڑھا ہے، خصوصاً اور عالم اسلام سے عموماً دست بستہ درخواست کرتا ہوں کہ لاہوری فداکاروں کی طرح میرزائیت کے قصر بے بنیاد کو برباد کرنے میں ممکن سعی سے دریغ نہ فرمائیں۔(زمیندار 15 مارچ 1933ء)

☆...... دریں اثناء اسی دن یعنی 10 مارچ (1933ء) بروز جمعہ کو جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت میں طلباء واساتذہ جامعہ کا عام اجتماع زیر صدارت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی منعقد ہوا جس میں مولانا ظفر علی خاں اور ان کے رفقاء کو اس جہاد عظیم کے لیے مبارکباد پیش کی گئی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے اخبار ''عادل'' میں خواجہ حسن نظامی کے اس بیان پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا جس میں انہوں نے عامۃ المسلمین کے اتحاد کا واسطہ دے کر مولانا ظفر علی خاں کو اس سے باز رکھنے کی تلقین کی۔ مولانا شبیر احمد نے فرمایا کہ قادیانیوں سے اتحاد کو اتحاد المسلمین کہنا نہ صرف یہ کہ گمراہ کن ہے بلکہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔

آخر میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے ارشاد فرمایا: ''مولانا ظفر علی خاں بلاشبہ سیاسی مدبّر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی قائد بھی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ آڑے وقتوں میں نتائج سے بے پرواہ ہو کر ملت اسلامیہ کی صحیح نمائندگی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند و دیگر مصیبتوں میں بسر ہوا ہے۔ مولانا اور ان کے اخبار نے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ میرے دل پر نقش ہیں۔ فتنۂ قادیان کے استیصال میں مولانا ظفر علی خاں نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے، وہ زمانۂ حال کے عین مناسب ومطابق ہے۔ اگرچہ ہمارے علماء نے اس فتنہ کی ابتداء سے اب تک قادیانیت کے خلاف جو عظیم الشان کام کیے ہیں، وہ بھی قابل قدر ہیں مگر مولانا ظفر علی خاں نے چند سال میں اس فتنہ کی سرکوبی میں جو کامیابی حاصل کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ فتنہ اب قیامت بن رہا ہے اور بحث ومناظرہ سے اب تک کوئی فائدہ نہیں ہوا تو انہوں

نے وہ طرزِ عمل اختیار کیا جو نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں گھر کر گیا۔ اس میں انہیں اتنی کامیابی ہوئی جو علماء کی متفقہ جدوجہد سے نہیں ہوئی۔ وہ مسلمانوں کو راستہ دکھا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ میری دعا ہے کہ ان کی خواہش پر طول وعرض ملک میں ہر جگہ ''دعوت وارشاد'' کی شاخیں قائم ہوں۔'' آخر میں ایک قرارداد کے ذریعے مولانا اور ان کے رفقاء کو ہدیۂ تبریک پیش کیا گیا اور یقین دلایا گیا کہ جملہ مسلمان اس مہم میں آپ کے ساتھ ہیں۔

(زمیندار 15 مارچ 1933ء)

انہی دنوں مسلمانان دہلی کا عظیم الشان اجتماع زیر صدارت سید مرتضیٰ بہادر رکن اسمبلی منعقد ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے حکومت پنجاب کے اس فعل کی مذمّت کی گئی اور اسے مداخلت فی الدین قرار دیا گیا اور حکومت کو متنبہ کیا گیا کہ مولانا اور ان کے رفقاء کا مقدمہ واپس لے کر جلد از جلد رہا کرے ورنہ نتائج کی ذمہ داری اس پر ہوگی۔ (الجمعیۃ مارچ 1933ء)

غرض سارے ملک میں طوفان کی ایک ایسی لہر دوڑ گئی کہ حکومت پریشان ہوگئی۔ مسلمان عوام کھل کر میدان میں آ گئے جس پر گورنمنٹ نے چند ماہ بعد اپنا مقدمہ واپس لے لیا۔ مولانا اور ان کے رفقاء غیر مشروط طور پر رہا ہو گئے۔ دوران مقدمہ مولانا ظفر علی خاں نے 5 اپریل 1933ء کو عدالت کو خطاب کرتے ہوئے حسب ذیل نظم پڑھی:

ہو رہی ہیں برکتیں نازل نئے آئین کی
مل رہی ہے خاک میں عزت نبی کے دین کی
باپ ''لندن''، ''شملہ'' بیٹا ''قادیاں'' روح القدس
اے مسلمانو! یہی تفسیر ہے والتین کی
قادیاں زادوں کے آگے آج کل پنجاب میں
عیسیٰ مریم کی چلتی ہے نہ الیاسین کی
آج وہ جاہل بھی کہلاتے ہیں سلطان القلم
چھین لی صحت زباں نے جن سے قاف اور شین کی
کل بنے پھرتے تھے جو اپنے زمانے کے نبی
آج چادر ان کے مرقد پر چڑھی سجین کی

بن گئے کافر مسلمان مٹ گئی رسم جہاد
عاقبت محمود ہے بے شک بشیرالدین کی
منکر ختم نبوت پر ہوا کیوں طعنہ زن
ہے یہی سب سے بڑی تقصیر مجھ مسکین کی

اب صورت حال یہ تھی کہ پورے ملک کے اہم شہروں وقصبات میں ''دعوت وارشاد'' کے ماتحت قوم اس فتنہ کے استیصال پر کمر بستہ ہوگئی۔ کشمیر کمیٹی میں قادیانیوں کی شرکت اور احرار کی تحریک کو ناکام بنانے میں ظفر اللہ خان اور قادیانیوں نے جو رول ادا کیا، اس نے احرار کو مجبور کردیا کہ وہ اس فرقۂ ضالہ کا سیاسی سطح پر مقابلہ کریں۔ مگر حکومت برطانیہ کب گوارا کرسکتی تھی کہ مرزائیت کا یہ شجرۂ خبیثہ جو اس کے استعماری مقاصد کے لیے وجود میں لایا گیا تھا، اسے کسی قسم کا گزند پہنچے۔ ظفر اللہ خان قادیانی مرکزی حکومت کا ایک اہم پرزہ تھے۔ یہ جدوجہد جب شدت اختیار کرگئی تو اگلے سال مجلس احرار نے قادیان میں کانفرنس کی تیاریاں شروع کردیں جس کی صدارت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری (مرحوم) نے کرنا تھی کیونکہ شعبہ تبلیغ کے وہ صدر تھے۔ اس میں مولانا ظفر علی خاں نے بھی شرکت کی اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کی قرارداد پیش کی جو درج ذیل ہے:

قرارداد نمبر (1) چونکہ مرزا غلام احمد قادیانی نے صاف الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے جو شخص مجھے نبی تسلیم نہیں کرتا، وہ اسلام سے خارج ہے اور تمام دنیائے اسلام کے علما، مرزا غلام احمد قادیانی کو اس کے دعویٰ نبوت اور دیگر دعاوی اور عقائد کفر کی بنا پر اسلام سے خارج ومرتد سمجھتے ہیں، اس لیے یہ کانفرنس حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ تمام مرزائیوں کو مردم شماری میں مسلمانوں سے الگ کردیا جائے۔

محرک: مولانا ظفر علی خاں۔ مؤید: مولانا ابوالوفا شاہجہان پوری، مولانا محمد مسعود الہڑوی، مولانا محمد بخش مسلم فاضل دیوبند!

قرارداد نمبر 2 میں، چوہدری ظفر اللہ کی تقرری کے خلاف احتجاج اور حکومت ہند کو انتباہ وتنبیہ، ان کے اس عہدہ سے مستعفی ہونے کا مطالبہ، سر فضل حسین پر عدم اعتماد کا اظہار کیا گیا۔ ان کے اس فعل کو اسلام سے غداری پر مبنی قرار دیا گیا۔

محرک: مولانا حسین احمد مدنی۔(زمیندار اکتوبر 1934ء)

اندریں حالات حکومت ہند کے اشارہ پر حکومت پنجاب نے زمیندار پر مشق ستم تیز کرنے کا فیصلہ کرلیا جو پہلے ہی جرم حق گوئی کا پرانا مجرم تھا۔ چنانچہ ایک بے ضرر فکاہی مضمون کی بناء پر اکتوبر 1934ء میں ''زمیندار'' سے چار ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کرلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ''زمیندار'' کے ''کشمیر نمبر''، ''مجاہد نمبر'' اور ''شہید نمبر'' شائع کرنے کے جرم میں (جس میں قادیانیوں کی کشمیر کمیٹی میں شرکت اور اس کے نتائج سے بھی مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا تھا) ''زمیندار'' کا منصور سٹیم پریس اور اس کے جملہ پتھر بھی ضبط کرلیے گئے جس پر قادیاں میں بے حد خوشیاں منائی گئیں کہ اب ''زمیندار'' کی آواز ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گی۔ نہ ہی زرضمانت ادا ہوگا، نہ ہی کوئی پریس اسے چھاپنے پر راضی ہوگا۔ مگر خدا جزائے خیر دے شیخ عنایت اللہ مالک کریمی پریس کو جنہوں نے ''زمیندار'' چھاپنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ ادھر بحمداللہ! زرضمانت بھی داخل کرادیا گیا۔ ہفتہ عشرہ کے بعد ''زمیندار'' کریمی پریس سے طبع ہوکر دعوت جہاد دینے کے لیے پھر میدان میں آ گیا۔ ''زمیندار'' کے صفحہ اوّل پر مولانا یوں گویا ہوئے:

ناموس رسول ﷺ کے تحفظ کی قیمت

سرکار نے ضبط کیا ''زمیندار'' کا مطبع
مرزائیوں کے گھر میں جلے گھی کے چراغ آج
چمکائے گئے اندلسی اور دمشقی
روشن ہوئے اسلام کے سینے کے یہ داغ آج
کیا طرفہ تماشا ہے کہ ہوں آ کے معارض
کعبہ کی عنادل سے کلیسا کے کلاغ آج
خمیازہ کش عشق رسول عربی ہوں
میرے دل مضطر کو میسر ہے فراغ آج
توحید کی دہلیز پہ ہوں ناصیہ فرسا
پہنچا ہے مرا عرش معلٰی پر دماغ آج

جو بوالہوسوں کو نہ ملی ہے نہ ملے گی
اس دولت سرمد کا ملا مجھ کو سراغ آج
ہے جس کی ہر ایک بوند میں کوثر کی ملونی
ساقی نے دیا مجھ کو وہ لبریز ایاغ آج
مرزائی بجاتے ہوئے بغلیں نکل آئے
خوش تھے کہ ہوا باغ ''زمیندار'' کا زاغ آج
لیکن یہ خوشی تھی فقط اک عشرہ کی مہماں
پھر رحمت باری سے وہی زاغ ہے باغ آج

(''زمیندار'' 14 نومبر 1931ء)

اسی پر بس نہیں بلکہ حکومت اپنی حد تک پورے تشدد سے حملہ آور تھی۔ ادھر مولانا بھی ڈٹ گئے۔ چنانچہ 2 نومبر 1934ء کو ملک معظم شاہ برطانیہ اور اس کے توسط سے پوری مسیحی دنیا کے نام کھلا خط اردو اور انگریزی میں شائع کیا گیا جس میں مرزا غلام احمد قادیانی کے ان اقوال وخرافات کو پیش کیا گیا جو انہوں نے حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریم صدیقہ اور دیگر بزرگوں کی شان میں کیں اور مطالبہ کیا گیا کہ اس فرقۂ ضالہ کو مسلمانوں سے الگ، غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے جس کا مسلمانوں سے کسی قسم کا تعلق مذہبی نہ ہو۔ مولانا نے مکتوب مفتوح میں جو ''زمیندار'' کے ڈیڑھ دو صفحوں پر مشتمل تھا کے آخر میں لکھا کہ:

1...... قرآن مجید حضرت مریم اور مسیح کو صدیقہ اور کلمۃ اللہ کے القاب سے یاد کرتا ہے۔ اس کے خلاف مرزائے قادیاں کی بکواس کی تاب مسلمان نہیں لاسکتے۔ اس سلسلہ میں جو انسدادی تدابیر اختیار کی جائیں، مسلمان آپ کے سپاس گزار ہوں گے۔

2...... ایک شاہی فرمان کے ذریعے ظفر اللہ خان کے تقرر پر خط تنسیخ کھینچا جائے۔ اس لیے کہ یہ شخص اپنے مذہبی عقیدہ کی رو سے مجبور ہو کر ساری دنیا کے مسلمانوں کو کافر سمجھتا ہے۔

3...... قادیانیوں کو ایک جداگانہ غیر مسلم فرقہ قرار دیا جائے۔

(مؤرخہ 22 نومبر 1934ء ظفر علی خاں مالک ومدیر ''زمیندار'' لاہور)

اس سیدھے سادے اور بے ضرر مطالبہ کے جرم میں ''زمیندار'' کی دو ہزار کی ضمانت

ضبط کر لی گئی اور مزید تین ہزار روپیہ ''زمیندار'' سے اور ایک ہزار روپیہ کریمی پریس سے طلب کیا گیا جہاں ''زمیندار'' چھپتا تھا۔ یہ نوٹس 8 دسمبر 1934ء کو موصول ہوا مگر جنوری 1935ء میں ''زمیندار'' نئی آن سے پھر آ موجود ہوا جس کی وجہ اسلامیان (متحدہ) ہند کا ''زمیندار'' کو اپنا ترجمان سمجھنا اور اسے زندہ رکھنے کا جذبہ تھا۔ چنانچہ 9 دسمبر 1934ء کے ''زمیندار'' میں ''زمیندار کا نیا امتحان'' کے عنوان سے یہ شعر لکھنے کے بعد:

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

مولانا ظفر علی خاں اپنے نام سے یوں رقمطراز ہوئے: ''میرزا غلام احمد کادیانی کی جھوٹی نبوت کا پول کھولنے کے جرم میں حکومت نے ''زمیندار'' سے تین ہزار روپیہ کی ضمانت لینے کے ساتھ اس کا بیس ہزار روپیہ کا (یہ اس زمانے کی رقم ہے) مطبع ضبط کرنے سے جو گہرا زخم لگایا تھا، اس کے مندمل ہونے کی کوئی شکل نہ نکلی تھی کہ اسی وضع کے ایک اور جرم کی پاداش میں آج اس نے چار ہزار روپیہ چہرہ شاہی کی ضمانت مانگی ہے۔ تین ہزار روپیہ ''زمیندار'' سے اور ایک ہزار روپیہ کریمی پریس سے جہاں ''زمیندار'' طبع ہوتا ہے۔ جرم یہ ہے کہ میں نے حضور تاجدار انگلستان اور حضور ممدوح کی وساطت سے ساری مسیحی دنیا کے نام وہ مکتوب مفتوح کیوں لکھا اور چھاپا جس میں ممدوح سے بحیثیت حامیٔ دین مسیح یہ التجاء کی گئی ہے:

(اوّلاً) حضرت مسیح ابن مریم اور حضرت مریم صدیقہ کی عزت کو مرزا غلام احمد قادیانی کے فحش اور اشتعال انگیز حملوں سے بچانے کے لیے کوئی مؤثر کارروائی کی جائے جو اس شخص کی کتابوں میں کیے گئے ہیں جنہوں نے مسلمانوں اور مسیحیوں دونوں کا دل دکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ یعنی مرزا اندکور کی ان کتابوں کو ضبط کیا جائے۔

(ثانیاً) چوہدری ظفر اللہ خان کے تقرر پر خط تنسیخ کھینچا جائے کہ ان صاحب کے عقیدہ میں تمام مسلمان کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ اس لیے ایسا شخص مسلمانوں کا نمائندہ نہیں ہوسکتا۔

(ثالثاً) قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے۔

اس افتتاحیہ کے آخر میں مولانا نے فرمایا: ''مسلمانوں سے میرا ایک ہی سوال ہے۔ کیا

آپ ''زمیندار'' کی ضمانتوں اور ضبطیوں سے ہیبت زدہ ہو کر حق اور باطل کے اس معرکے میں جس میں ہم اور آپ سر دھڑ کی بازی لگا کر شریک ہو چکے ہیں، پسپا ہو جائیں گے اور آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کو اپنا پیغمبر مان کر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ختم المرسلینی کا دامن چھوڑ کر ہار جائیں گے؟

(زمیندار 9 دسمبر 1934ء)

ساتھ ہی ''سرشت مرد مومن'' کے عنوان سے حسب ذیل نظم انہی دنوں شائع ہوئی:

اگر چندے کی حاجت ہے تو کر دعویٰ رسالت کا
بغیر اس ڈھونگ کے چندہ مہیا ہو نہیں سکتا
سنا ہے قادیاں میں بانسری بجتی ہے گوکل کی
مگر ہر بانسری والا کنہیا ہو نہیں سکتا
اگر مکہ سے بھی کرتا وہ ڈھیچوں ڈھیچوں ہو آئے
یہ ظاہر ہے خر عیسیٰ گویّا ہو نہیں سکتا
مجدد الف ثانیؒ سے غلام احمد کو کیا نسبت
ثریٰ کتنا بھی اونچا ہو ثریا ہو نہیں سکتا
برادر خواندگی کی شرط اگر ہو مرزائیت
قیامت تک بھی ہم سے یہ تو بھیا ہو نہیں سکتا
سرشتِ مردِ مومن کا بدلنا غیر ممکن ہے
چنبیلی کا یہ پودا بھٹ کٹیا ہو نہیں سکتا
جسے اسلام کی عزت پہ کٹ مرنا نہ آتا ہو
مسلمانوں کے بیڑے کا کھویا ہو نہیں سکتا

یہ وہ دور تھا کہ ادھر ''زمیندار'' اور ظفر علی خاں پر عتاب ہو رہا تھا، ادھر ڈیرہ دون سے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو احرار کانفرنس قادیان میں گرفتار کر کے گورداس پور لے جایا گیا اور جس پر مسلمانان لاہور کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں حکومت کے ان اقدامات کی مذمت کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ مسلمان اس فتنہ کا آخری دم تک مقابلہ کریں گے۔

قصہ مختصر یہ کہ اب حالات یہ صورت اختیار کر چکے تھے کہ پوری ملت بیدار ہو چکی تھی۔

چنانچہ علامہ اقبال نے قادیانیوں کو نہ صرف انجمن حمایت اسلام سے علیحدہ کرایا بلکہ اس کے خلاف کھل کر سامنے بھی آ گئے۔ جسٹس سر ظفر علی مرحوم جیسے لوگوں نے مرزائیوں کی مخالفت میں بیان دیئے۔ انہی دنوں راقم الحروف (نسیم) کرم آباد حاضر ہوا۔ مولانا نے میری ڈائری پر حسب ذیل شعر لکھ دیئے:

بنائے وحدت اسلام ہے اگر منظور
تو قادیاں کی نبوت کی روک تھام کرو
محمد عربی (ﷺ) رحمت دو عالم ہیں
تم امت ان کی ہو اس مرحمت کو عام کرو

اس اثناء میں ''زمیندار'' کا قادیانی نمبر شائع ہوا جس میں علامہ اقبال نے اس فرقہ ضالہ کے دلائل کی قلعی کھول دی۔ جب علامہ اقبال مرحوم نے مضبوط دلائل سے مرزائیت کی حقیقت بیان فرمائی تو اس پر مولانا نے ایک زوردار مقالہ سپرد قلم فرمایا جس کا ایک حصہ درج ذیل ہے: ''میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، قادیانیت کا خطرہ میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا۔ میری ساری عمر اس ہولناک فتنہ کا مقابلہ کرنے میں گزری ہے۔ مسلمانوں نے اوّل اوّل قادیانی فتنہ کو اہمیت نہ دی۔ علمائے امت نے اتنا ضرور کیا کہ جس طرح غلام احمد قادیانی نے ان تمام مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا، اسی طرح انہوں نے بھی اس پر اور اس کی امت قلیل الانفار پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ ان کے مایۂ ناز مسئلہ حیات مسیح پر اس کے ساتھ یا اس کے اتباع والوں کے ساتھ ہنگامہ خیز مناظرے کرتے رہے، لیکن زہر کا یہ تریاق کچھ زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوا۔ مرزائیوں کا یہ پروپیگنڈا اس مذہبی رواداری کے سائے میں جس کا حکومت وقت کو ادّعا ہے، پروان چڑھتا رہا۔ آخر میرے شور وغل اور میرے رفقاء کی ہاہو ہو، نے عام مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ جب حکومت وقت نے مرزائیت کی پیٹھ پر علی الاعلان تھپکیاں دینا شروع کیں تو ان کو صاف نظر آنے لگا کہ جس فتنہ سے انہیں پالا پڑا ہے، وہ کتنا ہولناک ہے۔ میں پہلے دن سے پکار رہا ہوں کہ فرقۂ ضالہ مرزائیہ جو اسلام کے نام پر مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہے، ہرگز یہ حق نہیں رکھتا کہ اس کا شمار مسلمانوں میں ہو بلکہ سکھوں، پارسیوں، عیسائیوں یا دوسری اقلیتوں کی طرح اس فرقہ ضالہ کا شمار بھی سرکاری کاغذوں میں جداگانہ اقلیت کے طور پر ہونا

چاہیے۔ جب حکومت کی امپریل مصلحتوں نے چوہدری ظفراللہ خان (قادیانی) جس کے عقیدہ میں تمام مسلمان مرزا غلام احمد قادیانی کو نہ ماننے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہیں، وائسرائے کی کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے مقرر کرنے کا فیصلہ کیا تو ''زمیندار'' نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ یہ فتنہ اب قیامت بننے والا ہے۔ چنانچہ طول وعرض ملک میں اس پر احتجاج ہوا مگر حکومت کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور چودھری ظفراللہ خان کا تقرر عمل میں آ گیا۔ اسی وقت سے مسلمان برابر پکار رہے ہیں کہ قادیانیوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے۔ حکومت ایک غیر مسلم کی حیثیت سے انہیں مراعات دے لیکن انہیں اسلام کا نمائندہ ہرگز نہ گردانا جائے۔ اس لیے کہ مسلمانوں سے ان کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مسلمانوں کا یہ سارا شور حکومت کے بہرے کانوں پر پڑا جس نے مسلمانوں کو بے چین کر رکھا ہے۔ اگر اس نے لب کشائی کی ضرورت محسوس کی تو مسلمانوں کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ سارا شور متعصب اور غیر ذمہ دار لوگوں کا بپا کیا ہوا ہے۔ مسلمانوں کا ذمہ دار فہیم طبقہ مرزائیوں کو مسلمان سمجھتا ہے۔

آخر وہ وقت بھی آیا کہ جو لوگ ذمہ دار اور فہیم وغیر متعصب تھے، انہوں نے بھی عامۃ المسلمین کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے لگی لپٹی رکھے بغیر حکومت کو بتا دیا کہ قادیانیت ایک جداگانہ مذہب ہے جسے اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر حکومت نے قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے میں کوتاہی کی تو مسلمانوں کا یہ شبہ یقین کے درجہ تک پہنچ جائے گا کہ حکومت مسلمانوں کی وحدت ملّی کو پارہ پارہ دیکھنے کی متمنی ہے۔ خدا بھلا کرے علامہ اقبال کا جن کے حکیمانہ بیان نے ان ساری حقیقتوں کو بکمال شرح وبسط الم نشرح کر کے مسلمانان ہند کی ایسی خدمت سرانجام دی ہے جس کا صلہ اسے حضور سرور کائنات ﷺ کی ختم المرسلینی کی بارگاہ سے مل سکتا ہے۔''

آخر میں مولانا نے لکھا جس پر ان کی بصیرت کی داد دینی پڑتی ہے۔ فرمایا:

''ختم نبوت کے اس عقیدہ کو جھٹلانے کی جرأت اس ساڑھے تیرہ سو سال کے عرصہ میں اگرچہ متعدد پرستاران طاغوت کو ہوئی ہے لیکن اس جرأت کا سب سے بے باکانہ مظاہرہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی قلیل الانفار ذریت کی طرف سے ہوا۔ میرا پختہ یقین ہے کہ اس تکذیب کی پاداش میں طائفہ قادیان جس کے نیم جاں جسم میں حکومت وقت کے سیاسی معالج

نے تھوڑی بہت حرکت پیدا کر رکھی ہے، اپنے وقت پر گردش روزگار میں دب کر فناء ہو جائے گا جس طرح اس سے پہلے مدعیان نبوت اور اس کی امتیں نابود ہو گئیں''۔

(زمیندار، 9 مئی 1935ء)

اس مقالہ کے آخر میں مولانا نے لکھا: ''قادیان کی کشتی اس وقت دریائے مکافات کے بھنور میں گھر گئی ہے اور ارباب بصیرت کو ایسا نظر آ رہا ہے کہ یہ ''پاپ بھری ناؤ'' کوئی دم میں ہی غرق ہو جائے گی اور دنیا سے قادیانیت کا نام ونشان حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا۔''

غرض مولانا مرحوم جہاں بھی رہے، مرزائیت کے خلاف مصروف جہاد رہے اور نہ صرف کہ مسلمانوں کو اس فرقہ ضالہ کے ناپاک عزائم سے متنبہ فرماتے رہے بلکہ اسے غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ بھی ہمیشہ کرتے رہے۔ مگر انگریزی اتحادی قوتوں نے ہمیشہ اس فرقہ کی پشت پناہی کی تا آنکہ قیام پاکستان کے بعد جب مولانا کے قویٰ شل ہو چکے تھے اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مسئلہ 1953ء میں پوری شدت سے کھڑا ہوا، ''زمیندار'' اس جہاد میں شامل تھا۔ چنانچہ ''زمیندار'' کا ڈیکلریشن منسوخ اور پریس ضبط کر لیا گیا۔ بعد میں ''آثار'' کے نام سے روزنامہ شائع ہوا یعنی حکومت نے زمیندار کی اشاعت پر بھی پابندی لگائی۔ اختر علی خان مرحوم نے افسوس جیل میں اس استقامت کا ثبوت نہ دیا جوان کے والد کا حصہ تھا اور چودہ سال قید بامشقت سے گھبرا گئے۔ مولانا اس دور میں ضعف ونقاہت اور جسمانی کمزوری کے باوجود دہلی دروازہ کے باہر ایک جلسہ میں تشریف لائے۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری (مرحوم) ان کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور گلے سے لگا کر گالوں کو تھپتھپا کر فرمایا کہ ظفر علی خاں! تیرے ''ستارہ صبح'' نے میرے جگر میں آگ لگا دی تھی۔

یہ ہے وہ مختصر داستان جو اس مرد مجاہد نے مرزائیت کے استیصال کے لیے کی اور الحمدللہ کہ آج پایہ تکمیل کو پہنچ کر رہی۔ مستقبل کا مؤرخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ سماجی اور معاشرتی طور پر قادیانیت کی جڑیں کھوکھلی کرنے، اس طائفہ ناپاک کے سیاسی عزائم کو بے نقاب کرنے میں حضرت مولانا ظفر علی خاں کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔

ان اللّٰہ بالغ امرہ قد جعل اللّٰہ لکل شئ قدراً (الطلاق:3)

پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

مولانا ظفر علی خاں، نا قابل فراموش خدمات

مولانا ظفر علی خاں کی قومی، ملی، علمی اور ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ہر دائرے میں انہوں نے گہرے نقوش اپنی یادگار کے چھوڑے ہیں۔لیکن دو میدان ایسے ہیں جن میں اُن کی خدمات نا قابل فراموش ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے قدرت نے انہیں خاص ان مقاصد کے لیے تخلیق کیا تھا۔ان میں ایک تو آزادی کے لیے جدوجہد کا میدان ہے جس میں ظفر علی خاں نے ایثار و قربانی کی لازوال مثال قائم کر کے غلامی سے آزادی تک راہِ پرخار میں عملی راہنمائی کر کے اہل وطن کی خدمت انجام دی۔ دوسرا میدان اس فتنہ عظیم کا استیصال کرنا اور اس کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دینا تھا، جو استعماری محکومی کا تلخ شاخسانہ تھا، یعنی قادیان کی جعلی نبوت، جس کی کاشت اور نشوونما میں برطانوی استعمار نے خاص دلچسپی لی اور یہ سرطان جسد ملی میں اپنے زہریلے اثرات کے ساتھ اتنا پھیل گیا کہ اس کے استیصال کے لیے قدرت کو ایک خاص ذہن کی تخلیق کرنی پڑی......اور یہ ظفر علی خاں ہی تھے جنہوں نے اس پھیلتے ہوئے کینسر کو جسد ملی سے الگ کر کے ملت کی حیاتِ نو کی راہ ہموار کی۔

انیسویں صدی کے آخر میں جب ظفر علی خاں تعلیمی مراحل طے کر رہے تھے، قادیانی فتنہ اپنے جوبن پر آ رہا تھا۔ برطانوی اقتدار کے زیر سایہ مذہبی آزادی کے نام پر مذہبی مناقشوں کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس میں عیسائی، آریہ سماجی اور مسلمان مبلغین نے مناظروں اور مباہلوں کا بازار گرم کیا ہوا تھا اور پنجاب کی سرزمین خاص طور سے اِس کا ہدف بنی ہوئی تھی۔استعمارِ برطانیہ کو ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی حکمتِ عملی کے لیے یہ بہت مفید تھا اور مشنریوں کی حوصلہ افزائی تو سرکاری سطح پر کمپنی کے زمانۂ حکومت سے ہو رہی تھی۔اسی فضا میں مرزا غلام احمد قادیانی کو اپنے پر پرزے نکالنے کا موقع میسر آیا اور وہ اسلام کے ایک مبلغ کی حیثیت سے اس تماشا گاہ میں

شریک ہوئے۔ مرزا صاحب کی کتابوں میں کوئی دوسرا مسئلہ ایسا نہیں جس کا ذکر انہوں نے اس جوش وخروش کے ساتھ بار بار کیا ہو۔ ان کے خیالات میں تضاد وتبائن بے حد ہے۔ وہ خود اپنے دعاوی کے متعلق ایسی متضاد باتیں کہتے ہیں کہ پڑھنے والا پریشان ہو جاتا ہے، لیکن تنسیخ جہاد اور حکومت انگریزی کی اطاعت کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہر قسم کے ابہام وتضاد سے پاک ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ان کے یہ بیانات:

- میرے والد صاحب مرزا غلام مرتضٰی مرحوم جنھوں نے سکھوں کے عہد میں بڑے بڑے صدمات دیکھے تھے۔ انگریزی سلطنت کے آنے کے ایسے منتظر تھے جیسا کہ کوئی سخت پیاسا پانی کا منتظر ہوتا ہے اور پھر جب گورنمنٹ انگریزی کا اس ملک پر دخل ہو گیا تو وہ اس نعمت یعنی انگریزی حکومت کی قائمی سے ایسے خوش ہوئے کہ گویا ان کو ایک جواہرات کا خزانہ مل گیا اور وہ سرکار انگریزی کے بڑے خیر خواہ جاں نثار تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے ایام غدر 1857ء میں پچاس گھوڑے مع سواران بہم پہنچا کر سرکار انگریزی کو بطور مدد دیے تھے اور وہ بعد اس کے بھی ہمیشہ اس بات کے لیے مستعد رہے کہ اگر پھر بھی کسی وقت ان کی مدد کی ضرورت ہو تو بدل وجان اس گورنمنٹ کو مدد دیں۔ اور اگر 1857ء کے غدر کا کچھ اور بھی طول ہوتا تو وہ سو سوار تک اور بھی مدد دینے کو تیار تھے۔ غرض اس طرح ان کی زندگی گزری اور پھر ان کے انتقال کے بعد یہ عاجز دنیا کے شغلوں سے بالکل علیحدہ ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف مشغول ہوا۔ اور مجھ سے سرکار انگریزی کے حق میں جو خدمت ہوئی، وہ یہ تھی کہ میں نے پچاس ہزار کے قریب کتابیں اور رسائل اور اشتہارات چھپوا کر اس ملک اور نیز دوسرے بلاد اسلامیہ میں اس مضمون کے شائع کیے کہ گورنمنٹ انگریزی ہم مسلمانوں کی محسن ہے۔ لہٰذا ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اس گورنمنٹ کی سچی اطاعت کرے اور دل سے اس دولت کا شکر گزار اور دعا گو رہے اور یہ کتابیں میں نے مختلف زبانوں یعنی اُردو فارسی، عربی میں تالیف کر کے اسلام کے تمام ملکوں میں پھیلا دیں۔ یہاں تک کہ اسلام کے دو مقدس شہروں مکہ اور مدینہ میں بھی بخوبی شائع کر دیں اور روم کے پایہ تخت قسطنطنیہ اور بلاد شام اور مصر اور کابل اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا، اشاعت کر دی گئی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلط خیالات چھوڑ دیے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی خدمت مجھ سے ظہور میں آئی کہ مجھے

اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان دکھلا نہیں سکا۔

(ستارہ قیصرہ صفحہ 1 تا 18 مندرجہ روحانی خزائن جلد 15 صفحہ 109 تا 126 از مرزا قادیانی)

❑ ''میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے، ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے۔''

(اشتہار، بحضور نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر دام اقبالہ نمبر 187 بتاریخ 24 فروری 1898ء مندرجہ مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ 196 طبع جدید، از مرزا قادیانی)

❑ ''پھر میں پوچھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے سرکار انگریزی کی امداد اور حفظِ امن اور جہادی خیالات کے روکنے کے لیے برابر سترہ سال تک پورے جوش سے، پوری استقامت سے کام لیا، کیا اس کام کی اور اس خدمتِ نمایاں کی اور اس مدت دراز کی دوسرے مسلمانوں میں جو میرے مخالف ہیں، کوئی نظیر ہے؟''

(کتاب البریہ صفحہ 5، 6 مندرجہ روحانی خزائن جلد 13 صفحہ 6، 8 از مرزا قادیانی)

❑ اس جگہ بار ہا بے اختیار دل میں یہ بھی خیال گزرتا ہے کہ جس گورنمنٹ کی اطاعت اور خدمت گزاری کی نیت سے ہم نے کئی کتابیں جہاد اور گورنمنٹ کی اطاعت میں لکھ کر دنیا میں شائع کیں اور کافر وغیرہ اپنے نام رکھوائے، اسی گورنمنٹ کو اب تک یہ معلوم نہیں کہ ہم دن رات کیا خدمت کر رہے ہیں۔............ میں یقین رکھتا ہوں کہ ایک دن یہ گورنمنٹ عالیہ ضرور میری اِن خدمات کا قدر کرے گی۔

(اشتہار مرزائے آنجہانی مورخہ 18 نومبر 1901ء، مجموعہ اشتہارات جلد دوم طبع جدید صفحہ 535)

❑ ''سرکار دولتمدار ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس برس کے متواتر تجربہ سے ایک وفادار جاں نثار خاندان ثابت کر چکی ہے اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کے پکے خیر خواہ اور خدمت گزار ہیں، اس خود کاشتہ پودا کی نسبت نہایت حزم اور احتیاط اور تحقیق اور توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو ایک خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔ ہمارے خاندان نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنے خون بہانے اور جان دینے سے فرق نہیں کیا

اور نہ اب فرق ہے۔ لہٰذا ہمارا حق ہے کہ ہم خدمات گذشتہ کے لحاظ سے سرکار دولتمدار کی پوری عنایات اور خصوصیت توجہ کی درخواست کریں تا ہر ایک شخص بے وجہ ہماری آبرو ریزی کے لیے دلیری نہ کر سکے۔"

(اشتہار، بحضور نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر دام اقبالہ نمبر **187** بتاریخ **24** فروری **1898**ء مندرجہ مجموعہ اشتہارات جلد دوم صفحہ **198** طبع جدید، از مرزا قادیانی)

علامہ اقبالؒ نے پچیس سال بعد (**1935**ء میں) قادیانی جماعت کی اساس کا تجزیہ کرتے وقت اس کے سیاسی پہلو پر خاص زور دیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا:

"The function of Ahmadism in the history of Muslim religious thought is to furnish a revelational basis for India's present political subjugation." (1)

ترجمہ: "احمدیت میں اہم ترین مذہبی اور سیاسی امور تنقیح طلب مضمر ہیں جیسا کہ میں نے اوپر تشریح کی ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے"۔

(اسلام اور احمدیت (پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کا جواب) از علامہ محمد اقبالؒ مطبوعہ حرفِ اقبال از لطیف احمد خان شروانی صفحہ **132،133**)

اور پھر پنڈت جواہر لال نہرو کے خط کا جواب دیتے ہوئے (**21** جون **1936**ء کو) دوٹوک الفاظ میں یہ لکھا کہ:

"I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India." (2)

ترجمہ: میں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں پاتا کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔

علامہ اقبال پر ظفر علی خاں کے اثرات کی بات شاید بعض لوگوں کو عجیب معلوم ہو، مگر یہ ایک حقیقت ہے۔ اقبال اور ظفر علی خاں کے تعلقات **1910**ء سے آخر دم تک ذاتی سطح پر، سوائے سائمن کمیشن کے موقع پر جزوی اختلاف کے، بڑے گہرے رہے۔ ان کے مزاجوں میں کچھ فرق تھا اور یہ قدرتی امر ہے مگر مقاصد ملی میں بڑی ہم آہنگی تھی۔ دونوں صاحبان ایک

دوسرے کی قدر پہچانتے تھے اور ایک دوسرے سے استفادہ کرتے تھے۔ ''زمیندار'' اور ''ستارۂ صبح'' میں اقبال کا کلام چھپتا تھا اور اقبال ان جریدوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے تھے۔ پھر وہ ان مباحث سے کیسے بے خبر رہ سکتے تھے جو ظفر علی خاں نے قادیانی نبوت کے بارے میں ستارۂ صبح اور زمیندار میں اُٹھا کر عالم اسلام میں ایک تحریک پیدا کی۔ اقبال ہی کیا، علماء اور مفسرین و محدثین بھی ظفر علی خاں کی اس تحریک سے بیدار ہوئے اور دینی اور سیاسی زاویئے سے حقیقت پسندانہ انداز میں قادیانی فتنے کا جائزہ لینے لگے۔

ظفر علی خاں کی بعض نجی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور ان کے چند جگری دوست، مرزا غلام احمد قادیانی کے دعووں، الہاموں اور پیشین گوئیوں کی حقیقت سے زمانۂ طالب علمی ہی میں آگاہ ہو کر متنفر ہو چکے تھے اور وہ اس فتنے کے خلاف محاذ آرائی کے لیے آمادہ ہو رہے تھے۔ حیدر آباد کے زمانہ قیام میں لاہور کے بعض جریدوں میں ظفر علی خاں نے نقاش کے قلمی نام سے مزاحیہ، طنزیہ انداز میں کچھ مضامین بھی آنجہانی مرزا کی زندگی میں لکھے۔ یہ مرزا صاحب کی زندگی میں اُن کی مخالفت کا آغاز تھا۔ 1908ء میں آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کا انتقال ہوا اور حکیم نور الدین ان کے جانشین ہوئے۔ حکیم نور الدین کے انتقال کے بعد قادیان میں مرزا بشیر الدین محمود اپنے آنجہانی والد مرزا قادیانی کے جانشین ہوئے اور انہوں نے زور و شور سے اپنے باپ کی نبوت کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کیا۔ اس میں کچھ حقیقت تھی یا حکمت عملی، بہر کیف مرزا غلام احمد آنجہانی کے مریدین دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ قادیانی کہلانے لگا جس کے سرکردہ مرزا بشیر الدین محمود تھے، دوسرے گروہ کو لاہوری پارٹی کہا جانے لگا جس کے سربراہ محمد علی لاہوری تھے۔ عام حلقوں میں انہیں محمودی اور کمالی گروہ بھی کہا جانے لگا اور قادیانیوں کی خاص اصطلاحوں میں اول الذکر گروہ کے لیے ''دمشقی'' اور ثانی الذکر کے لیے ''اندلسی'' کی اصطلاحیں بھی استعمال ہونے لگیں۔ ان دونوں گروہوں کی تو تو میں میں جاری تھی کہ ظفر علی خاں کو کرم آباد کی نظر بندی کے زمانے میں 1916ء کے آخر میں مشروط طور پر ''ستارہ صبح'' (ہفتہ وار) نکالنے کی اجازت ملی۔ وہ سیاست پر بات نہیں کر سکتے تھے، علم و ادب، تاریخ و مذہب کے موضوعات پر طبع آزمائی کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ ''قادیانی نبوت'' کے پوسٹ مارٹم کا فیصلہ کیا۔

فہم سلیم رکھنے والا کوئی بھی انسان ظفر علی خاں کی عالمانہ تحریروں کو پڑھ کر ان سے متاثر

ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، شاید مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروؤں میں کج فہمی تو بہت فراوانی سے پائی جاتی ہے مگر عقلِ سلیم کی شدید قلت ہے، اس لیے وہ اس معقولی استدلال کا جواب معتدل انداز میں دینے یا قائل ہونے اور قائل کرنے کے بجائے طنز وتعریض اور سب وشتم پر اُتر آئے اور ان تیروں کی قادیانی مبلغوں کے ترکش میں کوئی کمی نہیں تھی مگر یہاں مقابلہ ظفر علی خاں سے تھا جو ہجویات میں انوری اور خاقانی سے کم نہیں تھے۔ ''ستارۂ صبح'' ستمبر 1917ء میں ہفتہ وار سے روزنامہ ہوگیا تھا اور اس نے قادیانی نبوت کے خلاف مورچہ بھی سنبھالا ہوا تھا اور اقبال کی حمایت میں اہل طریقت سے اس کی جنگ بھی جاری تھی۔

آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کے جانشین مرزا بشیر الدین محمود اور ان کے متبعین اپنی ساری گل افشانیوں کے باوجود ظفر علی خاں کے حریف بذلہ نہ بن سکے تو اپنے جماعتی آرگن ''الفضل'' کی اشاعت 16 اکتوبر 1917ء میں التجاؤں اور عرضداشتوں پر اُتر آئے مگر دشنام طرازیوں اور دل آزاریوں سے پھر بھی باز نہ آئے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ملت اسلامیہ کے زخموں پر نمک چھڑ کنے کا حق تو انہیں حاصل رہے مگر فریق ثانی (ظفر علی خاں) اپنے لب سی لیں۔ اس انوکھی عرضداشت اور اشتعال انگیز فریاد کا ظفر علی خاں نے بڑی سنجیدگی سے نوٹس لیا اور ''ستارۂ صبح'' کی اشاعت یکم نومبر 1917ء میں ''قول فیصل'' کے تحت ''قادیان کا تھیٹر'' کے عنوان سے نظم ونثر میں لیڈنگ آرٹیکل شائع کیا۔

اب موسیو مرزا بشیر الدین محمود کے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اپنے آقایانِ ولی نعمت کے حضور اپنی دادفریاد کے لیے حاضر ہوں۔ وہ سر مائیکل اوڈوائر کے حضور باریاب ہوئے اور محضر پیش کیا۔ اتفاق یہ کہ اہل ملامت بھی دادفریاد کے لیے اپنے ''اولی الامر'' برطانوی سرکار کی چوکھٹ پر کورنش بجا لا رہے تھے۔ انہی محضروں اور عرضداشتوں کا نتیجہ تھا کہ ''ستارۂ صبح'' پر سنسرشپ کا احتساب سخت کر دیا گیا اور پھر ظفر علی خاں کو پنجاب چھوڑ کر حیدر آباد کا رخ کرنا پڑا، اور پھر حیدر آباد سے نکل کر کرم آباد میں بقیہ ایام نظر بندی کاٹنے پڑے۔ برطانوی سرکار نے اپنے ''خود کاشتہ پودے'' کو ظفر علی خاں کی علمی وشعری یلغار سے عارضی طور پر محفوظ کر لیا مگر ''ستارۂ صبح'' نے ذہنوں میں جو ہل چل پیدا کر دی تھی، اس کے اثرات بڑے دوررس تھے۔ قادیانی فتنے کے خلاف ملک کے اندر اور باہر ایک تحریک پیدا ہوگئی جس کے نتائج بہت جلد سامنے آنے لگے۔

تحریک خلافت اوراس کے بعد سیاسی مسائل نے اولیت حاصل کر لی تھی مگر قادیانی یا لاہوری مسئلے سے اب جدید تعلیم یافتہ طبقہ اورعوام اتنے لا پروانہیں رہے تھے۔ خود ظفر علی خاں اس عرصے میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہے، تاہم وہ اپنے مشن سے غافل نہیں تھے۔ اسی مشن کا ایک دوسرا مثبت پہلو شاعری میں اُن کا نعتیہ کلام تھا۔ حضور ختم المرسلین، رحمۃ للعالمین محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ ﷺ کی محبت وعقیدت کے جذبے کا تازہ کرنا اوراس سے جمہور کے دلوں کو گرمانا بھی جھوٹی نبوت کے خلاف ظفر علی خاں کا ایک جہاد تھا، اور زندان کی تنہائیوں میں ہوں یا زنداں سے باہر، وہ حضور رسالتمآب ﷺ کی محبت میں نغمے تخلیق کرتے رہے اور جمہور کے قلب وذہن کو منور کرتے رہے۔

پھر کشمیر تحریک شروع ہوئی اوراس مسئلے پر جو کشمیر کمیٹی بنی، اسے قادیانیوں نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کیا تو ظفر علی خاں سیاست کے پرچم کو ایک طرف رکھتے ہوئے اس باطل گروہ کے خلاف حق کی تلوار بن کر نکل آئے۔ دوسری طرف برطانوی حکومت ''اپنے خود کاشتہ پودے'' کی ڈھال بن کر میدان میں آ گئی اور حق کی آواز کو دبانے کے لیے ''زمیندار'' کے نمبروں کی ضبطی، ضمانت کی طلبی وضبطی، مطبع کی ضبطی اور جور واستبداد کے یہ سب حربے آزمانے کے ساتھ قید و بند کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا۔ مگر حق کی حمایت میں کوئی طاغوتی طاقت بھی ظفر علی خاں کا سر نہ جھکا سکتی تھی اور نہ جھکا سکی۔ ''ستارۂ صبح'' میں ظفر علی خاں نے جو تحریک دینی، علمی اور فکری سطح پر اُٹھائی تھی، وہ اب جمہور اسلامیانِ ہند کی تحریک بن چکی تھی جس کے قائد ظفر علی خاں تھے۔ 3 مارچ 1933ء (2 ذیقعد 1351ھ) کو ظفر علی خاں نے ''زمیندار'' میں ایک مختصر اداریہ لکھا جس کا عنوان تھا ''سر مستانِ بادۂ یثرب کا پیغام''

ہم تو سر کے بل گئے قتل گاہِ عشق میں
تیز ہو چکی چھری تو بھی چل حلال ہو!

وہ آخری فتنہ جس کی رسول اللہ ﷺ نے خبر دی تھی، مشرق میں قادیانیت کی شکل پکڑ کر ظاہر ہو چکا ہے، اوراُن کو جنہیں دیدۂ بینا دیا گیا ہے، صاف نظر آ رہا ہے کہ اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اجتماعی غیرت دینی اپنے پورے حجازی جوش، اپنی پوری مدنی استقامت کے ساتھ نہ اُٹھ کھڑی ہوئی تو اسلام کا ہندوستان میں خدا ہی حافظ ہے۔

میں مسلمانوں کو اللہ کے نام پر جو **لم یلد و لم یولد** ہے، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے نام پر جو خاتم النبیین ہیں، اسلام کے نام پر کہ اللہ کے نزدیک وہی دین ہے، درد بھرے دل سے صلائے عام دیتا ہوں کہ مجلس مرکزیہ دعوت وارشاد لاہور کی شاخیں ہندوستان کے ہر صوبے، ہر ضلع اور ہر قریہ میں قائم کریں اور اپنے تمام جزئی اختلافات اس مجلس عالیہ کے ان دو بڑے مقاصد کی تکمیل کی خاطر مٹا دیں:

1- فتنۂ قادیاں کا استیصال

2- فتنۂ تفرنج کی بیخ کنی

اگر مسلمان ان دوگونہ مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوگئے تو دنیا بھی ان کی ہے اور دین بھی ان کا۔ ورنہ بجز خسران مبین یعنی دنیوی اور دینی رسوائی کے اور کچھ نہیں!''

مولانا ظفر علی خاں نے اس تحریک کے سلسلے میں جیل جاتے وقت اسلامیان ہند کو یہ پیغام دیا:

❑ ''ہم آج تک اپنا مذہبی اور دینی فرض سمجھ کر وطن وملت کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں اور عقوبتیں برداشت کرتے رہے۔ آج ہم خالصۃً مذہب کی خاطر اور ناموس رسول اللہ ﷺ کی خاطر جیل جارہے ہیں۔ ہم ایک منٹ کے کروڑویں حصے کے لیے بھی یہ ضمانت دینے کو تیار نہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے کفر و ارتداد اور دجل کے اعلان سے ایک لمحہ کے لیے بھی باز آ جائیں۔ ہم اپنے مذہبی فرض کی ادائیگی کی پاداش میں جیل جارہے ہیں۔ میں اس تصریح کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میرے اور میرے رفقائے کار کے جیل جانے کے بعد ان مسلمانوں کے فرائض کیا ہیں اور کیا ہونے چاہئیں جو آقائے مدنی ﷺ کی ختم المرسلینی پر ایمان رکھتے ہیں۔ ساڑھے تیرہ سو سال سے یہ حقیقت اُن پر روشن ہے۔ میں کہوں گا کہ ہندوستان کے ہر قریہ، ہر شہر اور ہر ضلع میں مجلس دعوت وارشاد کی شاخیں قائم ہونی چاہئیں''۔ (3)

پہلے یہ تحریک ظفر علی خاں نے ایک دینی، علمی دعوت کے طور پر شروع کی تھی جس نے ذہنی وفکری بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔ اب یہ ایک عوامی، جمہوری تحریک کے طور پر شروع کی گئی اور مجلس دعوت وارشاد قائم کر کے ملک بھر میں اس کی شاخیں پھیلا دی گئیں۔ ظفر علی خاں اور ان کے ساتھی نقض امن کے اندیشے میں گرفتار کر لیے گئے۔ اس سے تحریک میں اور بھی زیادہ

جوش وخروش پیدا ہو گیا۔ علمائے کرام اس تحریک میں یک دل و یک جان ہو کر شریک ہوئے۔ اس تاریخی موقعہ پر مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے ارشاد فرمایا:

❑ ''مولانا ظفر علی خاں بلاشبہ سیاسی مدبر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی قائد بھی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ آڑے وقتوں میں نتائج سے بے پروا ہو کر ملت اسلامیہ کی صحیح نمائندگی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند و دیگر مصیبتوں میں بسر ہوا ہے۔ مولانا اور ان کے اخبار نے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ میرے دل پر نقش ہیں۔ فتنہ قادیاں کے استیصال میں مولانا ظفر علی خاں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے، وہ زمانہ حال کے عین مناسب و مطابق ہے۔ اگر چہ ہمارے علماء نے اس فتنے کی ابتداء سے اب تک قادیانیت کے خلاف جو عظیم الشان کام کیے ہیں، وہ بھی قابل قدر ہیں مگر مولانا ظفر علی خاں نے چند سال میں اس فتنہ کی سرکوبی میں جو کامیابی حاصل کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ فتنہ اب قیامت بن رہا ہے اور بحث ومناظرہ سے اب تک کوئی فائدہ نہیں ہوا تو انہوں نے وہ طرز عمل اختیار کیا جو نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقے کے دل میں گھر کر گیا۔ اس میں انہیں اتنی کامیابی ہوئی جو علماء کی متفقہ جدو جہد سے نہیں ہوئی۔ وہ مسلمانوں کو راستہ دکھا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ میری دعا ہے کہ ان کی خواہش پر طول وعرض ملک میں ہر جگہ ''دعوت وارشاد'' کی شاخیں قائم ہوں''۔(4)

تحریک کے بڑھتے ہوئے جوش وخروش کو دیکھ کر حکومت نے مقدمہ واپس لے کر ظفر علی خاں اور اُن کے ساتھیوں کو تو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا مگر تحریک کو دبانے کے لیے دوسرے حربے استعمال کرنے شروع کر دیے جس میں ''زمیندار'' اور اس کا مطبع خصوصی ہدف بنے۔ مگر اس تحریک کو دبانے کی جتنی کوشش کی گئی، اتنا ہی یہ اُبھرتی گئی۔ اس تحریک کو سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا خوش بیان اور شعلہ نوا خطیب بھی مل گیا جس کی خطابت کے سیل رواں میں قادیانی فتنے کا سفینہ کاغذی ناؤ کی طرح ڈولنے لگا اور برطانوی استعمار کو اپنے ''خود کاشتہ پودے'' کے بچاؤ کے لیے خصوصی تدابیر اختیار کرنا پڑیں۔ اکتوبر 1934ء میں قادیان میں مجلس دعوت وارشاد کی تبلیغی کانفرنس ہوئی اور ظفر علی خاں نے اس کانفرنس میں قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ قرار دینے کا مطالبہ پیش کیا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے ظفر اللہ خاں کو مسلمانوں کے نمائندے کے طور پر مرکزی حکومت میں لیے جانے پر شدید احتجاج اور سر فضل حسین پر عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ اس کے ساتھ ہی

برطانوی استعمار کا عتاب ''زمیندار'' پر بجلی بن کر گرنے لگا۔ ''زمیندار'' سے چار ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی گئی۔ اخبار کا مطبع منصور سٹیم پریس ضبط کر لیا گیا۔ قادیانیوں نے اس پر خوشیاں منائیں۔ مگر چند روز بعد ''زمیندار'' کریمی پریس میں چھپ کر دوبارہ نکل آیا۔

22 نومبر 1934ء کو ظفر علی خاں نے قیصر ہند، شاہ برطانیہ اور اس کے توسط سے پوری مسیحی دنیا کے نام ایک کھلا خط اردو اور انگریزی میں شائع کیا جس پر ''زمیندار'' کی دو ہزار کی ضمانت ضبط کر لی گئی اور تین ہزار روپے کی مزید ضمانت ''زمیندار'' سے اور ایک ہزار روپے کی ضمانت کریمی پریس سے طلب کر لی گئی۔ ''زمیندار کا نیا امتحان'' کے عنوان کے تحت مولانا ظفر علی خاں نے مندرجہ ذیل اداریہ لکھا: (5)

''دست از طلب ندارم تا کام من برآید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت کا پول کھولنے کے جرم میں حکومت نے ''زمیندار'' سے تین ہزار روپیہ کی ضمانت لینے کے ساتھ اس کا بیس ہزار روپیہ کا مطبع ضبط کرنے سے جو گہرا زخم لگایا تھا، اس کے مندمل ہونے کی کوئی شکل نہ نکلی تھی کہ اسی وضع کے ایک اور جرم کی پاداش میں آج اس نے چار ہزار روپیہ چہرہ شاہی کی ضمانت مانگی ہے...... جرم یہ ہے کہ میں نے حضور تاجدار انگلستان اور حضور ممدوح کی وساطت سے ساری مسیحی دنیا کے نام وہ مکتوب مفتوح کیوں لکھا اور چھاپا جس میں ممدوح سے بحیثیت حامی دین مسیح یہ التجا کی گئی ہے:

(اولاً) حضرت مسیح ابن مریمؑ اور حضرت مریم صدیقہؑ کی عزت کو مرزا غلام احمد قادیانی کے فحش اور اشتعال انگیز حملوں سے بچانے کے لیے کوئی مؤثر کارروائی کی جائے، جو اس شخص کی کتابوں میں کیے گئے ہیں، جنہوں نے مسلمانوں اور مسیحیوں دونوں کا دل دکھانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔

(ثانیاً) چوہدری ظفر اللہ خاں کے تقرر پر خطِ تنسیخ کھینچا جائے کہ ان صاحب کے عقیدے میں تمام مسلمان کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ اس لیے ایسا شخص مسلمانوں کا نمائندہ نہیں ہوسکتا۔

(ثالثاً) قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے......

''مسلمانوں سے میرا ایک ہی سوال ہے۔ کیا آپ ''زمیندار'' کی ضمانتوں اور

ضبطیوں سے ہیبت زدہ ہو کر حق اور باطل کے اس معرکے میں جس میں ہم اور آپ سر دھڑ کی بازی لگا کر شریک ہو چکے ہیں، پسپا ہو جائیں گے؟ اور غلام احمد قادیانی کو اپنا پیغمبر مان کر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ختم المرسلینی کا دامن چھوڑ کر ہار جائیں گے؟''

یہی وہ زمانہ ہے جب علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے قادیانی فتنے کا تاریخی تجزیہ کرتے ہوئے قادیانیوں کو اسلام اور ہندوستان کا ''غدار'' قرار دیا اور حکومت سے کہا کہ انہیں ایک جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے۔ (6) اسی زمانے میں جسٹس مرزا سر ظفر علی نے بھی قادیانیوں کو از روئے شریعت دائرہ اسلام سے خارج سمجھ کر حکومت سے انہیں ایک جداگانہ جماعت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ (7) اس طرح یہ تحریک مسلم عوام، علما اور جدید تعلیم یافتہ اہل فکر و نظر سب کی اجتماعی تحریک بن گئی۔

ظفر علی خاں کی بصیرت اور روشن ضمیری کا چراغ ان کے اسی پختہ یقین سے منور تھا جو انہیں انگریزی اقتدار کے زوال کے ساتھ اس طائفہ ضالہ کے نابود ہونے کی خبر اس وقت دے رہا تھا جب بظاہر اس کے آثار دور دور نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم نے اس باب میں ظفر علی خاں کے ''شعری الہامات'' سے جان بوجھ کر استفادہ نہیں کیا، تاکہ اس بحث کو ٹھوس علمی دائرے کے اندر ہی رکھا جا سکے۔ مگر اختتام بحث پر ایک دو شعری پیش گوئیاں پیش کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ظفر علی خاں کا شعری مجموعہ ''ارمغان قادیاں'' 1936ء میں شائع ہوا تھا اور یہ اشعار انہوں نے اسی موقع کی مناسبت سے کہے تھے:

تم کو گر منظور ہے سیرِ جہانِ قادیاں
اے مسلمانو! خریدو ''ارمغانِ قادیاں''
جی کو بہلاؤ گے کیونکر گر نہ لو گے یہ کتاب
کیونکہ مٹ جانے کو ہے نام و نشانِ قادیاں
اس بجھارت کو نہ بوجھا آج تک کوئی ادیب
میں نے ہی آخر کو حل کی چیستانِ قادیاں
میرے ہی خامے کی رنگینی تھی جس کے فیض سے
ہو گئی سننے کے قابل داستانِ قادیاں

میں نے دی اس کو لگام اور ہوگیا اس پر سوار
ورنہ کس کو مانتی تھی مادیانِ قادیاں

حواشی وحوالے

1. Thoughts And Reflections of Iqbal. P-273
2. Ibid P-306

-3 ’’زمیندار‘‘ بابت 4 مارچ 1933ء

-4 ’’زمیندار‘‘ بابت 15 مارچ 1933ء

-5 ’’زمیندار‘‘ بابت 9 دسمبر 1934ء

6- Thoughts and Reflections of Iqbal P-294

-7 اس پر مرزا بشیر الدین محمود سمیت جملہ قادیانیوں نے مرزا سر ظفر علی پر جو سب وشتم کیا، اس پر ظفر علی خاں کی ایک نظم ’’وفادارانِ مادر زاد‘‘ (ارمغان قادیاں صفحہ 61 تا 63) قابل ذکر ہے۔

خالد بزمی

تحریک ختم نبوت اور مولانا ظفر علی خاںؒ

تاریخ اسلام کے ہر طالب علم کو یہ معلوم ہے کہ رحمۃٌ للعالمین، شفیع المذنبین، سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، سرورِ دوعالم، نازش عرب و عجم، خیر البشر، ساقی کوثر، سید الانبیاء، شاہ دوسرا، دانائے سُبل، مولائے کُل، ختم الرسل حضرت محمد ﷺ کے بعد جس شخص نے اپنی باطل نبوت کا دعویٰ کیا، وہ جلد یا بدیر اپنے کیفر کردار تک ضرور پہنچا۔

اللہ تعالیٰ کی پاک اور سچی کتاب قرآن عظیم کا ضابطہ یہی ہے کہ:

جآء الحق و زھق الباطل اِنَّ الباطِلَ کان زھوقاً (بنی اسرائیل:81)

مرزا غلام احمد قادیانی (آنجہانی) سے پہلے تاریخ اسلام کے اوراق میں جن مدعیانِ نبوت اور اُن کے انجام بد کا ذکر موجود ہے، اُن میں بنوعنس کے سردار اسود عنسی، بنو اسد کے طلیحہ بن خویلد، مسیلمہ بن حبیب عرف مسیلمہ کذّاب اور سجاح بنت الحارث کے نام خصوصاً لوگوں کو معلوم ہیں۔ ان جھوٹے نبیوں کی جھوٹی نبوتوں کا انجام اس قدر عبرتناک تھا کہ صدیوں تک کسی شخص کو یہ جرأت و جسارت نہ ہوسکی کہ وہ اپنی جھوٹی نبوت کا دعوے کر کے ختم نبوت کے مضبوط و مستحکم قلعے میں نقب زنی کے بارے میں سوچ بھی سکے لیکن برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں کے دور غلامی میں اہل اسلام کو دانستہ جو نقصانات پہنچائے گئے، ان میں سب سے بڑا دینی نقصان یہ تھا کہ خود انگریزی حکومت نے مرزائے قادیانی کی گمراہ کن تحریک کو آب و دانہ مہیا کیا۔ اس باطل تحریک کے ساتھ انگریزی حکومت کے جو مفادات وابستہ تھے، ان میں مسلمانوں کے دلوں سے جذبۂ جہاد ختم کرنا اور اپنے مؤید پیدا کر کے اس طرح انہیں غلامی کی مضبوط زنجیروں میں جکڑنا سرفہرست تھے۔ مرزائیوں نے انگریزوں کے وفادار بن کر ان کے ایجنٹوں کا کردار انجام دیا اور اس طرح اسلام کا دعویٰ کر کے اسلام کو ہر ممکن نقصان پہنچایا۔ گویا مرزائیت کے درخت کی آبیاری

کا مقصد انگریز کے جاسوس پیدا کرنا تھا۔خدا کا شکر ہے کہ علمائے اسلام نے روزِ اوّل ہی سے اس گمراہ کن تحریک کا محاسبہ شروع کر دیا تھا۔اس سلسلے میں جن علمائے کرام کی مخلصانہ مساعی کا ذکر خاص طور پر تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو چکا ہے ان میں مولانا احمد رضا خان بریلویؒ، پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ، پیر جماعت علی شاہؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا عبدالجبار غزنویؒ، مولانا محمد حسین بٹالویؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا داؤد غزنویؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اوران کے رفقا، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی اوران کے رفقاء، مولانا ابوالحسنات قادری، مولانا عبدالستار خان نیازی، حافظ کفایت حسین اور مولانا محمد الیاس برنی کے اسمائے گرامی فراموش نہیں کیے جاسکیں گے۔ اسی طرح موجود دور میں جن لوگوں کو مرزائیت کی حد تک تحریک ختم نبوت کو منزل تکمیل تک پہنچانے کی سعادت نصیب ہوئی، ان میں مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا مفتی محمود احمد، پروفیسر عبدالغفور، حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری، نوابزادہ نصر اللہ خان اور مولانا محمد عطاء اللہ حنیف کے نام مدتوں یاد رہیں گے۔

مذکورہ علمائے کرام اور راہنمایانِ عظام کے علاوہ مشاہیر اسلام میں دو نام اس قدر امتیاز وانفرادیت کے حامل ہیں کہ وہ ہر دور میں نمایاں طور پر دلوں اور ذہنوں میں رہیں گے۔ ان میں سے ایک حضرت علامہ اقبالؒ اور دوسرے مولانا ظفر علی خاں مرحوم ہیں۔عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ اور ردّ مرزائیت کی تحریک میں جو علامہ اقبالؒ کا حصہ ہے، وہ ایک الگ تفصیل کا متقاضی ہے۔میرے پیش نظر اس وقت صرف مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی خدمات کا مختصر تذکرہ ہے۔اگر میں یہ کہوں کہ ردمرزائیت کے سلسلے میں صحافت کے میدان میں مشاہیر اسلام میں سے جس شخصیت نے سب سے زیادہ حصہ لیا ہے، وہ مولانا ظفر علی خاں تھے، تو اس میں مبالغے کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔

خدا کا ہزار شکر ہے کہ تقریباً ایک صدی پرانا مرزائیت کا دل آزار اور تکلیف دہ مسئلہ اب حل ہو چکا ہے اور مرزائیوں کو پاکستان نیشنل اسمبلی اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس میں جملہ اراکین کے متفقہ فیصلے کے مطابق غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا ہے۔اس موقع پر آپ اُس دور کا تصور کیجیے جب اس باطل عقیدے کو انگریز کی مکمل حمایت اور پشت پناہی حاصل تھی اور انگریز کا یہ خود کاشتہ پودا رفتہ رفتہ ایک تناور درخت بن کر اپنے برگ و بار پھیلا رہا تھا۔انگریزی حکومت کے اس دور

میں ہر قسم کے خوف و خطر سے بے نیاز ہو کر مولانا ظفر علی خاں نے اپنی البرز شکن نظم و نثر سے مرزائیت کے قلعے کو پاش پاش کر دیا۔ مولانا ظفر علی خاں جب یہ کہتے ہیں تو اپنے دعوے میں بالکل سچے ہیں کہ:

اس بجھارت کو نہ بوجھا آج تک کوئی ادیب
میں نے ہی آخر کو حل کی چیستانِ قادیاں

یہ اس دور کی بات ہے جب مرزائی گھر گھر اس باطل عقیدے کی اشاعت و تبلیغ کر رہے تھے:

جو مجاور ہیں بہشتی مقبرے کے آج کل
بیچتے پھرتے ہیں گھر گھر استخوانِ قادیاں

آنجہانی مرزا قادیانی کی تحریر میں صرف ونحو اور قواعد کی جو اغلاط ہیں، وہ کسی بھی زبان شناس سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس طرف بھی نشان دہی فرمادی تھی:

صرف غائب، نحو عنقا اور سلاست ناپید
ان سب اجزاء سے مرکب ہے زبانِ قادیاں

ہر باطل تحریک مکر و فریب اور کذب و افترا کے زور پر آگے بڑھتی ہے۔ مرزائیت نے بھی ایسے ہی ناجائز حیلوں سے کام لیا۔ اس لیے اگر کچھ سادہ لوح اس کے دام فریب میں آ گئے تو اس میں چنداں حیرت کی بات بھی نہیں۔ ظفر علی خاں سے اس سوال کا جواب سنیے:

لوگ حیراں تھے کہ جب پھیکا ہے پکوان اس قدر
ہو گئی پھر اتنی اونچی کیوں دکانِ قادیاں
جو فروشی کے لیے گندم نمائی شرط تھی
تھا بڑا ہی کائیاں بازارگانِ قادیاں

قادیانیت کی تحریک کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بانی آنجہانی مرزا قادیانی نے پہلے پہل اپنے آپ کو اسلام کے ایک مبلغ کی حیثیت سے روشناس کرایا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو مجدد قرار دے دیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ مسیح موعود اور مہدی موعود بن بیٹھا اور اپنے آپ کو ظلی و بروزی نبی کہنے لگا۔ جب کچھ سریع الاعتقاد لوگ اس کے حلقہ فریب میں شامل ہو گئے تو اس

نے ظلی نبی کی جگہ پر ''نبی'' کی اصطلاح آزادانہ استعمال کرنا شروع کردی۔اس قسم کے غلط عقیدے پرعمل پیرالوگوں کا انجام کیا ہوگا اور:

کیا سلوک ان سے روا رکھتے ہیں منکر اور نکیر
قبر میں خود دیکھ لیں گے منکرانِ قادیاں

''منکرانِ قادیاں'' سے مراد ''قادیاں کا انکار کرنے والے'' نہیں بلکہ قادیان کے انکار کرنے والے ہے۔ یہ ترکیب بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ کفار مکہ کی ترکیب ہے۔مولانا ظفر علی خاں نے ردِمرزائیت کے سلسلے میں اپنی طبع رسا کا جورنگ جمایا ہے اور اپنی شوخی تحریر کا جواعجاز دکھایا ہے، اس مضمون میں آپ اس کی متعدد مثالیں دیکھیں گے:

اکملت لکم پڑھ کر زبان عربی میں
ظلی و بروزی کی نبوت کو مٹا دوں
ہے جن کو محمد ﷺ کی مساوات کا دعویٰ
مثواہُ جھنم کی وعید اُن کو سنا دوں
کچھ فرق بروز اور تناسخ میں نہیں ہے
انکار ہو جن کو انہیں اقرار کرا دوں
اسلام سے جس قوم کو ہے کچھ بھی محبت
میں اُس کے لیے راہ میں آنکھوں کو بچھا دوں

''خلافت قادیانیہ'' کے زیرِعنوان مولانا ظفر علی خاں نے طنزاً کہا:

خدا آباد رکھے قادیاں کو پھر غنیمت ہے
کہ مضموں غیب سے کوئی نہ کوئی آ ہی جاتا ہے
بشیر الدین محمود اس دبستان کے معلم ہیں
مقنع جس میں فرط عجز سے گردن جھکاتا ہے

دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں مقنع کا مطلب ''نقاب پوش'' ہے۔ یہ شخص نہایت بدشکل، پست قامت اور کانا تھا۔اس نے اپنے چہرے پر سونے کا خول چڑھا رکھا تھا۔اس نے اپنے چہرے کی بدصورتی چھپانے کے لیے یہ تدبیر کی تھی، لیکن بے وقوف لوگ اس کے ظاہری

رعب و جمال کے شیدائی ہو گئے تھے۔ یہ شخص خلیفہ مہدی کے زمانے میں خراسان میں تھا۔ اس نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ ہزاروں بے وقوف اس کے پیرو ہو گئے جن میں بعض عالم و فاضل بھی شامل تھے۔ جب اس نے کچھ لوگوں کی مدد سے بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا تو خلیفہ مہدی نے اس کے خلاف لشکر کشی کی۔ اس پر وہ سیام کے قلعے میں محصور ہو گیا، جب ہر طرف سے ناامید ہو گیا تو اس نے اپنی بیویوں اور بچوں کو زہر دے دیا اور لکڑیاں جمع کر کے ایک بہت بڑا الاؤ بنایا، پھر اس میں آگ لگا دی اور اعلان کیا کہ میں اس آگ میں کود کر خدا کے پاس جا رہا ہوں جو میرے ساتھ جانا چاہیے، وہ بھی اس آگ میں کود جائے۔ اس پر کئی بے مغز لوگ اس کے ساتھ آگ میں کود کر جہنم رسید ہو گئے۔

مرزائے قادیان نے ایک قصیدے میں ایک زلزلے کی پیش گوئی کی تھی اور اس زلزلے کی ہلاکت خیزیاں بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس گھڑی زار روس بھی باحال زار ہو گا۔ اس میں یہ بھی شرط تھی کہ یہ پیشگوئی مرزا کی زندگی ہی میں پوری ہو گی لیکن یہ زلزلہ آنجہانی کی زندگی میں نہ آیا۔ مدت بعد انقلاب روس آیا تو مرزائیوں نے اسے اسی پیشگوئی کا نتیجہ قرار دیا۔ مرزا کی اس پیشگوئی کے بارے میں مولانا ظفر علی خاں نے ایک طویل نظم کہی جس کے بعض اشعار درج ذیل ہیں:

حال اُسی کو غیب کے اسرار کا معلوم ہے
بادشاہی اور گدائی پر ہے جس کا اختیار
لیکن ان باتوں سے مطلب قادیاں والوں کو کیا
جن کی منطق نے کیا دامانِ دانش تار تار
موسیو محمود کہتے ہیں کہ زار روس پر
اُن کے ابا کے قصیدے کی پڑی ہے آ کے مار
کوئی ان حضرت سے پوچھے ہے گر ایسا ہی تو کیوں
آپ ولیم کو نہیں دیتے ہیں گدی سے اتار
فرڈیننڈ اس وقت تک کیوں صوفیہ میں ہے مقیم
آپ کیوں ڈھاتے نہیں اس کا بھی قصر زرنگار

زار کی تو آپ نے پہلے ہی دے دی تھی خبر
بلجیم کا قادیاں نے کیوں نہ بانٹا اشتہار
مانٹی نگرو کی نسبت کیا ہے ارشاد آپ کا
غیب دانی آپ کی، اس کی ہوئی کیوں پردہ دار
اب بھی اس ہذیاں سے لِلہ دست کش ہو جائیے
ورنہ کھو بیٹھیں گے سب آپ اپنا جالوتی وقار

ان اشعار میں جس ولیم کا ذکر ہے، وہ جرمنی کا بادشاہ تھا اور وہ پہلی جنگ عظیم میں شامل تھا۔ اسی طرح فرڈنینڈ آسٹریا کا بادشاہ تھا۔ وہ جرمنی کا حلیف تھا۔ بلجیم پہلی جنگ عظیم میں تباہ ہو گیا تھا اور یورپ کی ریاست مانٹی نگرو کا تو نام ونشان ہی مٹ گیا تھا۔

مرزائیت کے علمبردار قرآن حکیم کی بعض آیات کا عجیب مطلب بیان کرتے تھے۔ انہوں نے **لیس کمثلہٖ** کی شرح بھی اپنے مطلب کے مطابق فرما دی۔ اس پر مولانا ظفر علی خاں نے اس طرح گرفت فرمائی ہے:

معنی **لیس کمثلہ** آپ ہیں
یعنی آپ اللہ میاں کے باپ ہیں
عرش کو جس نے کیا ہے بے سپر
آپ اسی گھوڑے کی برقی ٹاپ ہیں
جو سبق بھی دے دیا طاغوت نے
موسیو محمود دیتے چھاپ ہیں
قادیاں ہے چشمہ آبِ حمیم
باپ پانی تھے تو بیٹے بھاپ ہیں
فَاتبِعُهٗ کی انگیٹھی گرم ہے
آگ اس کی آپ لیتے تاپ ہیں
دیکھیے ملتی ہے کب ان سے نجات
اور کب کٹتے ہمارے پاپ ہیں

آج یقیناً مولانا ظفر علی خاں کی روح جنت میں خوش ہوگی کہ مرزائیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا ہے۔ اس سے پہلے یہ ذکر آچکا ہے کہ مرزائیت کی تحریک ایک سیاسی تحریک تھی۔ اس کے ثبوت میں متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ جس زمانے میں غازی امان اللہ خان حکمران تھے، ان دنوں علمائے اسلام نے ایک قادیانی مبلغ کو سنگسار کرادیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد اہل قادیاں، غازی امان اللہ خان کے دشمن ہو گئے۔ جب کچھ مدت کے بعد غازی امان اللہ خان کی حکومت کو زوال آیا تو قادیانیوں نے خوشی کی تقریب منائی۔ مولانا ظفر علی خاں نے قادیانیوں کے اس ظاہر و باطن خبث پر لکھا کہ:

شمع کابل کی بجھ گئی جس رات
قادیاں میں چراغ گھی کے جلے
موسیو مرزا بشیر الدین
سجدہ کرنے کلیسیا کو چلے
مغربیت ہے آپ کی انّا
دودھ پی پی کے جس کا آپ پلے
زندہ کیوں رہ گیا امان اللہ
موسیو اس سوال سے نہ ٹلے
جاں بچا کر نکل گیا اسلام
کفِ افسوس کفر کیوں نہ ملے

بٹالہ ضلع گورداسپور کے پر جوش رضا کارانِ اسلام کے سالار ایک نوجوان حاجی محمد حسین تھے۔ ایک اسلام دشمن مرزائی محمد علی نے اسے خنجر کے وار سے شہید کر دیا۔ مرزا بشیر الدین محمود نے قاتل کو ''غازی'' کا خطاب دیا اور اس کی جان بچانے کے لیے پریوی کونسل تک مقدمہ لڑتے رہے، لیکن آخر قاتل اپنے انجام بد تک پہنچا اور پھانسی پر لٹکایا گیا۔ مرزا محمود نے خود اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اسے اپنے نام نہاد ''بہشتی مقبرہ'' میں دفنایا۔ مولانا ظفر علی خاں نے محمد حسین شہید کے بارے میں یہ ایمان افروز اشعار کہے:

شہیدوں کا خوں رنگ لایا کرے گا
نشاں ظالموں کا مٹایا کرے گا
کہاں تک مسلماں کے قاتل کو شیطاں
خدا کے غضب سے بچایا کرے گا
بٹالہ میں اسلام کا زورِ بازو
حریفوں کے چھکے چھڑایا کرے گا
دکھایا کرے گا جلالِ محمد
علم قادیاں کا جھکایا کرے گا

مغلوں کے گھرانے میں ایک عزت دار خاتون محمدی بیگم تھیں۔ مرزا غلام احمد آنجہانی نے اس پاکباز خاتون کے بارے میں یہ مشہور کر دیا کہ اس کے ساتھ آسمان پر میرا نکاح ہو چکا ہے، حالانکہ آسمان تو کیا زمین پر بھی یہ نکاح کبھی عمل میں نہ آیا اور مرزا قادیانی ناکام و نامراد آنجہانی ہو گئے۔ مرزا غالب نے کہا تھا:

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ظفر علی خاں نے پہلے مصرعے پر یوں گرہ لگائی ہے:

''وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے''
مرے گر کعبے میں لندن میں گاڑو قادیانی کو

مرزا قادیانی نے اپنی باطل نبوت کے پرچار کے ساتھ ساتھ مختلف انبیائے صادقین کا استخفاف کیا اور اس اہانت کے سلسلے میں مرزائیت دین کے پردے میں دراصل ایک سیاسی تحریک تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ مرزائیوں نے سیاسی حالات سے ہمیشہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ایک بار مرزا بشیر الدین محمود ایک خاص مقصد لے کر لندن گئے تو مولانا ظفر علی خاں نے لکھا:

عناد اور بغض کی تصویر بن کر
گئے لندن بشیر الدین محمود

یہ مقصد آپ کا ہے اس سفر سے
کہ سرحد پر بچھا دی جائے بارود
دکھائے یورپ آ کر اس کو بتی
جہنم کی لپٹ جس میں ہو موجود
یہ ساری سرزمیں پھر بھک سے اڑ جائے
اور افغانوں کی جمعیت ہو نابود
کوئی اس دین کے دشمن کو سمجھائے
کہ ساری کوششیں تیری ہیں بے سود
بھلا برطانیہ کو کیا پڑی ہے
کہ دوزخ میں تری خاطر پڑے کود
ہے تو بھی کیا کسی کرنل کی میم
بھگا کر لے گئے ہوں جس کو مسعود

مرزائیت کی تحریک حقیقتاً نکوکاری کے پردے میں سیاہ کاری کا حیلہ تھی اور باطل نبوت کا مقصد دراصل نصاریٰ کی رضا جوئی تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے ''حدیثِ قادیاں'' کے عنوان سے آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر اس راز سے پردہ اٹھا دیا تھا:

حقیقت قادیاں کی پوچھ لیجیے ابن جوزی سے
نکوکاری کے پردے میں سیہ کاری کا حیلہ ہے
یہ وہ تلبیس ہے ابلیس کو خود ناز ہے جس پر
مسلمانوں کو اس رندے نے اچھی طرح چھیلا ہے
پلی ہے مغربی تہذیب کے آغوش عشرت میں
نبوت بھی رسیلی ہے پیمبر بھی رسیلا ہے
نصاریٰ کی رضا جوئی ہے مقصد اس نبوت کا
اور ابطال جہاد انجاحِ مقصد کا وسیلہ ہے

بیاس اور اس کی موجیں آئے دن کرتی ہیں غمازی
کہ پوتا قادیاں کے رب اکبر کا رنگیلا ہے

قادیانیوں نے انگریزی حکومت کے زیر سایہ اپنے مسلسل پروپیگنڈے سے مسلمانوں میں جا جا کر ایسا جال بچھایا کہ ان کی چالوں سے غافل اور سادہ لوح مسلمان دامے درمے بھی مرزائیوں کی مدد کرتے رہے، مولانا ظفر علی خاں نے ایک موقعہ پر ایسی ہی صورت حال دیکھ کر مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ:

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
کچھ یہود آتے ہیں دو جون کو چندے کے لیے
شاہ برطانیہ کی سالگرہ ہے اس دن
یہ اشارہ ہے ہر اللہ کے بندے کے لیے
گردن امت مرحوم کو پھر تاکا ہے
نام توحید پہ تثلیث کے پھندے کے لیے

ایک موقعہ پر مولانا ظفر علی خاں نے مسلمانوں کو انگریزوں اور قادیانیوں سے اس طرح خبردار کیا:

خدا نے تم کو بصیرت اگر عطا کی ہے
تو قادیانیوں کے تیر بے کماں سے بچو
دمشقیوں سے خطرناک تر ہیں اندلسی
گر اِن کی ''ایں'' سے بچے ہو تو اُن کی ''آں'' سے بچو
جو بات بات پہ تم کو حرام زادہ کہے
ہر ایسے سفلہ بد اصل و بد زباں سے بچو
نبی کی غصے میں ڈوبی ہوئی نگہ سے ڈرو
عتابِ حضرت آقائے دوجہاں(ﷺ) سے بچو

مندرجہ بالا اشعار میں سے دوسرے شعر میں دمشقی اور اندلسی دونوں لفظ خاص

اصطلاحوں کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔ بنو امیہ کے دور خلافت میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب ان کی حکومت دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک کا دارالحکومت دمشق (شام) تھا اور دوسری اندلس (ہسپانیہ یا سپین) میں تھی۔ مولانا ظفر علی خاں مرزائیوں کی قادیانی جماعت اور لاہوری جماعت کے لیے بالترتیب دمشقی اور اندلسی کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔

قادیانیوں نے گستاخیوں کے حوالے سے رسول مقبول ﷺ کی آل مبارک کو بھی نہ چھوڑا۔ ظفر علی خاں مرزائے قادیانی کی ان گستاخیوں پر علمائے امت سے شکوہ کرتے ہیں:

خدارا آنکھ کھول اور دیکھ تو اے ملت بیضا
کہ تیری کیا روش ہے اور ہے کیا رفتار دنیا کی
اِدھر دنیا و مافیہا سے تُو اس وقت تک غافل
اُدھر اسلام پر برسوں سے پیہم یورش اعدا کی
بشیر الدین محمود اٹھ کے پھیلاتا ہے بے کھٹکے
فرنگستاں کے سایے میں خرافات اپنے باوا کی
چھپے ہیں سو حسین ابن علی جس کے گریبان میں
رسائی جس کی منزل تک نہیں ہوتی مسیحا کی
کبھی حج ہوگیا ساقط، کبھی قیدِ جہاد اٹھی
شریعت قادیاں کی ہے رضا جوئی نصاریٰ کی
یہ فتنہ بڑھ چلا ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو
نہیں اے عالمانِ دیں! میں تم سے بے سبب شاکی

مرزا غلام احمد نے ایک مصرعے میں کہا ہے:

صد حسین است در گریبانم

اور دوسری جگہ دعویٰ کیا ہے کہ

عیسیٰ کجاست تا بہ نہد پا بہ منزلم

اوپر کے چوتھے شعر میں مرزا کے انہی جاہلانہ اور گستاخانہ دعاوی کی طرف اشارے ہیں۔

مرزائیوں کے بعض عقائد اس قدر مضحکہ خیز ہیں کہ مسلمانوں کا کوئی بھی مسلک ان کی تائید نہیں کر سکے گا۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مرزائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ بھاگ کر کشمیر میں آ گئے تھے اور ان کی قبر بھی وہیں ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے ''قادیانی خرافات'' کے عنوان سے مذکورہ عقیدے کی طرف اس طرح نشاندہی فرمائی ہے:

آسماں پر یوسف نجار کا بیٹا کہاں
کیا دھرا اس نیلے نیلے گنبد بے در میں ہے
آ بسا تھا بھاگ کر کنعاں سے وہ کشمیر میں
آخری اس کا ٹھکانا بھی اسی کشور میں ہے

مولانا ظفر علی خاں اس نشاندہی کے بعد مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

عیسیٰؑ مریم کی اس توہین کا سودائے خام
ایک مدت سے سمایا قادیاں کے سر میں ہے
چھپ رہے ہیں جس کے اندر محشرستاں سینکڑوں
اے مسلمانو! وہ فتنہ خود تمہارے گھر میں ہے

مرزا قادیانی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے انگریزوں کی تائید و حمایت اور تعریف و توصیف میں اس قدر لکھا ہے کہ اس سے پچاس الماریاں بھر گئی ہیں لیکن اس کے باوجود انگریزی حکومت نے میری خدمات کا اعتراف اس حد تک نہیں کیا جس قدر اسے کرنا چاہیے تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اسی نظم کے ایک شعر میں کہا:

جن پچاس الماریوں پر تھا غلام احمد کو ناز
حشر ان کا کاتب تقدیر کے دفتر میں ہے

مرزائیوں کے مشہور اخبار ''الفضل'' میں کسی مرزائی شاعر نے مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں جلے دل کے پھپھولے اس طرح پھوڑے کہ:

بری طرح قادیاں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ظفر علی خاں
سمجھ پہ کیوں پڑ گئے ہیں پتھر، یہ کیسے فتنے اٹھا رہے ہیں

جناب محمود کو برا کہہ کے کیا ملے گا سوائے ذلت
یہی نہ جو کچھ رہی تھی عزت، اسے بھی دل سے گنوا رہے ہیں
وہ اپنی مسجد الگ چنیں گے ہزار دنیا بنے مخالف
انہیں یہ ضد ہے کہ کیوں مسلمان ایک مرکز پہ آ رہے ہیں

سات اشعار کی یہ نظم اسی طرح کی خرافات کا مجموعہ ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کب خاموش رہنے والے تھے۔ انہوں نے اسی زمین میں آٹھ شعروں کی نظم سے جواب دیا۔ ان میں سے پانچ اشعار پیش خدمت ہیں:

یہ فتنہ پرداز قادیانی نئے نئے گل کھلا رہے ہیں
اُدھر رقیبوں سے مل رہے ہیں، ادھر ہمارے گھر آ رہے ہیں
منافقوں کی ہے یہ نشانی زباں پہ دیں ہو تو کفر دل میں
اسی نشانی سے قادیانی تعارف اپنا کرا رہے ہیں
رسول مقبول ﷺ کی شریعت کے نام پر دیں ہمیں نہ دھوکا
اسی شریعت کی آڑ لے کر وہ سب کو اُلّو بنا رہے ہیں
خبر پیمبر ﷺ نے جس کی دی تھی، وہ فتنہ اٹھا ہے قادیاں سے
خلیفہ محمود قادیانی اسے قیامت بنا رہے ہیں
ظفر علی خاں کی آبرو کو نہ حرف آیا نہ آسکے گا
خدا نے دی ہے جب اس کو عزت تو آپ کیوں تلملا رہے ہیں

ایک مجاہد مسلمان کے علاوہ ممتاز اور منفرد شاعر کی حیثیت سے بھی مولانا ظفر علی خاں کو جو بلند مرتبہ اور آبرومندی حاصل ہے، اس کا انکار ان کے دشمن بھی نہیں کرسکیں گے۔ مولانا مرحوم نے مرزائیت کی مذمت کے سلسلے میں جو منظومات سپردِ قلم کی ہیں، ان میں زبان دانی کے علاوہ ان کی مشاقی اور قادرالکلامی کے بھی بہترین نمونے موجود ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں ایسے ایسے ادق قافیے لاتے ہیں کہ کسی نقاد کے قول کے مطابق انہیں شہنشاہ قوافی تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں ان کی مختلف نظموں سے متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:

کان والو! انکرالاصوات ہے صوت الحمیر
گر یہ ڈھینچوں ڈھینچوں سننی ہو تو جاؤ قادیاں
عیسیٰؑ مریم کو گالی قادیاں دے لے مگر
یاد رکھے اس کی بھی ہیں نانیاں اور دادیاں

....

ہم مسلماں ہیں ازل سے شرک ہے جن کا حریف
قادیاں کا اس میں ہیکل ہو کہ ہو متھرا کا دیر
بولہب کی شان ہو یا ہو غلام احمد کی آن
ملتِ بیضا کے ساتھ اُن کا ہے پہلے دن سے بیر
ہم نے ان کے ساتھ نیکی کی، انہوں نے کی بدی
اور کر سکتے تھے کیا اسلام سے برتاؤ غیر

....

وہ افعی بانبیاں ضحاک کے شانوں میں تھیں جن کی
بروز اس عہد میں ان کا غلام احمد سپیرا ہے
ہوئی ہے قادیاں کی مادیاں کی پرورش جس میں
بشیر الدین محمود اس طویلے کا بچھیرا ہے

....

پکڑ فولاد سے بھی ہے مری سخت
مرا سینہ ہے چکلا اور چوڑا
غلام احمد مرا لوہا گیا مان
اٹھایا میں نے جب دیں کا ہتھوڑا
ہر اک میدان سے بھاگے قادیانی
کہ اُن کا پیشوا بھی تھا بھگوڑا

بشیرالدین کا ٹٹو تھا مریل
لگے چابک نہ لیکن پھر بھی دوڑا
چلی پنجاب میں جب دیں کی گاڑی
تو اٹکا قادیانیت کا روڑا
کیا مرزا نے بدنام انبیا کو
محمد مصطفیٰ ﷺ تک کو نہ چھوڑا
دیے اسلام کو چرکے جنہوں نے
انہی سے اس نے اپنا رشتہ جوڑا
نبوت لنگڑی اور اندھی خدائی
ملا ہے خوب ان دونوں کا جوڑا
یہی اس کی نبوت کی ہے پہچان
کہ مر کر بھی نہ منہ لندن سے موڑا

مرزائیت کی گزشتہ تاریخ میں کشمیر کمیٹی کا واقعہ بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ حسن اتفاق (مرزائیوں کے حق میں سوئے اتفاق) سے اس کمیٹی کے صدر علامہ اقبال تھے۔ علامہ مرحوم نے ایک موقعہ پر اس کمیٹی کو محض اس لیے توڑ دیا کہ اس پر قادیانی چھا رہے تھے اور ان پر کشمیر میں مرزائیت کی تبلیغ کا الزام تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے کشمیر کمیٹی کے بارے میں بھی ایک سے زائد نظمیں کہیں۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں:

باطل کا جنازہ تھا بڑی دھوم سے نکلا
قائم ہوئی جس دن نئی کشمیر کمیٹی
نابود ہوئے اندلسی اور دمشقی
دونوں نے بساط اپنی نحوست کی لپیٹی
مرزا کی نبوت کے لیے کھودی گئی قبر
گاڑی گئی جس میں یہ خرافات کی بیٹی

....

قادیاں خوش ہو کہ بر آئی ترے دل کی مراد
آخر آ ہی گئی کشمیر میں فوجِ انگریز
اگر انگریز ہے دولہا تو ہے تُو اس کی دلہن
مل گیا تجھ کو ہری سنگھ کی دولت کا جہیز
کیوں نہ اب اڑنے لگے تری نبوت کا سمند
چھیڑتی ہے جسے یورپ کی صلیبی مہمیز
خوانِ اسلام سے چندے کا نہ کر لقمہ طلب
جبکہ چن دی گئی ہے تیرے لیے کفر کی میز
دھجیاں نامۂ سرکارِ دو عالمﷺ کی اُڑا
اے کہ تجھ کو نہ رہا یاد مآلِ پرویز
آج تک خاک میں ملتی ہی چلی آئی ہے
ہر وہ طاقت جو مسلماں سے ہوئی گرمِ ستیز

مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھ ساتھ ان کے ''تقدس مآب'' صاحبزادے مرزا بشیر الدین محمود احمد کی ''رنگین شخصیت'' اوران کے ''سنہری کارناموں'' کا ذکر مولانا ظفر علی خاں کے اشعار میں جا بجا ملتا ہے۔ بعض حد سے متجاوز روا دار قسم کے لوگوں کو مولانا مرحوم کے کلام پر یہ اعتراض رہا ہے کہ وہ مرزا محمود کی ذاتی زندگی کے بعض مشاغل کا ذکر بھی نہایت واشگاف طور پر کر دیتے ہیں۔ اگر غور فرمایا جائے تو معلوم ہوگا کہ نبوت اور خلافتِ نبوت کے دعویداروں کے معاملے میں یہ طریقہ کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں ہونا چاہیے تاکہ عام لوگوں کو ان کے دعاوی کی صداقت کو جانچنے کا موقع مل جائے اور وہ ان کے اخلاق کو مسلمہ معیار پر پرکھ سکیں۔ مرزا بشیر الدین محمود کی سیرت میں مس روفو کا ''اغوا'' یقیناً کوئی قابل تقلید یا قابل توصیف کارنامہ نہیں ہے۔ اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ لاہور کے سیسل ہوٹل میں ایک اطالوی حسینہ مس روفو منتظمہ تھیں۔ مرزا بشیر الدین محمود نے ایک موقعے پر صرف ایک روز کے لیے وہاں قیام فرمایا۔ دوسرے روز وہ حسینہ ہوٹل سے غائب تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مرزا محمود کے بچوں کی گورنس کے طور پر قادیاں میں ملازم ہوگئی ہے۔ اگر مولانا ظفر علی خاں، مرزا محمود کی اس ''خوش ذوقی'' کی داد نہ

دیتے تو یہ مولانا مرحوم کی ''بے ذوقی'' کا ثبوت ہوتا۔ ''داد'' ملاحظہ فرمائیے:

اے کشور اطالیہ کے باغ کی بہار
لاہور کا دمن ہے ترے فیض سے چمن
پیغمبر جمال تری دل رُبا ادا
پروردگار عشق ترا چُلبلا چلن
اُلجھے ہوئے ہیں دل تری زلف سیاہ میں
ہیں جس کے ایک تار سے وابستہ سوختن
پروردہ فسوں ہے تری آنکھ کا خمار
آوردہ جنوں ہے تری بوئے پیرہن
پیمانہ نشاط تری ساقِ صندلی
بیعانہ سرور ترا مرمری بدن
رونق ہے ہوٹلوں میں ترا حسن بے حجاب
جس پر فدا ہے شیخ تو لٹو ہے برہمن
جب قادیاں پہ تیری نشیلی نظر پڑی
سب نشہ نبوتِ ظلی ہوا ہرن
میں بھی ہوں تیری چشم پُر افسوں کا معترف
جادو وہی ہے آج جو ہو قادیاں شکن

مس رِفو کے اچانک ہوٹل سے غائب ہو جانے کے بعد لوگوں کے دلوں میں یہ سوال ابھرا کہ آخر وہ ''برق'' کہاں گری ہے۔ اس پر مولانا ظفر علی خاں نے لکھا:

عشاقِ شہر کا ہے ''زمیندار'' سے سوال
ہوٹل سیسل کی رونق عریاں کہاں گئی
اس کے جلو میں جاں گئی ایماں کے ساتھ ساتھ
کیا کیا نہ تھا جو لے کے وہ جان جہاں گئی

خوف خدائے پاک دلوں سے نکل گیا
آنکھوں سے شرمِ سرور کون و مکاں ﷺ گئی
بن کر خروش حلقہ، رندان لم یزل
لے کر گئی وہ حشر کا ساماں جہاں گئی
رومہ سے ڈھل کے برق کے سانچے میں آئی تھی
اب کس حریم ناز میں وہ جان جاں گئی
یہ چیستاں سنی تو ''زمیندار'' نے کہا
اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ قادیاں گئی

اس سے پہلے اس بات کا ذکر اشارتاً آچکا ہے کہ مرزائی مسلمانوں سے اسلام کی اشاعت وتبلیغ کے نام پر چندہ اکٹھا کرتے تھے اور بعض لوگ جواُن کے دامِ ہمرنگ زمیں سے بے خبر تھے، انہیں چندہ دے دیا کرتے تھے۔ مولانا ظفرعلی خاں نے ''چندے کا دھندا'' کے عنوان سے جونظم کہی ہے، وہ اپنی فنی خوبیوں اور خاص طورر پر لطف قوالی کے اعتبار سے ایسی ہے کہ وہ ان صفحات میں مکمل نقل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پڑھیے اور داد دیجیے:

اگر چندے کی حاجت ہے تو کر دعویٰ رسالت کا
بغیر اس ڈھونگ کے چندہ مہیا ہو نہیں سکتا
سنا ہے قادیاں میں بانسری بجتی ہے گوکل کی
مگر ہر بانسری والا کنہیا ہو نہیں سکتا
اگر مکہ سے بھی کرتا وہ ڈھیچوں ڈھیچوں ہو آئے
یہ ظاہر ہے خر عیسیٰ گویّا ہو نہیں سکتا
مجدد الف ثانی سے غلام احمد کو کیا نسبت
ثریٰ کتنا بھی اونچا ہو ثریا ہو نہیں سکتا
برادر خواندگی کی شرط اگر ہو مرزائیت
قیامت تک بھی ہم سے یہ تو بھیا ہو نہیں سکتا

سرشتِ مردِ مومن کا بدلنا غیر ممکن ہے
چنبیلی کا یہ پودا بھٹ کٹیا ہو نہیں سکتا
جسے اسلام کی عزت پہ کٹ مرنا نہ آتا ہو
مسلمانوں کے بیڑے کا کھویا ہو نہیں سکتا

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد ﷺ پر جو فرشتہ وحی لاتا تھا، اس کا نام ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ وہ جبریل علیہ السلام تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی پر جو فرشتہ وحی لاتا تھا، اس کا نام ''ٹیچی ٹیچی'' تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کی ایک نظم کا عنوان یہی ہے:

نبوت مجھے بخشی انگریز نے
یہ پودا اسی کا ہے خود کاشتہ
پلومر کی بھٹی سلامت رہے
ہے جس کی صبوحی مرا ناشتہ
کنھیا بھی ہوں اور مہدی بھی ہوں
ہے دونوں کی عزت مری داشتہ
دکھائے نہ توحید آنکھیں مجھے
کہ تثلیث ہے پرچم افراشتہ
یہ ہے ٹیچی ٹیچی کی بر وقت چیچ
جو ہے مری تھیلی زر انباشتہ

اس نظم میں پلومر سے مراد مال روڈ لاہور کی مشہور دکان ای پلومر ہے۔ اس دکان میں انگریزی ادویہ کے علاوہ اعلیٰ درجہ کی غیر ملکی شرابیں بکتی تھیں۔ آخری شعر میں ٹیچی ٹیچی نامی جس فرشتے کا ذکر ہے، اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ آسمان قادیاں سے اُتر کر مرزا قادیانی کی جیب روپوں اور نوٹوں سے بھر دیا کرتا تھا۔

مولانا ظفر علی خاں نے باقاعدہ نظموں کے علاوہ مرزا اور مرزائیت کے بارے میں متفرق اشعار بھی کہے ہیں۔ انہوں نے مجموعی طور پر جو کچھ اس موضوع پر کہا ہے، اس کا مفصل ذکر ایک کتاب کی ضخامت کا طالب ہے۔ مرزائیت کے موضوع پر مولانا کے بعض متفرقات بھی خوب

ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

منکر ختم نبوت ہو کے اہل قادیاں
اپنے وقتوں کے ثمود و عاد ہو جانے لگے

....

طوقِ استعمار مغرب خود کیا زیبِ گلو
اور گواہ اس پر ہیں مرزا کی پچاس الماریاں

....

بقائے وحدتِ اسلام ہے اگر منظور
تو قادیاں کی نبوت کی روک تھام کرو

آخر میں مرزائے قادیانی کی موت پر ظفر علی خاں نے جو معرکہ آرا نظم کہی ہے، اس کے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

مرزائے قادیانی مر گیا
قادیانی فرقے کا بانی مر گیا
ہو گیا اسلام کا اک رخنہ بند
سنتے ہیں دجّال ثانی مر گیا
لے کے اپنے دل کے اندر سینکڑوں
آرزو ہائے جوانی مر گیا
کرتے ہیں مرزائی تاویلیں عبث
آئی مرگِ ناگہانی مر گیا

المختصر مولانا ظفر علی خاں نے اہل اسلام کو مرزائیت کے فتنے سے بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش فرمائی:

آسماں اُن کی لحد پر شبنم افشانی کرے

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی

ارمغانِ قادیان

''ارمغانِ قادیان''، مولانا ظفر علی خاں کے مجموعہ کلام کا چھٹا حصہ ہے جس کے چھپن عنوانات ہیں۔ اس کتاب کے صفحات 72 ہیں۔ ابتدائی ایڈیشن میں قادیانیت کے متعلق نظمیں اور قطعات ''بہارستان'' میں شامل ہیں۔ بعد میں اس حصے کو الگ کر کے اس نام سے شائع کیا گیا۔ یہ کتاب شعری اعتبار سے تو ان کے اس کلام کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ''ستارہ صبح'' اور ''زمیندار'' میں قادیانیوں کے خلاف چھپتا رہا۔ گویا یہ اشعار قادیانیت کے خلاف قلمی جہاد کا نمونہ ہیں۔ قادیانی تحریک نے اتحاد اسلامی کو سخت نقصان پہنچایا اور ان کی اجتماعی قوت میں بعض بنیادی مسائل کے سبب افتراق پیدا ہوگیا۔ ارباب علم آگاہ ہیں کہ انگریزوں کے مشرق میں سیاسی اقتدار کے غلبے نے انھیں اس امر کی طرف متوجہ کر دیا تھا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے ان کے مذہب میں افتراق پیدا کر دیا جائے تا کہ ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے۔ ایران میں بابیت کا ظہور اور پنجاب میں مرزائیت کا فروغ دونوں اس امر کی دلیل ہیں کہ دونوں جگہ انگریزوں نے دو افراد کو اس امر کے لیے تیار کیا کہ وہ اپنی طباعی اور ذہنی فوقیت کے سبب مسلمانوں میں مجدد بننے کے اہل ہیں اور وہ ہی اسلام کے صدیوں پرانے قوانین میں ترمیم کر کے ان کو رائج الوقت بنا سکتے ہیں۔ انگریزوں کو سب سے بڑا کھٹکا جہاد کا تھا، لہٰذا انھوں نے علی محمد باب کو ایران میں اور مرزا غلام احمد قادیانی کو پنجاب میں اس امر کے لیے تیار کیا کہ وہ مسلمانوں کی گری ہوئی حالت کو سدھانے کے لیے کام کر سکتے ہیں۔ ایران میں گویا سید جمال الدین افغانی کی تحریک کا یہ ردِعمل تھا اور پنجاب میں تحریک جہاد کو ختم کرنے کا ایک خاص ذریعہ تھا۔

''ارمغان قادیان'' کے مقدمے میں چراغ حسن حسرت لکھتے ہیں کہ ''مرزائیت'' دراصل سید جمال الدین افغانی کی تحریک کا ردعمل تھی، اس لیے کہ مرزائیت کا مقصد انگریز کی

اطاعت تھا اور افغانی تحریک کا مقصد اتحاد اسلامی اور مغربیت کے خلاف جہاد کرنا تھا۔ اس لیے مرزائیت نے انگریزوں کی اطاعت کو حکم نبوت کے تحت واجب قرار دے دیا، جبکہ مرزا صاحب مجدد کے مرتبے سے آگے بڑھ کر نبوت کا اعلان کر چکے تھے اور ان کی بات نہ ماننے والوں کا اقتصادی اور سیاسی بائیکاٹ کیا گیا، بلکہ انھیں کافر قرار دے دیا گیا۔ اگر مرزا صاحب کے عقائد کا مسئلہ صرف وفات مسیح، ظہور مہدی اور خروجِ دجال تک محدود رہتا تو شاید عام مسلمانوں پر اس کا کوئی اثر بھی نہ پڑتا، اس لیے کہ بہرحال وہ ان کی انفرادی رائے تھی لیکن سب سے زیادہ غلط قدم جو انھوں نے اٹھایا، وہ یہ تھا کہ ان تینوں مسائل کی تاویلات کے ذریعے اپنی نبوت کے منکرین کو اسلام سے خارج ہی کر دیا اور ان کے اعتقادات کو تسلیم نہ کرنے والا نہ صرف یہ کہ جماعت سے خارج سمجھا گیا، بلکہ وہ کافر کہلایا۔ شروع میں انھوں نے ختم نبوت کے مسئلے کو انتہائی مبہم طور سے اٹھایا اور چونکہ خود حکومت وقت کی پشت پناہی انھیں حاصل تھی، اس لیے دعوے کے اعلان نے ان کی سیاسی پوزیشن کو اور مضبوط کر دیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس مسئلے پر دو لحاظ سے توجہ کی۔ اوّل مذہبی لحاظ سے، دوسرے سیاسی لحاظ سے۔ انھوں نے قادیانی نبی کے عقائد کا تجزیہ کیا اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا جائزہ لیا اور پوری طرح ان کے عزائم آشکار کیے۔ انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی مخالفت خصوصیت سے اس لیے کی کہ ایک امتی حضور نبی کریم ﷺ کی ہمسری کا دعوے دار بن کر مسلمانوں کو گمراہ کر رہا ہے، جبکہ اس کی زندگی بعض ایسی کمزوریوں سے پر ہے اور جو صحیح معنوں میں ایک مومن کے لیے شرم و عار کا باعث ہے، لیکن مرزا صاحب ان کمزوریوں کو اپنے لیے نہ صرف یہ کہ باعث فخر سمجھتے ہیں، بلکہ ان چیزوں کو اپنے نبوت کے دعوے کے طور پر بھی پیش کرتے رہے۔ مثلاً محمدی بیگم سے نکاح پر اصرار، ان کے والد کا انکار اور ان کی طرف سے مختلف تاویلیں۔

ایک انسان کا مدعی الہام بن کر اپنے ہر فعل کو وحی الٰہی کے تابع کہہ کر دعویٰ کرنا ایک ایسی چیز تھی کہ جو کسی راسخ العقیدہ مسلمان کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ مرزا صاحب کا اعلان نبوت گویا ختم نبوت کے بعد ادعائے نبوت تھا۔ جیسا کہ مولانا ظفر علی خاں نے کہا ہے:

نبی (ﷺ) کے بعد نبوت کا ادعا ہو جسے
ہر ایسے بطل خرافات سے خدا کی پناہ

ظاہر ہے کہ ایسے انسان سے محبت اور اس کے مذہب کی تصدیق اسلام اور اسلامی معاشرے سے بغاوت کے مترادف قرار پائے گی۔ چونکہ سیاسی لحاظ سے مرزا صاحب کو پروپیگنڈے کے زیادہ مواقع ملے۔اس لیے سادہ لوح مسلمانوں پر اس نئی تحریک کا کافی اثر پڑا اور اس طرح مسلمان ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو کر نا اتفاقی کا شکار ہو گئے اور ملت اسلامیہ کو شدید نقصان پہنچا۔مولانا کا شروع سے یہ واضح نقطہ نظر تھا کہ اس تحریک کو انگریز نے اپنی سیاسی مصلحتوں اور ضرورتوں کی بنا پر جنم دیا ہے اور یہ اس کی عالمگیری اسی پالیسی کی ایک زنجیر ہے۔مرزا صاحب نے جہاد کے خلاف جو خصوصی پرچار کیا تھا، انگریزوں نے اس کو اپنے سیاسی مقاصد کی کامیابی کے لیے بطور آلہ استعمال کیا اور یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔انھوں نے سید احمد شہید کی روح کو کچلنے کے لیے اپنی تمام کوششوں کو صرف کر دیا تھا اور چونکہ پنجاب کے مسلمانوں کے گھرانے کے گھرانے اس طرح ذہنی لحاظ سے تقسیم ہو گئے تھے اور اس تقسیم نے ان کی معاشرتی طاقت پر بھی برا اثر ڈالا، اس لیے مولانا ظفر علی خاں نے مسلسل اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے اس سیاسی جماعت کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے پورا تہیہ کر لیا تھا۔اس لیے انھوں نے کبھی بھی کسی مصلحت آمیزی کا ساتھ نہیں دیا۔وہ سختیاں اٹھاتے رہے۔دھمکیاں کھاتے رہے، لیکن اپنے مؤقف سے سر مو نہ ہٹے اور اپنے ادبی معرکوں کے ذریعے ان کے اخبارات اور ان کے بیانات کا رد کرتے رہے۔

اسلام میں اس فرقہ کے باعث دو سبب سے نقصان پہنچا تھا۔ایک تو یہ کہ تاویل قرآن غلط کی گئی۔دوسرے تفسیر قرآن مجید بھی انھوں نے صرف اپنے خیال کے مطابق کی اور ترجمے کیے تاکہ قرآنی معانی کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھال سکیں۔انھوں نے جابجا تلاش کر کے ایسی آیات جمع کیں جو کسی نہ کسی طرح ان کے حق میں اور ان کے غیروں کے خلاف استعمال ہو سکیں، خواہ اس کے لیے کتنی ہی دور از کار اور خلافِ عقل تاویلات سے کام لینا پڑے۔اقبال نے سچ کہا ہے:

عصر من پیغمبرے ہم آفرید
آنکہ در قرآں بغیر از خود نہ دید

بقول حسرت موہانی ''مولانا ظفر علی خاں نے سب سے پہلے اس مقصد کی طرف توجہ کی اور ان پر یہ بات چونکہ واضح ہو گئی تھی کہ اس فرقے سے مذہبی نقصانات جتنے شدید ہیں، اس سے

زیادہ سیاسی نقصانات ہیں، اسی شدید احساس کی وجہ سے انھوں نے قلم سے نیزے کا کام لیا''۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ''ارمغانِ قادیان'' میں ان کی نظمیں تمام و بکمالہ شامل ہیں، لیکن بہرحال بقول چراغ حسن حسرت اس مجموعے میں اس طرح تمام بہترین نظمیں موجود ہیں اور یہ اشعار اس موضوع پر حاصل شاعری ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں:

میرے ہی خامے کی رنگینی تھی جس کے فیض سے
ہو گئی سننے کے قابل داستان قادیان

اس مجموعے میں نظمیں نئے نئے عنوانات کے ساتھ ہیں۔ اگرچہ بعض عناوین میں ادب سے زیادہ صحافت کا زور واثر ہے، مثلاً خنجر قادیان، اسرار دربار قادیاں، قادیان کا تھیٹر، خدائے قادیان اور زار روس، پیغمبر قادیان کا برزخی ترانہ، تہذیب نو کے ابلقی جلوے، مینارہ قادیان وغیرہ وغیرہ۔ اس مجموعے میں وہ نظمیں بھی ہیں جو قادیانیت کے متعلق فی البدیہہ کہی گئی تھی اور ان میں اکثر وہ نظمیں بھی ہیں جو ''ستارہ صبح'' کے دور کی ہیں۔ چونکہ اس کی نظر بندی اور قید کے زمانے میں سیاسی مضامین و اشعار شائع کرنے کی ممانعت تھی، لہٰذا ان کی فکر رسا نے قادیانیت کے متعلق بہت لکھا اور خوب لکھا۔ اس مجموعے کی دوسری خصوصیت ان کی وہ ظریفانہ ادبی چوٹیں ہیں، جو ان کا مخصوص رنگ ہے (مثلاً محمدی بیگم سے نکاح کے متعلق) اور نبوت کے دعوے پر محمدی بیگم کی پیشین گوئی کی تھی جو کسی طرح پوری نہ ہو سکی۔

سواد عرش سے اترے محمدی بیگم
قیامت آئے اگر اس دلھن سے بیاہ نہ ہو
نہ لطف بیٹھ کے بجرے میں دے بیاس کی سیر
اگر بغل میں کوئی ماہ نیم ماہ نہ ہو
جب اس میں جمع ہیں یہ سب جہنمی صفتیں
غضب ہے پھر بھی اگر قادیان تباہ نہ ہو

تیسری خصوصیت ان کا وہ شدید طنز ہے جس سے نفرت وحقارت کی چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ اس مجموعے کی چوتھی خصوصیت ان کے وہ علمی دلائل کے اشارے ہیں جن دلائل کی بنا

پر انھوں نے اپنے اشعار کی عمارت کھڑی کی ہے۔ یہ اشعار استدلالی انداز سے علم کلام کا حصہ ہیں جس کے ذریعے سے وہ دشمن کی دلیل کو رد کرتے ہیں اور اپنے استدلال کو پیش کر کے اپنی بات سمجھاتے ہیں۔ پانچویں خصوصیت ان کے وہ روزمرہ کے محاورے ہیں جن کے سبب اشعار میں لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ چھٹی خصوصیت عربی آیات اور امثال کا جگہ جگہ استعمال ہے۔ ساتویں خصوصیت ان کی وہ علمی اصطلاحیں ہیں جو اپنے مقصد کے لیے اشعار میں پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس طرح یہ مجموعہ اشعار کی تعداد کے اعتبار سے تو قلیل ہے، لیکن اپنی اہمیت کے لحاظ سے کسی طرح کم نہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ مجموعہ ''ہر چہ بہ قامت کہتر، بہ قیمت بہتر'' کا مصداق ہے۔ مولانا کے شعری مجموعات میں جو شعر درج ہیں، ان کی تعداد سات ہزار ایک سو اٹھاون ہے۔

فاطمہ اطہر

مولانا ظفر علی خاں کی نعتیہ شاعری

ظفر الملت مولانا ظفر علی خاں جامع الکمالات شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں ہماری ملی، علمی، تہذیبی، ادبی اور سیاسی تاریخ میں انتہائی بلند اور منفرد مقام حاصل ہے۔ آپ بیک وقت اعلیٰ پائے کے صحافی، ادیب، خطیب، شاعر، مترجم، ناول نویس، مدیر، سیاست دان اور سب سے بڑھ کر حضور خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کے عاشق صادق تھے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے نصف اول میں برعظیم پاک و ہند کی ادبی، سیاسی اور صحافتی تاریخ میں اپنی زوردار ملی شاعری اور خدمات سے انمٹ نقوش مرتب کیے ہیں۔ مسلمانانِ ہند کی جدوجہد آزادی میں مولانا ظفر علی خاں کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے نہ صرف عملی طور سے سیاست میں حصہ لیا بلکہ اپنی قومی اور ملی شاعری کے ذریعے مسلمانوں میں مسلمان ہونے کا احساس بھی بیدار کیا۔ ان کی دلیری، بے خوفی اور انگریزوں اور ہندوؤں سے بیک وقت چومکھی لڑنے کی صلاحیت بے پناہ تھی۔ بالخصوص انگریزوں سے نفرت ان کے مزاج میں رچی بسی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کا دینی پس منظر ان کی دینی غیرت و حمیت میں اضافے کا باعث ثابت ہوا۔ انہیں دین اسلام، قرآن مجید اور سرکار دو عالم ﷺ سے بے حد عقیدت و محبت تھی۔ نعت گوئی میں مولانا ظفر علی خاں اس درجہ کمال تک پہنچے جو ان سے بہتر شاعروں کو نصیب نہ ہوا۔ دراصل نعت کے لیے کمال سخنوری سے زیادہ کمال محبت و جنوں کی ضرورت ہوتی ہے اور مولانا کے پاس اس وارفتگی کا بڑا سرمایہ تھا۔

مولانا ظفر علی خاں کی نعتوں اور نعتیہ منظومات کے ماخذات کا سراغ لگائیں تو چار ماخذات فوری طور پر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ پہلا ماخذ قرآن پاک ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے قرآن پاک کا مطالعہ فقط بصارت سے نہیں بلکہ بصیرت سے کیا تھا اور خاص طور پر وہ آیات ان کے پیش نظر رہی تھیں جن میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مدح و ستائش کے پہلو نکلتے ہیں، یہی

سبب ہے کہ انہوں نے اپنی نعتوں میں ان آیات کو نہایت خوبصورت انداز میں نگینے کی طرح جڑ دیا ہے۔ملاحظہ فرمائیے:

جب محمد (ﷺ) کو ملا پیغام **اکملت لکم**
گل ہمیشہ کے لیے شمع **نبوت** ہو گئی
عرب کے واسطے رحمت، عجم کے واسطے رحمت
وہ آیا لیکن آیا **رحمة للعالمین** ہو کر
ان ھو الا وحی یّوحیٰ جس کی شان میں آیا ہے
رحمت عالم ہو کے اک امی اس مکتوب کو لایا ہے
جاء الحق و زھق الباطل اس کی زباں پر آتے ہی
کفر کے برج سربفلک پر پرچم دیں لہرایا ہے
ان الباطل کان زھوکا کہہ کے دیا ہے حق کو فروغ
پڑھ کے یہ افسوں منہ کے بل اس نے لات و ہبل کر گرایا ہے
آنکھ **مازاغ البصر** کے سرمہ سے بیگانہ ہو
حیف ہے پھر بھی ہو اس کو **ماطغی** کی آرزو
جو ماسوا کی حد سے بھی آگے گزر گیا
اے رہ نورد جادۂ **اسریٰ** تمھی تو ہو
سرمایہ ہے خونِ شہداء روزِ ازل سے
منشور **بل أحیاء** کے عنوان جلی کا
کر رہا ہے یونہی دور آسماں ہم پر یورش
جس طرح کعبہ پر چڑھ کر آئے تھے **اصحاب فیل**
ماہِ و انجم نے سر راہ بچھا دی آنکھیں
کیونکہ ہے ناقۂ **اسریٰ** کا سفر آج کی رات
ازل سے رنگ ہے اسلامیوں کا **صبغه اللهی**
مسلمانو! دو رنگی چھوڑ کر **یک رنگ** ہو جاؤ

محو دلوں سے ہو گئی آیۂ **لاتفرقوا**
چھوڑ دیا ہے ہاتھ سے رشتہ اعتصاد کو
تمہارا **عروۃ الوثقی** ہے **واعتصموا بحبل اللّٰہ**
پھر اسی رسی کو یارو تھام لیتے کیوں نہیں تم ہو

مولانا ظفر علی خاں کی نعت نگاری کا دوسرا اہم ماخذ احادیث مبارکہ ہیں۔ انہوں نے احادیث نبوی و قدسی کا نہ صرف یہ کہ ٹھوس مطالعہ کیا تھا بلکہ نہایت عقیدت سے اپنی نعتوں میں انہیں جگہ دی ہے۔ انہوں نے متفق علیہ احادیث کو اہمیت دی ہے اور ان سے اجتماعی سطح پر فائدہ حاصل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے کہ انہوں نے کس طرح حدیث نبوی و قدسی کو شعری پیرائے میں ڈھال کر پیش کیا ہے:

بحکم **اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ**
جگہ بہشت میں نکلی مرے مکاں کے لیے

....

گر ارض و سما کی محفل میں **لولاک لما** کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں

حضور اکرم ﷺ کی سیرت اور اسلاف کے واقعات و کارنامے بھی ظفر علی خاں کی نعتوں کے ماخذ ہیں۔ انہوں نے اسلامی اقدار کے حامل تاریخی واقعات کو اصلاح معاشرہ کے لیے استعمال کیا۔ اس طرح ایک طرف تو وہ واقعات محفوظ ہو گئے ہیں اور دوسری طرف عوام الناس میں وہ طرز عمل اپنانے کی تمنا بیدار ہوگئی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

قدموں پہ ڈھیر اشرفیوں کا لگا ہوا
اور تین دن سے پیٹ پہ پتھر بندھا ہوا
کسریٰ کا تاج روندنے کو پاؤں کے تلے
اور بوریا کھجور کا گھر میں بچھا ہوا
طیبہ سے آج بھی یہ صدا گونجتی سنو
وہ جو خدا کے ہو گئے ان کا خدا ہوا

مولانا ظفر علی خاں کی نعتوں کا چوتھا ماخذ قدما کا کلام ہے۔ انہوں نے کلاسیکی شعرا کا مطالعہ بھی بنظر غائر کیا تھا اور عربی، فارسی نعت نگاروں کا جو ایک رنگ ظفر کے کلام میں جاری و ساری دکھائی دیتا ہے، وہ ان کے وسیع مطالعہ کا واضح ثبوت ہے۔ اسلام کی عظمت کے مضامین سے ان کا کلام پر ہے۔ ہر وہ چیز جسے اسلام سے برائے نام بھی لگاؤ ہے، انہیں عزیز ہے۔ جس کلمہ گو کے رگ و پے میں اللہ اور اس کے دین سے اس درجہ الفت بسی ہوئی ہو، اس کے دل میں حب رسول ﷺ کا گہرا نقش ہونا ایک لازمی امر ہے۔ چنانچہ مولانا نے سرکار دو عالم ﷺ کی جا بجا مدح سرائی کر کے اس عقیدتمندی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کا یہ جذبہ ''فریاد بہ حضور سرور کونین ﷺ''، ''صلو علیہ وآلہٖ''، ''رحمۃ للعالمین ﷺ'' شبِ معراج، التجا بہ حضور سرورِ کائنات، نذر محقر، عرضداشت امت، اسلامیان ہند کی فریاد، نذرِ عقیدت، جشن میلاد النبی ﷺ، صاحبِ قاب قوسین او ادنیٰ ﷺ، عرش سے فرش تک، مقامِ محمود، تاجدارِ عرب وعجم، فخر رسلؐ، عشق رسولؐ، نور حقیقت، صاحب معراج، نوید مسیح، چشمہ آبِ بقا، اللہ والے، لاتخف انک انت الاعلیٰ، عالم وعامل، اطاعت واستطاعت، شانِ احمد مجتبیٰؐ، شان مصطفیٰؐ، من کان للہ کان اللہ لہٗ وغیرہ میں جلوہ گر ہے۔

جب مولانا حالی اور علامہ اقبال کی طرح ان کے پیش نظر یہ نکتہ آیا کہ سایۂ رسول ﷺ میں ہی عافیت ہے تو انہوں نے ایک وسیع تناظر میں یہ سوچا کہ اگر ایک شخص کی عاقبت اتباع نبوت ﷺ سے سنور سکتی ہے تو پوری قوم کی عاقبت اس سے کیوں نہیں سنور سکتی؟ لہٰذا انہوں نے نعت کو شخصی پیرائے سے نکال کر ملی پیرائے میں پیش کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ریاض مجید کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کی نعتوں میں ملی عناصر کا کینوس حالی اور اقبال سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

مولانا ظفر علی خاں کی نعتوں کا بغور مطالعہ کریں تو ان کی نعت نگاری کی دو سطحیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ پہلی سطح پر وہ اپنی نعتوں کا سلسلہ اس روایت سے جوڑتے ہیں جن کا تعلق میلاد ناموں اور اسی طرح کی دیگر نعتیہ منظومات سے ہے۔ اس میں شاعرانہ پیرایۂ اظہار سب سے زیادہ جلوہ گر ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

اے کہ تری نمود ہے غازۂ روئے کائنات
جلوہ فشاں ہیں ہر طرف تیری ہی سب تجلیات

قصد یہ کر رہا ہوں میں، نعت تری رقم کروں
کوزے میں بھر رہا ہوں میں مایۂ دجلہ و فرات
نور ترا نہ چیرتا گر افق شہود کو
ختم نہ ہوتی آج تک تیرگیٔ شب حیات

قلم کی تعریف میں کیا خوب ارشاد ہے:

جب نبی ﷺ کی نعت میں مصروف ہوتا ہے قلم
کیسے کیسے خوشنما موتی پروتا ہے قلم
مغفرت کی التجا کرتا ہے کاغذ کے سپرد
معصیت کے اگلے پچھلے داغ دھوتا ہے قلم

درج ذیل نعتیہ اشعار محبت رسول کریم ﷺ سے بھرپور عقیدت و احترام کا کمال رنگ لیے ہوئے ہیں۔

جو کرنی ہے جہانگیری محمد ﷺ کی غلامی کر
عرب کا تاج سر پہ رکھ خداوند عجم ہو جا
ہو سرکش سرو کی مانند اگر باطل نکالے سر
اگر حق آئے آگے ماہِ نو کی طرح خم ہو جا

....

کہنے کو ہوں آج میں نعت رسول کریم ﷺ
میری زباں کیوں نہ ہو رشک زبان کلیم ﷺ
تجھ سے مزین ہوئی مسند پیغمبری
تجھ سے فروزاں ہوئی بزم الف لام میم
تیری شفاعت کا گر ہم کو سہارا نہ ہو
رحم پر غالب رہے عدل خدائے عظیم
شافع روز جزا، تو نہ ہو گر کارساز
ہم کو میسر نہ ہوں خلد بریں کے نعیم

....

عرش پہ گر فرش بھاری ہے تو ہے اس خاک سے
جس میں محوِ خواب ہے کون و مکاں کا تاجدار
وہ کہ جس کی کفن برداری نے بخشا یہ عروج
جو گدا تھے ہو گئے کون و مکاں کے تاجدار

مولانا نے اپنی شاعری کی غرض خود اپنے ایک حسب ذیل شعر میں بیان کی ہے:

خدا کی حمد، پیغمبر ﷺ کی نعت، اسلام کے قصے
میرے مضموں ہیں جب سے شعر کہنے کا خیال آیا

بقول پروفیسر غلام حسین ذوالفقار: ''جذبہ عشق رسول ﷺ کے ساتھ اسلام اور اسلامی روایات سے والہانہ عقیدت نے ظفر علی خان کی شاعری میں ملی، اخلاقی اور تاریخی موضوعات کو بڑی اہمیت دی ہے۔ شوکت ماضی کے تاریخی افسانوں کے ساتھ ساتھ اتحادِ عالم اسلامی کے عصری رجحان نے ان کی شاعری کے ملی پہلو کو قوی تر کر دیا ہے''۔

درج ذیل نعت میں جو قدرت کلام جھلک رہا ہے، شاید اس کی کوئی مثال نہیں:

چشمہ اُبل رہا ہے مدینہ میں نور کا
ہر اس کی موج رقص ہے میرے شعور کا
چھنتا ہے جلوہ اس کی فضائے لطیف سے
صبح ازل کے نورِ سعادت ظہور کا
سر خاک پر ہے اور تصور ہے عرش پر
مجھ کو ہوا نصیب مواجہہ حضور ﷺ کا
ایک ایک سنگریزہ اُحد کا میرے لیے
ہم رنگ ہے خدا کی قسم کوہ طور کا
تھام کے پایہ عرش کا، کر یہ ادب یہ التجا
اے کہ ہے مبدء فیوض ایک فقط تیری ہی ذات
بندے بھلے ہوں یا بُرے تو تو ہے اے خدا کریم
قطع ہو کیوں کرم کا سلسلۂ نوازشات

مورِدِ لطفِ خاص پر کس لیے آج یہ عتاب
ہم سے پھرا ہوا ہے کیوں گوشہ چشم التفات

بقول پروفیسر ذوالفقار: ''ظفر علی خان کی تخلیقی صلاحیتیں ان کی نعتیہ شاعری میں اپنی ساری جمالی اور جلالی خصوصیات کے ساتھ بروئے کار آتی ہیں۔ ان کی شاعری کا یہ حصہ ہنگاموں اور اجتماعوں سے الگ ان کے خلوت خانۂ دل کا ترجمان ہے۔ یہاں جذبوں اور تخیل کے سہارے وہ اچھوتی اور لطیف فضاؤں میں سرگرم سیر رہتے ہیں۔ اظہار و بیان میں اُردو و فارسی کی خوش آہنگ ترکیبیں جذبے اور احساس کے مطابق سبک، شیریں اور پرشکوہ الفاظ اپنے اپنے موقعوں پر آتے ہیں۔ ان کی نعتیہ شاعری ''معنی بلند اور الفاظ خوش'' کے امتزاج سے صورت پذیر ہوتی ہے''۔

مولانا ظفر علی خان کی ایک دل پذیر نعت کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کہتے ہیں جس کو سطوتِ کبریٰ، تھی وہ اک اس کی مشق سرِ پا
گردنِ ہرقل جس سے ہوئی خم صلی اللہ علیہ وسلم
ہے عرب اس کا اور عجم اس کا، تھامے ہوئے ہیں ہم علم اس کا
وہ ہے ہمارا اس کے ہیں سب ہم صلی اللہ علیہ وسلم
جیت گئے اسلام کے غازی ہر گئی آخر کفر کی بازی
جھک نہ سکا توحید کا پرچم صلی اللہ علیہ وسلم
سب سے جب اونچا پایہ ہے اس کا اور تیرے سر پر سایہ ہے اس کا
ملت بیضا پھر تجھے کیا غم صلی اللہ علیہ وسلم

بہ حضور سرورکون ومکاں ﷺ یوں عرضداست پیش کرتے ہیں:

ختم تجھ پہ ہو گیا انسان کامل کا لقب
لا نہیں سکتے زمین و آسماں تیرا عدیل
بن گیا قرآن کی ہر ہر سطر ہر ہر لفظ میں
نطق تیرا شانۂ زلف پیام جبرئیل

لفظِ جنت قیدِ معنی سے رہا ہوتا اگر
تیری رحمت اہل عالم کی نہ ہو جاتی کفیل

بقول شخصے: ''ظفر علی خان جیسے باکمال اشخاص کسی قوم میں اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب قدرتِ ایزدی کو اس کی سربلندی مقصود ہو''۔

جناب پروفیسر محمد اقبال جاوید، مولانا ظفر علی خاں کی نعتیہ تاب وتب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شخصیت کی تعمیر میں توارثی روایات کا عکس بھی ہوتا ہے اور گرد وپیش بکھری ہوئی سچائیوں کے اثرات بھی۔ بسا اوقات وقتی تقاضے بھی سمند شوق کے لیے مہمیز بن جایا کرتے ہیں۔ نتیجہ معلوم کہ ساز تڑپتے، نغمے بکھرتے، جذبات مچلتے اور وقت کے ایوان مہکتے چلے جاتے ہیں کہ زندگی دیپک بھی ہے اور ملہار بھی، آتش بھی ہے اور گلزار بھی۔

مولانا ظفر علی خاں توارثی عظمتوں سے بھی بہرہ ور تھے اور ماحول بھی انہیں ایسا انقلاب آفرین ملا کہ اُن کی شخصیت نکھرتی چلی گئی اور وہ ''فلک کج رفتار کی قبائے زرنگار پر جگمگاتی ہوئی قندیلوں کو گواہ بنا کر'' جو محسوس کرتے رہے، علی الاعلان کہتے رہے، ہاتھ قلم بھی ہوتے رہے مگر وہ دورِ ستم پرور میں رودادِ جنوں لکھتے رہے۔ وہ ایک عہد کے شعر وادب اور سیاست وخطابت پر چھائے رہے۔ اُن کا قلم اُن کے لیے کبھی ڈھال کا کام دیتا تھا کبھی تلوار کا۔

قوت ایمان نے انہیں زندگی مستعار کے ہر سنگین مرحلے میں سربلند رکھا۔ وہ فرنگی کے ظلم واستبداد سے ٹکرائے۔ انہوں نے خواب غفلت میں مدہوش ملتِ اسلامیہ کو جھنجھوڑا، غیرت وحمیت کو بیدار کیا کہ وہ تب، عفت کی قبروں کا غازہ شب تاب بن چکی تھی۔ انہوں نے اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکنے پر مجبور کیا اور اُس دستار فضیلت کے بل کھولے جو رہن میخانہ ہو چکی تھی۔ انہوں نے اپنے قلم کو سوزِ جاودانی اور اپنی تقریروں کو دریاؤں کی روانی دے کر حضور ﷺ کی ختم المرسلینی پر شب خون مارنے والوں کو غبار معصیت بنا کر اُڑا دیا۔ ظفر علی خاں نے اس ماحول کو تازگی اور رعنائی دی جس میں شاخیں سر بریدہ اور کونپلیں دریدہ پیرہن تھیں اور اُس وقت ظلمتوں کو اجالا عطا کیا جب کہ آفتاب کی ہر کرن گریزاں تھی۔ وہ سراسر مثل خورشید تھے کہ ''ادھر ڈوبے اُدھر

نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے''۔ وہ میدانِ سیاست اور دُنیائے صحافت میں سیماب کی سی بے چینی اور برق کی سی تیزی لے کر ابھرے، اُن کے بارے میں حالی کا یہ اعتراف کچھ کم نہیں ہے ؎

پھیلے وہ بہ شکل سیل آتش
دل میں تیرے جو شرر تھے پنہاں

وہ بے قراری کی اسی کیفیت کے ساتھ استقامت کی دولت سے بھی بہرہ ور تھے۔ حق یہ ہے کہ جب شہر عشق میں جنوں کا قحط عروج پر تھا، خوف مسلط اور جبر کی حکمرانی تھی، حبس اس نوع کا تھا کہ لوگ لُو کی دعا مانگتے تھے۔ زبانیں اظہار کو ترستی تھیں، لفظ لب پر آتے تھے مگر آواز نہیں بن سکتے تھے۔ ایسے میں ظفر علی خاں نے سوچ کو زبان دی۔ اظہار کو بے ساختہ پن بخشا اور کشتِ جنوں کی آبیاری اپنے لہو سے کی۔ ہر خوف سے بے خوف ہونے کی صلاحیت اور حق کے راستے میں پیش آنے والی ہر رکاوٹ کو پائے استحقار سے ٹھکرا دینے کی جرأت، اُن کے اندر صرف ایک ہی جذبے نے ابھاری تھی، اور وہ حب رسول ﷺ کا جذبہ تھا، وہ خوب سمجھتے تھے کہ ؎

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجہ بطحا ﷺ کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

....

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاجدار طیبہ و بطحا ﷺ تمھیں تو ہو

....

تمہارا قافلہ کچھ لٹ چکا اور کچھ ہے لٹنے کو
رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر باد صبا کر دے

ظفر علی خاں جانتے تھے کہ اسی مسیحا کے پاس ہر دکھ کا علاج ہے، یہی ایک دیوار ہے جس کا سایہ ہر آبلہ پا کا خود انتظار کرتا ہے اور یہی وہ بارگاہ ہے جہاں پہنچ کر سرگرداں عقل کو منزل کا احساس نصیب ہوتا ہے۔ زندگی کی کوئی سی تلخی ہو، وقت کی کوئی سی کروٹ ہو، اور سیاست کی کوئی سی سنگینی ہو، ہر پھر کر، ان کی ہر سوچ، حب رسول ﷺ ہی سے شروع ہوتی اور اُسی پر ختم ہوتی تھی۔ وہ

اسی محور کے گرد گھومتے تھے۔ اسی جذبہ عالیہ سے بال و پر لے کر، اُن کا فکر انگڑائی لیتا، ان کا قلم لولوئے لالا ڈھالتا اور اُن کی زبان مہ و انجم بکھیرتی تھی۔ اور یوں لگتا تھا کہ ایک تختہ چمن کھلا ہوا ہے اور رنگا رنگ پھول شاخ گفتار سے ٹوٹتے چلے جا رہے ہیں۔ اور یہ فیض تھا اس ذات اقدس ﷺ سے محبت کا جس کے حسن سے سورج ضیا لیتا اور جس کے نطق سے غنچے پھول بنتے ہیں ۔

ہم بھلے ہیں یا برے ہیں، ترے آخر ہیں غلام
ہم کو ہم چشموں میں اے آقا ﷺ، نہ ہونے دے ذلیل

اور اسی جذبہ حب رسول ﷺ نے اُن کے رُخِ کردار کو فقر و غنا کے اس غازے سے نوازا تھا کہ جس کا حاصل غیرت، سرمستی اور وقار ہے۔ وہ اسی جذبے کے طفیل، اس دنیا میں معزز رہے جبکہ اخروی سرخروئی ایسی ہی گلرنگ زندگی کا ایک منطقی نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

مری مدح کرتی ہے ساری خدائی
ہوا ہوں میں جب سے ثنا خوانِ احمد ﷺ
ترانے مرے عرش پر گونجتے ہیں
میں ہوں عندلیب گلستانِ احمد ﷺ

....

مرا منہ لیا چوم روح الامینؑ نے
لیا میں نے جس وقت نام محمد ﷺ

مگر مولانا ظفر علی خاں کا قلم جب نعت کہتا ہے تو تراکیب کی ندرت اور اُسلوب کا بانکپن تو حسب معمول اپنے کمال کو چھوتا نظر آتا ہے مگر ان کے طناز قلم کی کاٹ، عقیدت اور شیفتگی کے سانچے میں ڈھل کر شبنم کے مانند لطیف، برگِ گل کی طرح گداز اور موجِ صبا کی طرح سبک ہو جاتی ہے۔ ہر لفظ محبت و عقیدت کی انگشتری کا نگینہ بن کر جگمگاتا اور ہر خیال جذب و شوق کی فضاؤں میں انگڑائی لیتا محسوس ہوتا ہے۔ مولانا راسخ العقیدہ تھے۔ مقام رسالت ﷺ کی رفعتوں، عظمتوں اور نزاکتوں کا انہیں کماحقہٗ احساس تھا۔ اس لیے انہوں نے کوشش کی کہ کہیں بھی حکایت، شکایت نہ بنے۔ عقیدت کی بینائی بھی قائم رہے اور آبگینے کی نزاکت کو ٹھیس بھی نہ لگے

کہ جب عقیدت، بصارت کھو دیتی ہے تو بدعت کی گمراہی اُسے وجہِ توہین رسالت بنا دیتی ہے۔ گمراہی کی پہچان یہ ہے کہ وہ بے ذوق بھی ہوا کرتی ہے اور کم نظر بھی۔ جبکہ توصیفِ رسالت ﷺ کے لیے قلم قلم، حرف حرف اور لفظ لفظ آگہی افروز احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہاں تو سو بار سوچ کر، ایک بار قلم اٹھتا ہے اور پھر بھی توصیف کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ظفر علی خاں کی نعت مبالغے سے دامن بچاتی اور واقعیت کا دامن تھام کر آگے بڑھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نعتیں جدید شعراء کے لیے اعتدال کے سانچے میں ڈھلا ہوا ایک خوبصورت معیار ہیں۔ اُن کی ذاتی زندگی پاکیزہ، بے داغ اور بے لوث تھی۔ کوئی سی انگلی بھی اُن کی کسی بے اعتدالی کی طرف اشارہ نہیں کر پاتی۔ اُن کی فکر بھی راست رہی اور عمل میں واضح۔ ایسے بے غبار کردار کا حامل انسان جب انسان کامل ﷺ کی مدحت کے لیے قلم اٹھائے گا تو اس کے بہکنے اور بھٹکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حق یہ ہے کہ مولانا کی دیگر منظومات اپنی تمام تر شعری لطافتوں اور ادبی خوبیوں کے باوجود، نسلِ نو کے لیے گلدستہ طاق نسیاں ہو چکی ہیں مگر ان کی نعتیں آج بھی فردوسِ گوش اور نشاطِ روح بنی ہوئی ہیں ۔

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھیں ﷺ تو ہو

اس زمین میں کتنی ہی نعتیں کہی گئی ہیں کہ اگر صرف انہیں یکجا کیا جائے تو ایک دفتر مرتب ہو سکتا ہے۔ مگر کوئی ایک نعت بھی، اس نعت کے تاثر و کیف کو نہیں چھو سکی۔ اس نعت کو تغزل کی خوبی نے بے پناہ تاثر دیا ہے۔ تغزل، غزل کو نہیں بلکہ اُس کیف کو کہتے ہیں جو شعر میں دلآویزی کی صلاحیت ابھارتا اور اس میں تیرِ نیم کش کی کسک اور خلش پیدا کرتا ہے۔ نظم و نثر کو بھی تغزل ہی رعنائی دیتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی کم و بیش تمام نعتیں، غزل کی ہیئت میں ہیں، اور تغزل کی کیف سامانیوں سے بہرہ ور۔ سید عبداللہ، اسی نعت کے متغزلانہ سحر کو محسوس کرتے ہوئے مولانا کی نعت گوئی کو یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں: ''ظفر علی خاں کی نعت ایک ایسے قلب کی آواز ہے جو یقیناً محبت سے آشنا ہے۔ نعت تو خیر محبت ہی کا ایک رنگ ہے۔ اُن کی عام شاعری کے لہجے اور اظہارات سے بھی اُن کے درد پسند دل کے راز ظاہر ہو رہے ہیں''۔ ...... اگر کوئی شعر لوگوں میں اس قدر مقبول ہو جائے کہ زبان زد عام ہو کر کم و بیش ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لے تو اس کی وجہ طرفگیٔ خیال کے ساتھ ساتھ شگفتگیٔ بیان بھی ہوتی ہے مگر جب نعت کے کسی شعر کو قبولِ عام کا شرف مل جائے تو سمجھئے کہ گدازِ فکر اور رنگینیٔ ادا کے ساتھ ساتھ وہ شعر بارگاہِ ناز میں بھی باریابی پا

چکا ہے۔مولانا کی وہ نعت جس کی ردیف ''تمھیں تو ہو'' ہے۔اسی نوع کی مقبول نعت ہے۔اسی طرح وہ نعت جس کا پہلا شعر ہے''وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں'' اپنی اولین اشاعت (یہ نعت پہلی بار پنجاب ریویو، اگست 1910ء اور نظام المشائخ میں چھپی تھی) سے لے کراب تک، قارئین میں کیف وسرور کی ایک دنیا بانٹتی چلی جارہی ہے۔اسی نعت کے بارے میں مولانا صلاح الدین احمد نے لکھا تھا کہ'' آج بھی اس کے رقص آور مصرعے برگ ہائے گل تر کے مانند معنبر ومعطر ہیں''۔اور پروفیسر غلام حسین ذوالفقار کے الفاظ میں ''اس نعت کی یہ دولت اُردو زبان کو بھی حیاتِ جاوداں مل گئی ہے''۔......(دل جس سے زندہ ہے از پروفیسر محمد اقبال جاوید)

مولانا ظفر علی خاں کے رشحات خامہ کا عالم سیاست وصحافت کی ہنگامی ضروریات تک محدود، مگر مولانا کی نعت گوئی اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہ ایک ایسا نغمہ ہے جس پر نہ کوئی موسم کی قید ہے نہ کسی وقت کی پابندی۔اس لیے یہ نغمہ چھکنے کے لیے نہ فصل لالہ وگل کا محتاج ہے اور نہ خزاں کی ویرانیاں ہی اس چہک کی مہک کو افسردہ کرسکتی ہیں۔یہ الگ بات کہ یہ نغمہ ہر ساز پر نہیں گایا جا سکتا۔اس کے لیے خاص دل مخصوص ہوتے ہیں۔ممکن ہے علامہ اقبال ہی کے تتبع میں، ظفر علی خاں نے بھی واقعہ معراج پر طبع آزمائی کی ہو۔اُن کی ایک طویل نعت اسی رنگ میں ہے۔گو علامہ دو شعر ہی کہہ سکے کہ بقول ایک نقاد وہ سو بار سوچتے اور ایک بار لکھتے تھے۔جبکہ ظفر علی خاں کی طبیعت میں روانی اور طغیانی تھی۔طبع رسا کھلتی تھی تو کھلتی ہی چلی جاتی تھی۔قلم حرکت میں آتا تھا تو روکے نہیں رُکتا تھا۔واقعہ معراج کے بارے میں مولانا کے خامہ عنبر شامہ کی اڑانیں دیکھیے۔ایک طرف جبرئیل حضور ﷺ کو لے جارہے ہیں اور دوسری طرف اُن کا قلم اُس مقام ارفع واعلیٰ کی حقیقتوں کو کھولتا چلا جارہا ہے جہاں عقل کے پَر جلتے اور عشق کا والہانہ پن باریابی پاتا ہے ۔

جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمھیں تو ہو
جو ماسوا کی حد سے بھی آگے گزر گیا
اے رہ نورد جادہ اسریٰ تمھیں تو ہو

ظفر علی خاں کی نثر ہو یا نظم، خطابت ہو یا عام گفتگو، وہ عربی کی بلاغت اور فارسی کی

حلاوت سے مالا مال ہوا کرتی تھی۔ اُن کی تراکیب پرشکوہ برجستگی کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ اُن کے قلم سے نکلنے والا ہر جملہ اور ہر مصرع خود بولتا اور دور سے جانا اور پہچانا جاتا تھا کہ تحریر لکھنے والے کی علمی رفعتوں کا نشان ہوا کرتی ہے۔ ایسے ہی لکھنے والوں کو صاحب طرز کہا جاتا ہے۔ ظفر علی خاں کی نعتوں میں خوبصورت تراکیب بکثرت ملتی ہیں۔ چند ایک ملاحظہ ہوں:

رونق بزم دودہ آدم، خواجہ گیہاں، جادہ شناس منزل وحدت، جلوہ نمائے نور حقیقت، خیر ممثل، فضل مجسم، صورت احساں، پیکر رحمت، نشانِ حجت حق، مظہر شان جلیل، شفیع مطاع، قسیم جسیم، نسیم وسیم، ظلمت جہل سقیم، سوزش آب حمیم، شب ہائے غاسق، دین قویم مصطفیٰ (ﷺ)، سیادت ایماں، ضلالت کفر، گلیم فقر، سواد طور، اوج شعیر، شرار جستہ، خاکستر شعور، سراپردہ ظہور، دیدہ ہوش۔

بالخصوص نغمگی اور آہنگ کے لحاظ سے نعت معنون بہ ''عرش سے فرش تک حضور سرورِ کونین ﷺ پر صلوٰۃ وسلام کی بارش'' بہت حسین ہے۔ ایک دو شعر بہ طور نمونہ درج ذیل ہیں:

رونق بزمِ دودۂ آدم، صلے اللہ علیہ وسلم
خواجۂ گیہاں، سرور عالم، صلے اللہ علیہ وسلم
جادہ شناس منزل وحدت، جلوہ نمائے نورِ حقیقت
ہادئ اکبر، مصلح اعظم، صلے اللہ علیہ وسلم
خیر ممثل، فضل مجسم، صورتِ احساں پیکرِ رحمت
آیۂ لطفِ ربک الاکرم صلے اللہ علیہ وسلم

لیکن ان سب باتوں سے قطع نظر جو خلوص، شیفتگی، خود رفتگی، عقیدت، فریفتگی اور عشق کی جھلکیاں ان نعتوں میں نظر آتی ہیں، ان کی صحیح قدر و قیمت اہل دل ہی جان سکتے ہیں۔ الفاظ بڑے کرب و اضطراب سے نکلے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان میں بڑی گہرائی ہے اور بڑا ٹھہراؤ۔ ہر مصرع ڈوب کر کہا ہوا معلوم ہوتا ہے، یہی باعث ہے کہ تاثر بہ درجۂ کمال موجود ہے، یہی وہ خاصیت تھی جس کی بہ دولت علامہ اقبالؒ جیسے قادر الکلام بھی ان نعتوں کو سن کر جھوم جھوم جاتے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے آپ کے قلم کو مصطفےٰ کمال پاشا کی تلوار سے تشبیہ دی تھی۔ مولانا خود فرماتے ہیں۔

قلم سے کام تیغ کا اگر کبھی لیا نہ ہو!
تو مجھ سے سیکھ لے یہ فن اور اس میں بے مثال بن

پروفیسر محمد اکرم رضا کا کہنا ہے: ''دوسری عظیم شخصیات کی خوبیوں کا احاطہ کرتے ہوئے دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ کیا تھیں؟ لیکن مولانا ظفر علی خاں کی ہمہ گیر شخصیت کو دیکھ کر فقط یہی سوال ابھرتا ہے کہ وہ کیا نہیں تھے۔ مولانا ظفر علی خاں بے مثال ادیب تھے۔ لازوال خطیب تھے، عظمت لوح وقلم سے آشنا انشا پرداز تھے۔ رفعت شعر وادب کے ہمراز تھے۔ بات کرتے تو جواہر بکھرتے، شعر کہتے تو گیسوئے ادب نکھرتے اور معنی آفرینی میں الجھتے تو لفظوں کے مقدر سنورتے تھے۔ ان کی تقریر سے مردہ لفظوں کو گویائی اور تحریر سے بے نام جذبوں کو زندگی کی رعنائی ملتی تھی۔ ان کی گویائی صداقت اسلاف کی پاسدار اور ان کی خاموشی گہرے طوفانوں کی راز دار تھی۔ ان کی پوری زندگی عشق رسول اللہ ﷺ کی تصویر، ان کی ہر تحریر آئینہ حق وصداقت کی تنویر اور ان کی ہر ادا آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی کی تفسیر تھی۔ ان کی نعتوں میں حسن عقیدت کا جمال اور ان کی قومی منظومات میں روح فطرت کا جلال پوشیدہ تھا۔ خطابت کا انداز یہ کہ ٹوپی کے پھندنے کی حرکت کے ساتھ نبض ہستی رکتی اور چلتی تھی۔ قیادت کا معیار یہ کہ ان کی تدبیر سے تقدیر یزداں بدلتی تھی، اور ان کی سیادت کا کمال یہ کہ ان کے نوک قلم سے ٹپکنے والے افتتاحی مقالات سفید فام آقاؤں کو اپنی سامراجیت کے اختتامی لمحات دکھائی دیتے تھے۔ ان کے قلم میں تلوار کی چمک، فکر میں نجم تاباں کی دمک، شاعری میں دردمندیٔ قوم کی کسک اور مدحت ونعت میں گلہائے جاں نواز کی مہک تھی۔ مولانا کی عظمت کی ایک جھلک مولانا ہی کے شعر میں ملاحظہ کیجیے:

حاسدانِ تیرہ باطن کو جلانے کے لیے
تجھ میں اے پنجاب اقبالؔ و ظفرؔ پیدا ہوئے''

مولانا ظفر علی خاں اوّل وآخر ایک سچے مسلمان تھے۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے اُن کا قلبی لگاؤ اور بے پناہ محبت وارادت اُن کی سچی نعت گوئی میں نمایاں ہے۔ وہ جب نعت کہتے ہیں تو اس قدر کیفیت سرشاری میں ڈوب کر کہتے ہیں جیسے یہی ایک میدان اُن کا خصوصی میدان ہو۔ مولانا ظفر علی خاں کا یہ طغرائے امتیاز یقیناً نعت گووؤں میں اُن کی سروقامتی کی دلیل ہے اور ان کے لیے وسیلۂ مغفرت اور سامان بخشش فراہم کرتا ہے۔ اس سوز وساز، جذب وشوق اور خلوص و

نیاز کے کچھ نمونے درج ذیل ہیں۔

شرق ہے تجھ سے مستفیض، غرب ہے تجھ سے فیض یاب
دونوں جہاں کی رحمتیں ہو گئیں تری ہم رکاب
جو ترے در کی خاک تھے ہو گئے آسماں جناب
لطف ترا ہے بے شمار، فیض ترا ہے بے حساب

....

تری نگاہِ مہرباں، ہم کو ذریعۂ فلاح
تیری دعائے مستجاب ہم کو وسیلۂ نجات
دور فتادہ ہی سہی تیرے مگر غلام ہیں
ہم سے پھرا ہوا ہے کیوں گوشۂ چشم التفات

مولانا کی شاعری میں خلوص وعقیدت مندی کے ساتھ ساتھ جدت طبع اور ندرت بیان کے وہ وہ کرشمے موجود ہیں کہ قاری پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔انہوں نے اس مخصوص صنفِ سخن کو جو چار چاند لگائے ہیں، وہ ہر نعت گو شاعر کے بس کا روگ نہیں۔مولانا نے اس رنگ میں جو کچھ کر دکھایا ہے، وہ کسی صورت شاہکار سے کم نہیں۔ مدحِ رسول ﷺ مولانا کے جذبات واحساسات کا نہایت ہی نازک گوشہ ہے۔جب توجہ اس طرف مبذول ہوتی ہے تو پھر نہ پوچھیے کہ عقیدت ونیاز مندی کیونکر سمٹ کر زندہ وجاوید شعروں کا روپ دھار لیتی ہے۔

اے کہ ترا جمال ہے زینتِ محفل حیات
دونوں جہاں کی رونقیں ہیں ترے حسن کی زکوٰۃ
تیری جبیں سے آشکار پرتو ذات کا فروغ
اور تیرے کوچے کا غبار سرمۂ چشم کائنات
بارگہِ الست سے بخش دیے گئے تجھے
سب فلکی تصرفات سب ملکی تجلیات

مولانا ظفر علی خاں نے حضور نبی رحمت ﷺ کے مقام کو بیان کرنے میں مضمون نہایت ہی سادہ اور عام فہم نعت میں کہا ہے اور ان کے یہاں ہر مقام پر حقیقی اوصاف کا بیان ملتا ہے۔اس

لیے وہ ایک نعت 'مقام محمد ﷺ' میں لکھتے ہیں:

زمانے میں چمکا ہے نام محمد ﷺ
ہوئی روشن صبح شام محمد ﷺ
نہ پہنچے وہاں جبرئیل امیں بھی
بلند اس قدر ہے مقام محمد ﷺ
میرا منہ لیا چوم روح الامین نے
لیا میں نے جس وقت نام محمد ﷺ
پلایا ہے بھر بھر کے ساقی نے مجھ کو
خدا کے خمستاں سے جام محمد ﷺ
فقط دو حقائق پہ دنیائے قائم
بقائے خدا و دوام محمد ﷺ

بارگاہِ ایزدی میں شاعر کی دُعا بھی اسی کیفیت کی آئینہ دار ہے۔

بتا دوں گا کہ خاک ہند یوں اکسیر بنتی ہے
مری پلکوں کو جاروب حریم مصطفٰے کر دے

اسی لیے تصدق، جاں نثاری اور نیاز مندی کے جذبات کی ترجمانی کثرت سے پائی جاتی ہے۔

میرے ہزار دل ہوں تصدق حضور ﷺ پر
میری ہزار جان ہو قربان مصطفٰے ﷺ
رشتہ مرا خدا کی خدائی سے ٹوٹ جائے
چھوٹے مگر نہ ہاتھ سے دامانِ مصطفٰے ﷺ
لائے نہ کیوں یہ نغمہ ملائک کو وجد میں
گاتا ہے جس کو بلبل بستان مصطفٰے ﷺ

....

سارے جہاں کی حکمتیں تیرے کلام پر نثار
سارے جہاں کی دولتیں تیرے نظام پر نثار
ہم تیری ذات پر فدا ہم تیرے نام پر نثار
تیری گلی میں ہوں مقیم تیرے مقام پر نثار
سلطنت اِک جہاں کی ہے تیری نگاہ التفات

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے بقول مزاج کے اعتبار سے مولانا ظفر علی خاں شعلۂ جوالہ تھے۔ انہوں نے سب سے زیادہ قلمی جہاد مسلمان کو مسلمان بنانے کے لیے کیا۔ ویسے بھی ''ان کا اصل میدان رزم ہی ہے اور وہ تنہا اس میدان میں مبارز طلبی کے لیے نظر آتے ہیں، اسی لیے شدھی، سنگھٹن اور قادیانیت کے فتنوں پر ان کا قلم تیغ عریاں بن گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا ظفر علی خاں جیسے مجاہد ملت ''قدرت کسی قوم کو اس وقت ودیعت کرتی ہے جب اس کی تقدیر بدلنا مقصود ہو''

مولانا کے نعتیہ کلام میں ہندی مسلمانوں کی کسمپرسی، عالم اسلام کی زبوں حالی، تحریک خلافت، تحریک عدم تعاون، تحریک ہجرت، شدھی اور سنگھٹن تحریکوں کے سلسلے میں رونما ہونے والے مسلم کش فسادات اور متعدد ایسی معاصر سیاسی قومی تحریکوں کے اثرات ملتے ہیں جن سے اس وقت کے مسلمان بالعموم اور ہندی مسلمان بالخصوص کسی نہ کسی طور پر منسلک رہے ہیں۔ انہوں نے پژمردہ اور مغلوب مسلمانوں کے اندر ایمان کی حرارت اور سعی وعمل کا صور پھونکنے کے لیے اپنی نعت گوئی سے ایک تحریک کا کام لیا۔ جنگِ طرابلس اور جنگ بلقان کے صبر آزما ایام میں مسلمان ہر چہار جانب سے لاتعداد مصائب میں گھرے ہوئے تھے۔ ہر تدبیر ناکام اور ہر کوشش بے سود تھی۔ اغیار کے ظلم وستم اور مسلمانوں کی بے بسی سے گھبرا کر مولانا ظفر علی خاں، حضور سرورِ کائنات ﷺ کی بارگاہ میں فریاد کرتے ہیں:

ہم ہیں ننگے سر اٹھ اے شانِ عرب آنِ عجم
اور پہنا دے ہمیں پھر سطوت کبریٰ کا تاج
سر چھپانے کا ٹھکانا بھی انھیں ملتا نہیں
جن کی ہیبت لے چکی ہے ایک عالم سے خراج

اب دوا سے کام کچھ چلتا نہیں بیمار کا
اب تو ہے تیریؐ دعا ہی تیریؐ امت کا علاج

مولانا صلاح الدین احمد تحریر کرتے ہیں۔ ''ظفر علی خاں نعت کے مجدد ہیں اور انہوں نے اپنی تخلیقات میں جذبات عقیدت کے ساتھ ساتھ آگاہی حقیقت کو قائم رکھا ہے''۔ مولانا کا عشق رسول ﷺ اس بات کا متقاضی ہے کہ ان کی شاعری کو اس پہلو سے بھی دیکھا جائے کہ خالص نعت کے علاوہ ان کی ملی، قومی، سیاسی اور صحافتی قسم کی شاعری میں بھی نعتیہ عناصر اردو کے کسی بھی ملی شاعر سے زیادہ تعداد میں ملتے ہیں۔ اسی طرح شدھی، سنگھٹن اور فتنہ قادیانیت کے خلاف غالباً مولانا سے زیادہ کسی شاعر نے قلمی جہاد نہیں کیا۔

ظفر علی خاں نے رسول اکرم ﷺ کی ذات کو اپنی نعتوں کا محور بنایا اور کسی بھی سطح پر عقیدت واحترام کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی ذات سب سے زیادہ معتبر اور نہایت قابل احترام ہے۔ لہٰذا ہر وہ واقعہ جو آپ ﷺ سے منسوب ہے، ظفر علی خاں نے اسے اپنا موضوع بنایا ہے۔ عقیدت واحترام کی یہ فضا صرف ظاہری نہیں بلکہ وہ ہر اس چیز سے بھی عقیدت سے پیش آتے ہیں جس کا کسی نہ کسی سطح پر تعلق حضور ﷺ سے جڑ گیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

خدا نے اس کو اپنے حسن کے سانچے میں ڈھالا ہے
چھنا ہے اس کا پرتو نور صبح اولین ہو کر
نہ نکلی کوئی بات اسی کی زباں سے تا دم آخر
نہ نکلی ہو جو زیب نطق جبرئیلؑ امیں ہو کر

مولانا ظفر علی خاں نے عقیدت ومحبت کی اس فراوانی میں یہ التزام بطور خاص رکھا ہے کہ حقیقت وصداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور غلو اور بے جا تخیل کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا۔ ان کی مشہور نعت ''وہ شمع اجالا............'' کو ان کے فن نعت گوئی کی نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دُنیا کے درباروں میں

گر ارض و سما کی محفل میں **"لولاک لما"** کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں، یہ نور نہ ہو سیاروں میں
جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں
ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی بوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی، کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

نعت میں مجاہدانہ سپرٹ کی روح کی کارفرمائی مولانا ظفر علی خاں کی کاوش ہے۔ناموس رسول ﷺ پر مر مٹنے کی تلقین وتمنا اور عزت وعظمت، پیغمبر ﷺ کے احترام کے لیے جانثاری کی تعلیم (جسے شریعت میں ایمان کامل کی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے) ان کا مشن ہے۔

زکوٰۃ اچھی حج اچھا روزہ اچھا اور نماز اچھی
مگر میں باوجود ان کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں خواجۂ یثرب کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

وہ جیل کی صعوبتوں کو اس لیے اٹھاتے رہے کہ خواجہ کونین ﷺ کے پیغام کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کی جائے۔حکومت کی زیادتیوں پر سینہ ٹھونک کر کھڑے رہے کہ حق کی بات کہتے ہوئے اسوۂ حسنہ کی پیروی کریں۔چنانچہ بارگاہِ نبوی میں عرض پرواز ہیں۔

پیمبر (ﷺ) کی شفاعت پر مری اس عرض کا حق ہے
کہ آقا تیری خاطر میں نے چکی جیل میں پیسی

نعت منشائے یزدانی اور تقاضائے ازلی بھی،نعت تمنائے نظر، دل کی آواز اور روح کی تڑپ کا نام ہے۔اس لیے نعت کا مقصد جذبہ اخلاص وعقیدت کے اظہار کا نام ہے۔چنانچہ ان موثرات قلب ونظر کے ساتھ جب مولانا ظفر علی خاں نعت کے لیے قلم اٹھاتے ہیں تو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا نام لکھتے ہی ان کی انگلیوں کی پوریں روشن وتابناک ہوجاتی ہیں۔

محمد مصطفیٰ ﷺ کا نام لکھ کر
منور ہو گئے میرے انامل

عام نعتیہ رنگ کے برخلاف مولانا کے نعتیہ کلام میں تغزل کو زیادہ دخل نہیں ہے۔ یہاں جو بھی ہے اوصاف کا بیان ہے۔ لیکن جگہ جگہ داخلی کیفیت کی آمیزش نے جذبات کی لطافتوں سے کلام کو تغزل کے محاسن سے بھی محروم نہیں رکھا۔ مولانا کے کلام کی یہ خصوصیت ان کی نظم ''صاحبِ قاب قوسین اوادنیٰ'' سے پیش کی جاتی ہے۔

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھیں تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھیں تو ہو
پھوٹا جو سینہ شب تار الست سے
اس نور اولیں کا اجالا تمھیں تو ہو
سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایت اولیٰ تمھیں تو ہو
گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاجدار یثرب و بطحا تمھیں تو ہو
دنیا میں رحمت دو جہاں اور کون ہے
جس کی نہیں نظیر وہ تنہا تمھیں تو ہو

رسول کریم ﷺ سے ایمانی رشتہ درحقیقت محبت وعقیدت کا رشتہ ہے جس کے بغیر ایمان کی تکمیل ممکن نہیں۔ نعتیہ شاعری میں اسی ایک جذبہ کی کارفرمائی شاعر کو نغمہ کے لیے ابھارتی ہے جو اس دولت سے سرفراز کیا گیا۔ وہ حقیقت میں دونوں جہانوں کی نعمتوں سے مستغنیٰ ہو گیا۔ مولانا، الفت رسول ﷺ کو لطفِ خدا کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

مجھ کو رسول اللہ کی الفت، لطف خدا سے مل ہی گئی
اے دلِ نادان اس سے زیادہ تجھ کو ہو کس دولت کا حصول

کلام میں جذب، کیف ومستی اور شوق کی شدت کا یہ عالم ہے کہ گلِ محمدی کا یہ فدائی اس گلستان کے کانٹوں سے بھی پیمانِ محبت باندھ کر انتہائی جذبہ سرفروشی سے سرشار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مقصدی نظر رکھنے کی بنا پر کا یہ جذبہ بے مقصد نہیں ہے۔ وہ جمال محمدیؐ کا فریضہ بن کر اسوۂ محمدیؐ کی تجلیوں کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ وہ صفات محمدیؐ میں زندگی کی تعمیر کے سامان کا متلاشی

ہے۔اس کے نزدیک حضرت محمد ﷺ کا نام ہر عقدہ کشائی کے لیے اسم اعظم کا حکم رکھتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں، حضور نبی کریم ﷺ کی غلامی کو آخر کیوں وسیلہ نجات سمجھتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ مسلمان تھے بلکہ اس لیے کہ جانتے تھے کہ دربارِ رسالت ﷺ میں وہ سب کچھ موجود ہے جو تاریخ نے اپنے سینے میں جمع کیا ہوا ہے یا جو بعد میں جمع کرے گی۔ وہ رسولِ عربی ﷺ کی حکمت اور ان کے فلسفے کی اہمیت اور جاذبیت کو اس انداز سے بیان فرماتے ہیں کہ سننے والے اس چیز کو اس سے قبل جاننے کے باوجود ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ارسطو کی حکمت ہے یثرب کی لونڈی
فلاطون ہے طفل و بستانِ احمد

مولانا ظفر علی خاں کی روح پکار پکار کر کہہ رہی ہے:

مسلمانو! ترقی کا ہے یہ اک سہل سا لٹکا
محمد ﷺ کی غلامی کا کمر سے باندھ لو پٹکا
اس تعلیم سے برگشتگی کی جس نے پل بھر میں
زمیں پر آسماں سے ملت بیضا کو دے ٹپکا

خدائے لایزال نے جو کچھ حضور خیر الانام ﷺ کے بارے میں کہا اور قرآن وحدیث کے اوراق، سیرت طیبہ کا جو نقش پیش کرتے ہیں، مولانا کی نعتیں اس کی ہو بہو تصویر ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

؎ عشق مہماں ہوا حسن کے گھر آج کی رات
جذبۂ دل ہے بآغوشِ اثر آج کی رات
اپنے اللہ سے ملنے کے لیے جاتا ہے
اپنے اللہ کا منظورِ نظر آج کی رات
ماہ و انجم نے سرِ راہ بچھا دیں آنکھیں
کیونکہ ہے ناقۂ اسریٰ کا سفر آج کی رات
کہکشاں جلوہ فشاں ہے کہ اسی رستے سے
ہونے والا ہے محمد ﷺ کا گزر آج کی رات

مولانا ظفر علی خاں کی حسب ذیل نعت اردو ادب کے خزینہ کا گوہر گراں مایہ ہے۔

اے خاورِ حجاز کے رخشندہ آفتاب
صبحِ ازل ہے تیریؐ تجلی سے فیضیاب
زینت ازل کی تو ہے، رونق ابد کی توؐ
دونوں میں جلوہ ریز ہے تیرا ہی رنگ و آب
چوما ہے قدسیوں نے ترےؐ آستانہ کو
تھامی ہے آسمان نے جھک کر تیریؐ رکاب
شایاں ہے تجھ کو سرورِ کونین ﷺ کا لقب
نازاں ہے تجھ پہ رحمتِ دارین ﷺ کا خطاب

اس کے بعد وہ ایک نعت میں کہتے ہیں۔

مجھے دین و دنیا کی دولت ملی ہے
کہ ہے مرے ہاتھوں میں دامانِ احمدؐ

مولانا ظفر علی خاں دینی غیرت وحمیت کے پیکر اور مجاہد ختم نبوت تھے۔ ان کی نعتیہ شاعری اور نظموں میں عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ اور فتنہ قادیانیت کی سرکوبی کے موضوع پر بڑے ایمان پرور اشعار ملتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہوگئی اس پر ﷺ ختم رسالت دیتے گئے ہیں جس کی شہادت
موسیٰ عمران، عیسیٰ مریم صلی اللہ علیہ وسلم
قادیاں جب حجتِ "اکملت" کا منکر نہیں
پھر اسے انکار ہے ختمِ رسالت ہی سے کیوں
منکر ختم نبوت کے مقدر میں ہے درج
ذلت و خواری و رسوائی الیٰ یوم التناد
وہ سفارش کر رہے ہیں دین کی پچر نکال
میں گزارش کر رہا ہوں کفر ہی کی کر نکال

منکرِ ختم **نبوت** ہو رہا ہے قادیاں
آگیا **وقت** جہاد **ایمان** کا خنجر نکال
کہہ دو مرزا سے کہ **خاک** کعبہ اڑ سکتی نہیں
اپنے دل سے یہ تمنائے جنوں پرور نکال

....

نبیؐ کی شرم نہ ہو خوف **لا اله** نہ ہو
ہوس نہ جس کی ہو ایسا کوئی گناہ نہ ہو
ہے مسیلمہ کی **دولت** جو ملی ہے مرزا کو
یہ **غراب** آخریں ہے جو وہ تھا کلاغ پہلا
جواب **الفضل** کا ترکی بہ ترکی دے تو دیں ہم بھی
اتاریں کیسے لیکن **نقل اصوات حماری** کی
کان والو **انکر الاصوات** ہے **صوت الحمیر**
گر یہ ڈھینچوں ڈھینچوں سننی ہو تو جاؤ قادیاں
باپ لندن، شملہ بیٹا، قادیاں روح القدس
اے مسلمانو! یہی تفسیر ہے **والتین** کی
کل بنے پھرتے تھے جو اپنے زمانے کے نبی
آج چادر ان کے مرقد پر چڑھی **سجین** کی

....

معنی **لیس کمثله شیءٌ** آپ ہیں
یعنی آپ اللہ میاں کے **باپ** ہیں
قادیاں ہے چشمۂ آبِ **حمیم**
باپ پانی تھے تو بیٹے **بھاپ** ہیں

....

اکملت لکم پڑھ کے زبان عربی میں
ظلی و بروزی کی **نبوت** کو مٹا دوں

میں قائل الہام تو وہ مائل ایہام
کوثر میں پیوں آب **حمیم** ان کو پلا دوں
ہے جن کو محمد(ﷺ) کی مساوات کا دعویٰ
مثواہ جھنم کی وعید ان کو سنا دوں
میرے لیے تفسیر تو ان کے لیے **تاویل**
خود کھاؤں میں **رماں** انہیں **زقوم** کھلا دوں
مرزا جی کا خدا بھی خوب ہے جس نے انھیں
پہلے پیغمبر بنایا پھر لٹیرا کر دیا

مولانا ظفر علی خاں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے جناب پروفیسر مرزا محمد منور کہتے ہیں کہ ''مولانا ظفر علی خاں کی جنگ بھی خدا اور رسول ﷺ کی خاطر تھی اور صلح بھی'' اور جناب سید عبداللہ نے کیا خوب کہا: ''مولانا ظفر علی خاں ان اکابرین ملت میں سے ہیں جو صدیوں کے وقفے سے عالم ہستی میں آتے ہیں''۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

محمد متین خالد

حاصل مطالعہ

باعمل مجاہد ختم نبوت

مولانا ظفر علی خاں کا نام زبان پر آتے ہی دل و دماغ میں بجلیاں سی کوند جاتی ہیں۔ آنکھوں کے سامنے ایک عجیب قسم کی شخصیت آ جاتی ہے۔ جس نے تحریر سے، تقریر سے انگریزی استعمار کے خلاف ایک عجیب قسم کی چومکھی جنگ لڑی۔ وہ شعلہ بیان مقرر اور سحر انگیز لکھاری ہی نہیں تھے، ایک باعمل مجاہد بھی تھے کہ ہمیشہ اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا مجاہدانہ مقابلہ کیا۔ جب ذرا سوچ کر اس بات کا تجزیہ کرتا ہوں کہ آخر ایسی کون سی قوت تھی جس نے اس درویش کو اتنا دلیر بنائے رکھا، تو تمام منطق تمام دلائل اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آقائے دو جہاں کملی والے ﷺ سے والہانہ محبت نے مولانا کے دل میں زندگی بھر ایمان کو روشن سے روشن تر رکھا۔ ان ہی نورانی کرنوں کا فیضان تھا کہ انھوں نے اپنی تحریر اور تقریر سے نصف صدی تک کروڑوں دلوں و دماغوں کو منور کیے رکھا۔ ایسی ایسی عظیم نعتیں کہیں کہ اُردو ادب آج تک ان کی نظیر پیش نہیں کر سکا۔

ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھیں تو ہو

یہ شہرۂ آفاق شعر بھی ظفر علی خاں ہی کا ہے:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف تو مولانا موصوف گویا شمشیر برہنہ تھے۔ مرزائے قادیان، قادیان کے رہنے والے تھے۔ مرزا فیملی ''حسن و جمال'' کی وجہ سے مشہور تھی بلکہ قادیان کا پورا مغل قبیلہ بھی۔ ان سب کو لپیٹ میں لے کر نبوتِ قادیاں کی عجیب طرح کی چٹکی لی، شعر ملاحظہ فرمائیے:

قسم ہے قادیاں کے گل رُخوں کی گل عذاری کی
غلام احمد کی الماری پٹاری ہے مداری کی
(روشنی چراغوں کی از صادق نسیم)

قادیانیت کے خلاف قلمی جہاد

عشقِ رسول ﷺ مولانا ظفر علی خاں کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔حضور خاتم النبیین ﷺ کے در کی غلامی ہی پر مرحوم نے ہمیشہ فخر کیا اور اسی مقدس نسبت کو سینے سے لگائے رہے۔مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا سب سے بڑا دینی کارنامہ ''قادیانیت'' کے خلاف اُن کا قلمی جہاد ہے۔قادیان کے اس جھوٹے نبی اور اس کے بیٹے مرزا بشیر محمود کو انھوں نے اپنی نظموں میں ننگا کر کے چوراہے پر کھڑا کر دیا ہے۔قادیانیت کے خلاف اُن کی ایک ایک نظم ان کے لیے سند شفاعت اور مغفرت کا پروانہ ہے۔(ماہر القادری، ماہنامہ فاران جنوری 1957ء)

ہرگز نہ کسی سے بجز اللہ کے ڈرنا

نعت گوئی میں ظفر علی خاں اس درجہ کمال کو پہنچے جو ان سے بہتر شاعروں کو نصیب نہیں ہوا۔دراصل نعت کے لیے کمال سخنوری سے زیادہ کمالِ جنون کی ضرورت ہوتی ہے۔ظفر علی خاں کے پاس اس وارفتگی کا بڑا وافر سرمایہ تھا۔ظفر علی خاں کی بیشتر نعتیں بڑی سہل اور پر معنی ہیں۔والد محترم کی ہدایت کے مطابق میں نے بچپن میں وہ نعت یاد کی۔جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے:

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

اس وقت مجھے اس نعت کا ہر شعر بڑا سادہ اور آسان لگا۔جب کچھ مدت گزری اور میں نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا، تو ایک ایک مصرعے کے پر مغز ہونے کا پتہ چلا۔اسی نعت کے اس مصرعے کی راہبری میں جس میں ''ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی'' کا ذکر ہے، میں تاریخ اور فقہ کے کتنے ہی فروعی اور اختلافی مقامات سے ٹھہرے بغیر گزر گیا......مسدس کے مصنف نے اپنی منزلت اور مرتبے کے باوجود ایک نوجوان کی شان میں شعر کہے، کیونکہ وہ عالی ظرف اور ہنر شناس بھی تھا۔مولانا حالی کا پھوس کی چھت والا بنگلہ یونین ہال کی عمارت کے ساتھ واقع ہے۔ممکن ہے جب ظفر علی خاں تقریر کے لیے آئے تو ہال کے کسی مشرقی دروازے سے ان کی نظر اس بنگلے پر پڑی ہو

اوران کے ذہن میں ان خوشگوار یادوں کے دریچے کھل گئے ہوں۔ وہ جذبے سے مغلوب ہو کر بولے اور سب کو اپنے ساتھ بہا کر لے گئے۔ ان کی تقریر کا موضوع وہ اساسی اور سیاسی قرارداد تھی جسے چند ماہ پہلے مسلم لیگ نے لاہور کے منٹو پارک میں منظور کیا تھا۔ اس تقریر میں قائداعظم کا ذکر کئی بار آیا۔ تقریر کے دوران ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حالی اور قائداعظم کے درمیانی وقفہ کا نام ظفر علی خاں ہے۔ تقریر ختم ہوئی، تو اپنی آٹوگراف لے کر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میں ان دنوں سکول کا طالب علم تھا۔ ظفر علی خاں کی خاطر یونیورسٹی کے جلسے میں آن پہنچا تھا۔ ظفر علی خاں نے میری طرف دیکھا اور البم کو چوڑے رُخ پر موڑ کر یہ الفاظ لکھ دیے:

''بجز اللہ کے اور کسی قوت سے نہ ڈرو''۔ ظفر علی خاں 28 اگست 1940ء

اس نصیحت کا حق ظفر علی خاں کو پہنچتا تھا۔ ان کی زندگی اس اصول سے عبارت تھی۔ شہید گنج، کشمیر، حیدرآباد، بلقان، طرابلس، ترکی، کانگریس، شدھی، سنگھٹن، پیری مریدی، ختم نبوت، آزادی، پاکستان اور نہ جانے کتنے دوسرے موقف اور موقع تھے جہاں ان کی بے خوفی کو جہاد کا درجہ حاصل تھا۔ میں نے ظفر علی خاں کا کلام یہ دیکھنے کے لیے اُٹھایا کہ نثر کا وہ مضمون جو انہوں نے میری البم میں لکھا تھا، اسے کہیں نظم بھی کیا ہے۔ مجھے کتنے ہی اشعار میں اس نصیحت کا عکس نظر آیا اور دو چار شعر اس عبارت کا منظوم ترجمہ معلوم ہوئے، مثلاً اقبال کے مرثیے کا ایک شعر ہے۔

ہر روز دیا اس نے مسلماں کو یہی درس
ہرگز نہ کسی سے بجز اللہ کے ڈرنا

کانگریس سے ناراض ہوئے، تو اپنے مخصوص رنگ میں اس خیال کو یوں باندھا۔

ڈرنا ہے تو ایک اللہ سے ڈر
مرنا ہے تو اس کی راہ میں مر
اس نکتہ کو رکھ پیشِ نظر
دم مست قلندر دھر رگڑا

(آوازِ دوست از مختار مسعود)

فتنۂ قادیانیت کی سرکوبی

مولانا ظفر علی خاں نے 1914ء سے لے کر 1947ء تک جب تک ان کے قویٰ میں طاقت رہی اور ان کی قوت گویائی قائم رہی، ان میں چلنے پھرنے اور تقریر کرنے کی سکت رہی اور ان کا قلم چلتا رہا، انہوں نے مرزائیت کے استیصال کے لیے مسلسل جہاد کیا۔ نظم و نثر میں وہ برابر مرزا غلام احمد قادیانی اور مرزا بشیر الدین محمود کے خلاف نکتہ چینی کرتے رہے۔ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نبی آخر الزمان ہیں، آپ ﷺ کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو گیا اور آپ ﷺ کے بعد کوئی ظلی اور بروزی نبی نہیں آ سکتا۔ اگر اس واضح اور غیر مبہم عقیدہ کے بعد کوئی شخص ظلی یا بروزی نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کا شروع سے یہ عقیدہ تھا کہ مرزائیت کوئی مذہب نہیں بلکہ ایک سیاسی تحریک ہے جسے انگریز نے اپنی بعض سیاسی مصلحتوں اور ضرورتوں کی بنا پر جنم دیا اور انگریز اس فرقہ کو مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی نظریات کو ناکام بنانے کے لیے استعمال کرتا رہا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس ضمن میں اپنے اکثر و بیشتر مضامین میں یہ دلیل دی ہے کہ جہاد اسلام کا جزو لاینفک ہے۔ جہاد کے نام سے انگریز اور غیر مسلم طاقتیں ہمیشہ خوف زدہ اور ہراساں رہی ہیں۔ اس لیے ''جہاد'' کی تنسیخ کا اعلان کرانے کے لیے انگریز کو ایک منظّم جماعت، ہوشیار اور چالاک شخصیت کی ضرورت تھی۔ اس لیے اس نے بعض مصلحتوں کی بنا پر اس کام کے لیے مرزا غلام احمد قادیانی کو منتخب کیا۔ چنانچہ مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کرنے کے بعد جہاد کو حرام قرار دے دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریز نے جو مسلمان علماء کی طاقت سے ہمیشہ خائف رہا ہے، مرزا غلام احمد کو مسلمان علماء کے خلاف دل کھول کر استعمال کیا۔ مرزا قادیانی نے مولوی نور الدین ''خلیفہ اول'' کی مدد سے مسلمان بزرگوں اور علماء کے خلاف انتہائی افسوسناک رویہ اختیار کیا۔

مولانا ظفر علی خاں مرزائیوں کو ہمیشہ انگریز کا خود کاشتہ پودا لکھتے رہے۔ مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریز کو یہ ذہن نشین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی رجحانات کو جو آہستہ آہستہ ابھر رہے تھے، ختم کرنے کے لیے اس امر کی ضرورت ہے کہ مسلمان علما کو مذہبی بحثوں میں الجھا دیا جائے تاکہ وہ مسلمانوں کے سیاسی مسائل کی طرف دھیان ہی نہ دے سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز نے پنجاب میں جو جیالے نوجوانوں کا خطہ ہے اور جسے فوجی اعتبار

سے متحدہ ہندوستان میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل رہی ہے، ایک ایسے ''نبی'' کو جنم دیا جو اس کے اشارہ پر مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے خلاف انگریز کی تائید وحمایت میں کام کرتا رہا۔

چنانچہ انگریز نے مرزائیت کو جنم دے کر مسلمانوں کے اتحاد ملی کی دیواروں میں جو شگاف کیا، ظفر علی خاں اس شگاف کو بھرنے کے لیے مسلسل اور لگاتار، مرزائیت کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ مرزائیت کے خلاف نبرد آزما ہونے کی وجہ سے ''زمیندار'' اور مولانا ظفر علی خاں کو صبر آزما مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انہوں نے ان مصیبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

(مولانا ظفر علی خاں از اشرف عطا)

خلافت قادیان اور مولانا ظفر علی خاں

اخبار زمیندار کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں کی ہم کو بھی شکایت ہے کہ وہ قادیانی خلیفہ کے حق میں ادب سے نہیں بولتے۔ کبھی ان کو موسیو (فرنچ زبان میں بمعنی مسٹر) بولتے ہیں کبھی مسٹر محمود کہتے ہیں۔ اس کے متعلق قادیانی اخبار الفضل لکھتا ہے کہ ظفر علی خاں کو قادیانی مخالفت کا صلہ مل گیا اور حیدر آباد سے ان کی تنخواہ بند ہوگئی۔ اس بندش پر اظہار مسرت کرنے کے بعد لکھتا ہے:

''اب تو مولوی ثناء اللہ جیسے کج بحث انسان کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسٹر ظفر علی خاں کو ان کے مساعی کا ایک حد تک صلہ مل گیا جو انہوں نے سلسلہ احمدیہ کے خلاف کیں''۔

(الفضل قادیان 11 جون 1920ء ص 11)

ہم مولانا ظفر علی خاں صاحب کو صلہ ملنے کی تصدیق کریں یا نہ کریں لیکن آیت قرآن کی تصدیق تو ضرور کریں گے جس میں ارشاد ہے:

ان تمسسکم حسنة تسؤھم و ان تصبکم سیئة یفرحوا بھا. (آل عمران: 120)

ترجمہ: تم مسلمانوں کو اگر فائدہ پہنچتا ہے تو تمہارے مخالف رنجیدہ ہوتے ہیں اور اگر تم کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔

مولانا ظفر علی صاحب! قادیانیوں کا یہ برتاؤ آپ ہی سے نہیں بلکہ جملہ مسلمانانِ دنیا سے ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ جس زمانہ میں سقوط بغداد ہوا جس کی وجہ سے ساری اسلامی دنیا میں ماتم تھا اور ایک آواز آ رہی تھی۔

فلیبک علی الاسلام من کان باکیاً

ترجمہ: جو کوئی رونے والا ہے، آج وہ اسلام پر روئے۔
اسی زمانہ میں اسی الفضل نے ترکوں کو بندر اور سوئر کہہ کر لکھا تھا کہ:
''ہر مسلمان کو ترکی حکومت سے نفرت کرنی چاہیے۔ یہ محافظ اسلام نہیں بلکہ دشمن اسلام ہے۔ قردو خنازیر پر غور کرنے سے ان لوگوں (ترکوں) کے اسلام کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے''۔
(الفضل 3،10، اپریل 1917ء ص 3)

سچ ہے **لعن اللّٰہ العقرب لا تدع مصلیا ولا غیرہ**۔ آہ:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

(ہفت روزہ اہل حدیث 16 جولائی 1920ء 28 شوال 1338ھ شمارہ نمبر: 35 جلد 17: ص 2 تا 3)

سارقین نبوت کا تعاقب

مولانا نے قومی اور ملی نظمیں کہیں۔ فتنہ مرزائیت کو بھی للکارا، یہ للکار بھی دراصل حب رسول ﷺ کا ایک خوبصورت ثمر ہے کہ ختم نبوت ایک بنیادی ستون ہے۔ اگر یہ لرزتا ہے تو دین کی پوری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اگر شان رسالت ﷺ پر شب خون مارنے والوں کو للکارا تو یہ اُن کا ایک دینی فریضہ تھا جسے انہوں نے جرأت اور استقامت کے ساتھ ادا کیا۔ اسی سرفروشانہ شاعری کا نتیجہ تھا کہ کچھ ہی سال بعد یہ فتنہ اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔ ختم نبوت کے تحفظ کی تاریخ مولانا ظفر علی خاں کے نام اور کام کا اعتراف کیے بغیر نہ آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ مکمل ہو سکتی ہے۔ ایک مرزائیت ہی نہیں بلکہ جس نے بھی حضور ﷺ کے خلاف کچھ کہا، ظفر علی خاں کے قلم نے اُس ناپاک گریبان سے الجھنا اپنا فرض سمجھا۔ انہوں نے عصری مسائل کا تذکرہ بھی نعت میں کیا اور نعت کو ناموس رسالت ﷺ کے تحفظ کا بہترین ذریعہ بھی بنایا ؎

جو مسلم ہے تو جاں ناموس ملت پر فدا کر دے
خدا کا فرض اور اس کے نبی ﷺ کا قرض ادا کر دے

ان نظموں میں سارقین نبوت کے بارے میں مولانا کے قلم کا طنزیہ لب ولہجہ، تلواروں سے کہیں زیادہ بے باک، شدید اور تیز ہے۔ میں مولانا کی ان نظموں کو بھی نعت ہی کہوں گا کہ یہ ناموس رسالت مآب ﷺ کے تحفظ کی خاطر کہی گئی ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ نے مخالفین کے

گستاخانہ اور ہجو یہ اشعار کا جواب دینے کے لیے صحابہ کرامؓ کو ترغیب دی تھی۔ حضرت حسانؓ بن ثابت کی شاعرانہ صلاحیتوں کا رُخ بھی اسی ترغیب نے موڑا تھا، اور با قاعدہ نعت گوئی کا آغاز بھی اسی تشویق و ترغیب کا دلآویز نتیجہ ہے۔ مولانا کی نعت گوئی نے یہ ثابت کر دیا کہ زلف و عارض کی ہر مبالغہ آمیز مجازی داستان، رُخِ رسالت ﷺ کے سامنے ہیچ ہے کہ حضور ﷺ کا چہرہ زیبا، جمال الٰہی کا آئینہ تھا اور آپ ﷺ کا اسوہ حسنہ، کمال رحمت باری کی انتہا۔ جس آنکھ نے اس چہرے کو دیکھ لیا اور اُس کردار کو پا لیا، اس کی نگاہ میں کوئی اور جچا ہی نہیں کہ آفتاب مل جائے تو ہر مہتاب کا بے نور ہو جانا، لازم ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ظفر علی خاں نے غزل کہنے کی جملہ صلاحیتوں کے باوجود ایک بھی رسمی غزل نہیں کہی۔ نعت کی نزاکت، صداقت اور سعادت قلم کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ نعت کہنے کے بعد کسی مجازی محبوب کی تعریف میں بھی گل کترنے کی کوشش کرے کہ محبت اپنی جگہ ہے مگر غیرت اس سے کہیں فزوں تر ہے۔ بقول سعدی ؎

ہر شاہدے کہ در نظر آمد بہ دلبری
در دل نیافت راہ کہ آں جا مکان تست

(دل جس سے زندہ ہے از پروفیسر محمد اقبال جاوید)

محبتِ رسول کا پیکر

حضور نبی کریم ﷺ سے متعلق مولانا ظفر علی خاں کا یہ عقیدہ بالکل واضح تھا کہ آپ ﷺ خدا کے آخری نبی ہیں اور آپ ﷺ کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔ حضور ﷺ کی حدیث ''**لانبی بعدی**'' پر ایمان کامل تھا اور یہ کہ خدا کی طرف سے آپ ﷺ کو جملہ مخلوقات پر تصرف کا حق حاصل ہے۔ حضور ﷺ کی ذات والا صفات نے تمام نکات سرمدی کو حل کر دیا ہے اور حضور ﷺ نے عرب و عجم کی تفریق ختم کر دی اور نسل و ذات کا فرق مٹا دیا۔ اسی سب سے موجودات عالم کی تمام رونقیں صرف آپ ہی کے سبب سے ہیں اور آخرت میں آپ ﷺ شفیع المذنبین ہیں۔ مولانا کہتے ہیں:

لوں نام مصطفیٰ کا کہ آتا نہیں قرار
اس قصۂ لذیذ و دل آویز کے بغیر

''ایک سچا مسلمان یقیناً دین کے بارے میں حساس ہوتا ہی ہے۔ وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں سب سے زیادہ نازک جذبات رکھتا ہے۔ اس عالم محسوسات میں ایک مسلمان کو جس قدر محبت حضور کی ذات اقدس سے ہوتی ہے، وہ کسی اور سے نہیں ہوسکتی۔ حضور ﷺ اس محبت اور عقیدت کے سب سے بڑے مرکز ہیں، باقی سب عقیدتیں اسی کی تابع ہیں۔ حضور ﷺ کے ساتھ قلبی لگاؤ ایمان کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ ایک مسلمان کی نظر میں حضور ﷺ صرف ایک مصلح ہی نہیں بلکہ منشائے خداوندی کے آخری شارح اور ترجمان ہیں۔ ان کی محبت سے انسان کے دل و دماغ میں ایمان کی شمع روشن ہوتی ہے اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری سے انسان دنیا و آخرت میں فائز المرام ہوتا ہے۔ چونکہ انسانی معاشرہ میں نبی کا مقام انتہائی نازک مقام ہے۔ ایک معمولی بات بھی جو کسی دوسرے انسان کی زندگی میں پیش آ جائے، چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔ نبی کی زندگی میں اگر پیش آ جائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اسی لیے ان کا کوئی ادنی قدم بھی منشائے الٰہی سے ہٹا ہوا نہیں ہوتا اور ان کے افکار و اعمال میں ذرہ برابر کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جو منشائے الٰہی سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ اس کا احترام اسی بنا پر ہے کہ وہ مرضی الٰہی کا مکمل نمائندہ ہے اور اس کا اسوۂ حسنہ اللہ کی مرضی کی پوری نمائندگی کر رہا ہے''۔

اس بنا پر ایک مسلمان کی پوری زندگی کا ماحصل یہ ہے کہ جب اس نے حضور نبی کریم ﷺ کو آخری پیغامبر مان لیا ہے تو ان کے اسوۂ حسنہ اور ارشادگرامی کو اپنا سرمایہ ایمان بنائے اور ان کے نام کی عظمت اپنے افعال حسنہ سے قائم کرے۔ آپ ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ **من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ** (النساء:**80**) اس کا مقصد زندگی ہو اور حضور ﷺ کی اطاعت میں اس طرح غرق ہو کہ وہ اسلام کا سراپا پیغام بن جائے، اس کی زندگی اسلام کا صحیح نمونہ بن جائے۔ ان کی محبت میں دیوانگی حقیقت میں فرزانگی ہے:

دیوانگی نہ ہو تو یہ فرزانگی نہ ہو
مسلم ہے ہیچ عقل جنوں خیز کے بغیر
سارے جہاں کی پیاس بجھانی محال ہے
اسلام کے پیالۂ لبریز کے بغیر

مولانا کے سیاسی خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور یہ ہر شخص کا بنیادی حق ہے۔ لیکن ان کی نیت پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ چونکہ طبعاً صاف دل انسان تھے، اس لیے بغض و کینہ رکھنا ان کے لیے قطعی ناممکن تھا۔ انہوں نے قادیانیت کی کھل کر مخالفت کی۔ چونکہ وہ پوری طرح اس عقیدے پر قائم تھے، کہ حضور خاتم النبیین ﷺ کے بعد اب کسی نئے نبی کا آنا ہی ناممکن ہے اور حدیث شریف **لانبی بعدی** اس امر کی وضاحت کرتی ہے، اس لیے انہوں نے اپنی پوری زندگی پوری جرأت کے ساتھ قادیانیت کی تردید میں صرف کر دی۔

محبت رسول ﷺ کی اہمیت کا اندازہ مولانا کی ان نعتوں سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہر بات، ہر پریشانی میں حضور انور ﷺ سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اسی عشق نے قادیانیت کی مخالفت میں اشعار لکھوائے اور اس کے خلاف قلمی جہاد کا محاذ بھی قائم کرا دیا اور اپنے اخبار کے صفحات اس کے لیے وقف کر دیے اور نہ صرف تحریروں بلکہ تقریروں کے ذریعہ بھی اس مشن کو جاری رکھا۔ ان کی آواز قید خانوں کی دیواروں سے بھی گونجی، تو وہ بھی عشق رسول میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مختصر یہ کہ ان کا منتہائے مقصود ہمیشہ عشق رسول ﷺ رہا''۔

(مولانا ظفر علی خاں، احوال و آثار از ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی)

مادیاں اور قادیاں

ظفر علی خاں کی ممدوحہ ''مادیاں'' سے کون واقف نہیں ہے۔ ایک ''مادیانی'' تک بند نے جو بقول مولانا ظفر علی خاں ''میر قاسم علی کی دوورقی کی رعایت سے فاروق تخلص کرتے'' تھے، علامہ اقبال کی تضحیک و تخفیف اور اپنی بدعات شنیع کی اشاعت کی غرض سے ایک ہزل کہی۔ اس ہزل کے دو شعر یہ تھے:

دیکھنی ہو عہد نو میں گر دہی شان و شکوہ
قادیاں میں پھر مسلمانوں کی بیداری بھی دیکھ
چھوڑ دے شکوے مسیح پاک کو اقبال مان
اک نظر فاروقؔ کی یہ گرم گفتاری بھی دیکھ

مولانا کو یہ ہزل جناب پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی (جو اس زمانے میں کالج کے طالب علم تھے) نے بہاولپور سے اطلاعاً ارسال کی تھی۔ مولانا نے اس پر فکاہات کا زعفران زار سجایا۔

پہلے تو نثر میں اس ہرزہ سرائی کی خبر لی اور لکھا۔

''علامہ اقبال نے اگر اردو سے تعلق توڑ کر فارسی سے رشتہ جوڑ لیا ہوتا اور قادیاں کے ماعروں کی پھکوڑیات کا جواب دنیا ان کے لیے باعثِ عار ونگ نہ ہوتا تو وہ یقیناً اس نظم کا جواب یوں دیتے''

اس کے بعد آٹھ اشعار کی ایک نظم کہی جس کے دو شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

کاٹنا مقصود ہے جس سے شجر اسلام کا
قادیاں کے لندنی ہاتھوں میں وہ آری بھی دیکھ
مشیٔ فی النوم اور اس کے فلسفہ پر کر نظر
قادیاں کے نازنینوں کی طرحداری بھی دیکھ

(مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقبال از جعفر بلوچ مطبوعہ مرغزار (ظفر علی خاں نمبر) گورنمنٹ کالج شیخوپورہ)

تحفظ ختم نبوت اور مولانا ظفر علی خاں

تحفظ ختم نبوت کے لیے مولانا ظفر علی خاں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے قادیانیت کی چال بازیوں کو بھانپ لیا تھا۔ ان کے والد 6 دسمبر 1909ء کو انتقال کر گئے۔ مولانا ظفر خان نے جنوری 1910ء میں ''زمیندار'' کی ادارت سنبھالی۔ یہ وہ وقت تھا جب مرزا غلام احمد قادیانی کا فتنہ پھیل رہا تھا۔ وہ 26 مئی 1908ء کو انتقال کر گئے۔ حکیم نور الدین خلیفہ اوّل بنے وہ بھی 3 مارچ 1914ء کو دنیا سے کوچ کر گئے۔ مرزا بشیر الدین محمود نے ان کی جگہ لی وہ غلام احمد کے فرزند تھے لیکن دماغ سے فارغ تھے۔ اس جماعت نے قادیانیت کے فروغ کے لیے خفیہ منصوبے بنانے شروع کیے۔ محمد علی احمدی نے انجمن احمدیہ لاہور کی بنیاد رکھ لی۔ انگریزوں نے اس اختلاف سے فائدہ اٹھایا۔ مولانا ظفر علی خاں اور ان کے ساتھیوں کی کوشش سے قادیانیوں کو 1935ء میں جداگانہ اقلیت قرار دینے کا نعرہ بلند ہوا۔ انگریزی استعمار نے فتنہ قادیانیت سے مفادات حاصل کیے۔ مرزا محمود اور اس کے چیلوں کی بھرپور کوششوں کے باوجود سرکاری مردم شماری کے مطابق 55 ہزار نفوس فرقہ قادیانیت میں نظر آئے۔ مجموعی طور پر یہ اعداد و شمار بھی بہت زیادہ تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کی عدالت سنبھالتے ہی مرزا غلام احمد اور ان کے جانشینوں کو شرعی اعتبار سے شکست دی۔ کم پڑھ لکھے مسلمانوں کو مرزائیت کے ناسور سے آگاہ کیا۔

مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کو مرزائیت کے خلاف ایک جہاد کے لیے وقف کر دیا۔ وہ ہر شمارہ میں قادیانیت کے بارے میں نظم و نثر کے حوالے سے اپنے خیالات سپردِ قارئین کرتے۔ مسلمانوں کے شوق کا عالم یہ تھا کہ وہ دو پیسے میں ''زمیندار'' خریدتے اور ایک آنہ اس کی پڑھائی پر خرچ کرتے۔ مولانا ظفر علی خاں کی ان سرگرمیوں کا راستہ روکنے کے لیے انھیں 7 اکتوبر 1914ء کرم آباد میں نظر بند کر دیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے یکے بعد دیگرے کئی اخبارات جاری کیے۔ مارچ 1916ء میں روزنامہ ''لمحات'' منظر عام پر آیا اور کچھ دن کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ دسمبر 1916ء میں انھوں نے ہفتہ وار ''ستارۂ صبح'' جاری کیا۔ جنوری 1917ء میں پہلا شمارہ منصۂ شہود پر آیا۔ 27 اگست 1917ء کو یہ روزنامہ ہو گیا۔ ''ستارۂ صبح'' نے لاہور سے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ اس اخبار نے قادیانیت کا احتساب کیا۔ سر مائیکل اڈوائر مولانا ظفر علی خاں کے بہت خلاف تھا۔ لاہور میں اجتماعی جلسے کی اجازت نہ ملنے کے بعد مولانا حیدر آباد دکن چلے گئے۔ حضرت شورش کاشمیری اپنی کتاب ''تحریکِ ختم نبوت'' میں لکھتے ہیں۔

''قادیانی امت کو پہلی جنگِ عظیم کے دوران اور اس سے کئی سال بعد تک چھیڑنا آسان نہ تھا کیوں کہ برطانوی حکومت کی استعماری مصلحتیں گوارا ہی نہ کرتی تھیں لیکن مولانا ظفر علی خاں نے ''ستارہ صبح'' میں مصرع طرح اٹھایا اور قادیانی امت کے استعماری وجود کو ولولۂ دین سے پسپا کرنا شروع کیا۔ مولانا کے ہاتھ میں دو ہتھیار تھے۔ ایک نثر کا ہتھیار تھا، دوسرا نظم کا۔ مولانا نے اپنی شگفتہ نثر میں قادیانی عقائد کا تجزیہ کیا۔ موضوع و بحث علمی ہوتے لیکن گرفت اس پیرایہ میں کرتے کہ خواص و عام متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ جو لکھتے، دل میں گھب جاتا۔ خواص قائل معقول ہوتے۔ عوام میں احتجاج و تنفر کی روح پیدا ہوتی۔ مثلاً اس زمانہ میں مولانا نے ایک مقالہ لکھا۔ ...... ''احمد کون ہے؟ حضور سرورِ کون و مکاں یا میرزائے قادیان'' میرزا غلام احمد اس عنوان سے چونک گئے اور قادیانیت کا گھونگھٹ اتر گیا۔ ایک دوسرا مضمون ''بعثتِ مجددین'' کے عنوان تھا۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے ارمغان قادیان کے دیباچہ میں لکھا کہ نہایت بلند پایہ اور دقیع مضمون ہے، جو نہایت کاوش سے لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں نہایت طویل مقالے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض مضامین ایسے ہیں جن میں طنز کا انداز نمایاں ہے۔ مثلاً متنبّی قادیان کی ناک، قادیان اور سید امیر علی مرحوم، ملنگ بہ اشتیاق گولے کے۔ الولد سر لابیہ، متنبّی قادیاں اور اس کا

لاہوری طنبورہ، ''ستارۂ صبح'' میں کئی ایک وقتاً فوقتاً مضامین چھپتے رہے۔ میرزا بشیر الدین محمود نے ان سے بدحواس ہو کر سر مائیکل اڈوائر کو بصیغہ راز امداد کی درخواست کی اور اسے مولانا کے خلاف بھڑکایا۔ اِدھر اہلِ طریقت بھی زمیندار کی نکتہ چینی سے برہم تھے۔ انھوں نے زمیندار کے خلاف درخواست گزاری اور مولانا کے خلاف اڈوائر کو مشتعل کیا۔ یہ چیز مرزا بشیر الدین کی بالواسطہ مدد گار ہوگئی۔ اڈوائر بھی پر تول رہا تھا کہ مولانا حیدر آباد لوٹ گئے اور ستارۂ صبح دسمبر **1917**ء کے آخری دنوں میں بند ہوگیا لیکن مولانا ظفر علی خاں کے قلم کی بدولت مسلمانوں میں یہ ذہن پیدا ہو چکا تھا کہ مرزائی نہ صرف حضور ﷺ کی ختم المرسلینی کے غاصب ہیں بل کہ ملتِ اسلامیہ کی شہ رگ پر استعمار کی چھری ہیں۔ القصہ مولانا قادیانیت کے خلاف احتساب کی پہلی آواز تھے جس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی اور مسلمانوں کو اس خطرہ سے چوکنا کیا اور انھیں قادیانیت سے متعلق یقین ہوگیا کہ مسلمانوں کی یثربی وحدت کو دولخت کرنے کے لیے برطانوی استعمار کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔''

مائیکل اڈوائر نے مولانا ظفر علی خاں کو قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار رکھا۔ اخبار بند کیا۔ مولانا کا **700** روپے ماہوار کا وظیفہ بند کروایا لیکن مولانا ظفر علی خاں اپنے مشن سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹے۔ مولانا ظفر علی خاں **1920**ء سے پاکستان بن جانے تک اور روزنامہ ''زمیندار'' نے پاکستان میں **1952**ء تک قادیانیت کے خلاف ایک تحریک کی صورت کام کیا۔ مولانا ظفر علی خاں کے مضامین اور شاعری قادیانیوں کے احتساب کے لیے وقف تھی۔ انھوں نے ہر سٹیج پر مرزا غلام احمد قادیانی کو دجال کہا اور ہمیشہ عدالت میں بھی اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ انھوں نے عشقِ رسول ﷺ کی قلم سے قادیانیت کو طنز کے نشتر مار مار کر نہ صرف زخمی کیا بل کہ اسے چلنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔ مرزائیت کے احتساب میں لاکھوں لوگ ان کے ہم نوا بن گئے اور تحریک نے برعظیم پاک و ہند میں تہلکہ مچا دیا۔ زمیندار کے افق سے بہت سے شاعروں ادیبوں نے شہرت دوام حاصل کی۔ سیاست، ثقافت، علم و ادب، حتیٰ کہ زندگی کے ہر شعبہ میں غلام محمد قادیانی کی جماعت کا احتساب ہوتا رہا اور یہ بات بھی منظر عام پر آگئی کہ اس جماعت کے پس منظر میں برطانوی استعمار کا ہاتھ تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کی ''ارمغان قادیان'' قابلِ مطالعہ ہے۔ مولانا ظفر علی خاں ایسے اکابر کی وجہ سے **7** ستمبر **1974**ء کو اسلامی جمہوریہ پاکستان نے

انھیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔ ان کی ہر چال ناکام ہوئی اور وہ کسی طور بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ عزیزم پروفیسر عاصم اشتیاق کی خواہش پر مولانا ظفر علی خاں کی تحفظ ختم نبوتؐ کے لیے کاوشوں پر ایک پورا دفتر درکار ہے۔ ان کے کاروانِ جدوجہد کی ستائش کرنے والوں میں اپنا نام شامل کروانے کا اس سے بہتر موقع نہیں تھا۔

(عقیدہ ختم نبوت: مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کی روشنی میں از ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم)

قادیانیوں کا خدا

آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا انکار بھی عجب وحشت خیز چیز ہے کہ مدیر ''الفضل'' کو اپنی **31** مارچ کی اشاعت میں اپنے ایک نامہ نگار کی زبانی منکرین کی نادانی کا مرثیہ پڑھتے ہوئے جھنجھلا کر خدا کی قسم کھانی پڑی کہ ''مسیح موعود نبی اللہ تھا''۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا خدا ہے جس کی قسم مرزا قادیانی کی نبوت کی دلیل ہے۔ ''الفضل'' کا دعوے ہے کہ یہ خدا وہی ہے جس نے قرآن میں بنی اسرائیل کی فضیلت کے حسب ذیل دلائل بیان کیے ہیں:

واذ قال موسى لقومه يا قوم اذكروا نعمة الله عليكم اذجعل فيكم انبياء وجعلكم ملوكا واٰتيكم مالم يوت احد من العالمين. (المائدہ:20)

ترجمہ: جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا کی اُن نعمتوں کو یاد رکھو جو اُس نے تم میں انبیاء کو معبوث کرنے اور تم کو بادشاہ بنانے اور اُن عطیات کے بخشنے سے نازل فرمائیں جو دنیا کی کسی اور قوم کو نہیں بخشے گئے۔

پھر اس خدا کی مزید نشاندہی ''الفضل'' نے فرقان حمید کی اس آیت سے کی ہے:

اليوم اكملت لكم دينكم و اتممت عليكم نعمتي و رضيت لكم الاسلام دينا. (المائدہ:3)

ترجمہ: آج کے دن ہم نے تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر دیا اور ہم نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور ہم نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔

اس خدا کو تو ہم بھی جانتے اور مانتے ہیں اور اگر رسالت کی تصدیق کے لیے قسم کھانے ہی کی ضرورت ہو تو واللہ ثم باللہ کی دہری قسم کھا کر خدا ہی کے الفاظ میں کہتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ''**رسول الله وخاتم النبيين**'' ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرزا قادیانی کی

رسالت کے لیے جس خدا سے مدیر "الفضل" نے استشہاد کیا ہے، وہ کوئی اور ہی ہوگا جس کے منہ میں معبود حقیقی کے اصلی کلام کی غلط تفسیر ٹھونس کر آپ ہم سے کلام مجید کی اس سرمدی حقیقت کی تکذیب کرانا چاہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ پر نبوت اس طرح ختم ہوگئی جس طرح مکتوب مہر لگنے کے بعد تمام ہو جاتا ہے۔

[مرزا قادیانی نے کہا تھا:

"سچا خدا وہی خدا ہے جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا۔"]

(دافع البلاء صفحہ 11، مندرجہ روحانی خزائن جلد 18 صفحہ 231 از مرزا قادیانی)

(ستارہ صبح 16 اپریل 1917ء)

قادیانی ماعری

مرزا غلام احمد قادیانی جہاں اور گوناگوں کمالات کے جامع تھے، خیر سے شاعر بھی تھے۔ قرآن مجید نے اس قسم کی سخن بافیوں سے یہ کہہ کر بیزاری ظاہر کی ہے کہ "**ماھو بقول شاعر**" لیکن مرزا صاحب کا یہ عقیدہ تھا کہ

شاعری جزو یست از پیغمبری

اسی لیے اُن پر آئے دن "وحی" نظم میں اترا کرتی تھی۔

"سراج الاخبار" (جہلم) اور "وطن" لاہور کے بیدرد نکتہ چیں مرزا قادیانی کی شاعری کو "ماعری" قرار دیتے ہیں اور اپنے سفاکانہ دعوے کی تائید میں جناب ممدوح کے ایک الہامی قصیدے کا یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

ہوش اڑ جائیں گے انساں کے پرندوں کے حواس
بھولیں گے نغموں کو اپنے سب کبوتر اور ہزار

"سراج الاخبار" کا بیان ہے کہ قادیاں کے "سلطان القلم" کو ادب اردو سے کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ لفظ "ہزار" کے استعمال سے بھی واقف نہیں۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ یہ لفظ یہاں کوئی معنی رکھ سکتا ہے۔ حاشا وکلا۔ اگر اس سے مراد ہزار داستاں ہو تو اس کی کوئی نظیر بتائیے کہ یہ حذف کیسے درست ہو سکتا ہے؟

جناب "سلطان القلم" کے الہامی قصیدے میں ہزار کا قافیہ تو چست بندھا ہے۔ البتہ

ازار کی بندش ڈھیلی ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔

آئے گا قہر خدا سے خلق پر اک انقلاب
اک برہنہ سے نہ یہ ہو گا کہ تا باندھے ازار

''کہ تا'' کی اس معجزانہ ترکیب پر ملا اعلی میں بھی احسنت وزہ کا غلغلہ بلند ہوتا ہوگا!

اسلامی تہذیب سکھاتی ہے کہ ''**الناس باللباس**'' دنیا کی دوسری مہذب قوموں میں بھی لباس شب خوابی لازمہ انسانیت ہے۔لیکن مرزا قادیانی کی کچھ اور ہی تعلیم ہے۔ہمیں سکھایا جاتا ہے کہ کم ازکم شبستاں میں

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے نہیں جس کا ہے سیدھا اُلٹا

لیکن یہ ایک جداگانہ بحث ہے۔ یہاں سوال فقط اس قدر ہے کہ خدا کا وہ کون سا مفاجاتی قہر بنی نوع انسان پر نازل ہونے والا تھا جس سے مرزا کی وحی منظوم نے دنیا کو ڈرایا ہے اور جس کی نشانی آپ نے یہ قرار دی ہے کہ بحالت برہنگی انسان کو اتنی بھی مہلت نہ ملے گی ''کہ تا باندھے ازار''۔اس سوال کا جواب ''سلطان القلم'' نے خود ہی ان صاف وصریح الفاظ میں دیا ہے:

یک بیک اک زلزلہ سے سخت جنبش کھائیں گے
کیا بشر اور کیا شجر اور کیا حجر اور کیا بحار

یہ پیشین گوئی **1905**ء میں کی گئی تھی جبکہ بھونچال کی ایک تباہ کن لہر کانگڑہ کے علاقہ کو زیروزبر کر چکی تھی اور مرزا قادیانی جو سان فرانسسکو اور مسینا کے واقعات کو نہ بھولے تھے، اپنی لچکیلی الہامی زبان میں جس کے لفظوں کی لدونت اور مرونت ابھرنے اور پھیلنے کے ساتھ سکڑنے اور سمٹنے کی فقید النظیر قابلیت رکھتی ہے، اپنی معتقدین کو نہایت آسانی سے یقین دلا سکتے تھے کہ دنیا میں ایک زلزلہ عظیم رونما ہونے والا ہے جس کی بطش شدید سے کائنات کا ذرہ ذرہ تہ و بالا ہو جائے گا۔پیشین گوئیاں سن اور تاریخ اور ساعت ظہور کی تصریح کی قید سے آزاد ہوتی ہیں اور اگرچہ مرزا صاحب نے بھی اس آنے والے بھونچال کے لیے کوئی خاص تاریخ تو معین نہیں فرمائی لیکن مستقبل بعید کا تصور بہرحال آپ کی تخویف سے خارج تھا۔آپ کو یقین تھا کہ چند ہی روز میں قہر ایزدی بشکل زلزلہ دنیا پر نازل ہونے والا ہے۔فرماتے ہیں:

اک نشاں ہے آنے والا آج سے کچھ دن کے بعد
جس سے گردش کھائیں گے دیہات و شہر و مرغزار

یونانیوں کے آسمان کی گردش سنی تھی اوراسی مناسبت سے دور قمر کی گردش، لیل ونہار کی گردش، قسمت کی گردش ہمارے سننے میں آئی تھی لیکن چراگاہوں کی گھاس کی پتیوں کی گردش، دیہات کے اپلوں کی گردش خاص ''سلطان القلم'' کی ایجاد ہے۔لیکن ہم پھرادب کی بحث میں پڑ گئے۔ہمیں یہاں قادیانی الہام سے سروکار رکھنا چاہیے۔

''سراج الاخبار'' کا بیان ہے کہ 1905ء میں مرزا قادیانی کو چند ہی دن میں ایک قیامت خیز زلزلہ کے آنے کا اس درجہ یقین تھا کہ آپ اپنے بال بچوں اور مریدوں سمیت دارالامان قادیاں سے ہجرت فرما کر جنگل میں جا گھسے۔منجموں اور رمالوں کی وحشت انگیز پیشین گوئیاں جہال وعوام میں بعض دفعہ افراتفری ڈال دیا کرتی ہیں۔حکومت نے اپنی رعایا کے سریع الاعتقاد طبقوں کواس قسم کی ترہیب کے انداز کے مدہش اثر سے بچانے کے لیے جناب ممدوح کو متنبہ کر رکھا تھا کہ ڈرانے والی پیشین گوئیاں شائع کر کے رعایا میں خلفشار نہ پیدا کریں۔مرزا صاحب کواندیشہ ہوا کہ مبادا آپ کا زلزلہ نما الہامی قصیدہ اس انتباہ کے لحاظ سے قابل اعتراض ٹھہرے، اسی لیے آپ نے اپنے مقدس صحیفہ الحکم کی اشاعت مورخہ 24 مئی 1905ء میں ''ضروری گزارش قابل توجہ گورنمنٹ'' کے عنوان سے حسب ذیل عذر سپرد قلم فرمایا۔

''جس آنے والے زلزلہ سے میں نے دوسروں کوڈرایا،اُن سے پہلے میں آپ ڈرا اور اب تک قریباً ایک ماہ سے میرے خیمے باغ میں لگے ہوئے ہیں۔ میں واپس قادیاں میں نہیں گیا۔............میں مع اہل وعیال اوراپنی تمام جماعت کے جنگل میں پڑا ہوں اور جنگل کی گرمی کو برداشت کرر ہا ہوں''۔

وہ عالمگیر زلزلہ جس سے نذیر خود ڈرا تھا حالانکہ کم ازکم اُس کواوراُس کی جماعت کوجس کے خدا کے ساتھ خاص الخاص تعلقات ہیں، ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی، آج تک نہیں آیا۔نہ برہنوں کواَزار باندھنے کی ضرورت پیش آئی ہے اور نہ کبوتر اور ہزار اپنے نغمے بھولے ہیں۔لیکن یہ کس طرح ہوسکتا تھا کہ خدا کے ''نبی'' کا فرمودہ باطل ہو۔اس فرمان قضا تو امان پر تو جناب مرزا صاحب کی ''سچائی'' کا دارو مدار تھا اورانکار کرنے والوں کے لیے سفاہت کی جامع و مانع گالی

بارگاہ قادیاں سے مقدر ہو چکی تھی:

ہاں نہ کر جلدی سے انکار اسے سفیہ ناشناس
اس پہ ہے میری سچائی کا سبھی دار و مدار

وہ جو کہا گیا ہے کہ ''پیراں نمے پرند و مریداں مے پرانند'' بالکل سچ ہے۔ بیچارے مرزا صاحب کے وہم و گمان میں بھی یہ بات داخل نہ تھی کہ جو نشان ''آج سے'' (یعنی مئی 1905ء سے) ''کچھ دن کے بعد'' آنے والا تھا، اُس کا مارچ 1917ء کے واقعات سے کچھ بھی تعلق ہوگا لیکن قصیدہ الہامی میں قافیہ کی ضرورت نے ایک موقع پر اس طرح بھی تک سے تک ملائی تھی۔

مضمحل ہو جائیں گے اس خوف سے سب جن و انس
زار بھی ہو گا تو ہو گا اُس گھڑی با حال زار

نکولس ثانی زار روس کا معزول ہونا تھا کہ مرزائی حلقوں میں غل مچ گیا کہ دیکھا ''مسیح موعود'' کی بات کس طرح پوری ہوئی اور خدا نے اپنے ''نبی'' کی لاج کس طرح رکھ لی۔ **لاحول ولا قوة الا باللّٰه العلی العظیم. ونعوذ باللّٰه من شرور انفسنا ومن سیأت اعمالنا من یهده اللّٰه فلا مضل له و من یضلل فلا هادی له۔**

مرزا قادیانی کو شعر کہنے کی جو دھت پڑ گئی تھی، افسوس کہ وہ مذاق سلیم کا خون کر کے رہی۔ اُن کے مرید اُن کی ان مل بے جوڑ قافیہ پیمائی کی تقلید کرنے لگے اور اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ جو لوگ نحو اور عروض کا نام تک نہیں جانتے اور نثر میں بھی ایک فقرہ تک صحیح نہیں لکھ سکتے، اپنے آپ کو امرء القیس اور متنبی سمجھنے لگتے ہیں اور ''سلطان القلم'' کی ساری امت اسی خود فراموشانہ انانیت میں مبتلا نظر آتی ہے۔

کوئی صاحب کرم داد نامی ہیں۔ جن کی دستار فضیلت میں ہمارے فاضل معاصر ''الفضل'' نے ''مولوی'' کا طرہ تو لگایا ہی ہے، لیکن شاعرانہ حیثیت سے اُن کے قلم کو ''حقیقت رقم'' بھی تسلیم کیا ہے۔ ''مولوی'' کرم داد صاحب کے ''قلم حقیقت رقم'' کے اعجاز پر ان کا صرف یہ ایک شعر گواہ ہے:

وہی اس رمز کو جانے جو قاف و الف و تا مانے
سن گیارہ میں کیا حکمت رکھا کیوں عدد بارہ ہے

مفاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل

یہ پِین پِین پیں یہ ٹُن ٹُن ٹُن ہے سلطان القلم کی دھن

(ستارۂ صبح یکم مئی 1917ء)

قادیان کا تھیٹر

''ناظرین کرام، ہز ہولی نس موسیو بشیر الدین محمود کی ''عرضداشت'' کے الفاظ بھولے نہ ہوں گے جن میں آپ نے ان چرکوں کی تفصیل گنوائی تھی جو ''ستارۂ صبح'' کے دشنہ استہزا نے قادیانیت کے جگر میں رہ رہ کر لگائے ہیں، اور اپنے دل صد پارہ کی قاش فروشی کے بعد ہم سے استدعا کی تھی کہ ہم آئندہ کے لیے اس سلسلہ طعن و تعریض کو بند کر دیں۔ جس کے دوسرے معنی یہ تھے کہ جناب ممدوح اور آپ کی امت کثیر الانفار کو تو یہ اختیار دے دیا جائے کہ اسلام کا منہ چڑائیں۔ روایات اسلام کا استخفاف کریں۔ رسول اللہ ﷺ کی نقلیں اُتاریں۔ ازواج مطہرات حضور سرور کائنات علیہ والصلوٰۃ والسلام کے ناموس کو اپنے خاندان کی خواتین کے القاب و آداب کے لیے وجہ محاکات بنائیں۔ لیکن ہم کو اجازت نہ ہو کہ آپ کے اور آپ کی امت کے اس بے باکانہ طرز عمل پر ایک حرف بھی زبان قلم سے نکالیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ ہماری باتیں آپ کو کڑوی معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارے اقوال آپ کو گراں گزرتے ہیں۔ ہمارا قلم آپ کے دل نازک کے لیے خنجر و نشتر کا حکم رکھتا ہے کہ اس کی ایک ایک جنبش اس کے سوسو عرضوں کو اپنے ساتھ لپیٹ لاتی ہے۔ آپ کا ارشاد بالکل درست ہے۔ لیکن کبھی آپ کو بھولے سے بھی یہ خیال آیا ہے کہ ہم بھی پہلو میں دل رکھتے ہیں۔ یہ دل بھی جذبات سے بھرا ہوا ہے، اور یہ جذبات بھی مجروح ہو سکتے ہیں۔

آپ تو اس حقیقت کبریٰ سے دور جا پڑے۔ لیکن ہمارے دل کے پاک ترین گوشے اور ہماری آنکھ کے نازک ترین پردہ میں اس کا یہ جیتا جاگتا مفہوم ہر وقت موجود ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کے بعد حضرت محمد مصطفیٰ واحمد مجتبیٰ علیہ صلوٰۃ وسلاماً ودائماً ابداً خلاصہ کائنات و زبدۂ موجودات ہیں۔ جن پر انسان کے لیے حجت حق ختم ہوگئی۔ جن کی ذات عدیم المثال ہے اور جن کی صفات فقید النظیر ہیں۔ پھر آپ ہی انصاف فرمائیں کہ ہمارے دل کو کس درجہ تکلیف ہوتی

ہے۔ ہماری روح کو کس قدر صدمہ پہنچتا ہے۔ ہمارے جذبات کس حد تک مجروح ہوتے ہیں۔ جب آپ مرزا قادیانی جیسے آلودۂ خطا و نسیان انسان کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جیسے انسان کامل کی مسند اکملیت پر بٹھا کر اسلام کا منہ اس طرح چڑاتے ہیں:

1- ہم بغیر کسی فرق کے بہ لحاظ نبوت انہیں (مرزا غلام احمد کو) ایسا ہی رسول مانتے ہیں جیسے کہ پہلے رسول مبعوث ہوتے رہے۔

2- ہم مانتے ہیں اور صدق دل سے جانتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی بعثت اول جیسی کہ پانچویں ہزار میں ہوئی، ایسی ہی چھٹے ہزار کے لیے مقدر تھی اور سورۂ جمعہ میں اس کا ذکر ہے۔

3- حضرت مرزا صاحب کی صداقت کے لیے اس قدر نشانات ظاہر ہوئے کہ اگر وہ ہزار نبی پر بھی تقسیم کیے جائیں تو ان کی نبوت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

4- پھر ہم کہتے ہیں کہ وہ (مرزا غلام احمد) **جری اللّٰہ فی حلل الانبیاء** تھا۔ یعنی تمام انبیاء کا نمونہ آپ کی ذات قدسی صفات میں جمع تھا۔

5- آپ نے (''ستارۂ صبح'' نے) اس کو (مرزا غلام احمد کو) نہیں پہچانا۔ مگر ہم نے تو اسے دیکھنے کی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ یقیناً سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے جمیع کمالات قدسیہ کا جامع ہے اور **مبشراً برسول یاتی من بعدی اسمه احمد** کا مصداق۔

6- جس بات نے حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بنا دیا، وہی بات اس (مرزا غلام احمد) میں ہمارے نزدیک موجود تھی۔

7- اس (مرزا غلام احمد) کے اقوال و تصانیف کا ایک ایک لفظ ہمارے لیے ایسا ہی حجت قوی اور قیمتی ہے جیسے کسی اور نبی کا۔

8- جب ایک ایسے شخص کی بھی تعظیم کی جاتی ہے جو دو چار خادم رکھتا ہو، اور کوئی مہذب آدمی پسند نہیں کرتا کہ ایک معمولی وجاہت کے انسان کو بھی بُرا کہے اور اس کی توہین کرے، تو آپ (''ستارۂ صبح'' اور قادیانیت کے دوسرے مسلم معترضین) کے لیے یہ کیونکر جائز ہو گیا کہ اس خدا کے برگزیدہ جاہ و جلال کے نبی، عظیم الشان نبی، ایک لاکھ چوبیس ہزار

کی شان رکھنے والے نبی **انت منی و انا منک، ظھورک ظھوری** کے مخاطب نبی کو کھلے کھلے الفاظ میں گالیاں دیں۔ (''الفضل'' قادیاں، مورخہ 16 اکتوبر 1917ء)

تقدس مآب موسیو بشیر الدین محمود اور ان کے عقیدت کیش یقین مانیں کہ یہ الفاظ پڑھ پڑھ کر فرطِ غیظ و غضب سے ہماری حالت دگرگوں ہوئی جاتی ہے، اور ہمارا غرق خون دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے ان کا منصب چھین کر کسی نا اہل کو دے دینا مسلم آزاری کا ایک ایسا فعل ہے جس کے ارتکاب کی جرأت اس سوا تیرہ سو سال کے عرصہ میں قادیاں والوں ہی کو ہوئی ہے۔ مسلمان باقی تمام حرکات مذبوحی کو جائز رکھ سکتے ہیں لیکن اس کی تاب نہیں لا سکتے کہ ہرا یرے غیرے کو محمد مصطفیٰ ﷺ بنا دیا جائے۔ اگر موسیو بشیر الدین محمود جنہیں اپنے پانچ لاکھ مریدوں کے ایثار و فدویت پر گھمنڈ ہے، ہم چالیس کروڑ جان نثارانِ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی کسی شمار و قطار میں سمجھتے اور ہمارے جذبات کی بھی پروا کرتے، تو ہم ان کی خدمت میں عرض کرتے ۔

می بخور مصحف بسوز آتش اندر کعبہ زن
ہرچہ خواہی کن و لیکن مسلم آزاری مکن

غضب خدا کا، آپ غلام احمد قادیانی کو محمد مصطفیٰ ﷺ بنائے دیتے ہیں اور جو القاب حضور سرور کائنات ﷺ سے لسان شرع میں مخصوص ہیں، وہ اُن سے چھین کر مرزا غلام احمد کو علیہ الصلوٰۃ والسلام لکھتے ہیں، اور اس بے حجابانہ نقالی میں یہاں تک غلو کرتے ہیں کہ اپنے گھر کی ہر بی بی کو ام المومنین کے لقب سے پکارتے ہیں۔ ذرا آپ اپنے آپ کو ہز امپریئل میجسٹی امپرر آف انڈیا تو کہہ دیکھیے اور اپنی زوجہ محترمہ کے لیے ہر امپریئل میجسٹی کا خطاب تو تجویز کر دیکھیے، سیاست برطانیہ کا آہنی ہاتھ آپ کو کسی کال کوٹھڑی میں بند نہ کر دے تو سہی۔

للہ! اس مسخر گی سے باز آ جایئے اور ہم مسلمانوں کے مقدس ترین جذبات کو سرپائے استہزا سے نہ ٹھکرایئے۔ ہمیں یہ تھیٹر دیکھنا پسند نہیں۔ گھر میں آپ جو چاہے، کر لیجیے۔ لیکن سر بازار اسلام کی عزیز ترین روایت کو رسوا نہ کیجیے۔ ہمارا آپ سے کوئی ذاتی عناد نہیں۔ کوئی شخصی جھگڑا نہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہم مسلمانوں کے عقائد کا استخفاف نہ کریں اور جو روایات

ہمیں مدینہ سے ترکہ میں ملی ہیں، ان کی نقلیں نہ اتاریں۔ ہماری التماس آپ کی خدمت میں صرف اسی قدر ہے‘‘۔

(روزنامہ ’’ستارۂ صبح‘‘ یکم نومبر 1917ء)

عقل اور معجزہ

ہمارا اعتقاد ہے کہ دین اسلام کا ہر عقیدہ اور ہر حکم فطرت انسانی کے مطابق اور میزان عقل میں پورا اترنے والا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی کہیں گے کہ مذہب کے بعض حقائق عالیہ ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں عقل انسانی کی رسائی نہیں۔ کیونکہ مذہب کائنات کی نازل کی ہوئی ابدی وسرمدی حقیقت ہے اور انسان کی عقل ضعیف اس کا پورا احاطہ کرنے سے قاصر وخاسر ہے۔

آج کوئی عقل کا علمبردار کسی نبی کے معجزے کو سائنس کے کسی مسلمہ کی بنا پر صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کل یورپ کے علماء جدید تحقیقات کے بعد سائنس کا وہ مسلمہ ہی باطل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اثبات معجزہ کا وہ سارا تار و پود بکھر کے رہ جاتا ہے۔ حالانکہ معجزہ اس قسم کی ریتلی اور پھسپھسی بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ اس کی کنہ کو پہنچنے کے لیے خدا جانے ابھی عقل انسانی کو تربیت کے کتنے مراحل طے کرنے پڑیں۔

آج گاندھی جی کہتے ہیں کہ جب تک مذہب کے تمام اصول عقل کے معیار پر پورے نہ اتر لیں، قابل تسلیم ہی نہیں ہیں۔ گویا الہام کوئی شے نہیں، سب کچھ عقل ہی ہے۔ اسی قسم کے ضلالت آمیز استدلال کے متعلق مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ؎

گر بہ استدلال کار دیں بُدے
فخر رازی راز دار دیں بُدے
پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

قادیانی بھی عقل انسانی کے بہت بڑے اجارہ دار بنے پھرتے ہیں اور ان کے صحیفۂ زمینی یعنی ’’الفضل‘‘ نے اپنی تازہ اشاعت میں ’’مباحثہ گاندھی وظفر‘‘ پر ایک طویل مضمون لکھ کر مہاتما جی کی تائید اور مولانا کی تردید کی ہے۔ یہ ان لوگوں کی حمایت اسلام ہے۔ موسیو مرزا کا یہ صحیفہ لکھتا ہے کہ حمایت اسلام یہی ہے کہ غیر مسلم کی نکتہ چینی کو برداشت کیا جائے۔ حالانکہ

برداشت کرنا قطعاً مفید نہیں، جواب دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہم موسیو مرزا بشیر الدین محمود سے یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ جب ان کے والد بزرگوار ایک شخص مسمی عبداللہ سے مٹھی چاپی کروار ہے تھے تو انہیں کشف میں دکھایا گیا تھا کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ بیٹھے ہوئے سرخ روشنائی سے کچھ لکھ رہے ہیں۔ اتنے میں اللہ تعالیٰ نے قلم کو ذرا جھٹکا دیا تو سرخ روشنائی آپ کے والد آنجہانی کے پاجامے اور میاں عبداللہ کی ٹوپی پر پڑی۔ چنانچہ حالت کشف دور ہونے کے بعد دیکھا تو روشنائی کے چھینٹے موجود تھے۔ وہ پاجامہ اور وہ ٹوپی غالباً اب تک آپ کے پاس بطور تبرک موجود ہوگی۔

عقل انسانی سوال کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کہاں بیٹھے ہوئے تھے؟ اور انہیں سرخ روشنائی سے لکھنے کی کیا خاص ضرورت داعی ہوئی تھی؟ پھر اس روشنائی کے قطرے اللہ تعالیٰ کی نشست گاہ سے ہزارہا فضاؤں کو چیرتے ہوئے آپ کے واجد ماجد کے پاجامے پر کیونکر آن پڑے؟ اور پھر آپ کے والد تو ''نبی'' تھے ہی، اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز ہوتا ہی رہتا تھا۔ آخر میاں عبداللہ نے کیا قصور کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ٹوپی پر دوات انڈیل کر اسے ستیاناس کر دیا؟ نعوذ باللہ۔

انبیاء کے معجزات اور دین اسلام کے احکام تو ایک طرف رہے، آپ ذرا اپنے والد آنجہانی کے اس کشف ہی کی حقیقت عقل کے رو سے بیان کر دیجیے۔ پھر ذرا یہ بھی فرمائیے کہ مرزا صاحب آنجہانی کو جب ایام آئے، حمل ٹھہرا، بچہ پیدا ہوا اور وہ بچہ بھی خود مرزا صاحب ہی کی ذات والا صفات تھی۔ اس ہرزہ سرائی کا ثبوت بھی عقل سے دیجیے کہ مرزا صاحب ''خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ'' کیونکر بن گئے۔

واضح رہے کہ مرزا قادیانی کی ہفوات کی دیگ میں سے یہ صرف ایک دو چاول ہیں۔ اگر کہیں ہم پورے ''معجزات'' اور 'کشوف' کی تفصیل لکھ کر پیش کر دیں تو قادیانی تو درکنار، ساری دنیا کی عقلیں چکر کھا جائیں۔

عقل کے دعویدار اور دلائل و براہین سے ہر الہامی اور آسمانی حقیقت کو ثابت کرنے والوں کو چاہیے کہ پاجامے اور حیض والے کشف کو بھی عقل سے ثابت کریں۔ ورنہ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ بعض ایسی باتیں بھی ہوا کرتی ہیں جن کا راز اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ اسلام کو تسلیم کرنے کا مدار عقل پر نہیں، فطرت صحیحہ پر ہے۔ جن مسلمانوں نے سب سے پہلے

اسلام قبول کیا تھا، وہ فلاسفر نہ تھے، حکیم نہ تھے بلکہ ان کی فطرتیں صالح تھیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے پیغام نے ان کے دلوں میں اثر کیا۔ وہ مومنون بالغیب تھے۔ آج یورپ عقل کا مخزن ومنبع ہے لیکن اسلام کو قبول نہیں کرتا کیونکہ بڑے بڑے حکما وعقلا کی فطرتیں انتہائی عقل رکھنے کے باوجود مسخ ہو چکی ہیں۔

از منطق و حکمت نکشاید پر معشوق
اینجا ہمہ آرائش افسانہ عشق است

(زمیندار 22 مارچ 1925ء)

ارتداد

ارتداد ایک ایسا جرم ہے جس کے مستوجب سزا ہونے پر ساری دنیا طوعاً وکرہاً متفق ہے۔ آج اگر ملک معظم جارج پنجم رومن کیتھولک ہو جائیں تو ایک لمحہ کے اندر تخت سے اتار دیئے جائیں کیونکہ آئین انگلستان میں شاہی خاندان کا مذہب پروٹسٹنٹ درج ہے اور کوئی بادشاہ اس مذہب سے مرتد ہونے کے بعد تخت شاہی پر متمکن نہیں رہ سکتا۔ کیا کسی شخص کو ''محض اختلاف عقائد کی بناپر'' بادشاہ سے گدا بنا دینا قتل'' سے کچھ کم ہے؟

شہنشاہ ولیم قیصر جرمنی نے اپنے خاندان کی ایک شہزادی کو جس نے پروٹسٹنٹ عقائد ترک کر کے رومن کیتھولک مذہب اختیار کر لیا تھا، ایک خط لکھا جس میں اس کے ارتداد پر سخت رنج و تاسف ظاہر کیا اور شہزادی کو بتایا کہ تم نے ہمارے خاندان سے انتہائی غداری کا ثبوت دیا ہے۔ میں تم کو یہ سزا دیتا ہوں کہ میرا خاندان اب تم سے کوئی تعلق نہ رکھے گا۔ ہم نے تم کو اپنے کنبے میں سے خارج کر دیا اور تمہاری ہستی ہمارے نزدیک معدوم ہے۔ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یورپ کے انتہائی آزاد خیالوں کے نزدیک بھی ارتداد جرم ہے؟

ہم مرزائیوں اور ان کے حمائیتوں سے یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کا امیر کسی جرم کا مرتکب ہو تو کیا اسے بھی عام مسلمانوں کی طرح شریعت ہی کے مطابق سزا دی جائے گی؟ یقیناً اس کا جواب تو اثبات ہی میں ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود امیر المومنین (خدانخواستہ) مرتد ہو جائیں تو کیا تدبیر کیا جائے گی؟ آپ کے نزدیک تو نہ ارتداد ''شرعاً جرم'' ہے نہ اس کی کوئی سزا ہے۔ تو کیا مسلمان اس مرتد کی اطاعت بدستور کرتے رہیں گے اور اسے قتل

نہ کریں گے؟ اور اگر قتل کر دیں گے تو کیا ''محض اختلاف عقائد کی بنا پر'' یہ قتل ''وحشیانہ'' نہ ہوگا؟

لیکن ہم نے یہ سوال خواہ مخواہ کیا کیونکہ خود مرزائیوں کے عمل میں اس کا جواب موجود ہے۔ جو لوگ کفار کی حکومت کی وفاداری کو جزوِ ایمان قرار دیتے ہیں اور انہیں ''**اولی الامر منکم**'' بتاتے ہیں، انہیں مرتد خلیفہ کی اطاعت کرنے میں کیا باک ہوسکتا ہے''۔

(زمیندار 10 اپریل 1925ء)

قادیانی چوہے

قادیانی چوہے آج کل اسلام کے مودی خانے میں گھسے ہوئے ہر چیز کو کترنے میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی طاعون سے اپنے بندوں کو محفوظ رکھے۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ قادیانیوں کے مشن متعینہ لندن نے ''تبلیغ قادیانیت'' کا کام چھوڑ چھاڑ کر افغانستان کے خلاف سازشیں شروع کر دی ہیں۔ چنانچہ سات مشہور انگریزوں کے دستخطوں سے ایک اعلان شائع کیا گیا ہے جس میں قادیانیوں کی سنگساری پر افغانستان کو ملامت کی گئی ہے۔ گویا قادیانی بڑے بڑے جغادری کافروں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر کے اسلام کے قلعہ پر حملہ آور ہو رہے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حق کی طاقت کے سامنے سارا یورپ بھی نہیں ٹھہر سکتا اور ناصری مسیح کی امت قادیانی مسیح کی بھیڑوں کے ساتھ مل کر بھی اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ **ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا**۔

اگر کتوں کے بھونکنے سے چاند کی روشنی کم ہوسکتی تو اب تک دنیا کبھی کی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مار رہی ہوتی۔ موسیو مرزا کو چاہیے کہ قادیانیوں کی نازک پیشانیوں کو افغانستان کی چٹانوں سے متصادم نہ ہونے دیں۔ اُس ''بنیان مرصوص'' کا تو کچھ نہ بگڑے گا، آپ ہی کے لوگوں کے فرق دان، گالدان ہو کر رہ جائیں گے۔

(زمیندار 13 اپریل 1925ء)

'قادیانی ذوالقرنین'

مرزا قادیانی آنجہانی کی نبوت بھی عجیب بھان متی کا پٹارا تھی کہ جو چاہا اس میں سے نکال کے رکھ دیا۔ کبھی مسیحیت کا دعوے کیا تو کبھی مہدی کہلائے۔ کبھی گرونانک کا روپ دھارا تو

کبھی کرشن جی کے بہروپ میں آ گئے۔ کبھی اویس قرنی بنے اور کبھی سلمان فارسیؓ سے شجرہ جاملایا۔ کبھی ابراہیمؑ ہوئے تو کبھی اسمٰعیلؑ، کبھی جبرائیلؑ تو کبھی عزرائیلؑ یعنی

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

آپ کی شیوٴن مختلف کی بوقلمونی یہاں تک بڑھی کہ اگر باری تعالیٰ جل جلالہ کے ننانوے نام ہیں تو آپ کے ایک سوایک کیوں نہ ہوں۔ آخر زمانہ حاضر کے ''نبی'' ٹھہرے۔ (نعوذ باللہ)

آپ کے اسمائے ''فتح'' میں سے ایک نام ''ذوالقرنین'' بھی ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں جب ان ذوالقرنین صاحب کے صاحبزادے انگلستان گئے تو آپ نے اس سفر کو بھی قرآن سے ثابت کیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ **فاتبع سبباً حتی اذا بلغ مغرب الشمس** (الکہف:85،86) موسیو مرزا نے کہا تھا کہ اگر ''ذوالقرنین زمانہ'' کا کوئی خادم بھی ''مغرب الشمس'' تک پہنچ گیا تو گویا پیشگوئی پوری ہوگئی۔ گو ذوالقرنین صاحب کو خود لندن دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ ہم نے اس پر لکھا تھا کہ اگر فی الواقع اس آیت سے مرزا صاحب آنجہانی کے کسی خادم کا انگلستان جانا ہی مقصود ہے تو یہ پیش گوئی پوری ہو چکی ہے کیونکہ خواجہ کمال الدین سب سے پہلے مرزائی ہیں جو انگلستان گئے۔

لیکن ''ذوالقرنین'' کے لفظ سے آج ہمیں ایک نئی بات سوجھی۔ اس کا ترجمہ ہے، ''وہ شاخہ'' کیونکہ قرن سینگ کو بھی کہتے ہیں۔ مرزا صاحب آنجہانی کے فرق دان پر جہاں ایک سینگ ''نبوت'' کا پیدا ہوگیا تھا، وہاں دوسرا وفاداری برطانیہ کا سینگ بھی موجود تھا۔ غالباً ''زبان الہام'' نے اسی رعایت سے آپ کو ذوالقرنین یعنی دوشاخہ نبی قرار دیا ہوگا۔

اس لقب کی ایک اور بھی توجیہہ ہوسکتی ہے۔ مولوی نورالدین کے انتقال کے بعد فوراً جماعت مرزائیہ کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک قادیانی اور ایک لاہوری۔ اس رعایت سے بھی مرزا قادیانی کا ذوالقرنین ہونا ثابت ہے اور موسیو مرزا کو چاہیے کہ اس اختلاف پر خدا کا شکر ادا کریں جس کی وجہ سے مرزا صاحب کے ایک اسم صفاتی کی تفسیر ہوگئی۔

یہ دونوں جماعتیں مدت سے آپس میں گاؤزوری کر رہی تھیں۔ کبھی لاہوری امیر قادیانی امام کو اپنے سینگوں پر اٹھا کہ زمین پر پٹخ دیتا تھا تو کبھی قادیانی مینڈھا ٹکر مار کر لاہوریوں کے حواس اس طرح غائب کر دیتا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ لیکن جب سے نعمت اللہ خاں کی سنگ

ساری عمل میں آئی ہے، دمشق اور اندلس دونوں ہم کنار ہورہے ہیں۔ مسئلہ قتل مرتد اس گنگا جمنی فرقے کا بن رہا ہے اور محمد علی لاہوری اور مرزا البشیر الدین محمود دونوں لپٹ کے رو رہے ہیں۔

بنال بلبل اگر با منت سر یا ریست
کہ مادو عاشق زاریم و کارِ ما زا ریست

پچھلے دنوں ایک مختصر مجمع احباب میں لاہوری اور قادیانی مرزائیوں کا تذکرہ جو آیا تو بعض حضرات نے لاہوریوں کو ''قادیانیوں'' پر ترجیح دی لیکن بعض دوستوں نے ان کو قادیانیوں سے بھی زیادہ خطرناک بتایا اور ایک صاحب نے کہا: ''اجی۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں، ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں''۔ اس پر آقا محمد طاہر نے فرمایا: جی ہاں بلکہ ایک ہی قینچی کے دو پھل کہیے۔'' اس تنظیر کو احباب نے پسند کیا۔ راقم الحروف نے عرض کی کہ مدت سے یہ دونوں پھل الگ الگ پڑے تھے، ان میں نئی میخ امیر امان اللہ خاں نے ٹھونکی ہے؟

(زمیندار 17 اپریل 1925ء)

شیطان کے دوست

قادیانی پدی کے باسی شوربے میں نئے سرے سے ابال آ رہا ہے اور اب موسیو مرزا محمود کو یہ سوجھ رہی ہے کہ خواہ تمام کائنات کے شیاطین وطواغیت سے اتحاد کرنا پڑے، لیکن ایک دفعہ تو افغانستان کو صفحۂ ہستی سے محو کر کے رہیں گے۔ یعنی جس خواہش نے انگلستان اور روس کے بہترین مدبرین کو ڈیڑھ سو سال سے تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے، وہی اب موسیو مرزا کے لیے سارس رقص بن رہی ہے۔ لیکن یہ ناچ اپنے ''امامانہ'' اندازِ رقص وتواجد کی وجہ سے تماشائیوں کی ضیافت طبع کا جو کچھ سامان بہم پہنچا رہا ہے، وہ انگریزوں اور روسیوں کے رقص میں بالکل ناپید تھا۔ کیونکہ ان کے رقص میں تو ہوائی جہازوں کی پرواز کے نغمے اور توپوں کے گھنگھروؤں کی جھنکار سنائی دیتی تھی لیکن موسیو مرزا بالقابہ محض کولوں کو مٹکانے، تھرکنے، تھرتھرانے اور ڈاڑھی ہلا ہلا کر بھاؤ بتانے ہی میں کمال فن کا اظہار فرما رہے ہیں۔

رقاصِ قادیان اپنی امداد واعانت کے لیے جمعیۃ الاقوام، برطانیہ، فرانس، امریکہ، کانن ڈائل، سر آلیو لاج اور پروفیسر نکلسن کو آوازیں دے رہا ہے اور کائنات ارضی کے تمام ''**ارباباً من دون اللّٰہ**'' اس کی آواز پر کان دھر رہے ہیں۔ لیکن ان بدبختوں کو معلوم نہیں کہ

امان اللہ خاں کا اللہ سب سے بڑا ہے۔ اس کی گرفت سب سے زیادہ شدید اور اس کا غضب سب سے زیادہ ہولناک ہے۔

جولوگ شیاطین سے سوالات کر کے ایک اسلامی سلطنت کی تباہی پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں، انہیں بہت جلد اپنی کمینہ مساعی کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ **ومن یتخذ الشیطٰن ولیاً من دون اللّٰہ فقد خسر خسراناً مبیناo یعدھم و یمنیھم وما یعدھم الشیطٰن الا غرورًاo اولئک ماوھم جھنم ولا یجدون عنھا محیصًاo** (النساء: 119 تا 121)

(زمیندار 18 اپریل 1925ء)

قادیانیوں کو شریعت حقہ کا الٹی میٹم

غلاتِ قادیان کے عقائد کے ناشر نعمت اللہ قادیانی کی سنگساری کے ساتھ ہی ہم نے (زمیندار میں) چند مفصل مقالات سپرد قلم کیے تھے جن میں قادیانی مذہب کی توضیح کی گئی تھی اور اس کے دینی مفاسد اور سیاسی نقصانات کا راز طشت از بام کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ہم نے اس امر پر بھی روشنی ڈالی تھی کہ افغانستان کے اندر قادیانیوں کے وجود سے عوام و جمہور کے اندر کس طرح شورش پھیل رہی تھی اور فتنہ وفساد پیدا ہو رہا تھا۔ ہم نے بالوضاحت بیان کر دیا تھا کہ قادیانی، لوگوں کے عقائد کو خراب کر رہے ہیں، اغیار کے پروپیگنڈا کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور لوگوں کو اجانب سے محبت کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

ان مقالات میں ہم نے وہ تمام دلائل و براہین بیان کر دیئے تھے جن کی بنا پر افغانستان ان فتنہ پردازوں کے قتل کو جائز وواجب قرار دیتا ہے اور لکھ دیا تھا کہ کسی کو افغانستان کے اس حق میں مدافعت کرنے کا استحقاق نہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر قادیانی سخن شنو اور سخن فہم ہوں گے تو ان کے لیے یہی بیانات کافی ثابت ہوں گے۔ وہ آئندہ کے لیے اپنے بے جا واویلا اور بے سروپا و جاہلانہ شطحیات سے باز آ جائیں گے۔ اسی بات کو مدنظر رکھ کر ہم نے دو اور قادیانیوں کی سنگساری کے موقع پر کچھ نہ لکھا جنہوں نے پھر فتنہ انگیزی کی تھی اور اجنبیوں اور دشمنوں کے ساتھ ان کی خط وکتابت پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی۔ مگر ان لوگوں نے اس امر کے باوجود اپنے اعمال سے توبہ نہ کی۔ ان نئے واقعات پر ہم نے کچھ نہ لکھا لیکن روزنامہ شریفہ ''زمیندار'' نے اس موضوع پر مبسوط و مسلسل مقالات سپرد قلم کیے اور جریدۂ محترم 'الجمعیت' نے بھی دلائل

مسکت سے اس مسئلہ کو ثابت کیا لیکن اس کے باوجود مکار و عیار قادیانی اپنی حیلہ بازانہ دسیسہ کاریوں سے باز نہ آئے اور جہلا کے دماغوں کو اپنی ہذیان سرائی سے پریشان کرنے میں مصروف رہے۔ اسی لیے ہم پھر اسی موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے مجبور ہوئے ہیں، تا کہ فساد کے یہ جراثیم افغانی جرائد کے سکوت کو اپنی جاہلانہ سخن پروری کے اثر کا نتیجہ نہ سمجھنے لگیں۔ فی الحال ہم اپنے اس ارادہ کو آئندہ کی اشاعت پر ملتوی رکھتے ہیں اور ان بیہودہ لوگوں کے لیے صرف سطور ذیل پر اکتفا کرتے ہیں۔

قادیانی دشمنان اسلام کے آلہ کار ہیں

افغانستان کے اندر مختلف مذاہب رکھنے والی رعایا آباد ہے اور غیر ملکی لوگ بھی جو طرح طرح کے مذاہب رکھتے ہیں، افغانستان میں رہتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ دینی اور سیاسی فتنہ و فساد کا باعث نہیں ہوتے اور لوگوں کے عقائد سے تعرض نہیں کرتے اور دشمن کا آلہ کار بر آری نہیں بنتے، اس لیے ان سے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی جاتی۔ لیکن قادیانیوں کا مسئلہ صرف ایک مذہبی مسئلہ نہیں، بلکہ اس کی خالص سیاسی حیثیت بھی اغراض افغانستان کے لیے بہت مضر ہے۔ کیونکہ قادیانیوں کا مذہب آخر کار بعض اغیار و اجانب کی فرماں پذیری اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر موقوف ہے۔ ہر شخص اس امر کی تصدیق کرے گا کہ اس قسم کے خوفناک سیاسی جراثیم کا وجود افغانستان کے لیے زہر قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے افغانی اسلامی حکومت قادیانیوں کے عقائد کو افغانستان میں پھیلنے کا موقع نہیں دے سکتی۔ اگر قادیانیوں کی خواہش ہے کہ ان کے پیرو افغانستان کے قوانین کی گرفت سے محفوظ رہیں تو انہیں چاہیے کہ اپنے مبلغین کو افغانستان نہ بھیجیں اور ان کو افغانستان آنے اور تبلیغ کرنے سے روکیں۔ اگر وہ اپنے اس فعل سے دست بردار نہ ہوں گے تو ان کے ساتھ قانون شریعت کے مطابق جو دینی و سیاسی حقوق کا محافظ ہے، معاملہ کیا جائے گا اور ان کے پیرووں کا خون خود انہی کی گردنوں پر ہوگا۔ (امان افغان، افغانستان)

(زمیندار 30 اپریل 1925ء)

قادیانی توپ

ضلع جہلم میں ایک گاؤں ''دوالمیال'' ہے۔ یہاں مرزائی زیادہ رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ عظیم میں اس چھوٹے سے گاؤں نے **460** رنگروٹ دیئے تھے۔ سند ہے کہ حال ہی میں ان مرزائیوں کو سرکار نے ایک توپ عطا کی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب افغانستان کی خیر نظر

نہیں آتی کیونکہ قادیانی تو توپ و تفنگ کے بغیر ہی دنیائے اسلام پر کافی گولہ باری کر رہے ہیں۔ توپ مل گئی تو خدا جانے کیا قیامت برپا کریں، بشرطیکہ چلانی آتی ہو۔ ورنہ یوں چلانے کو تو لاہور میں بھی ایک بھنگیوں کی توپ ہے اور دوالمیال میں مرزائیوں کی توپ موجود ہے۔

(زمیندار 6 مئی 1925ء)

قادیانی اور افغانستان

قارئین کرام ''زمیندار'' کی اشاعت مورخہ 30 اپریل میں کابل کے معزز و محترم جریدہ ''امان افغان'' کے ایک مقالہ کا ترجمہ ملاحظہ فرما چکے ہوں گے۔ اس ذمہ دار جریدے کے الفاظ سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت افغانستان کے ارباب بست و کشاد قادیانیوں کو محارب مرتد سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا مذہب ''امان افغان'' کے نزدیک بعض اغیار و اجانب کی فرماں پذیری اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر موقوف ہے۔ اس لیے افغانستان میں قادیانیوں کا وجود صرف دینی فتنے ہی کا باعث نہیں بلکہ ''اجنبیوں اور دشمنوں کے ساتھ ان کی خط و کتابت'' جاری ہونے کی وجہ سے سیاسی طور پر بھی بے انتہا خطرناک ہے۔

ہم نے بارہا اسی نکتہ پر اظہار خیالات کیا اور متعدد مضامین اسی موضوع پر لکھے کہ قادیانی چونکہ حکومت برطانیہ کی وفاداری کو جزو ایمان سمجھتے ہیں، لہٰذا اسلامی حکومتوں کے لیے ان کا وجود خطرے کا موجب ہے۔ لیکن بعض ''جدید تعلیم یافتہ'' اور یورپ کے خیالات کی پیروی کرنے والے مسلمان صرف سنگساری کے واقعہ کو سر پر اُٹھائے پھرتے تھے اور حالات و حقائق کو سمجھنے کی کوشش نہ کرتے تھے۔ کاش وہ ''امان افغان'' کے بیان ہی سے افغانستان کے طرز عمل کی مصلحت سمجھ سکیں اور خواہ مخواہ بلا وجہ ایک اسلامی سلطنت اور اس کے غیور و شجاع فرماں روا کے دشمنوں کو مدد نہ دیں۔ ایک اسلامی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مسلم رعایا میں غلط عقائد نہ پھیلنے دے۔ مرتدین کو شرعی سزا دے اور ہر قسم کے فتنے کا سدباب کر دے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس سے یہ حق نہیں چھین سکتی جو خدا اور رسول ﷺ نے اسے عطا فرمایا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ قادیانی عقل سے کام لیں گے اور افغانستان میں اپنے مبلغین بھیجنے کی حرکت مذبوحی سے باز رہیں گے، ورنہ افغانستان کے سب سے بڑے اخبار نے یہ اعلان تو کر ہی دیا ہے کہ:

''اگر وہ اپنے اس فعل سے دست بردار نہ ہوں گے تو ان کے ساتھ قانون

شریعت کے مطابق جو دینی وسیاسی حقوق کا محافظ ہے، معاملہ کیا جائے گا،
اوران کے پیروؤں کا خون خود انہی کی گردنوں پر ہوگا‘‘۔

(زمیندار 7 مئی 1925ء)

لومڑی اور مرزا محمود

ایک لومڑی کا ذکر ہے کہ وہ کسی شکاری کے جال میں پھنس گئی۔اس نے جال میں سے نکلنے کے لیے بہت زور لگایا۔اس پر اسے مخلصی تو مل گئی لیکن نہایت خوبصورت گچھے دار دُم ٹوٹ کر جال ہی میں رہ گئی اور لومڑی کو اپنا لنڈورا پن بہت ہی ناگوار ہوا کیونکہ دوسری لومڑیاں اس پر ہنستی تھیں اور اپنی ’’سوسائٹی‘‘ میں اسے نکو بناتی تھیں۔اس پر لومڑی نے سوچا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچنی چاہیے جس سے دوسری تمام لومڑیاں بھی میری ہی طرح لنڈوری ہو جائیں اور میری ہنسی اڑانے والا کوئی نہ رہے۔اس پر اس نے بعض لومڑیوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ دم ایک نہایت لغو چیز ہے۔خواہ مخواہ کا بوجھ اور فائدہ کچھ بھی نہیں۔آج کل کا فیشن بھی یہی ہے کہ دم نابود کر دی جائے۔ چنانچہ میں نے دم کٹوا لی ہے اور تم کو بھی چاہیے کہ فیشن کی پابندی کرو۔لیکن لومڑیاں بہت دانا تھیں۔انہوں نے اس کی نیت سمجھ لی اور کہا کہ ’’معاف کرو، ہم پرانے فیشن ہی میں اچھی ہیں‘‘۔

یہی مثال موسیو مرزا محمود کی ہے کہ ان کے والد آنجہانی کے نزدیک حج بیت اللہ ایک بے سود چیز ہے اور اسی لیے کوئی قادیانی حج کرنے نہیں جاتا اور اب ’’الفضل‘‘ نے اپنی تازہ اشاعت میں مسلمانوں کو حج سے منع کیا ہے۔گویا کوشش کی ہے کہ دوسری لومڑیاں بھی اسی کی مانند ’’دُم کٹی‘‘ ہو جائیں اور کوئی یہ کہنے والا باقی نہ رہے کہ قادیانی حج نہیں کرتے۔لیکن امید ہے کہ مسلمان اس لنڈوری لومڑی کو وہی جواب دیں گے جو لومڑیوں نے دیا تھا۔

موسیو مرزا کی تین بیویاں تھیں۔ایک کا پچھلے دنوں انتقال ہو گیا۔گویا ایک اسامی خالی ہو گئی جس کو بھرنے کے لیے آپ بنگال سے ایک نئی دلہن لائے ہیں۔3 مئی کو آپ استقبالِ عروس کے سلسلے میں بٹالہ تشریف لائے ہوئے تھے۔نامہ نگار کا بیان ہے کہ جب ٹرین پہنچی تو آپ بے تابانہ اپنی دلہن کی طرف لپکے، اس سے مصافحہ کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے ’’ویٹنگ روم‘‘ کے تخلیہ میں چلے گئے۔بٹالہ کی انجمن ’’شباب المسلمین‘‘ نے آپ کو بارہا مناظرہ کے لیے دعوت دی اور آپ نہ آئے لیکن بنگالے کا جادو آپ کو کشاں کشاں لے آیا۔

نامہ نگار رقمطراز ہے کہ 3 مئی کو قادیان کے ''بہشتی مقبرہ'' کے متصل ایک جوہڑ میں ایک کنستر تیرتا ہوا دیکھا گیا۔ جب وہ پانی سے باہر نکالا گیا تو اس میں سے ایک نوزائیدہ بچہ نکلا جو بعد میں مرگیا۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے، ابھی کچھ پتہ نہیں چلا۔ گو ''نبی جی'' کے دربار میں اور ''خلیفۃ المسیح'' کے زیر سایہ ایسا ہونا بہت ہی شرمناک ہے۔ لیکن سنا ہے کہ بعض قادیانی اس کو بھی ''مسیح موعود'' کی کسی پیشین گوئی کا نتیجہ بتارہے ہیں۔ **اللھم زدفزد**

(زمیندار 13 مئی 1925ء)

گنا چوری بمقابلہ مرزا قادیانی

''گنا چوری نبی'' صاحب نے پانچ سو صفحے کی ایک کتاب ''چشمۂ نبوت'' حصہ اوّل کے نام سے شائع کی ہے جس سے آپ کی نبوت کے عجیب وغریب کرشمے ظاہر ہوتے ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ 22 مئی 1921ء مطابق 13 رمضان المبارک 1339ھ بروز جمعہ عصر کے وقت جب سورج غروب ہونے میں گھنٹہ یا پون گھنٹہ باقی ہوگا، اللہ تعالیٰ نے عبداللطیف خاں گنا چوری کو اپنا نبی نامزد فرما کر دنیا کی ہدایت کے لیے بھیج دیا۔ کوئی پانچ مہینے گزرے ہوں گے کہ اسی سال 25 اکتوبر کو آپ مہدی آخرالزمان بھی بنادیئے گئے۔ اس کے بعد الہام کا سلسلہ جاری ہوگیا اور اب تک تھمنے ہی میں نہیں آتا۔

مرزا غلام احمد آنجہانی کہا کرتے تھے کہ یہ جو دنیا پر زلزلے آرہے ہیں اور طاعون پھیل رہی ہے، یہ میرے ہی دعوے کی تصدیق ہورہی ہے۔ ''گنا چوری'' معدی بھی یہی فرمارہے ہیں کہ جاپان میں جو پچھلے سال عذاب نازل ہوا تھا، وہ میری اسی وجہ سے تھا۔ اگر یہ درست ہے، تو اللہ تعالیٰ دوابہ بست جالندھر کو محفوظ رکھے۔ ہمارا خیال ہے کہ پچھلے سال دریائے ستلج میں جو طغیانی آئی تھی، اس میں بھی ان معدی صاحب کی شرارت کو کچھ نہ کچھ دخل ضرور تھا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ پیدا تو آپ ہوئے گنا چور میں اور عذاب میں مبتلا ہوگیا جاپان۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ آخر بیچارے جاپانیوں نے کیا قصور کیا تھا کہ جناب کے نزول کا نزلہ انہی کے عضو ضعیف پر گرا۔ یورپ والے بدستور خدا کی نافرمانی میں مصروف ہیں لیکن ان پر نہ ''مسیح موعود'' کی پیری اثر کرتی ہے اور نہ ''گنا چوری نبی'' صاحب ہی ان کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔

ایک دل فریب بات یہ ہے کہ ''گنا چوری نبی'' صاحب ''قادیانی نبی'' کے سخت مخالف

ہیں اور قادیانیوں کو مباہلہ کی دعوت دے رہے ہیں۔ اگر موسیو مرزا محمود طرح نہ دے گئے تو یہ مباہلہ بہت دلچسپ ہوگا۔

(زمیندار 27 مئی 1925ء)

''قادیانی کتے''

پچھلے دنوں ہم نے ''ایسوسی ایٹڈ پریس'' کی اس خبر کا مضحکہ اڑایا تھا کہ وائسرائے نے اوٹکمنڈ میں انیس مچھلیاں پکڑیں۔ اس کے بعد لائڈ جارج کے کتے نے کسی کو کاٹ کھایا اور انگلستان کے اخباروں نے اس خبر کو بہت اہمیت کے ساتھ چھاپا۔ ہم نے اس پر بھی اظہار خیالات کیا۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ لائڈ جارج کے بعض ہوا خواہ ہندوستان میں موجود ہیں جو ہمارے حملوں کا جواب دینے پر تل جائیں گے۔ چنانچہ قادیان کا ''الفضل'' اس پر بہت چراغ پا ہوا ہے اور لکھتا ہے کہ جب غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے دائیں ہاتھ پر کتے نے کاٹ کھایا تھا تو ''زمیندار'' نے یہ خبر کیوں درج کی تھی۔

''الفضل'' کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے نزدیک لائڈ جارج کے کتے کا کسی دوسرے کو کاٹ کھانا اور غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے ہاتھ کا زخمی ہونا مساوی حیثیت نہیں رکھتا۔ مسٹر لائڈ جارج کے کتے نے بعض انسانوں پر عافیت تنگ کر دی تھی اور غازی پاشا کا دست راست ڈیڑھ کروڑ مسلمانوں کی آزادی کا محافظ ہے۔ ''الفضل'' کو یاد ہوگا کہ آج سے چھ سات سال پہلے اس کے ''آقا و مولا'' موسیو مرزا محمود کو بھی پاگل کتے نے کاٹا تھا اور قادیان کے اخباروں نے یہ خبر بڑی شان سے اپنے کالموں میں درج کی تھی۔

(زمیندار 10 جون 1925ء)

قادیانی فرزندان ناہموار

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ شہر لاہور میں ایک غیور مسلمان رہتا تھا جس کے والد کے عقائد سوئ اتفاق سے قادیانی واقع ہوئے تھے۔ لیکن یہ مسلمان تحریک میرزائیہ کا سخت مخالف تھا۔ ایک دفعہ اس نے تنگ آ کر یہاں تک کہہ دیا کہ ''اگر مرزا قادیانی آنجہانی میرے سامنے آئے تو میں اِن کا منہ نوچ لوں''۔ اس پر تمام قادیانی کبوتر خانوں میں پھڑ پھڑاہٹ کا ایک شور اٹھا اور یہ لوگ اپنے پیرو مرشد کی شان میں ''منہ نوچنے'' کا لفظ سن کر بہت غیظ و غضب کا اظہار کرنے لگے۔

اس غیظ وغضب کا طوفان یہاں تک بڑھا کہ ایک برگشتہ بخت اور اوندھی کھوپڑی کے مرزائی نے لاہور کے اخبار ''اعلان جنگ'' میں ایک کالم کا ایک زہریلا مضمون ''فرزندانِ ناہموار'' کے عنوان سے سپرد قلم کر کے اپنے پیر ومرشد مسیح کذاب کی تہذیب وشائستگی کا تکملہ مہیا کر دیا۔

پدر اگر نتواند پسر تمام کند

اس مرزائی بدزبان نے اس غیور مسلمان کو مخاطب کر کے لکھا کہ اگر مرزا غلام احمد مر گئے ہیں تو کیا ہوا، ان کے مرید تو موجود ہیں اور خصوصاً تمہارا باپ موجود ہے۔ اس کا گلا پکڑ کر زمین پر چت پچھاڑو، چھاتی پر چڑھ بیٹھو، جی بھر اس کا منہ نوچو اور ڈاڑھی اکھاڑو۔''

سبحان اللہ۔ کیا تہذیب ہے اور کیسا خوشگوار انداز بیان ہے جو زمانۂ حال کے سودیشی نبی نے اپنے امتیوں کو سکھایا ہے۔ اس پر اس غیور مسلمان نے اخبار ''اعلان جنگ'' کے عبوساً قمطریر ایڈیٹر اور ان کے مغلوب الغضب مضمون نگار سے پوچھا کہ کیوں صاحب، آپ کے ہاں یہی دستور ہے کہ اگر باپ سے عقائد میں اختلاف ہو تو اس کی یہی درگت بنائی جائے؟ مرزا غلام مرتضٰی، مرزا غلام احمد آنجہانی کے والد تھے اور غیر احمدی تھے، کیا مرزا صاحب نے بھی اپنے باپ کی چھاتی پر چڑھ کر اس کی ڈاڑھی نوچی تھی؟ مرزا سلطان احمد اور مرزا فضل احمد، مرزا غلام احمد آنجہانی کے فرزند ہیں لیکن اپنے باپ کو نبی نہیں مانتے، کیا انہوں نے بھی اپنے باپ سے یہی سلوک کیا تھا؟

کیا مولانا محمد علی لاہوری، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ، خواجہ کمال الدین، ایڈیٹر ''اعلان جنگ'' اور دیگر مرزائیوں کے والد ''غیر احمدی'' نہ تھے؟ کیا ان سب حضرات نے اپنے باپوں سے یہی سلوک کیا تھا جس کی سفارش آپ فرما رہے ہیں؟ اگر باپ دادا کے عقائد کا پابند نہ رہنا کسی کو ''فرزند ناہموار'' کا لقب دے سکتا ہے تو آپ کے پیر ومرشد اور یہ سب بزرگ بھی تو ''فرزندان ناہموار'' ہی کی فہرست میں آتے ہیں جس کی سفارش آپ فرما رہے ہیں؟ اگر باپ دادا کے عقائد کا پابند نہ رہنا کسی کو ''فرزند ناہموار'' کا لقب دے سکتا ہے تو آپ کے پیر ومرشد اور یہ سب قادیانی بھی تو ''فرزندان ناہموار'' ہی کی فہرست میں آتے ہیں۔

نامہ نگار ''اعلان جنگ'' اس غیور مسلمان کو ''بے ادب و گستاخ'' بتا رہا ہے۔ حالانکہ ہم نے مرزائیوں میں ایسے ایسے بے ادب، گستاخ اور شقی ازلی دیکھے ہیں جو باپ کا جنازہ تک نہیں پڑھتے۔ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی آذر کے مذہب کو جھوٹا نہ کہتے تھے بلکہ خود مرزا

صاحب آنجہانی بھی اپنے باپ دادا کو گمراہ ہی سمجھتے تھے اور آج کل کے تمام مرزائی بھی جن کے باپ ابھی تک حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے دین پر قائم ہیں، اپنے بزرگوں کو مخاطب کر کے زبانِ حال سے یہی شعر پڑھ رہے ہیں کہ ؎

بامن میا ویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

(زمیندار 16 جون 1925ء)

کنوئیں کا مینڈک

تحصیل مردان ضلع پشاور میں ایک صاحب مسمی عبدالمنان کسی معاملے میں پولیس کے زیر عتاب ہو گئے۔ ایک دفعہ کانسٹیبلوں کے ڈر سے جو بھاگے اور کہیں پناہ نہ ملی تو آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک کنوئیں میں کود پڑے۔ لوگ اِدھر اُدھر سے جمع ہوئے اور بڑی کوشش سے آپ کو نکالا۔ خدا جانے اس افتاد سے دماغ پر کچھ خاص اثر پڑا، یا تحت الثریٰ کے فرشتوں سے کچھ گفت وشنید ہو گئی کہ آپ باہر آتے ہی نبوت کا دعوے کرنے لگے۔ آپ نے آس پاس کے لوگوں سے فرمایا کہ میری اصلی روح کنوئیں میں گرتے ہی قفس عنصری سے رہا ہو کر عالم بالا کو تشریف لے گئی اور اس کی جگہ یسوع مسیح کی روح میرے بے جان جسم میں حلول کر گئی۔ اب میں تمام دنیا کی ہدایت کے لیے مامور ہوا ہوں۔ اگر کسی نے مجھے جھٹلایا تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔

آپ نے اسی اعلان پر اکتفا نہ کی بلکہ سنت انبیا کے مطابق حکام وقت کو بھی دعوت دی۔ چنانچہ اسسٹنٹ کمشنر صاحب مردان کے پاس اس ''چاہی نبی'' کی طرف سے ایک مکتوب پہنچا جس میں لکھا تھا کہ میں مسیح موعود ہوں، روح القدس اور فنا فی اللہ ہوں۔ اگر آپ کو کسی آسمانی مدد کی ضرورت ہو تو میری طرف رجوع کیجیے کیونکہ میں تمام عالم کی نجات کے لیے آیا ہوں۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب ''نبی شناس'' کے مادے سے بالکل کورے واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بیعت کرنے کی بجائے اس کنوئیں کے مینڈک کو پاگل خانے بھجوایا۔ وہاں پہنچے تو وارڈروں کے ہنٹروں نے چار دن میں آپ کی نبوت کے پرخچے اُڑا دیئے۔ دماغ درست ہو گیا۔ عقل کی باتیں کرنے لگے، چنانچہ وہاں سے تندرست قرار دے کر نکال دیئے گئے۔

باہر آتے ہی آپ کی نبوت پھر عود کر آئی۔ آپ کے بعض ہمسایوں نے آپ سے کہا کہ

آپ دجال سے جہاد تو کرتے نہیں، مسیح کیونکر بن گئے۔ چنانچہ آپ نے تلوار ہاتھ میں لی اور دن رات کھیتوں میں پھرتے اور تلوار چلا چلا کر فصلیں کاٹتے رہے اور ''ڈان کوئزٹ'' کی طرح بزعم خویش یہ سمجھتے رہے کہ دجال کی فوج کو قتل کر رہے ہیں۔ گاؤں کے لوگوں کی ستم ظریفی روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی۔ چنانچہ چند خوش باش لوگوں نے جو ہمیشہ آپ کی نبوت کا تمسخر کیا کرتے تھے، آپ سے کہا کہ حضرت، دجال کی فوج تو ساری کی ساری کٹ گئی لیکن ابھی تک دجال قتل نہیں ہوا، وہ قتل ہو جائے تو آپ کو مانیں۔

اس دیوانے کی نبوت کا پارہ کھولاؤ کے درجے تک پہنچ گیا اور اس نے اہل دنیا کی قیادت حاصل کرنے کی ہوس میں وہ حرکت کی جس کے ذکر سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس شخص نے ایک دن اپنے دو سال کے معصوم بچے کو قتل کر دیا اور دوسرے دن یہ اعلان کیا کہ: ''لو۔ خدائے قدوس کی آخری حجت بھی تمام ہوئی۔ بڑی مشکل سے میں نے دجال پر فتح پا کر اسے ہمیشہ کے لیے تہ خاک سلا دیا ہے۔ اے یہودی مسلمانو! کیا تم اب بھی اس ابراہیم صفت مسیح موعود کو نہ مانو گے؟'' سنا ہے کہ پولیس نے اس سرپھرے سفاک کو گرفتار کر لیا ہے اور اب اس پر قتل کا مقدمہ چلایا جائے گا۔

دوسری قوموں کے لوگ پاگل ہوتے ہیں تو ان کی دیوانگی صرف بڑیں ہانکنے، لوگوں کو اینٹ پتھر مارنے اور گالیاں دینے ہی تک محدود رہتی ہے لیکن مسلمان پاگل ہوتا ہے تو نبوت سے کم دعوے نہیں کرتا۔ اس کنوئیں کے مینڈک ابوالدجال ہی کو دیکھو جس نے خدا پر افترا ہی نہیں باندھا بلکہ اپنے جنون میں معصوم بچے کو بھی قتل کر ڈالا۔ سنا ہے کہ پچھلے سال جب طاعون سے ہزاروں انسان نہنگ اجل کا لقمہ بن گئے تو محکمہ نہر کے بعض پنجابی پٹواری اس ''چاہی نبی'' کے معتقد بھی ہو گئے تھے۔ جب تک دنیا میں اس قسم کے احمق باقی ہیں، نبوت کے مدعیوں کو برابر روٹی ملتی رہے گی۔ خدا ان لوگوں سے سمجھے جنہوں نے ختم نبوت کی مہر توڑ کر دنیائے اسلام میں اس فتنے کا دروازہ کھول دیا۔

(زمیندار 15 اگست 1925ء)

قادیانی عجائبات

آسمان قادیان کا صحیفہ ''الفضل'' بھی زمانۂ حاضر کے عجائبات سے ہے۔ کسی مسلمان کو

چھینک بھی آئے تو چلاّ اٹھتا ہے کہ مسیح موعود کی صداقت کا نشان ظاہر ہوا لیکن اپنے آپ پر دنیا جہان کے جوتے بھی برس جائیں تو یہی کہتا رہتا ہے کہ نیکوں کو اس دنیا میں تکلیفیں پہنچا ہی کرتی ہیں۔

31 اگست کو باغ بیرون دہلی دروازہ میں جو جلسہ منعقد ہوا، اس میں چند شر پسندوں نے مولانا ظفر علی خاں اور ان کے فرزند کو گالیاں دے کر اپنی سفاہت و دنایت کا ثبوت دیا اور ہمارے اشد شدید مخالفین بھی ان کی اس زیادتی پر نہایت افسوس کا اظہار کر رہے ہیں لیکن ''الفضل'' اس واقعہ پر بغلیں بجا بجا کر کہہ رہا ہے کہ دیکھا؟ یہ سب ''مسیح موعود کی مخالفت'' اور ''احمدیوں'' کو مرتد کہنے کی سزا ہے۔

مرزا قادیانی آنجہانی نے ایک دفعہ بحالت غنودگی و ربودگی ایک فقرہ چست فرما کر اسے الہام الٰہی سے منسوب کر دیا تھا کہ **انی مھین من ارادا ھا نتک** یعنی جس نے تیری اہانت کا ارادہ کیا، میں اس کی اہانت کرنے والا ہوں۔ ''الفضل'' کے ایک نامہ نگار صاحب فرماتے ہیں کہ یہ الہام مولانا ظفر علی خاں پر پورا ہوا کیونکہ انہوں نے قادیانی مسیح اور اس کی بھیڑوں کی اہانت کی تھی۔ سبحان اللہ کیا منطق ہے۔ کیوں صاحب، جب بعض مقامات پر مرزائیوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں جوتے پڑے ہیں، اس وقت بھی یہ ''حدیث مرزائی'' صادق آتی ہے یا نہیں۔ ہمارے نزدیک کسی مسلمان امیر کے حکم سے کسی کا مارا جانا کفر و الحاد کی نشانی ہے۔ کابل میں جن مرتدوں کو حکم شریعت نے اس عذاب سے مارا، کیا انہوں نے بھی مرزائے آنجہانی کی اہانت کا ارادہ کیا تھا؟ شاید قتل کا ارادہ کیا ہوگا، جبھی تو مار ڈالے گئے ورنہ غالباً ''اہانت'' ہی کے بعدر رہا ہو جاتے۔

کیا آپ کو یاد نہیں جب امرتسر میں آپ کے ''نبی'' نے تقریر کرتے ہوئے ماہِ رمضان کے احترام کو بالائے طاق رکھ کر چائے کی پیالی مجمع عام میں نوش فرمائی تھی، تو کیا ہوا تھا؟ کنکر پتھر، لکڑی جوتا غرض جو کچھ کسی مسلمان کے ہاتھ آیا، اس نے اٹھا کے آپ کے نبی صاحب کے منہ پر مارا اور وہ چیختے ہوئے بھاگ نکلے۔ اس وقت مرزا آنجہانی نے کس کی اہانت کا ارادہ کیا تھا کہ ان کو خدا تعالیٰ نے مجمع عام میں اتنا ذلیل و خوار کیا؟

اب آپ فوراً کہہ اٹھیں گے کہ مرزا صاحب پر تو سنتِ مصطفویٰ پوری ہوئی تھی کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو بھی بعض بدبختوں نے پتھر مارے تھے۔ کیا سنت مصطفویٰ ﷺ اسی پر

پوری ہوسکتی ہے جس نے عمر بھر خدا پر افترا باندھا۔ختم نبوت کی مہر کوتوڑ کر آقائے دو جہاں ﷺ کی توہین کی اور حرمین شریفین کو چھوڑ کر ضلع گورداسپور کے ایک غلیظ و کثیف گاؤں کو مسلمانوں کا مرکز قرار دینے کی کوشش کی؟ کیا سنت مصطفویٰ ﷺ اس شخص پر پوری نہیں ہوسکتی جو عمر بھر حضور خواجہ کون ومکان ﷺ کے نام کی عزت وناموس کے لیے مر مٹنے پر تیار رہا اور جس نے اپنی جان، اپنا مال اور اپنا سب کچھ خدا کے راستے میں قربان کر دینے کی توفیق پائی؟

یہ کیا منطق ہے کہ جب ظفر علی خاں پر مغلظات کی بوچھاڑ ہو، تو آپ اسے ''مسیح موعود'' کی مخالفت کا نتیجہ قرار دیں اور جب آپ کی سرین پر کنٹاپ رسید ہوں تو ہم اسے ایک متنبّی کی تائید وحمایت کا نتیجہ قرار نہ دے سکیں۔ خدا کے لیے احتیاط سے کام لیجیے اور اپنے بچھائے ہوئے جال میں آپ ہی نہ پھنس جایئے۔

(زمیندار 16 اگست 1925ء)

کرناٹکی نبی

لیجیے، کرناٹک کے علاقے میں ایک اور ہادی ٹپک پڑے، آپ نوجوان ہیں۔ ابراہیم خاں اسم گرامی ہے۔ کتور ضلع بلگام کے رہنے والے ہیں۔ تیس سال کی عمر، ایف اے فیل، اردو فارسی معمولی جانتے ہیں۔ عربی سے بالکل کورے، رنگ گندمی، میانہ قامت، پیشہ زراعت ہے لیکن بالفعل انگریزی کے مدرس ہیں۔ کھیلوں میں فٹ بال سے بہت رغبت ہے۔ اسی روپے تنخواہ پاتے ہیں۔ حد درجہ کفایت شعار ہیں۔ شادی نہیں کی، چال چلن برا نہیں، لیکن بوسہ بازی کو معیوب نہیں سمجھتے۔ ان تمام حالات کے باوجود ایک نئے اور مستقل مذہب کے بانی ہیں اور مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ فرماتے ہیں۔

آپ کے مذہب کا نام ہے ''اللہ ازم'' اور مشن کو ''اللہ اینڈ برہما مشن'' کہتے ہیں۔ الہام کے مدعی ہیں۔ انگریزی میں ایک ضخیم کتاب لکھ ماری ہے اور آپ کا خیال ہے کہ اس کے شائع ہوتے ہی سب مذاہب مٹ جائیں گے اور سب لوگ ''اللہ ازم'' میں شامل ہو جائیں گے۔ آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ مادہ ہی خدا ہے اور وہی مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کی بعثت کا مقصد کیا ہے؟ فرمانے لگے کہ موجودہ مذاہب خالق ومخلوق کا حقیقی رشتہ بتانے سے قاصر ہیں، اس لیے خدا نے مجھے بھیجا ہے۔

کرناٹکی نبی صاحب سے سوال کیا گیا کہ آپ کی شریعت میں شادی بیاہ کا کیا قانون ہے؟ آپ نے نہایت سنجیدگی ومتانت سے فرمایا کہ عورت اور مرد کے تعلقات اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے اور ازدیادِ نسل کے لیے ہیں۔ مگر افسوس کہ لوگ اس رمز سے نا آشنا ہیں۔ میری شریعت میں ایک عورت پر بہت سے اشخاص قناعت کر سکتے ہیں اور حسب خواہش طرفین سب عورت مرد ایک دوسرے سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ غرض ان تعلقات پر کوئی پابندی نہ ہونی چاہیے۔ سوال کیا گیا کہ اس آزادانہ حرامکاری سے جو پلے پیدا ہوں گے، ان کی کفالت و تربیت کون کرے گا اور وراثت کا کیا نظام ہوگا؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ کام اللہ دازم کا مشن کرے گا۔ رہی وراثت، جب تمام روئے زمین پر اسی مشن کی حکومت ہو جائے گی تو اس کی وراثت صرف مشن کو پہنچے گی، کوئی شخص کسی جائیداد کا وارث نہ ہوگا۔

یہ جدید نبی صاحب کسی خاص طریقہ عبادت کے قائل نہیں، صرف خدا کا خیال دل میں رکھنا کافی سمجھتے ہیں۔ یوں کبھی کبھی اتوار کو گرجا میں تشریف لے جاتے ہیں۔ ایک دو دفعہ کسی مندر میں بھی جا گھسے تھے مگر چونکہ ہندو اس مداخلت بیجا سے ناراض ہو گئے، اس لیے وہاں جانا چھوڑ دیا۔ عیدین پر مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شریک تھے۔ غرض نبی کیا ہیں ''ہر دیگی چمچہ'' ہیں۔ سنا ہے کہ اب تک سینتالیس آدمی آپ پر ایمان لا چکے ہیں لیکن اپنی ملتوں کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ آ ملنے کی جرأت نہیں کرتے۔

آپ سے سوال کیا گیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، وہ سچے تھے یا جھوٹے؟ آپ نے فرمایا کہ رات ذرا اللہ میاں سے پوچھ لوں، کل صبح جواب دوں گا۔ دوسرے دن کہنے لگے، مجھے معلوم ہوا کہ ایک مندر میں بت نصب ہے اور اس پر پھولوں کے ہار پڑے ہوئے ہیں۔ آس پاس لوگوں کا بہت بڑا اجتماع ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نبی نہیں تو ولی ضرور تھے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر مرزا صاحب نبی نہ ہونے کے باوجود نبوت کا دعویٰ کرتے تھے تو گویا جھوٹ بولتے تھے۔ بھلا کبھی جھوٹا بھی ولی ہو سکتا ہے؟

پرانے زمانے میں تو اللہ تعالیٰ امیوں میں سے نبی مبعوث فرماتے تھے اور انہیں علم و بصیرت کی دولت سے مالا مال کر دیتے تھے۔ لیکن آج کل شاید نبوت کی شرائط میں تعلیمی قابلیت

بھی داخل کر دی گئی ہے، گو وہ نامکمل ہی ہو۔ایک شخص مختارِعدالت کے امتحان میں فیل ہوتا ہے تو مسیح موعود بن جاتا ہے، دوسرا ایف اے میں فیل ہوتا ہے تو مامور من اللہ قرار پاتا ہے۔ بڑے بڑے ایم اے اور پی ایچ ڈی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور انہیں الہام تک نہیں ہوتا۔معلوم ہوتا ہے کہ آج کل امتحانوں میں فیل ہونا بھی جزوِ پیغمبر قرار پا گیا ہے۔ پرانے زمانے میں نبی بکریاں چرایا کرتے تھے لیکن آج کل فٹ بال کھیلتے ہیں۔ پہلے تو نبوت چالیس سال کی عمر میں ملا کرتی تھی، آج کل دس سال پہلے ہی عطا کر دی جاتی ہے۔مسلمانو! دعا مانگو کہ

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے
خصوصاً آج کل کے انبیا سے

(زمیندار 29 اگست 1925ء)

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تجدید و تشکیل

لاہور 3 جولائی آج رات کے نو بجے باغ بیرون دہلی دروازہ میں مسلمانانِ لاہور کا ایک عظیم الشان جلسہ زیرِ صدارت میاں عبدالعزیز صاحب صدر بلدیہ لاہور منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد ابتدا میں پانچ ہزار کے قریب اور اختتام کے وقت آٹھ ہزار سے متجاوز تھی۔ مولانا ظفر علی خاں اور علامہ سر محمد اقبال کی تشریف آوری پر حاضرینِ جلسہ نے اللہ اکبر کے پُر جوش نعرے بلند کیے۔ مولوی محمد یعقوب نے قرآن حکیم کے ایک رکوع کی تلاوت کی اور مولوی احمد یار خاں نے علامہ اقبال کی ایک نظم گا کر سنائی۔ صاحبِ صدر کی درخواست پر علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی کے متعلق تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''علامہ اقبال نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہونے کے اسباب و علل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس سلسلہ میں ایک بیان اخبارات میں شائع کرا چکا ہوں اور بعض اخبارات نے میرے اس بیان پر تنقید کی ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود کی طرف سے بھی میرے اس بیان کا جواب دیا گیا ہے۔ جواب الجواب کے لیے میں اخبار کے صفحات کے بجائے اس جلسہ کو ترجیح دیتا ہوں جو میرے مشورہ کے مطابق مسلمانانِ لاہور نے منعقد کیا ہے۔

علامہ اقبال نے کہا کہ مسلمانوں میں ابھی سیاسی زندگی کا آغاز ہے اس لیے ضروری ہے، جمہور اسلام ہر معاملہ پر اچھی طرح غور کریں اور ان کے سامنے تمام مسائل پر پوری روشنی

ڈالی جائے۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ذاتی اختلافات مٹا کر ایک ہو جائیں اور سیاسیاتِ حاضرہ کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے لیے مفید راہ تلاش کریں۔

آپ نے کہا کہ پچیس تیس سال ہوئے جب لاہور میں آل انڈیا کشمیر کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی تھی اور اس کانفرنس میں صرف اہل خطہ حضرات اور کشمیری قومیت رکھنے والے شامل ہو سکتے تھے۔ میں نے اس وقت بھی اس امر سے اختلاف کا اظہار کیا تھا اور میری رائے تھی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی بنائی جائے جس میں ہندوستان کے وہ تمام افراد شامل ہو سکیں جو اہلِ کشمیر سے ہمدردی رکھتے ہوں۔ چنانچہ میں اس کانفرنس میں شامل نہیں ہوا۔ اس کانفرنس نے کشمیر کے مسلمان لڑکوں کو تعلیم سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ریاست میں ملازمتیں نہ ملیں۔ چنانچہ وہاں اضطراب پیدا ہوا اور زبردست تحریک شروع ہو گئی۔ اس تحریک کے جاری کرنے کا الزام میرے اور سر محمد شفیع مرحوم کے سر تھوپا گیا۔ ان دنوں میں شملہ میں تھا۔ وہاں پر ایک آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ چونکہ عام طور پر خیال یہ تھا کہ اس کمیٹی کی ضرورت چند روز کے لیے عارضی طور پر ہو گی، اس لیے اس کا کوئی آئین یا ضابطہ نہ بنایا گیا اور اس کے صدر مرزا بشیر الدین محمود مقرر ہوئے۔ کشمیر کے اندرونی حالات کے تغیر کے طول پکڑ جانے کے باعث اس کمیٹی کے کام کو جاری رکھنا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تین چار سال تک یہ حالات درست نہ ہو سکیں گے اور کشمیر کمیٹی کو زندہ رکھنے کی ضرورت باقی رہے گی۔

شملہ میں قائم ہونے والی عارضی کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین محمود تھے جن سے کمیٹی کے بعض ارکان کو اختلاف پیدا ہوا اور تجویز کی گئی کہ نئے انتخاب عمل میں لائے جائیں۔ مرزا صاحب نے استعفیٰ دے دیا اور کمیٹی نے عارضی طور پر مجھے صدر اور ملک برکت علی کو سیکرٹری مقرر کر دیا تھا کہ کمیٹی کے ضوابط مرتب کر کے عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔ اس کے بعد محمڈن ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں کمیٹی کے ضوابط کا آئین پیش کیا گیا۔

اس موقع پر علامہ سر اقبال نے اس جلسہ کی داستان سنائی اور حاضرین کو بتایا کہ اس جلسہ میں قادیانی ممبروں نے اس قسم کی ترمیمیں پیش کرنی شروع کر دیں جن کا مقصد میں یہ سمجھا کہ یہ لوگ کمیٹی کے اندر قادیانی حلقہ کی ایک اور کمیٹی بنانا چاہتے ہیں، جس سے کام خوش اسلوبی سے نہیں ہو سکے گا۔ چنانچہ میں نے جلسہ کا رنگ دیکھ کر اپنی رائے ظاہر کر دی اور زبانی طور پر استعفیٰ

پیش کر دیا۔ دو دن کے بعد میں نے اخبارات کو بیان دیا اور عامۃ المسلمین سے اپیل کی کہ وہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تشکیل کے لیے عام جلسہ منعقد کریں۔

علامہ اقبال نے فرمایا کہ مجھے سیاسی انجمنوں میں قادیانیوں کی شمولیت پر مذہبی حیثیت سے کوئی اعتراض نہیں، اگرچہ میں ان کے عقائد کو غلط سمجھتا ہوں لیکن کشمیر کمیٹی کے واقعات نے یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ قادیانی کسی غیر قادیانی انجمن میں پوری وفاداری کے ساتھ کام نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ہر جگہ اس ذہن کے ساتھ جاتے ہیں کہ ان پر اپنے امام کی اطاعت، جسے وہ نبوت کے سلسلہ سے تعبیر کرتے ہیں، ہر شے پر مقدم ہے۔ مرزا صاحب کی طرف سے میرے اس اعتراض پر جو جواب شائع ہوا ہے، اس میں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا گیا، صرف یہ کہا گیا ہے کہ بعض دوسری اسلامی انجمنوں میں بعض قادیانی کام کر رہے ہیں لیکن میرا جواب یہ ہے کہ ان انجمنوں میں ابھی تک ایسا واقعہ پیش نہیں آیا، جس سے قادیانیوں کی وفاداری کا امتحان ہو سکتا۔ علامہ سر محمد اقبال نے مرزا بشیر الدین محمود کے اس بیان کی تکذیب کی کہ مسلم کانفرنس میں ان کے برابر کسی نے چندہ نہیں دیا، جس کی تعداد تین ہزار روپیہ تھی۔ علامہ موصوف نے فرمایا کہ (میں) آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت میں اعلان کر سکتا ہوں کہ بعض مخیرّ مسلمانوں نے بیک وقت آٹھ آٹھ ہزار روپیہ کی رقمیں مسلم کانفرنس کو دی ہیں۔ قادیانیوں کا دعویٰ غلط ہے۔

علامہ اقبال نے کہا کہ اب یہ معاملہ محمڈن ہال سے نکل کر آپ کے سامنے آ گیا ہے اور سوال یہ ہے کہ آیا کشمیر کمیٹی کی ہیئتِ ترکیبی وہی رہے جو پہلے تھی یا اسے بدل دیا جائے (آوازیں: کشمیر کمیٹی کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اگر ہے تو وہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں)

علامہ اقبال نے اپنی تقریر کے آخری حصہ میں مولانا غلام بھیک نیرنگ کی تجویز سے حاضرین کو آگاہ کیا کہ کشمیر کمیٹی کی جگہ ایک آل انڈیا مسلم سٹیٹ ڈیفنس کمیٹی بنائی جائے جو تمام ریاستوں میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا کام اپنے ذمہ لے۔

ازاں بعد صاحبِ صدر نے حاضرین سے کہا کہ علامہ سر اقبال نے تمام حالات آپ کے سامنے پیش کر دیے ہیں۔ ان کا یہ مقصد نہیں کہ کسی کو اس کے مذہبی عقائد کی بنا پر کمیٹی سے نکالا جائے بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیاد صحیح اصول پر قائم کی جائے تا کہ کمیٹی کشمیر کے مسلمانوں کے لیے مفید ثابت ہو (ایک آواز۔ مگر کمیٹی میں مرزائی نہ رکھے جائیں کیونکہ انھوں

نے اسے تبلیغ کا میدان بنالیا ہے)

ملک برکت علی نے اس مختصر مگر پُر زور تقریر کے بعد حسب ذیل قرارداد پیش کی۔

''اہلِ لاہور کا یہ عظیم الشان جلسہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی اس تجویز کو صمیم قلب سے تسلیم کرتا ہے کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کو ایسے طریق پر تشکیل دیا جائے جس میں مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں کی آراء کی پورے طور پر نمائندگی ہوتا کہ نہایت موثر طریق سے مسلمانان کشمیر کے جائز حقوق کے حصول کے لیے ایجی ٹیشن اور پروپیگنڈا ہو سکے تا کہ وہ اپنے ملک کی خدمت میں ذمہ دار طور پر شریک ہوں۔ یہ عظیم الشان اجتماع ڈاکٹر سر محمد اقبال پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے انھیں اس بات کا پورا حق دیتا ہے کہ وہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیادی انجمن کے ارکان نامزد کریں اور یہ مجلس کمیٹی کا آئین تیار کرے اور جیسا مناسب ہو، کمیٹی کے نام تبدیل کرے، عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لائے اور دیگر امور کا تصفیہ کرے جو کمیٹی کے کاروبار کے لیے ضروری ہوں اور یہ مسلمانانِ ہند کی اس بہترین آرگنائزیشن کے شایان شان ہو۔''

حاجی شمس الدین نے اس قرارداد کی تائید کی اور قرارداد منظور ہو گئی۔ صرف دو قادیانیوں نے اختلاف کا اظہار کیا۔

ازاں بعد صاحب صدر نے علامہ اقبال سے درخواست کی کہ وہ نئی آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے ارکان کے نام نامزد کریں۔ حضرت علامہ نے اٹھ کر کہا کہ بعض حضرات نے مجھے نئی کمیٹی کے لیے اسماء کی ایک فہرست دی ہے۔ میں وہ فہرست اس جلسہ کے سامنے پیش کرتا ہوں، جلسہ بااختیار ہے کہ جسے چاہے ممبر رہنے دے اور جسے چاہے نکال دے۔ ملک برکت علی نے نام پڑھ کر سنائے اور حاضرین منظور کے نعرے بلند کرتے رہے۔ کوئی ڈیڑھ سو کے قریب نام پڑھ کر سنائے گئے۔ حاضرین نے قادیانیوں اور لاہوری مرزائیوں کے علاوہ مولانا سیّد حبیب آف سیاست اور مولانا غلام رسول مُہر، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا اسمٰعیل غزنوی اور وغیرہ کے نام مسترد کر دیے اور ان کی جگہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی مظہر علی اظہر، مولانا داؤد غزنوی، غازی عبدالرحمٰن اور مولانا حبیب الرحمٰن کے نام شامل کیے گئے۔

ازاں بعد حضرت مولانا ظفر علی خاں نے دوسری قرارداد پیش کی جو شیخ محمد عبداللہ اور دیگر اسیرانِ سیاسی کی رہائی اور مقدمات کی واپسی کے مطالبہ پر مشتمل تھی۔ حضرت مولانا نے اپنے مخصوص

اور دلفریب انداز میں فرمایا کہ ''آج میری طبیعت خوشی سے باغ باغ ہے۔ آج میں اپنی سالہا سال کی جدوجہد کے آثار اس جلسہ کی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ اس وقت کونے کی اینٹ کون ہے۔ مرزا بشیر محمود کا وہ مقولہ سنا ہوگا کہ ہم کونے کی اینٹ ہیں، جس پر یہ اینٹ گرے گی، وہ سر پاش پاش ہو جائے گا اور جو کھوپڑی اس اینٹ سے ٹکرائے گی، وہ ٹوٹ جائے گی۔ آج یہ مقولہ اس اجتماع کے حق میں تبدیل ہو گیا اور آپ حضرات نے ثابت کر دیا کہ کونے کی اینٹ کون ہے۔

حضرت مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا کہ میرے کشمیر سے دیرینہ تعلقات ہیں۔ میرے والد محترم اپنی عمر کا ایک حصہ کشمیر میں بسر کر چکے ہیں اور میں بھی اُن کے ساتھ کشمیر کے چپے چپے پر پھر چکا ہوں۔ آج میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں کیونکہ آپ نے مجھے اس کمیٹی کا رکن بنایا ہے اور اب یہ کمیٹی آپ کی تشکیل کردہ جماعت بن گئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم ان واقعات کو فراموش نہیں کر سکتے کہ کشمیر میں ایک پتلا دبلا ڈوگرہ ایک موٹے تازے مسلمان کو بید سے مارتا تھا اور مسلمان اس کے سامنے بچے کی طرح بلبلا کر روتا تھا۔ میں نے یہ نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن اب مظالم سے تنگ آ کر وہاں کے مسلمانوں نے ایجی ٹیشن کی اور ہمتِ مردانہ کے ساتھ ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنے کا عزم بالجزم کر لیا ہے وہ اپنے حقوق اور جائز مطالبات کے لیے سربکف میدان میں نکل آئے ہیں۔ آپ نے مسلمانانِ کشمیر کے اندرونی اختلافات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان اختلافات کی وجہ یہی قادیانی تبلیغ ہے۔ بعض مسلمانوں نے غلطی کی کہ اس کام میں قادیانیوں کو ساتھ ملایا۔ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ آج ہم علامہ اقبال کو پھر اپنے درمیان دیکھ رہے ہیں۔ اب ہمیں چاہیے کہ حکومتِ کشمیر سے اپیل کریں کہ وہ کھونٹا جس کے بل بوتے پر یہ فسادات رونما ہوئے تھے، اکھاڑ دیا گیا ہے۔ یعنی قادیانیوں کی مفسد جماعت کو کمیٹی سے باہر نکال دیا گیا ہے اور اب یہ خالص مسلمانوں کی جماعت بن گئی ہے لہٰذا حکومتِ کشمیر کو چاہیے کہ اس کے مشوروں پر عمل پیرا ہو کر اپنے ہاں امن قائم کرے۔

کشمیر کمیٹی کو قادیانیوں کے ہاتھ میں دینے کے نتائج آپ نے دیکھ لیے۔ اہلِ کشمیر اور ان کے لیڈر مجبور تھے کہ قادیانیوں کو اپنے ہاں رسوخ بڑھانے دیں۔ شیخ محمد عبداللہ مجبور تھا کہ قادیان سے تعلق رکھے۔ اب وہ لوگ مسلمانوں سے رشتے استوار کریں گے اور شیخ عبداللہ کو قادیانی تصفیہ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

مولانا ظفر علی خاں نے حسب ذیل قرارداد پیش کی جس کی تائید مولوی محمد الدین فوق نے کی اور قرارداد منظور ہوگئی۔

''مسلمانان لاہور کا یہ عظیم الشان جلسہ کشمیر کے افسوس ناک حالات حاضرہ کو بہ نگاہِ اضطراب دیکھتا ہے جس کی بنا پر بلا امتیاز کشمیر کے لیڈروں اور ان کے رفقا کو اس بنا پر گرفتار کرلیا گیا ہے کہ اس طریقِ عمل سے مختلف اسلامی طبقوں میں صلح وآشتی پیدا ہوگی۔ اس جلسہ کی پختہ رائے یہ ہے کہ موجود قابلِ افسوس حالات کو روبراہ لانے کے لیے شیخ محمد عبداللہ اور ان کے رفقا کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے اور ریاست بھر میں جس قدر مقدمات گزشتہ فسادات کشمیر کے زیر سماعت ہیں، ان کو واپس لے لیا جائے۔''

(تیسری قرارداد کرسی صدارت کی طرف سے پیش کی گئی اور منظور ہوئی۔ اس قرارداد میں کہا گیا کہ مسلمانانِ ہند کشمیری مسلمانوں کی ہر ممکن مدد کریں اور اپنے اندرونی اختلافات مٹا کر متحد ہو جائیں۔ (ملخص از جعفر)

آخر میں مولانا ظفر علی خاں نے نئی کشمیر کمیٹی کی مالی امداد کے لیے اپیل کی اور بہ نفس نفیس مبلغ سو روپیہ دینے کا اعلان فرمایا اور مولانا محمد بخش مسلم نے عید میلاد النبی ﷺ کے جلوس کا اعلان کیا۔ جلسہ رات کے بارہ بجے برخاست ہوا اور دعا مانگی گئی۔

(زمیندار 10 جولائی 1931ء ص 14)

ذرية البغايا

آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کی ساری عمر رب اکبر پر بہتان باندھنے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ ختم المرسلینی کا استخفاف کرنے، انبیائے علیہم السلام کا منہ چڑانے، ائمہ کرام پر پھبتیاں کہنے، علمائے امت پر بازاری آوازے کسنے اور مسلمانوں کو فحش گالیاں دینے میں بسر ہوئی، اس سبّاب اعظم نے اپنی سوقیانہ فحاشی کا آخری مظاہرہ عزازیلی غرور کے لہجہ میں مسلمانوں کو ابوالفضل کے شعر سے یوں مخاطب کرنے سے کیا۔

ولدالزنا ست حاسد منم آں کہ طالع من
ولد الزنا کُش آمد چو ستارۂ یمانی

ہر شخص میں نسبی حمیت ہوتی ہے، ہر قوم کو اپنی صحت نسب کا پاس ہوتا ہے اور مسلمان تو اس بارہ میں سراپا غیرت واقع ہوا ہے۔ قادیان کے متنبّی نے جب اسے ولدالزنا اور حرام زادہ کہہ کر پکارا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اگر قادیان کے گرداگرد نصرانی عسکریت کا وہ حصار کھینچا ہوا نہ ہوتا جس کی پناہ نے مرزا آنجہانی کو اس درجہ زبان دراز بنا دیا تھا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ فرزندان توحید کے نسب پر اس فحش حملہ کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔

اُدھر تو مرزا آنجہانی مرتے مرتے ہر اُس مسلمان کو کافر، جہنمی اور حرام زادے کا لقب دیتے گئے جو ان کا منکر ہوا۔ اِدھر ان کی امت دن رات یہ پروپیگنڈا کر رہی ہے کہ نجات اخروی کا راز صرف ''حضرت مسیح موعودؑ'' کے اتباع میں مضمر ہے جو ''اخلاق عالیہ اسلامیہ'' کے مظہر اتم ہیں۔ ''زمیندار'' نے جب اس طاغوتی ڈھول کا پول کھولا تو قادیانی حلقوں میں پٹس پڑ گئی۔ موسیو بشیر اپنے قبلہ آنجہانی کی خرافات کا منطقی نتیجہ ہیں، ان سے تو یہی توقع ہو سکتی تھی کہ ''زمیندار'' کو پیٹ بھر کر گالیاں دیں کہ یہ سنت ان کے باوا، ان کے گلے میں ڈالتے گئے ہیں اور مولانا ظفر علی خاں کو پانی پی پی کر کوسیں کیونکہ مولانا نے بھی ان کا وہ ناطقہ بند کیا ہے کہ یاد ہی تو کرتے ہوں گے، مگر قادیانیت کی اندلسی (لاہوری) شاخ کے بزرگوں سے کسی سنجیدہ تر منطق کی توقع تھی۔ ''پیغام صلح'' کی اشاعت مورخہ 11 نومبر نے اس امید کا بھی خاتمہ کر دیا۔

قارئین کرام کو وہ تاریخی الٹی میٹم یاد ہوگا جو لاہوری جماعت کی طرف سے ''زمیندار'' کو یہ کہہ کر دیا گیا تھا کہ ''حضرت مسیح موعودؑ'' نے اپنی کسی تحریر یا تقریر میں مسلمانوں کی نسبت ''حرام زادہ'' کا لفظ کبھی استعمال نہیں کیا۔ یہ سب مولانا ظفر علی خاں کی افترا پردازی ہے جو قادیانیت کے خلاف مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کرتے ہیں اور ''حضرت مرزا'' جیسے ''صاحب خلق عظیم'' کی نسبت ''عالم اشرار میں بیٹھ کر'' ایسی ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جو ''گندہ دہانی اور فحش نویسی کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہیں''۔ اس الٹی میٹم میں ''زمیندار'' سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ یا تو ثابت کرے کہ ''حضرت مسیح موعودؑ'' نے مسلمانوں کو ''حرام زادہ'' کہا اور اگر ثبوت سے عاجز رہے تو اپنے الفاظ واپس لے کر اپنی شرافت کا ثبوت دے بشرطیکہ شرافت کا ایک ذرہ بھی اس میں موجود ہو۔

اس متحدیانہ تحریر کا مسکت جواب میں نے ''زمیندار'' کی اشاعت مورخہ 14 نومبر 1931ء کے حوالہ کر دیا۔ دوسرے دن مولانا ثناء اللہ صاحب کا مسکت تر جواب موصول ہوا جن

پر لاہوری جماعت کے ''خلق عظیم'' نے ''بدکار'' کا آوازہ کس کر اپنے بدزبان پیشوا کی سنت کو تازہ کر دیا ہے۔ یہ جواب بھی ''زمیندار'' کی اشاعت مورخہ 15 نومبر 1931ء میں چھپ گیا۔ ان جوابات نے دنیا پر واضح کر دیا کہ اندلسی قادیانیوں کا چیلنج مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ بودا تھا۔ ان جوابات سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکار ہوگئی کہ مرزا قادیانی آنجہانی پرلے درجہ کے فحش گو تھے اور انہوں نے فرزندان اسلام کے حق میں ذیل کی جامع و مانع گالی تصنیف کی تھی۔

"تلک کتب ینظر الیها کل مسلم بعین المحبة والمودة وینفع من معارفها ویقبلنی و یصدق دعوتی. الا ذریة البغایا."

ترجمہ: ''میری ان کتابوں کو ہر مسلمان محبت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کے معارف سے فائدہ اٹھاتا ہے اور میری دعوت کی تصدیق کرتا ہے اور اسے قبول کرتا ہے مگر کنجریوں (بدکار عورتوں) کی اولاد نے میری تصدیق نہیں کی۔''

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ 547، 548 مندرجہ روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 547، 548 از مرزا قادیانی)

لاہوری جماعت کے نزدیک شرافت کا معیار یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عمداً یا بے خبری کے باعث کسی پر کوئی الزام لگائے جس کا اس کے پاس کوئی ثبوت موجود نہ ہو تو متنبہ کیے جانے پر اپنی غلطی تسلیم کرے اور اپنے الفاظ واپس لے لے کہ آج کل معذرت کا طریقہ یہی ہے۔ کیا میں بھی اسی معیار کو اس لاہوری جماعت کے حضور میں پیش کر کے توقع رکھ سکتا ہوں کہ اب جبکہ یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس سلسلہ کے پیشوا نے اپنی دعوت کے رد کرنے والے مسلمانوں کو ''حرام زادہ'' کہہ کر یاد کیا تو ان دل آزار الفاظ کو جو اس سلسلہ کے ترجمان خصوصی ''پیغام صلح'' نے ''زمیندار'' اور اس احقر کی نسبت بلاوجہ استعمال کیے ہیں، یہ سلسلہ واپس لے کر اپنی شرافت ''حقہ'' کا ثبوت دے گا بشرطیکہ اس میں شرافت کا ''ذرہ بھر بھی'' موجود ہو۔

اسی سلسلہ میں ایک اور گزارش بھی بے جا نہ ہوگی۔ ''پیغام صلح'' کے سرورق پر ''سلسلہ حقہ احمدیہ'' کی جہاں اور خصوصیات گنائی گئی ہیں، وہاں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس سلسلہ کے عقیدہ میں کوئی کلمہ گو کافر نہیں۔ کلمہ سے آپ کی مراد اس شخص سے ہوگی جو خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت کے اقرار کے ساتھ حضرت محمد مصطفی ﷺ کی ختم المرسلینی کا بھی اقرار کرتا ہو اور زبان ہی سے اقرار نہ کرتا ہو بلکہ قلب سے اس کی تصدیق بھی کرتا ہو۔ بظاہر آپ کی مراد یہی معلوم ہوتی

ہے کیونکہ آپ کا دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ آئے گا نہ نیا نہ پرانا۔ لیکن آپ کے پیرومرشد مرزائے قادیانی آنجہانی کا عقیدہ کچھ اور ہی ہے۔ وہ تو صاف لفظوں میں کہتے گئے ہیں کہ ''جو شخص مسلمان ہو کر مجھ پر ایمان نہ لائے گا، وہ کافر ہے، حرام زادہ ہے، جہنمی ہے۔'' اب آپ ہی ارشاد فرمائیے کہ آپ کو سچا سمجھا جائے، یا آپ کے پیرومرشد کو؟ اگر آپ کے پیرومرشد سچے ہیں تو تین حرف ہیں اس سچائی پر۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ اپنے بدزبان، دریدہ دہن اور جھوٹے پیشوا کی تعلیم پر از سرنو غور کریں اور اس کی خرافات سے منہ موڑ کر پھر دین حنیف کے اسی دائرہ میں آجائیں جہاں نہ گالیاں ہیں، نہ پھٹکاریں ہیں، نہ پھبتیاں ہیں، نہ ظلی نبوت کا فریب ہے، نہ جھوٹی مسیحیت کی تلبیس ہے، نہ خانہ ساز مہدویت کے چکمے ہیں، نہ ابلہ فریب مجددیت کے دم جھانسے ہیں بلکہ دونوں جہانوں کی رحمتوں کا ہجوم ہے، فوز دنیوی و فلاح اخروی کے سامان ہیں اور جہاں نبی محترم ﷺ کا وہ دامن ہے جس کے تھامنے والوں کا نام تاقیام قیامت آسمانوں میں اور زمینوں میں چمکتا رہے گا۔

(زمیندار، 19 نومبر 1931ء)

مرزا قادیانی کی منہ مانگی موت

قادیان کے البیلے خلیفہ موسیو مرزا بشیر الدین محمود نے اور ان کی مضل امت نے قسم کھا رکھی ہے کہ مسلمانوں اور ان کے واجب الاحترام زعماء کو بھانت بھانت کی گالیاں دینے، ان پر رنگا رنگ پھبتیاں کہنے اور ان کی رسوائی کا بوقلموں سامان فراہم کر کے اپنے لیے سرمایہ فلاح اخروی یعنی عذاب جاودانی سمیٹنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ قادیانیوں کو ''زمیندار'' اور مولانا ظفر علی خاں سے دیرینہ عناد محض اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے حضور سرورکون ومکان ﷺ کی شان ختم المرسلینی کے حلہ دیبائی میں جسے خدائے ذوالجلال نے خود اپنی نورانی انگلیوں سے بنا ہے، ظلیت اور بروزیت کے عزازیلی ٹاٹ کا پیوند لگانے والے مرزا قادیانی آنجہانی کے اکاذیب واباطیل کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے اور ان کی قادیانی شطحیات کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔

قادیان کا آسمانی گزٹ ''الفضلہ'' اپنی تازہ اشاعت میں مولانا ظفر علی خاں کی گرفتاری پر اپنی ناقابل ضبط مسرت کی نمائش اپنے مخصوص ابلیسانہ انداز میں اس طرح کرتا ہے۔

''آپ (مولانا ظفر علی خاں) کی تاریخ میں متعدد ایسے واقعات موجود ہیں کہ جب

بھی آپ نے حضرت مسیح موعود (مرزا قادیانی) اور جماعت احمدیہ کے خلاف بے ہودہ سرائی شروع کی، جھٹ غضب الٰہی کے نیچے آ گئے۔ کچھ عرصہ سے مسلمانوں کے اندر اپنا وہ زائل شدہ رسوخ بحال کرنے کے لیے جو آپ کی ہندو نوازی اور کانگرس پرستی کی نذر ہو چکا تھا، آپ نے خواہ مخواہ ہمارے خلاف حد درجہ کی دل آزاری اور شرانگیزی شروع کر رکھی تھی اور خدا تعالیٰ نے آپ کو اس ذلت میں ڈال کر پھر ایک بار **انی مھین من اراد اھانتک** کا وعدہ پورا فرمایا ہے۔ پہلے سیاسی وجوہ پر گرفتاریوں کو جو لوگ ذلت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے تھے، ان کے لیے اس رسوائی اور توہین سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔''

ان الفاظ کے صاف معنی یہ ہیں کہ موسیو مرزا بشیر الدین محمود اور ''الفضل'' کے نزدیک مولانا ظفر علی خاں کی گرفتاری کا سبب ان کی وہ قلمی سرگرمیاں ہیں جن کی زد براہ راست قادیانیت پر پڑ رہی ہے اور جس نے مرزائے آنجہانی کی اندلسی و دمشقی امت کے گھروں میں صف ماتم بچھا دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو مولانا ثناء اللہ امرتسری مرزائے آنجہانی کے دارالبوار کی طرف ہجرت فرما جانے کے باوجود کیوں زندہ ہیں اور اس وقت تک امرتسر میں مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کیوں دندنا رہے ہیں؟

آج سے چوبیس سال پہلے مرزا قادیانی ہنوز منازل ارتقا کے اس انتہائی درجہ پر فائز نہ ہوئے تھے، جہاں پہنچ کر انہیں بتدریج **رب السموات والارض** کے والد ماجد ہونے کا شرف حاصل ہو جانے والا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا ثناء اللہ امرتسری فاتح قادیان کی دیرینہ یثربی منطق مرزا غلام احمد کی نوخاستہ قادیانی شطحیات کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑی ہوئی تھی اور اپنے حریف کا دم ناک میں کر چکی تھی۔ بے کسی اور اضطرار کے اس عالم میں چاروں طرف سے مایوس ہو کر مرزائے قادیان نے حق و باطل کا فیصلہ خود خداوند عالم کے بے لاگ انصاف پر چھوڑا اور پورے خضوع پورے خشوع کے ساتھ اپنی احمدیت اور مسیحیت اور مہدویت اور مجددیت کا گونا گوں واسطہ دے کر رب اکبر سے دعا مانگی کہ اے حق و باطل کے فیصلہ کرنے والا خدا! اس نابکار ثناء اللہ امرتسری نے مجھ تیرے برگزیدہ رسول کو بہت ہی ستا رکھا ہے، بس اپنے فرشتہ اجل کو حکم دے کہ ثناء اللہ کی کھڑے کھڑے جان نکالے تا کہ میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کر سکوں کہ مقربین بارگاہ لم یزل کے دشمنوں کا یہ حشر ہوا کرتا ہے۔ اس دعا کا تیر قادیان کی بانکی کمان سے

چھوٹتے ہی عرش اعظم پر جا پہنچا اور نشانہ پر اس اوچھے طریق پر بیٹھا کر جناب عزرائیل نے مولانا ثناءاللہ سے دو دو ہاتھ کرنے کے بجائے مرزا غلام احمد قادیانی کا ٹینٹوا جا دبوچا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ مولانا ثناءاللہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے یہی اعلان کرتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ ان کے صادق اور مرزائے آنجہانی کے کاذب ہونے پر خود بارگاہ احکم الحاکمین نے وہ مہر لگادی جو تا بہ ابد کسی کے توڑے نہ ٹوٹے گی۔

ظاہر ہے کہ مرزائے آنجہانی کی ربانی قدرت کے علی الرغم جس کی تصدیق خدا نے **انت منی بمنزلة اولادی** (تو بمنزلہ میرے بیٹے کے ہے اور **انما امرنا اذا اردنا شیئا ان تقول له کن فیکون** (تیری تو یہ شان ہے کہ جب تو کسی بات کا ارادہ کرے اور کہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے) فرما کے کردی ہے۔ جبکہ مولانا ثناءاللہ آج بھی زندہ ہیں اور کن فیکونی آنجہانی کی امت کو اپنی صداقت کا یقین دلا کر انگاروں پر لوٹا رہے ہیں۔ تو مولانا ظفر علی خاں کی گرفتاری اور سزایابی کو قادیان کے البیلے خلیفہ کی نیم ربانی قدرت اور شان کن فیکونی کا نتیجہ قرار دینا بالکل بے معنی ہے۔ جب آپ کے مسیح موعود اپنے اعلان کی رو سے جھوٹے ثابت ہو چکے ہیں تو آپ کیا اور آپ کے موسیو مرزا کیا؟

یاد رکھیے کہ ظفر علی خاں انگریزوں کے خلاف آج لکھنا چھوڑ دے تو آپ کی طرح وہ بھی اپنے محفوظ گوشہ میں بیٹھ کر آپ کے البیلے خلیفہ اور ان کے باوا کی ایسی خبر لے سکتا ہے کہ آپ کو قدر عافیت معلوم ہو جائے۔

خدا ان قادیانیوں کو شرمائے جو علماء دین اور زعماء ملت کی ہتک کرنے سے باز نہیں آتے۔ لیکن کیا کریں، مرزائے آنجہانی جوان کے پیرو مرشد ہیں، انہیں یہی درس دیتے گئے ہیں کہ مسلمانوں کو ''حرام زادہ'' کہو، ان کے عالموں کو ''بدذات مولویاں'' کہہ کر پکارو اور دنیا جہان کی غلاظت اچھال کر پھر بھی مقدس کے مقدس رہو، کیونکہ ان کے تقدس کی ضمانت دولت بہیہ برطانیہ پہلے دن سے دے چکی ہے۔ (زمیندار، 18 دسمبر 1931ء)

آستین کے سانپ

خواجہ حسن نظامی کی طرف سے آج کی ڈاک میں مولانا ظفر علی خاں کے نام ذیل کا مطبوعہ پیغام آیا ہے جو آپ کے اخبار عادل کے 17 فروری کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے:

''محترمی۔ آپ کی قومی خدمات کی میری نظر میں اور ساری قوم کی نگاہ میں بے انتہا قدر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمان قوم کو آپ سے یہ شکوہ ہے کہ آپ ایسے نازک وقت میں جب مسلمانوں کو متحد کرنے کی ضرورت ہے، ایک غلط قدم اٹھا رہے ہیں۔ آپ نے قادیانی اور غیر قادیانی کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، وہ ہرگز موجودہ حالات میں موزوں نہیں ہے۔ آپ کی ہمسایہ قوم تو اچھوتوں کو اپنے اندر ملانے کی کوشش میں مصروف ہے اور آپ کی حالت یہ ہے کہ آپ ان قادیانیوں کے خلاف مسلمانوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا کر رہے ہیں جنہوں نے بلاشبہ مشرق و مغرب میں اسلام کی بہت ہی بڑی خدمت کی ہے۔ میرے نزدیک اور مسلمانوں کے نزدیک یہ وقت سنی، حنفی، قادیانی کے سوال اٹھانے کا نہیں۔ اس وقت تو سب کو متحد ہو جانے کی ضرورت ہے، مجھے امید ہے کہ آپ میری گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔ (آپ کا مخلص ایڈیٹر عادل)''

یہ وہی خواجہ حسن نظامی ہیں جو کسی زمانہ میں منشی غلام احمد قادیانی کے ادعائے نبوت کو اسلام پر ضرب کاری تصور کرتے تھے اور مرزائیوں کی اسلام سوز سرگرمیوں سے تنگ آ کر اپنی اسلامی حمیت کی سفارش پر برسبیل تحدی پاپائے قادیان کو للکارا تھا کہ آؤ ہم دونوں ناک سے ناک ملا کر قطب مینار سے چھلانگ لگائیں۔ اگر میں سلامت رہا اور یقیناً سلامت رہوں گا تو میں سچا اور تم جھوٹے، تمہارے قبلہ و کعبہ جھوٹے اور تمہارا مذہب جھوٹا۔ خدا کی شان آج وہی خواجہ حسن نظامی، مولانا ظفر علی خاں کو تلقین فرما رہے ہیں اور پاپائے قادیان کی حمایت میں جواب اپنی قطب الاقطابی کا بھی اعلان کر چکے ہیں ''مسلمان قوم'' کی نمائندگی کا فرض ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ مولانا نے خواجہ صاحب کے ارشاد کا جواب ذیل کے اشعار میں دیا ہے۔ توقع ہے کہ ان کے مطالعہ کے بعد آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس خارزار میں قدم زن ہونا آپ کے بس کی بات نہیں۔

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنے ارادتمندوں کے لیے تعویذ لکھنے میں مصروف رہیں۔ مولانا ظفر علی خاں جو کچھ کر رہے ہیں، اپنا فرض اور تمام مسلمانوں کا فرض کفایہ سمجھ کر کر رہے ہیں۔ یہ سنی اور حنفی غیر حنفی کا سوال نہیں ہے۔ وہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں کے اتحاد و اتفاق اور ان کو مجموعی حیثیت سے بنیان مرصوص دیکھنے کے آرزومند ہیں اور تیس سال سے اسی آرزو کی تکمیل کی مساعی میں منہمک ہیں۔ رہے قادیانی تو ان کو دنیا بھر کے علماء اسلام کافر، مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج بلکہ دشمن اسلام تصور کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب کو چاہیے کہ پہلے دنیا بھر کے علماء کو پیغام دیں کہ وہ اپنے فتاویٰ واپس لے لیں، اس کے بعد یہ فرمائیں کہ مولانا ظفر علی خاں جو کچھ کر رہے ہیں، وہ ہم مسلمان کی آرزو کے خلاف ہے۔

ہم مسلماں ہیں ازل سے شرک ہے جن کا حریف
قادیاں کا اس میں ہیکل ہو کہ ہو متھرا کا دیر
بولہب کی شان ہو یا ہو غلام احمد کی آن
ملّتِ بیضا کے ساتھ ان کا ہے پہلے دن سے بیر
ہم نے ان کے ساتھ نیکی کی انہوں نے کی بدی
اور کرسکتے تھے کیا اسلام سے برتاؤ غیر
تیر مونجے کا کبھی دل میں ترازو ہوگیا
اور کبھی سنگین چرچل کی گئی پہلو میں پیر
مشرق و مغرب کے احساں ہیں ہمارے سینہ پر
اُس کے نیزوں کے کچوکے اس کی بندوقوں کے فیر
خواجۂ دہلی کو جا کر کوئی دے میرا پیغام
در مقاماتِ طریقت ہر کجا کردیم سیر
عافیت را با نظربازی فراق افتادہ بود

(زمیندار، 19 فروری 1933ء)

اعتراف عظمت

امام العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ نے دارالعلوم دیو بند میں جمعہ کے

اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''علمائے اسلام نے انفرادی حیثیت سے متواتر کوشش اس فتنہ کے استیصال کے لیے کیں لیکن دور حاضر میں جناب ظفر الملت والدین مولانا ظفر علی خاں کا اقدام یقیناً لطف الٰہیہ ہے۔ان کی یہ جدوجہد اوران کے رفقاء کی قربانی خدا کے نزدیک ان شاءاللہ مقبول ہوگی۔دعا ہے کہ وہ خدا جس نے پیغمبر آخرالزمان ﷺ کے لائے ہوئے دین مبارک کے لیے قرآن حکیم میں **الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی** ارشادفرمایا،ان کو ثواب دارین عطا فرمائے۔ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد''

''مولانا شبیر احمد عثمانی نے مولانا ظفر علی خاں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا:

فتنہ قادیان کے استیصال میں مولانا ظفر علی خاں نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے، وہ زمانہ حال کے عین مناسب ومطابق ہے۔ہمارے علمانے اس فتنہ کی ابتدا سے اب تک قادیانیت کے خلاف جو عظیم الشان کام کیے ہیں، وہ بھی قابل قدر ہیں مگر مولانا ظفر علی خاں نے چند سال میں اس فتنہ کی سرکوبی میں جو کامیابی حاصل کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔انہوں نے دیکھا کہ اب یہ فتنہ قیامت بن رہا ہے اور بحث ومناظرہ سے اب تک کوئی فائدہ نہیں ہوا تو انہوں نے وہ طرز عمل اختیار کیا جو نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں گھر کر گیا،اس میں انہیں اتنی کامیابی ہوئی جو علماء کی متفقہ جدوجہد سے نہیں ہوئی''۔

(روزنامہ زمیندار 15 مارچ 1933ء)

مجلس دعوت وارشاد

موجودہ صدی کے نصف اول میں جب قادیانی حضرات نے اپنی سرگرمیوں کو تیز کیا اوراپنا دائرہ اثر بڑھانے کے لیے سادہ لوح مسلم عوام کو غیر ملکی سامراج کی سرپرستی میں قائم ہونے والی نبوت کے چنگل میں پھنسانے کے لیے ایک نیا رنگ دیا تو مسلمان اکابر نے بھی ان کے احتساب کو تیز کیا۔مولانا ظفر علی خاں نے **1933**ء میں اسی مقصد کے لیے ایک تنظیم ''مجلس دعوت وارشاد'' کے نام سے قائم کی جس میں مولانا احمد علی لاہوریؒ،مولانا لال حسین اخترؒ،مولانا محمد بخش مسلم،مولانا حبیب اللہ،مولانا عبدالحنان اور خان احمد یار خاں بھی شامل تھے۔اس تنظیم کے تحت جامع مسجد مبارک اہل حدیث لاہور میں باقاعدہ جلسے منعقد کیے جانے لگے جن میں علما

مسلم عوام کو قادیانیوں کے عزائم اور عقائد سے آگاہ کرتے۔ مجلس دعوت وارشاد کی ان سرگرمیوں سے تنگ آ کر حکومت نے مولانا ظفر علی خاں اوران کے رفقا کو مارچ 1933ء میں گرفتار کرلیا۔ اس گرفتاری کے موقع پر مولانا ظفر علی خاں نے مسلمانان ہند کے نام یہ پیغام دیا جوان کی حق گوئی، حق پرستی، اسلام اورختم نبوت سے والہانہ لگاؤ اور جذبہ سرفروشی کا شاہد عادل ہے کہ جس جرم کی پاداش میں گرفتار کر کے انہیں جیل لے جایا جارہا ہے، وہ اسی جرم کا پھرارتکاب کررہے ہیں اوریہی وجہ ہے کہ ظفر علی خاں کا نام جریدۂ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو چکا ہے۔

مجلس دعوت وارشاد کی سرگرمیوں سے تنگ آ کر جب حکومت نے مولانا ظفر علی خاں اوران کے رفقا کو گرفتار کرلیا تو اس نظر بندی کے دوران مسلم عوام میں دعوت وارشاد کے کام کو جاری رکھنے کے لیے مولانا ظفر علی خاں کے ایما پر مولانا لال حسین اختر اور خان احمد یار خان کی ضمانت داخل کر دی گئی تا کہ دعوت وارشاد کا وہ سلسلہ رکنے نہ پائے جوان حضرات کی موجودگی میں شروع ہوا تھا۔ ان حضرات کی رہائی کے وقت مولانا ظفر علی خاں نے جیل سے مسلمانان ہند کے نام یہ پیغام بھیجا۔ جس کے ساتھ مندرجہ ذیل اپیل بھی کی:

''میرا یہ پیغام زمیندار کی وساطت سے زادگان توحید تک پہنچا دو کہ حضرت محمد ﷺ کے خدا کا نام اور اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے میں باطل کی قہرمان طاقتوں کے مقابلے میں پچیس سال تک سینہ سپر رہا اور زمیندار کو اپنے خون سے سینچ کر پروان چڑھایا۔ اب میں مسلمانوں کو یہ امانت خودان کے سپرد کر چکا ہوں۔ اب ان کے اختیار میں ہے کہ اسے زندہ رکھیں یا کندھا دے کر ہمیشہ کے لیے آغوش لحد میں سلا کر ان معاندین کی دیرینہ آرزو پوری کریں جو سالہا سال سے زمیندار کو صفحہ ہستی سے معدوم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔''

('کلیاتِ نثر ظفر علی خاں' از ڈاکٹر زاہد منیر عامر)

زمیندار کی معجزانہ نشأت

دسمبر 1934ء میں ''زمیندار'' کچھ دن بند رہا۔ دوبارہ اجراء پر میں نے مذکورہ بالا عنوان سے ذیل کی نظم لکھی جو 7 دسمبر کے پرچے میں شائع ہوئی۔

موجۂ بحر حوادث کے تھپیڑوں کا شہید
پھر نرالی شان سے کھلا ہے ہو کر سربکف

پھر نئے انداز سے آیا ہے جولان گاہ میں
ترکش ناسازیٔ قافع کے تیروں کا ہدف
رہتی دنیا تک یہ آویزش رہے گی یادگار
خیل طاغوت اک طرف تنہا ''زمیندار'' اک طرف
حق کے جلوے صفحۂ گیتی پہ چھا جانے لگے
خانۂ باطل میں بچھ جانے لگی ماتم کی صف
ہوگیا کافور رنگ چہرۂ تلبیس آج
سینہ کوبی کر رہا ہے قادیان ناخلف
عزم راسخ نے فنا کر ڈالے بے شک گماں
ہو گیا پیش نظر الحق یعلو کا سماں

مولانا ظفرعلی خان صاحب قبلہ نے اس نظم کی داد ان الفاظ میں دی: ''زمیندار کے پاس شاہجہان کا خزانہ تو ہے نہیں کہ جس طرح اس نے ایک غزل کہنے پر کلیم کو سونے چاندی میں تلوا دیا تھا۔ اسی طرح زمیندار بھی اس نظم کے صلہ میں ''طالوت'' پر سیم وزر نچھاور کرے۔ البتہ ادب کا گنج شائیگاں مبداء فیاض سے ضرور ارزانی ہوا ہے۔ دو شعر حاضر ہیں۔ جناب طالوت قبول فرمائیں اور اپنی نظم کے تیسرے شعر کے بعد ان کا اضافہ کر دیں۔''

اس کے سر پہ سایہ ہے شام و بگاہ اللہ کا
اس نے پایا ہے محمد ﷺ کی معیّت کا شرف
کیوں نہ اس کے حوصلے آ کر بڑھائے جبرئیل
کیوں نہ پہنچے عرش سے اس کو نوید لا تخف

(علامہ طالوت کا مضمون مطبوعہ روزنامہ زمیندار 7 دسمبر 1934ء)

آپ بیتی

''میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، قادیانیت کا خطرہ میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا۔ میری ساری عمر اس ہولناک فتنے کا مقابلہ کرنے میں گزری ہے۔ مسلمانوں نے اول اول قادیانی فتنے کو اہمیت نہ دی۔ علمائے امت نے اتنا ضرور کیا کہ جس طرح غلام احمد قادیانی نے

ان تمام مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا، اسی طرح انہوں نے بھی اس پر اور اس کی امت قلیل الانفار پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ ان کے مایہ ناز مسئلہ حیاتِ مسیح پر اس کے ساتھ یا اس کے اتباع والوں کے ساتھ ہنگامہ خیز مناظرے کرتے رہے۔ لیکن زہر کا یہ تریاق کچھ زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوا۔ مرزائیوں کا یہ پروپیگنڈا اس مذہبی رواداری کے سائے میں جس کا حکومت وقت کو ادعا ہے، پروان چڑھتا رہا۔ آخر میرے شور وغل اور میرے رفقاء کی ہاؤ ہو نے عام مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ جب حکومت وقت نے مرزائیت کی پیٹھ پر علی اعلان تھپکیاں دینا شروع کیں تو ان کو صاف نظر آنے لگا کہ جس فتنے سے انہیں پالا پڑا ہے، وہ کتنا ہولناک ہے۔ میں پہلے دن سے پکار رہا ہوں کہ فرقہ ضالہ مرزائیہ جو اسلام کے نام پر مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہے، ہرگز یہ حق نہیں رکھتا کہ اس کا شمار مسلمانوں میں ہو، بلکہ سکھوں، پارسیوں، عیسائیوں یا دوسری اقلیتوں کی طرح اس فرقہ ضالہ کا شمار بھی سرکاری کاغذوں میں جداگانہ اقلیت کے طور پر ہونا چاہیے۔ جب حکومت کی امپریل مصلحتوں نے چوہدری ظفر اللہ خاں جس کے عقیدہ میں تمام مسلمان مرزا غلام احمد قادیانی کو نہ ماننے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہیں، وائسرائے کی کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے مقرر کرنے کا فیصلہ کیا تو ''زمیندار'' نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ یہ فتنہ اب قیامت بننے والا ہے۔ چنانچہ طول وعرض ملک میں اس پر احتجاج ہوا، مگر حکومت کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور چودھری ظفر اللہ خاں کا تقرر عمل میں آ گیا۔ اسی وقت سے مسلمان برابر پکار رہے ہیں کہ قادیانیوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے۔ حکومت ایک غیر مسلم کی حیثیت سے انہیں مراعات دے، لیکن انہیں اسلام کا نمائندہ نہ گردانا جائے۔ اس لیے کہ مسلمانوں سے ان کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مسلمانوں کا یہ سارا شور حکومت کے بہرے کانوں پر پڑا جس نے مسلمانوں کو بے چین کر رکھا ہے۔ اگر اس نے لب کشائی کی ضرورت محسوس کی تو مسلمانوں کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ سارا شور متعصب اور غیر ذمے دار لوگوں کا بپا کیا ہوا ہے، مسلمانوں کا ذمے دار فہیم طبقہ مرزائیوں کو مسلمان سمجھتا ہے۔

آخر وہ وقت بھی آیا کہ جو لوگ ذمے دار اور فہیم و غیر متعصب تھے، انہوں نے بھی عامۃ المسلمین کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے لگی لپٹی رکھے بغیر حکومت کو بتا دیا کہ

قادیانیت ایک جداگانہ مذہب ہے جسے اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔اگر حکومت نے قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے میں کوتاہی کی تو مسلمانوں کا یہ شبہ یقین کے درجہ تک پہنچ جائے گا کہ حکومت مسلمانوں کی وحدت ملی کو پارہ پارہ دیکھنے کی متمنی ہے۔خدا بھلا کرے علامہ اقبال کا جن کے حکیمانہ بیان نے ان ساری حقیقتوں کو بکمال شرح وبسط الم نشرح کر کے مسلمانان ہند کی ایسی خدمت سرانجام دی ہے جس کا صلہ اسے سرور کائناتؐ کی ختم المرسلینی کی بارگاہ سے مل سکتا ہے''۔

''............ختم نبوت کے اس عقیدے کو جھٹلانے کی جرأت اس ساڑھے تیرہ سوسال کے عرصے میں اگرچہ متعدد پرستاران طاغوت کو ہوئی ہے، لیکن اس جرأت کا سب سے بے باکانہ مظاہرہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی قلیل الانفار ذریت کی طرف سے ہوا۔ میرا پختہ یقین ہے کہ اس تکذیب کی پاداش میں طائفہ قادیان جس کے نیم جان جسم میں حکومت وقت کے سیاسی معالج نے تھوڑی بہت حرکت پیدا کر رکھی ہے، اپنے وقت پر گردش روزگار میں دب کر فنا ہو جائے گا، جس طرح اس سے پہلے مدعیان نبوت اور ان کی امتیں نابود ہوگئیں''۔

(''زمیندار'' بابت 9 مئی 1935ء)

موت ہی ہے اب علاج درد مرزا

جس زمانہ میں مرزا قادیانی کو بڑھاپے میں نوشہ بننے اور محمدی بیگم کو اپنی منسلک ازدواج میں منسلک کرنے کا شوق چرایا تو آپ نے سب سے پہلے اپنے وزیر بے تدبیر اور مشیر بے توقیر حکیم نورالدین سے ایک دن بر سبیل تذکرہ بیان کیا کہ حال میں مجھے ایک الہام ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشیت خداوندی میں یوں مقدر ہے کہ میں ابھی ایک اور شادی کروں اور اس سے اولاد پیدا ہو۔ چنانچہ ابھی ابھی ایک الہام ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مسیح موعود و خاکسار اپنی اولوالعزمانہ زندگی کی نشاۃ ثانیہ میں شادی بھی کرے گا اور اولاد بھی پیدا کرے گا۔ الہام کے الفاظ یہ ہیں۔**یتزوج ویولد لهٗ**

حکیم صاحب یہ سن کر حسب معمول مسکرائے۔ مطلب یہ تھا کہ آپ کا مطلب میں نے سمجھ لیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے چند اشعار مرزا صاحب کی شادی خانہ آبادی کے متعلق پڑھے۔ حکیم صاحب نے تو یہ شعر پڑھتے وقت مرزا صاحب سے کہا تھا کہ یہ اس عاجز نے بر سبیل

ارتجال کہے ہیں۔

کتخد اشد بار دیگر مہدی عالی نژاد
بافراواں عزو تمکین با وقار و زیب و زین
از سر نو زد وصلی صید تا نقشے زند
بازیٔ چرخ و غا بازش نسازد گرسنین
مہرہ ور ششدر یفتد گر کشادی رو وہد
منبر ندبر تختہ از نرس حریفاں کعبتین

حکیم صاحب، نعمت خاں عالی کے ان اشعار آبدار کا مصنف اپنے کو ظاہر کر کے مرزا کے جاہل جلیسوں اور مقربوں سے داد ہی لے رہے تھے کہ دفعتہً ...... تمام مرزائی اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ مرزا صاحب جب گھر پہنچے تو خیال آیا کہ اصلی مقصد تو حکیم صاحب سے کوئی مقوی و مسمن نسخہ دریافت کرنا تھا مگر وہ صرف ہماری شادی کا مذاق اُڑا کر ہی چلے گئے۔ جھٹ کاغذ قلم دوات طلب فرمایا اور ایک رقعہ حکیم صاحب کی خدمت میں بدیں مضمون لکھا کہ جو تذکرہ آج حسب منشا خداوندی، میں نے آپ سے شروع کیا تھا، اس سے مدعا یہ نہ تھا کہ آپ میرے ارادہ کا (جس کا محرک، الہام خداوندی ہوا ہے)، مذاق اُڑا کر چلے جائیں بلکہ اس کی تعمیل کے لیے طیار ہونے میں میری دستگیری فرمائیں اور میرے لیے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیں جس کا استعمال مجھے زوجیت کی ان ذمہ داریوں سے جنہیں 'وظیفہ زوجیت' سے تعبیر کیا جاتا ہے، عہدہ برا ہونے کے قابل بنا دے۔ حکیم صاحب نے جواباً لکھا کہ 'لبوب کبیر' جو آپ کے لیے ابھی پچھلے دنوں تیار ہوا ہے، وہی کھاتے جایئے کہ انحطاط قوی کے وقت وظیفہ زوجیت کے بجالانے میں زیادہ سرگرمی کا اظہار موت کے گڑھے میں آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگانے کے مترادف ہے۔

حکیم صاحب کا رقعہ پڑھ کر مرزا صاحب دل میں تو بہت ناراض ہوئے۔ مگر مصلحتاً ناراضی کا اظہار نہیں کیا بلکہ بہ منت بار دیگر ایک رقعہ لکھا جس میں بالاصرار یہ درخواست کی کہ میرا ضعف کلیتہً انتہا کو پہنچ گیا ہے، اس کا لحاظ رکھتے ہوئے کوئی نیا نسخہ تجویز فرمایئے۔ حکیم صاحب کو رات کی رقعہ بازی جوان کے اپنے عیش و آرام میں مخل ہو رہی تھی، ناگوار گزری اور انہوں نے بادل ناخواستہ اٹھ کر یہ شعر مرزا صاحب کے رقعہ کی پشت پر ہی لکھ کر رقعہ واپس کر دیا۔

ساز زرعونی زخولنجان وجو زو زنجبیل
تو وری و دار خلئل سعد و قسط ہمینین

اگلے دن مرزا صاحب علی الصباح خود حکیم صاحب کے مکان پر پہنچ گئے اور نسخہ کے اجزا پر بحث شروع ہوئی۔ حکیم صاحب نے کہا کہ آپ تو مسیح موعود اور مہدی زماں ہیں اور آپ کے ہر حکم کی تعمیل یا ہر سوال کا جواب ہر انسان پر فرض ہے۔ لیکن اگر آپ کے سوا کوئی اور میرا مغز اس طرح چاٹتا تو میں اسے فوراً کہہ دیتا ۔

خانہ ام را مدرسہ کر دی تو اے خانہ خراب
ہم بہ درد آمد زبان از گفتگو ہم لوزتین

مرزا صاحب نے کہا کہ طب میں آپ کا کمال مسلم ہے۔ یہ تو فرما دیجیے کہ آپ کی مجوزہ دوا سے اگر پورا فائدہ نہ ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ حکیم صاحب نازک مزاج تھے۔ مرزا صاحب کے سوالات کی بوچھاڑ سے گھبرا گئے اور کہا کہ اگر اس سے فائدہ نہ ہوا تو یہ کہنا پڑے گا کہ

چارہ ات فصد و جا جین است دکی صد غتین

یعنی پھر شاہ رگوں کا فصد اور کان کے ساتھ جو جگہ ہے، اس پر لوہے سے داغ دینا آپ کا علاج ہے۔ یعنی

موت ہی سے اب علاجِ دردِ مرزا ہو تو ہو

مرزا صاحب نے محسوس کیا کہ حکیم صاحب ناراض ہو گئے ہیں اور کہا کہ اچھا، اس زمین میں کوئی اور شعر تو سنایئے۔ حکیم صاحب نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ

قافیہ شد ختم و باقی نیست غیر از خصیتین

دربار قادیان کے ایک شاعر خاص نے جو ہر وقت سایہ کی طرح مرزا صاحب کے ساتھ لگے پھرتے تھے اور جو موقع کے گواہ ہیں اور جن سے زیادہ راست گو قادیانیوں میں آج تک نظر نہیں آیا، ہم سے یہ روایت اس توضیح کے ساتھ کی کہ شعر اگرچہ نعمت خاں عالؔی کے ہیں مگر حکیم صاحب نے مرزا صاحب سے کہا کہ میں نے یہ شعر فی البدیہہ کہے ہیں۔

ہم نے راوی کے بیان کی تصدیق کر لی ہے۔ یہ اشعار فی الحقیقت 'وقائع نعمت خاں عالیؔ' میں موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم نورالدین صرف مرزا صاحب کے خلیفہ اول

ہونے کے لحاظ سے 'مارق اعظم' ہی نہ تھے، بلکہ دوسروں کی متاع سخن پر نہایت دلیری سے ڈاکہ ڈالنے کے اعتبار سے 'سارقِ اعظم' بھی تھے۔

(روزنامہ زمیندار (قادیان نمبر) اگست 1937ء)

میرے لیے بھی جیل میں جگہ بنا دیجیے

ظفر الملت والدین حضرت مولانا ظفر علی خاں قبلہ مدظلہ نے ''ختم نبوت'' کے موضوع پر تقریر کرنے والوں کی گرفتاریوں کی اطلاع سن کر فرمایا کہ ''نبی آخر الزماں ﷺ کی حرمت کے لیے جیل جانا کیا، اگر سر کٹانے کی نوبت بھی آئے تو میں اسے اپنے لیے عین سعادت سمجھوں گا'' مولانا نے فرمایا کہ ہاتھ پاؤں میں رعشہ، ضعف اور پیرانہ سالی کے باعث میں ایک عرصہ سے عملی زندگی سے کنارہ کشی کر چکا ہوں لیکن اگر حکومت یہ قطعی فیصلہ کر چکی ہے کہ ''ختم نبوت'' پر تقریر کرنے والوں کی جگہ جیل ہے تو میں سمجھا ہوں کہ میرا ٹھکانہ بھی اب جیل ہی میں ہوگا۔ میرے لیے بھی وہاں جگہ بنا دی جائے۔ گفتگو کے اخیر میں حضرت مولانا نے الحاج خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان اور وزیر اعلیٰ پنجاب میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ سے اپیل کی کہ وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں۔ خواجہ بطحا ﷺ کی بارگاہ میں گستاخی کرنے والوں کے منہ میں لگام دیں اور ایسی صورت حال پیدا نہ ہونے دیں کہ مسلمان حضور سرور کائنات ﷺ کی عزت و ناموس کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ ہو جائیں''۔ (روزنامہ زمیندار 2 جولائی 1952ء)

مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے اور ظفر اللہ کی برطرفی کے مطالبات

مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے اور چودھری ظفر اللہ خاں کی وزارت خارجہ سے علیحدگی کے متعلق مطالبات بالکل جائز اور درست ہیں۔ آپ صبر و تحمل اور نظم و ضبط کے ساتھ قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی پر امن جدوجہد کو اس وقت تک جاری رکھیے۔ جب تک کہ یہ مطالبات تسلیم نہ کر لیے جائیں یہ ہے وہ پیغام جو پروانہ رسول کے لیے عاشق خاتم النبیین حضرت مولانا ظفر علی خاں مدظلہ العالی نے مری سے اسلامیان پنجاب کے نام بھیجا۔

مولانا نے حکومت پاکستان سے اپیل کی ہے کہ وہ مسلمانوں کے جائز مطالبات کو بلا کسی تاخیر کے تسلیم کر لینے کا اعلان کر دے۔ حضرت مولانا نے اپنے پیغام میں فرمایا ہے کہ

مسلمانوں کے بہت سے مسالک میں متعدد امور پر اختلاف پایا جاتا ہے لیکن ''ختم نبوت'' واحد مسئلہ ہے جس پر ہر مسلک کے مسلمان کلیتاً متفق ہیں۔ سردار انبیاء آقائے دو جہاں حضور سرور کائنات محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ پر نبوت اور رسالت ختم ہوگئیں ان کے بعد جو شخص نبوت کا دعویدار ہے، وہ ظلی ہو یا بروزی، وہ کاذب ہے۔

علمائے اسلام کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ مرزائی مسلمان نہیں ہیں۔ انگریزی عہد میں حکومت نے استعماری مصلحتوں کے پیش نظر اس خود کاشتہ پودے کی آبیاری کی اور پروان چڑھایا۔ لیکن پاکستان کی اسلامی حکومت کے راستے میں تو ایسی کوئی مصلحتیں نہیں، اسے چاہیے کہ وہ فوراً مرزائیوں کو اقلیت قرار دے دے۔ دولت خداداد پاکستان کے مسلمانوں کو اس امر پر مطلق اعتراض نہ ہوگا کہ حکومت پاکستان مرزائی اقلیت کے ساتھ اسلامی اصول اور قائداعظم علیہ الرحمۃ کے ارشاد کے مطابق رواداری اور فیاضی کا سلوک کرے لیکن اسلامیان پاکستان یہ کسی صورت میں گوارا نہیں کر سکتے کہ اقلیتی فرد پاکستان کی کسی کلیدی آسامی پر فائز ہو۔ ملت ہمیشہ اس شک میں مبتلا رہے کہ نہ معلوم ان کی حکومت کے راز ہائے سربستہ حلف رازداری کے باوجود محفوظ بھی ہیں یا نہیں اور نہ ہی وہ یہ برداشت کر سکتے ہیں کہ کوئی دریدہ دہن عالم اسلام کی سب سے بڑی مملکت میں رسول اکرم ﷺ (فداہ امی وابی) کی شان والا صفات میں گستاخی کرنے کی جرأت کرے۔

مولانا نے فرمایا کہ پاکستان کو معرض وجود میں آئے قریباً پانچ سال ہو گئے ہیں لیکن اس کا دستور منظوری کے مرحلہ سے نہیں گزرا۔ اگر اپنا دستور مرتب ہو چکا ہوتا اور اس کے تحت انتخابات ہو گئے ہوتے تو نہ چودھری ظفر اللہ خاں قادیانی اس عہدے کے اہل ہوتے .... اور نہ ان کی برطرفی اور علیحدگی کا مطالبہ ہوتا۔ اپنا پیغام ختم کرتے ہوئے مولانا نے اسلامیان پنجاب کو تلقین کی کہ وہ اپنے جائز مطالبات کو تسلیم کرانے کے لیے صبر و تحمل، نظم و ضبط کے ساتھ اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی پر امن جدوجہد کو جاری رکھیں۔ (روزنامہ زمیندار 4 جولائی 1952ء)

ایک پہلو دار شخصیت

حقیقت یہ ہے کہ کسی جماعت یا شخصیت سے وابستگی یا کسی کی مخالفت ان کا مقصد نہ تھی۔ یہ تو ذرائع تھے، ایک اعلیٰ و ارفع مقصد کے حصول کے۔ ان کی وابستگی صرف اسلام سے تھی۔ اسلام کے تعلق سے وہ مسلمانوں کے بہی خواہ تھے اور مسلمانوں کی آزادی و ترقی کے لیے

ہمیشہ کوشاں رہے۔اس وابستگی میں کبھی فرق نہیں آیا۔اگر وہ کسی جماعت میں شامل ہوتے تو اس نظریہ کے تحت کہ اس سے ان کی قوم کو فائدہ پہنچے گا۔جب وہ یہ محسوس کرتے کہ وہ جماعت، اسلام اور اہل اسلام کے مفاد کے خلاف ہے تو وہ اس سے قطع تعلق کر لیتے اور اس کی مخالفت بھی کرتے۔اس طرح جس شخصیت کے متعلق وہ محسوس کرتے کہ یہ قوم وملک کے لیے مفید کام کر رہی ہے تو وہ اس کی تعریف وتوصیف میں بخل سے کام نہ لیتے اور جب یہ محسوس کرتے کہ اس شخصیت کے کسی قول یا فعل سے قوم وملک کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے تو وہ اس کا ساتھ دینے پر کسی طرح بھی آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ہم اُن کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن انہوں نے جس خلوص، جاں نثاری اور بے باکی سے اسلام اور اہل اسلام سے اپنی وابستگی کا ثبوت دیا ہے، اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد اور ایک ہی محور تھا، اور وہ تھا، اسلام کی سر بلندی۔ان کی پوری زندگی اس محور کے گرد گھومتی رہی۔ان کی تمام توانیاں اسلام اور اہل اسلام کی خدمت میں صرف ہوئیں۔ان کی نہ دوستی اپنی ذات کے لیے تھی نہ دشمنی۔ان کا عمل **''الحب فی اللہ والبغض فی اللہ''** پر تھا۔اس سے زیادہ استقلالِ مزاج کیا ہوسکتا ہے کہ اسی ایک لگن میں اپنی پوری زندگی صرف کردی۔کوئی ترغیب اور کوئی ترہیب ان کو اس مقصد سے ہٹا نہ سکی۔

مرزائیت اور اس کے بانی آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کی جس شد ومد سے انہوں نے مخالفت کی، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، ادبی ہو یا علمی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کے لیے وہ شمشیر برہنہ تھے اور مسلمانوں اور ان کے دوستوں کے لیے سراپا شفقت ورافت۔ایسے سچے مسلمان اور مخلص راہنما روز روز پیدا نہیں ہوتے۔اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے اور ہمیں اپنے ان محسنوں کو یاد رکھنے اور ان کی خدمات کے عملی اعتراف کی توفیق عطا فرمائے۔

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں!
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

(مولانا ظفر علی خاں، ایک پہلو دار شخصیت مطبوعہ ''چناب'' (مولانا ظفر علی خاں ایڈیشن 1984ء مولانا ظفر علی خاں ڈگری کالج، وزیر آباد)

کتابیات

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	پبلشر
-1	روزنامہ زمیندار لاہور (جنوری تا دسمبر 1923)	مولانا ظفر علی خاںؒ	مولانا ظفر علی خاںؒ ٹرسٹ لاہور
-2	روزنامہ زمیندار لاہور (جنوری تا دسمبر 1924)	مولانا ظفر علی خاںؒ	مولانا ظفر علی خاںؒ ٹرسٹ لاہور
-3	گفتارِ ظفر علی خاںؒ (جلد اول)	احمد سعید	مولانا ظفر علی خاںؒ ٹرسٹ لاہور
-4	مولانا ظفر علی خاںؒ (احوال و آثار)	ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی	مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور
-5	قیدِ فرنگ (مولانا ظفر علی خاںؒ کے ایامِ اسیری)	آغا شورش کاشمیریؒ	مطبوعاتِ چٹان میکلوڈ روڈ لاہور
-6	اقبالؒ اور ظفر علی خاںؒ	جعفر بلوچ	اقبال اکادمی پاکستان
-7	انمول موتی (جلد اول) مضامین مولانا ظفر علی خاںؒ	ڈاکٹر محمد صادق	مولانا ظفر علی خاںؒ ٹرسٹ لاہور
-8	انمول موتی (جلد دوم) مضامین مولانا ظفر علی خاںؒ	ڈاکٹر محمد صادق	مولانا ظفر علی خاںؒ ٹرسٹ لاہور
-9	ارمغان قادیاں	مولانا ظفر علی خاںؒ	مکتبہ کاررواں لاہور
-10	کلیات مولانا ظفر علی خاںؒ	زاہد علی خان	الفیصل پبلشرز اردو بازار لاہور
-11	نگارشات مولانا ظفر علی خاںؒ (جلد اول)	احمد سعید	مولانا ظفر علی خاںؒ ٹرسٹ لاہور
-12	ظفر علی خاںؒ	آغا شورش کاشمیریؒ	مولانا ظفر علی خاںؒ ٹرسٹ لاہور
-13	مولانا ظفر علی خاںؒ	اشرف عطا	مولانا ظفر علی خاںؒ ٹرسٹ لاہور
-14	کلیات نثر ظفر علی خاںؒ (جلد اول)	زاہد منیر	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور
-15	مولانا ظفر علی خاں	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
-16	روشنی چراغوں کی	صادق نسیم	مکتبہ علم و ادب راولپنڈی
-17	آوازِ دوست	مختار مسعود	فیروز سنز لاہور
-18	دل جس سے زندہ ہے	پروفیسر محمد اقبال جاوید	نعت ریسرچ سنٹر کراچی

19- ظفر علی خاں اور اُن کا عہد — عنایت اللہ نسیم سوہدروی اسلامک پبلشنگ ہاؤس، لاہور

20- عقیدہ ختم نبوت: مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کی روشنی میں — ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم Y-319 اقبال کالونی سرگودھا

21- چناب (مولانا ظفر علی خاںؒ نمبر) — ظفر علی خاں ڈگری کالج وزیر آباد

22- مرغزار (ظفر علی خاں نمبر) — گورنمنٹ کالج شیخوپورہ

23- زمیندار کی مختلف فائلیں

24- ستارۂ صبح کی مختلف فائلیں

رعایتی قیمت مطبوعات عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان

رعایتی قیمت	مصنف	نام کتاب	نمبر شمار
400	پروفیسر محمد الیاس برنیؒ	قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ	1
400	ابوالقاسم مولانا محمد رفیق دلاوریؒ	رئیس قادیان	2
300	ابوالقاسم مولانا محمد رفیق دلاوریؒ	ائمہ تلبیس	3
1200	حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ	تحفہ قادیانیت (چھ جلدیں)	4
700	جناب محمد متین خالد صاحب	فتنہ قادیانیت کے خلاف عدالتی فیصلے (2 جلدیں)	5
2500	حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب	تحریک ختم نبوت (10 جلد مکمل سیٹ)	6
1000	حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب	مقدمہ بہاولپور مکمل سیٹ (تین جلدیں)	7
6600	متعدد حضرات کے مجموعہ رسائل	محاسبہ قادیانیت. جلد نمبر 1 تا 25 (مزید جلدوں کی اشاعت جاری ہے)	8
1000	حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب	قومی اسمبلی میں قادیانی مسئلہ پر بحث کی مصدقہ رپورٹ (5 جلدیں)	9
300	حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب	قادیانی شبہات کے جوابات (کامل)	10
1200	حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب	چمنستان ختم نبوت کے گلہائے رنگارنگ (5 جلدیں) مکمل سیٹ	11
200	حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب	آئینہ قادیانیت	12
200	حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب	ایک ہفتہ شیخ الہندؒ کے دیس میں	13
200	جناب محمد متین خالد صاحب	قادیانیوں سے فیصلہ کن مناظرے	14
250	حضرت مولانا اللہ وسایا صاحب	تذکرہ مجاہدین ختم نبوت	15
400	مولانا محمد بلال، مولانا محمد یوسف ماما	خطبات شاہین ختم نبوت (دوجلدیں)	16
250	مولانا عبدالغنی پٹیالویؒ	اسلام اور قادیانیت ایک تقابلی مطالعہ	17
400	رسائل اکابرین	مجموعہ رسائل (رد قادیانیت) (دوجلدیں)	18
200	مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ، مولانا قاضی احسان احمد	قادیانیت کا تعاقب	19
250	مولانا مفتی مصطفیٰ عزیز صاحب	ختم نبوت کورس	20

نوٹ: ...... عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت تبلیغی ادارہ ہے۔ تبلیغ کے نقطۂ نظر سے تقریباً لاگت پر کتب مہیا کی جاتی ہیں

ملنے کا پتہ: ...... عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت حضوری باغ روڈ ملتان ...... جامعہ عربیہ ختم نبوت مسلم کالونی چناب نگر ضلع چنیوٹ

مولانا ظفر علی خانؒ اور فتنۂ قادیانیت

تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر مولانا ظفر علی خانؒ کے معرکہ آرا مضامین، مقالات، توضیحات، اداریے، خطبات، مکاتیب اور شاعری کا دلکش مرقع

محمد متین خالد

عالمانہ شکوہ، ادیبانہ جلال و جمال اور صحافیانہ بے باکیوں پر مشتمل مربوط و مبسوط ایک ایسی دل آویز کتاب

- جس کے مضامین کا انتخاب انتہائی محنت شاقہ اور عرق ریزی سے اردو کے قدیم اور تاریخ ساز اخبار 'زمیندار' اور 'ستارہ صبح' کی فائلوں سے کیا گیا ہے۔
- جو فتنہ قادیانیت کے رد میں لکھے گئے تاریخ ساز مضامین اور ولولہ انگیز نظموں کا سدا بہار گلدستہ ہے۔
- جو استعماری آب و گل سے تیار ہونے والے فتنہ قادیانیت کا علمی، تحقیقی، استدلالی اور تجزیاتی محاکمہ ہے۔
- جو پرشکوہ ترکیبوں، نادر استعاروں، دلکش تشبیہوں، تیز دھار روزمروں، سنگلاخ زمینوں، اوق قافیوں، دلچسپ محاوروں، نایاب ضرب الامثال اور جدید الفاظ و اصطلاحات کا ایک پوشیدہ جہاں اپنے اوراق و صفحات کے دامن میں نگینوں کی طرح سمیٹے ہوئے ہے۔
- جس کے گراں بہا رشحات، فتنہ قادیانیت کے لیے روز حشر کا محاسبہ ہیں۔
- جو اپنے دامن میں روانی و سلاست اور فصاحت و بلاغت سے بھرپور نظم و نثر کا ایک جامع، بلند پایہ اور سحر انگیز ادبی سرمایہ لیے ہوئے ہے۔
- جو معجزانہ نشاۃ پر مبنی علم و تحقیق کا ایک بے مثال اور حیرت انگیز گنج گراں مایہ ہے۔
- جس کی بعض شعلہ فشاں تحریروں کے باعث مولانا ظفر علی خانؒ کو گوناں گوں مصائب و شدائد، جبر و استبداد اور زنجیر و تعزیر کے مراحل کا سامنا کرنا پڑا۔

نابغۂ عصر جناب محمد آصف بھلی، معروف سیرت نگار جناب پروفیسر تفاخر محمود گوندل اور نامور سکالر جناب عبدالروف کی علمی رفعتوں پر مبنی ایمان افروز تقاریظ کے ساتھ

عالمی مجلس تحفظِ ختم نبوت
حضوری باغ روڈ، ملتان۔
061-4783486